منکرینِ اسلام کو دندان شکن جوابات

۱۔۲

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہ

تالیف

مولانا محمد رحیم رحمانی سہسرامی

Faisal International

منکرین اسلام کو
دندان شکن جوابات

حصہ اول

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ

بانی دارالعلوم دیوبند

تالیف

مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فاضل دارالعلوم دیوبند

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

© کتاب کے جملہ حقوق بحق ناشر مکمل محفوظ ہیں

کوئی بھی صاحب اس کتاب کے کسی بھی حصے کو بغیر ناشر کی اجازت کے چھاپنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس کے خلاف قانونی کاروائی کی جائیگی۔(ناشر)

I.S.B.N. : 81-86971-98-X

نام کتاب	منکرین اسلام کو دندان شکن جوابات
افادات	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ
تالیف	مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی
حصہ	اول
صفحات	۲۰۰
سن اشاعت	۲۰۰۴
باہتمام	محمد نوید صدیقی
قیمت	.....
کمپیوٹر کتابت و ٹائٹل ڈیزائن	فیصل کمپیوٹرس دیوبند
مطبع	فیصل پریس دیوبند
ناشر	فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند

PHONES : 01336-224110,222694 FAX.224110

Distributed by

FAISAL BROTHERS

468, Gali Bahar Wali Chhatta Lal Mian
Daryaganj New Delhi.110002 Ph. 3245665
e-mail : faisal_india@rediffmail.com

انتساب

محسن انسانیت، شفیع محشر، ساقی کوثر

تاجدار کونین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ

کے نام

محمد نسیم رحمانی

شریک افتاء والقضاء

دارالعلوم وقف دیوبند

کلمات دعائیہ

فقیہ الاسلام حضرت مولانا مفتی مظفر حسین صاحب نور اللہ مرقدہٗ
ناظم اعلیٰ مظاہر علوم وقف سہارنپور

بسم اللہ والصلاۃ علی نبیہ، پیش نظر مجموعہ ''منکرین اسلام کو دنداں شکن جوابات'' عزیزم مولوی محمد نسیم رحمانی کی محنت اور تحقیق علم کا مظہر ہے، موصوف کی طالب علمانہ سعی وکوشش امید کہ بارگاہ الٰہ میں مقبول اور عند الناس مشکور ہوگی۔

دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس مجموعہ کو مخلوق خدا کے لئے نافع بنائے اور عزیز مؤلف موصوف سلمہ کو اخلاص کے ساتھ خدمت دین مبین کی توفیق دے۔ آمین

العبد
مظفر حسین مظاہری
۱۸/ جمادی الاولی ۱۴۲۳ء

فہرست

مضامین	صفحات
انتساب	۳
کلمات دعائیہ	۴
تصدیق وتوثیق	۹
ارشاد عالی	۱۰
ارشاد معتبر	۱۱
تقریظ لطیف	۱۳
تقریظ عظیم	۱۶
کچھ یادیں کچھ باتیں	۱۸
اسلام میں روحانیت	۱۹
اشکالات و جوابات (فی باب الصوم)	۲۳
اشکالات و جوابات (فی باب الحج)	۲۶
اشکالات و جوابات (فی باب الزکوٰۃ)	۳۰
اشکالات و جوابات (فی باب النکاح)	۳۲
اشکالات و جوابات (فی باب الاکل والشرب)	۳۵
اشکالات و جوابات (فی باب الجنایات والحدود)	۴۱
اشکال و جواب (فی باب عذاب قبر)	۴۳
اشکال و جواب (ثم استوی علی العرش الخ)۔ پارہ (۱۱) سورہ یونس پر) (بحوالہ مناظرہ تحصیل، ص:۱۳۲)	۴۷
اشکال و جواب (ان اللہ علی کل شئ قدیر)	۴۸
اشکال و جواب (حروف مقطعات پر)	۴۹

اشکال و جواب (کلمہ طیبہ پر)	۵۰
اشکال و جواب (لو انزلنا هذا القرآن علی جبل پارہ ۲۸ رسورہ حشر)	۵۱
اشکال و جواب (یایها النبی لم تحرم پارہ ۲۸ سورہ تحریم)	۵۳
اشکال و جواب (اذا قال ربک للملئکة پارہ: نمبر ۱ رسورہ بقرہ)	۵۴
اشکال و جواب (انی جاعل فی الارض پارہ ۱: سورہ بقرہ)	۵۵
اشکال و جواب (حضرت سیدنا آدم علیہ السلام)	۵۶
اشکال و جواب (عقیدہ فرقہ فلاسفر)	۵۷
اشکال و جواب (ام الکتب الخ)	۵۸
اشکال و جواب (عذاب قبر)	۵۹
اشکال و جواب (حضرت یونس علیہ السلام)	
اسلام کی صداقت، ص: ۴۸ مصنفہ، حضرت تھانویؒ)	۶۰
اشکال و جواب (نبی کریم ﷺ کے عمل)	۶۱
اشکال و جواب (شادی و بیاہ)	۶۲
اشکال و جواب (زید ابن حارثہؓ اور نبی)	۶۳
اشکال و جواب (لا اکراہ فی الدین پارہ ۳ رسورہ بقرہ)	۶۵
اشکال و جواب (مثل مابعوضة فما فوقها پارہ ۱: سورہ بقرہ)	۶۶
اشکال و جواب (معراج النبی ﷺ)	۶۷
حضرت عائشہ کے ہار گم ہونے)	۶۸
اشکال و جواب (حرمت شراب)	۶۹
اشکال و جواب (شیاطین کے بہکانے)	۷۰
اشکال و جواب (آتوا الزکاة الآیه)	۷۱
اشکال و جواب (نماز پر)	۷۲
اشکال و جواب (نبی کے قول)	۷۳
اشکال و جواب (حضرت عائشہ)	۷۴

اشکال و جواب (ازواج مطہرات)	۷۶
وید کلام الٰہی نہیں بلکہ مقولات ہے (مناظر تحصیل، ص:۱۳۱)	۷۷
چوری کی اجازت (بحوالہ مناظرہ تحصیل، ص:۷۳)	۸۰
اعتراضات اور اس کے جوابات منجانب آریہ	۸۱
اشکالات انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر	۸۹
حقانیت اسلام (مقالات عثمانی) (بحوالہ: حضرت نانوتویؒ)	۹۲
حضرت نانوتویؒ کی تقریر وحدانیت پر	۱۰۰
شفقت خداوندی کی کوئی حد نہیں (بحوالہ: حجۃ البالغۃ: مصنفہ: حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)	۱۰۳
اسلام میں توحید کامل	۱۰۶
سیتا اگر ست ہوتی تو راون کے ساتھ نہ جاتی (بحوالہ: شبد ستھارتھ پرکاش، ص:۴۹)	۱۰۸
عقیدۂ آریہ	۱۱۰
رامائن سے بھی ہم اہل ایمان کی تائید ہوتی ہے	۱۱۱
اشکالات و جوابات	۱۱۳
براہین الوحدانیہ	۱۲۰
البرهان الثانی علی الوحدانیة	۱۲۳
البرهان الثالث علی الوحدانیة	۱۲۸
عبارة الوید علی الوحدانیة	۱۳۲
ابنیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام	۱۳۳
رسالت	۱۳۸
اشکالات اور اس کے جوابات (فی باب الصلاۃ (ظہر)	۱۴۱
وجہ تعین العصر	۱۴۳
وجہ تعین صلوٰۃ مغرب	۱۴۴

وجہ تعین صلوٰۃ عشاء	۱۴۵
وجہ تعین صلوٰۃ فجر	۱۴۶
مخاطب پنڈت جی	۱۴۷
کیا مورتی کی تصدیق ہوتی ہے؟	۱۵۰
غیر مسلموں کے اقوال	۱۵۲
وحی الٰہی پر آریوں کا اعتراض	۱۵۴
قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ثبوت (بالدلائل)	۱۵۸
(بحوالہ قبلہ نما ص:۲، مصنفہ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ)	۱۶۰
آریوں کا اعتراض اسلام پر	۱۶۴
غیر مسلموں کی زبان فی معاملۃ القرآن	
(اسلام کی صداقت	۱۷۲
معجزۂ کلام الٰہی	۱۷۷
سوال و جواب فی سلسلۃ الاسلام	۱۸۰
سوال و جواب فی سلسلۃ القرآن	۱۸۳
اللہ تعالیٰ کو عاشق رسول کہنا سخت گناہ	۱۸۴
قرآن میں ایجادات جدیدہ کا ذکر (بحوالہ: کتب تھانویؒ)	۱۸۶
قرآن مطب روحانی ہے	۱۸۸
حضرات ائمہ مجتہدین پر اعتماد کا سبب (ایضاً ص:۳۰۷)	۱۹۰
تواضع حاصل کرنے کا طریقہ (ایضاً ص:۳۵۸)	۱۹۲
جلالت شان رسولؐ (بحوالہ، الاسلام ص:۶۳)	۱۹۲
معجزہ قرآن (ایضاً ص:۶۴)	۱۹۳
خاتم الانبیاء (ایضاً ص:۶۴)	۱۹۳
مسلمانوں کے تمدن کی کہانی غیروں کی زبانی (ایضاً ص:۶۳)	۱۹۴
ڈاکٹر کی زبان (ایضاً ص:۶۷)	۱۹۸

تصدیق وتوثیق

فخر المحدثین، بحر العلوم

حضرت مولانا انظر شاہ صاحب مسعودی

شیخ الحدیث وناظم تعلیمات دار العلوم وقف دیوبند

مولوی محمد نسیم رحمانی از ہر ہند دار العلوم وقف دیو بند کے ممتاز ترین فضلاء میں سے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں ابتداء ہی سے تحریر وتقریر اور مطالعہ وغیرہ کا ذوق سلیم عطا کیا ہے ۔جو اس دور میں نعمت عظمیٰ ہے،موصوف کے شوق مطالعہ کا اندازہ ان کی کاوشوں سے بخوبی مترشح ہے کہ ابتداء کے باوجود ان کی متعدد کتب تقاریر،شروحات وغیرہ طبع ہو چکی ہیں۔جس کو طلبہ نے قبول کیا اور اہل علم نے پسند،اگر یہ ذوق وشوق باقی رہا تو مستقبل کے متعلق اچھی توقعات قائم کی جاسکتی ہیں۔

اسلام سے متعلق بے سود اعتراضات بلکہ بے بنیاد اعتراضات کا سلسلہ شروع سے ہے اور اس میں اب شدت آگئی ہے اس لئے ضرورت ہے کہ عصری لب ولہجہ اور موجودہ تقاضوں کے تحت ان اعتراضات کا جواب دیا جائے الحمد للہ اس کو مولوی محمد نسیم صاحب رحمانی نے نبھایا ہے اور یہ مجموعہ اسلام کا صحیح مطالعہ کی راہیں ہموار کرے گا۔

خدا تعالیٰ مؤلف عزیز کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔آمین

انظر شاہ

(شیخ الحدیث دار العلوم وقف دیو بند)

ارشاد عالی

محسن امت، مفکر اسلام، استاذ الاساتذہ، حضرت مولانا محمد ولی صاحب رحمانی دامت برکاتہم
سجادہ نشین، سرپرست جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر (بہار)
سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ

عزیزی مولوی محمد نسیم رحمانی سلمہ کی تازہ قلمی کاوش سامنے ہے، حضرت نانوتویؒ کے فکر ونظر کے بعض حصوں کو انہوں نے اس کتاب میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اور بڑی محنت سے قیمتی باتوں کو جمع کر دیا ہے۔

عزیز موصوف کی متعدد کتابیں مختلف موضوعات پر شائع ہو چکی ہیں اب دار العلوم وقف کے طالب علم کی یہ اہم علمی کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے، ان کی علمی، دینی، تحقیقی اور اصلاحی کوششوں کو دیکھ کر عزیز موصوف کے حوصلہ ہمیت اور علمی شغف کی داد نہ دینا زیادتی ہے، اللہ تعالیٰ ان سے دین اور علم کی خدمت لیتا رہے اور دارین کی سعادتوں کے دروازے ان پر کھول دے۔ آمین

اس طرح کی تحریریں دینی مدارس کے طلبہ کی علمی جہت اور خدمت دین کے جذبہ کی شہادت دیتی ہیں ان شہادتوں کے رہتے ہوئے مدارس کی امانت اور نفع رسانی اور نئی نسل کی تعلیم وتربیت کی بے پناہ صلاحیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ ان سر چشموں کے فیض کو ترقیوں سے نوازتا رہے۔ آمین یا رب العالمین

محمد ولی رحمانی (۱۹/۹/۱۴۲۲ء)

ارشادِ معتبر

نبیرۂ حجۃ الاسلامؒ استاذ محترم حضرت مولانا محمد اسلم صاحب قاسمی زید مجدہم
استاذ حدیث وتفسیر دارالعلوم وقف دیوبند

دنیا میں آج اگر صحیح ترین اور کوئی غیر محرف دین ہے تو وہ اسلام ہے، اس حقیقت کی سچائی کا سب سے بڑا ثبوت ایک یہ بھی ہے کہ ڈیڑھ ہزار برس سے یہ دین شب وروز کی بے شمار الٹ پھیر کے باوجود ہر قسم کی تحریفات سے پاک ہے، اللہ نے جس طرح اسے اتارا، جبرئیل نے جن الفاظ کے ساتھ پہنچایا اور آنحضرت نے جس طرح صحابہ کو سپرد کیا، یہ بغیر کسی ترمیم واضافہ کے آج بھی ہو بہو اسی طرح قائم ہے، نہ اس کے الفاظ بدلے اور نہ اس کے معنی ومفہوم میں یہ طویل گردش ایام کوئی فرق پیدا کرسکی، اللہ کا وعدہ پورا ہو کر رہا، دنیا کے مذاہب میں آج یہی واحد مذہب ہے جس کو لیل ونہار کی گرد دھندلا نہ سکی اس کا رخ روشن آج بھی چاندنی کی طرح اجلا اور پھول پتیوں کی طرح پاکدامن ہے، فطرت کے اس بانکپن کے ساتھ یہ دین آج تک اصل و جزئیات دونوں میں مکمل استناد کے ساتھ سرفراز ہے، یہ اس دین کے ساتھ دین فطرت ہونے اور اس کے احکام کے ابدی ہونے کی روشن ترین دلیل ہے، جو دین قرین فطرت اور قرین عقل ہوگا وہی وقت کی دستبرد سے محفوظ اور غیر محرف رہ سکتا ہے، کیوں کہ خلاف فطرت احکام ہی متبعین کو ان میں تغیر وتبدل کرنے پر مجبور کرتے ہیں، ایک دین حق میں ہر حکم خالق کی طرف سے ہوگا جو خالق فطرت ہے لہذا وہی انسانی فطرت اور اس کے تقاضوں کو صحیح طور پر جانتا ہے پس یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ دین میں کوئی ایسا رخنہ چھوڑ دے جہاں سے تحریف در آئے۔

اگر چہ یہ دین عقل ونقل کی کسوٹی پر ڈیڑھ ہزار سال سے کھرا ثابت ہوتا آرہا ہے مگر ہر دور میں مخالفین کا ایک طبقہ اس کے اصل و جزئیات سے برسر پیکار رہا، نت نئے اعتراضات اور دور از کار اتہامات کے ذریعہ اس کے دامان عفت کو داغدار کرنے کی کوششیں بھی ہوتی رہیں ہیں نیز اپنی موت آپ مرتی بھی رہیں۔ متبعین اسلام نے اس دین کے ایک ایک جزئیہ کو نقل وعقل کی کسوٹی پر پرکھا، چنانچہ تاریخ کے ہر دور میں مسلم علماء کے درمیان مسند معقول ومنقول پر بے شمار عظیم شخصیات ابھرتی رہیں، جنہوں نے روایت و درایت ہر دو اعتبار سے دین حق کا دفاع کیا اور معترضین کو مسکت دلائل سے لاجواب کیا مگر اللہ نے

انسانوں اوران کی عقلوں میں تفاضل رکھا ہے، بعض لوگ دلائل حقہ کے سامنے سرنگوں ہوجاتے ہیں تو کچھ لوگ ہٹ دھرمی کی رہ اختیار کرتے ہیں لہذا ایک طبقہ حق کو حق جاننے کے باوجود خود کو معترضین کی صف میں کھڑا رکھنا پسند کرتا ہے کیوں کہ اس کی ضدی طبیعت یا ''انانیت'' اسے سر جھکانے نہیں دیتی، انکی عقلی صلاحیتیں ہمیشہ منفی راستوں پر ہی گامزن رہتی ہیں، وہ اس طبعی کلیہ سے تغافل کی حد تک انجام بنتے رہتے ہیں کہ عقل کی توانائیاں صرف مادے میں راہ یاب ہیں جہاں روحانیت کا دائرہ کار شروع ہوتا ہے وہاں عقل عرصہ ہوا اپنی ہیچمدانی کا اقرار کرچکی ہے، لہذا عقل سے ماوریٰ باتوں میں قوائے عقل کا استعمال کرنا بجائے خود نادانی ہے، لہذا عقل کو پابند وحی کرنا ضروری ہے تا کہ اطمینان میسر ہو۔

عقل گرداند کہ دل در بند زلفش چوں خوش است ☆ عاقلاں دیوانہ گردند از پئے زنجیر ما

ایسے لوگ ہر دور میں اٹھتے رہے لیکن علمائے اسلام جن میں معقولی شخصیات اور متکلمین اسلام بطور خاص نمایاں ہیں، معاندین کے جملہ اعتراضات کا مدلل جواب دیتے رہے جس میں روایت و درایت کی چاشنی بہم آمیز رہی، چنانچہ قریب العہد حضرات میں حضرت مولانا اسماعیل شہید، حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم النانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند، محقق اسلام حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ، مجاہد آزادی حضرت العلام، مولانا سید محمد علی مونگیریؒ، محدث عصر حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ اور حکیم الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند رحمہم اللہ اس سلسلۃ الذہب کی معروف کڑیاں ہیں، حق تعالیٰ ہر زمانے کے مطابق دفاع اسلام کے لیے مردان کار پیدا فرمائے اورانشاء اللہ یہ سلسلہ تا قیامت یونہی جاری رہے گا۔

زیر نظر کتاب جیسے راقم الحروف جستہ جستہ بھی بہت سرسری انداز میں ہی دیکھ پایا، عزیز محترم مولوی محمد نسیم رحمانی صاحب متعلم وقف دارالعلوم دیوبند کی ایک مفید اوراولین کاوش ہے جس میں موصف نے حضرت الامام النانوتویؒ کے ذریعہ عقل ونقل کی روشنی میں دیئے گئے جوابات کا اقتباس پیش کیا ہے، یہ استدلال حضرت کے علوم، طبعی ذہانت اور خداداد فراست کے آئینہ دار بھی ہیں اورآپؒ کی قوت استنباط کا شہکار بھی مؤلف کی یہ ابتدائی کوشش ایک سعی محمود ہے۔ اللہ تعالیٰ برکت وترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

(حضرت مولانا) محمد اسلم (صاحب) قاسمی
استاذ تفسیر وحدیث وقف دارالعلوم دیوبند

تقریظ لطیف

فرید العصر، مظہر اسلاف، حضرت مولانا فرید الدین صاحب مدظلہ العالی
استاذ حدیث وتفسیر دار العلوم وقف دیوبند

نحمده ونصلی علی رسوله الکریم : اما بعد: فاعوذ بالله من الشیطان الرجیم .ویحق الحق ویبطل الباطل ولو کره المجرمون

عالم مجموعہ اضداد ہے توحید کی ضد شرک علم کی ضد جہل اور اسلام کی ضد کفر ہے۔ اسی طرح لیل ونہار، ظلمت ونور کا تضاد ہر اہل عقل ودانش کے سامنے عیاں ہے صدر اسلام سے لے کر دور حاضر تک فسطائی طاقتیں صلیبی سازشیں اسلام اور اہل اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں اعمال فاحشہ عقائد باطلہ کی پردہ داری کی غرض سے اسلام پر رکیک حملے کرتے رہتے ہیں۔ تاکہ اہل حق اقدام کے بجائے دفاع پر الجھ کر رہ جائے لیکن اس دین حق کی حفاظت خود خداوند قدوس نے اپنے ذمہ لے رکھی یہی وجہ ہے کہ دین مبین نہ مٹا ہے نہ مٹے گا ہمیشہ اس کا آفتاب انشاء اللہ بلند رہے گا اس کے برخلاف مٹانے والے خود مٹ گئے آج صفحہ ہستی پر اس کا کوئی نام ونشان تک نہیں مشیت الٰہی کے مطابق جو سر آج اسلام کے خلاف ابھر رہے ہیں کل تک وہ روندے اور کچلے جائیں گے حکمت و موعظت دلائل و براہین معاندین اسلام کی سرکوبی کے لیے فاعل مختار نے رازیؒ اور غزالیؒ کو پیدا فرمایا۔ قوت بازو سے اسلام پر حملہ آوروں کو زیر کرنے کے لئے محمد بن قاسم اور سلطان صلاح الدین ایوبی کو اس کے مد مقابل کھڑا کر دیا۔ ان مردان حق کے سامنے ان فتنہ پروروں کی ایک نہ چلی۔

ہم اپنے ماضی قریب ہی کی طرف نظر اٹھاتے ہیں تو آریہ سماج کا علمبردار پنڈت دیانند سرسوتی نظر آتا ہے جس نے اپنی دریدہ دینی کا ہدف اسلام اور اہل اسلام کو بنا کر اپنے حلقہ ارادت سے داد وتحسین حاصل کی ہے اس کا ناطقہ بند کرنے کے لیے قادر مطلق نے حجۃ الاسلام حضرت الامام مولانا محمد قاسم صاحب النانوتوی علیہ الرحمہ بانی دار العلوم

دیو بند کا وجود بخشا ان کی رفعت علمی کا یہ عالم کہ بلندی تک نگاہ کی رسائی سے پہلے دستار نیچے آجاتی ہے تو دوسری طرف بحر تصوف کا شناور نظر آتے ہیں جب حضرت علیہ الرحمہ نے اس پنڈت کا تعاقب کیا تو پنڈت کو راہ فرار اختیار کرنے ہی میں عافیت نظر آئی۔

آج سے نصف صدی پہلے تک ہندوستان پر انگریز کا تسلط تھا، ان کے مظالم نوک قلم پر لانے سے آج بھی رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں انہوں نے ظلم و بربریت سے مسلمانوں کی زبان وقلم پر پابندی لگانے کی نہ یہ کہ صرف کوشش کی بلکہ اپنی پوری طاقت صرف کردی لیکن قوت و اقتدار کے باوجود اسے کامیابی نہ مل سکی جس سے ارباب مظالم کو تشویش ہوئی اس کا حل نکالنے کے لیے برطانیہ میں میٹنگ ہوتی ہے اس میں یہ تجویز پاس ہوئی کہ دیار ہند میں مشن اسکولس قائم کئے جائیں چنانچہ اس منصوبہ کے تحت ''لارڈ بوکائلے'' ہندوستان آکر مختلف مقامات پر مشن اسکول قائم کرتے ہیں جس کا مقصد یہ تھا کہ فرزندان توحید کو ایسی تعلیم دی جائے کہ تثلیث کے قائل ہوجائیں رنگ ونسل تو ہندوستانی ہومگر انکا مزاج ان کی وضع قطع عیسائی وصلیبی ہو۔ حضرت حجۃ الاسلام علیہ الرحمہ نے اس چیلنج کو قبول فرما کر دارالعلوم دیوبند قائم کیا اور اس دشمن اسلام کا عملی جواب دیا بہ ارشاد خداوندی: **ویحق الحق ویبطل الباطل ولو کرہ المجرمون** باطل واہل باطل ناپید ہوگئے حق قائم ہے اور تابد قائم ودائم رہے گا، حق کا آفتاب آج بھی اسی طرح اپنی پوری تابانی کے ساتھ ضیاء پاش ہے جس کی تمازت سے باطل جل کر راکھ ہورہا ہے اور حق کو جلا حاصل ہورہی ہے۔

نبیرۂ حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ سابق مہتمم دارالعلوم دیوبند کی بھی اس میدان میں وقیع خدمات ہیں، علماء یہود ونصاریٰ کی طرف سے سوالات آتے رہے حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ اپنے حکیمانہ جواب سے انہیں مطمئن فرماتے رہے انہیں کے سوال کے جواب میں ''اسلام کا اخلاقی نظام'' اور ''اسلامی تہذیب وتمدن'' جیسی تصانیف معرض وجود میں آئیں جو آج بھی ان کے لیے مشعل ہدایت ہیں آج کے پرآشوب دور میں حضرت حکیم الاسلام علیہ الرحمہ کے فرزند اکبر حضرت مولانا محمد سالم قاسمی صاحب دامت برکاتہم اپنے علمی تجربات کی روشنی میں شبان اسلام کو لائحہ عمل اپنانے کی رہبری فرماتے رہے ہیں، رب قدیر سے دعا ہے کہ حضرت دامت برکاتہم کے سایہ

عاطفت کو ہم پر تادیر قائم رکھے۔آمین۔

جس طرح حضرت نانوتویؒ کی نسبی اولاد نے اپنے جدامجد کی روایات قائم رکھنے پر اپنی زندگی وقف کردی ہے اسی طرح روحانی اولاد نے بھی اس منارۂ نور کو باقی رکھنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی نہ ہی اسے مدھم پڑھنے دیا ہے بلکہ اس کی روشنی کو چہار دانگ عالم میں پھیلانے میں مصروف نظر آتے ہیں۔موجودہ حالات میں بھی اسلام اوراہل اسلام کو بدنام کرنے کی پوری کوشش ہورہی ہے بلکہ کفر کا تمام زوراسی پر صرف ہورہا ہے اس لیے اسے خاموش کرنے کی عزیزم مولوی محمد نسیم رحمانی القاسمی سلمہ متعلم وقف دارالعلوم دیوبند نے اپنی کتاب ''منکرین اسلام کودنداں شکن جوابات'' میں بھرپور کوشش کی ہے جو درحقیقت حضرت اقدس نانوتوی علیہ الرحمہ کے مضامین کا اقتباس ہے نیز ان کی دعاء وتمنا کا مظہر ہے پس اللہ رب العزت شرف قبولیت سے نوازے اور منکرین کے لیے سامان ہدایت اور مؤلف کے لیے ذخیرہ آخرت بنائے آمین۔یا رب العالمین۔

والسلام

فریدالدین القاسمی

تقریظ عظیم

نبیرۂ حضرت علامہ انور شاہ کشمیریؒ، مقرر شیریں بیاں وادیب شہیر
حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

اسلام ایک آسمانی دین ہے ہر اعتبار سے مکمل ہی نہیں بلکہ اکمل، اول دن سے اپنی حقانیت کا اعتراف کرایا مگر اسی دن سے اس کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کیا گیا دشمنی کی انتہا، مخالفتوں کا طوفان، اعتراضات کی بھرمار، نہ جانے کس کس نے اس کی راہ میں کانٹے بچھائے ہر ایک نے اپنی بساط بھر اس کی دشمنی کو سعادت جانا اور اس سعادت کے حصول میں دنیا سے بھی گئے اور آخرت کو بھی کھویا۔

یہ بھی ایک تعجب انگیز بات ہے کہ ہر صدی اور ہر دور میں اسلام پر اعتراضات کرنیوالے موجود رہے اور اس پر کوئی زمانہ ایسا نہیں گذرا کہ مخالفتوں اور دشمنیوں سے وہ محفوظ رہا ہو یہ بات جتنی تعجب میں ڈالنے والی ہے اس سے زیادہ عقل کو حیران کردینے والا معاملہ یہ ہے کہ اسلام نے پوری ثابت قدمی، استقلال اور ہمت مردانہ کے ساتھ ان یورشوں، سازشوں اور مکر وفریب کا مقابلہ کیا ہمیشہ اسی کو سرخروئی حاصل ہوئی اور فتح نے ہر بار اسی کی آغوش میں سکون، راحت اور اطمینان کی سانس لی۔

آج بھی اعتراضات کرنے والے اعتراض کر رہے ہیں جواب دینے والے جواب دے رہے ہیں ان اعتراضات پر بھی واقفیت ضروری ہے اور ان کے جوابات کا علم ہمیں ہونا چاہیے عزیزی مولوی محمد نسیم رحمانی سلمہ متعلم دارالعلوم وقف دیوبند نے اعتراضات کو بھی جمع کیا اور جوابات کی بھی ترتیب دی اور اب یہ مجموعہ آپ کے ہاتھوں میں ہے ہر مسلمان کے لیے یہ بے نظیر تحفہ ہے خاص طور پر طلبائے علوم دینیہ کے لیے تو یہ ایک سوغات ہے اس کو نہ صرف یہ کہ ہر طالب علم اپنے پاس رکھے بلکہ اس کا مطالعہ اپنے اوپر لازم کرے انشاء اللہ فوائد مرتب ہوں گے۔

مرتب موصوف نے حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم کی کتابوں سے تمام جوابات کا انتخاب کیا ہے اگر نقل جواب میں ان سے کہیں چوک ہوئی یا وہ بات مکمل طور پر ادا نہیں کر پائے تو ایک طالب علم کے یہاں اگر ایسی چیزیں پائی جائیں تو وہ زیادہ قابل گرفت نہیں ہونی چاہیے اس نظر اور اسی اعتبار سے اس کتاب کا مطالعہ کرنے کی درخواست کرتا ہوں۔

خداوند قدوس عزیز سلمہ کی اس کوشش کو قبول فرما کر لوگوں کے درمیان بھی قبولیت عطا فرمائے ان کے ذریعہ اسی طرح علمی و تحقیقی کام وجود میں آتے رہیں یہی میری دعا ہے اور یہی میری خواہش۔

نسیم اختر شاہ قیصر

استاذ دارالعلوم وقف دیوبند

۱۴۲۲/۲/۱۱ء

کچھ یادیں کچھ باتیں

حضرت حق جل مجدہ کا بہت بڑا احسان و کرم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس مختصر سے رسالے کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ درحقیقت ''منکرین اسلام کو دنداں شکن جوابات'' ایک ایسا موضوع ہے کہ جس پہ ہم تمام اہل ایمان کا مطالعہ لازم وضروری ہے اور اس موضوع پر حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند نے زبردست کام کیا اور فرقۂ باطلہ وضالہ کو شکست دی اسی طرح محقق ومدقق عالم حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ نے قلم اٹھایا اور غیر مسلموں کے طرح طرح کے سوالات کے جوابات دیئے۔ نیز اہل علم کیلئے ضروری ہے کہ اس فن پر گہرا مطالعہ کریں کیوں کہ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ اکثر ممالک میں اسلام کو مغلوب کرنے کی طرح طرح کی ناپاک کوششیں کی جارہی ہیں اور اہل ایمان سے طرح طرح کے سوالات کئے جارہے ہیں۔ کبھی تعدد الٰہ پر تو کبھی تعدد ازواج پر اسی طریقے سے کبھی انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام پر تو کبھی ائمہ عظام پر، لہذا علماء اسلام کو چاہیے کہ اس موضوع پر بکثرت اپنی علمی طاقت صرف کریں تاکہ دشمنان اسلام کے نظریات باطلہ وخیالات فاسدہ نظر خاک ہوں۔

بہر حال ہمارے متعدد ساتھی بالخصوص مولوی ضیاء اللہ سہرساوی نے حکم دیا کہ اس موضوع پر ایک ایسی کتاب لکھو کہ جس کے ذریعہ غیر مسلموں کے دنداں شکن جواب دیئے جائیں لیکن یہ ضعیف متعلم اپنے ناقص العلم ہونے کی وجہ سے بار بار انکار کرتا رہا۔ پھر بھی ساتھیوں کا اصرار روز بروز بڑھتا رہا آخر کار کم علمی کے باوجود ساتھیوں کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے ناتمام قلم وفہم کو حرکت دی اور جملہ اساتذہ کرام بالخصوص فرید العصر حضرت مولانا فرید الدین صاحب و حضرت مولانا نسیم اختر شاہ قیصر دامت برکاتہم نے کافی ہمت افزائی کی جنکی دعاؤں اور حوصلہ افزائی کی بدولت یہ مختصر سی کتاب معرض وجود میں آئی۔ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اس عمل کے ذریعہ اس عبد ضعیف اور والدین کی مغفرت کرے۔ آمین۔

محمد نسیم رحمانی
ابن محترم جناب شیخ صوفی غلام مصطفیٰ صاحب
مقام وڈاکخانہ منور، وایا مہشی، سہرسا (بہار) پن 852216

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تقریظ ادیب زماں حضرت الاستاذ حضرت مولانا غلام نبی صاحب مدظلہ
استاذ حدیث دارالعلوم وقف دیوبند

شیشہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

زیر نظر کتاب ''منکرین اسلام کے دندان شکن جوابات'' مولوی محمد نسیم رحمانی سلمہ کی طالب علمانہ کاوش کا نتیجہ ہے، عزیز موصوف نے منکرین اسلام کے مختلف اعتراضات اور شبہات کے جواب میں اکابر امت کی مستند کتابوں سے استفادہ کر کے ایک مجموعہ تیار کیا ہے جو اپنے موضوع پر غالباً ایک منفرد کام ہے مولوی محمد نسیم رحمانی باصلاحیت اور محنتی ہیں اور مطالعہ کا کافی شوق و ذوق رکھتے ہیں خدا تعالیٰ اس کتاب کو قبولیت عامہ عطا فرمائے مولف سلمہ کے علم میں برکت دے اور صلاحیتوں میں اضافہ فرمائے۔ اور مستقبل میں اسلام کی بہتر سے بہتر خدمت کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔

غلام نبی قاسمی
۴ رمئی بروز جمعہ ۲۰۰۱ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریظ مجاہد ملت حضرت مولانا فضیل احمد صاحب دامت برکاتہم
جنرل سیکریٹری مرکزی جمعیۃ علماء ہند

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم.

''منکرین اسلام کے دندان شکن جوابات'' نامی کتاب کا مسودہ احقر کے سامنے ہے اس کو دارالعلوم دیوبند وقف کے مؤقر اساتذہ مولانا فریدالدین، مولانا غلام نبی مدظلہما کی تقریظات حاصل ہیں۔

عزیزی مولوی محمد نسیم رحمانی سلمہ کی کتاب ''بصیرت افروز تقریریں'' پہلے شائع ہوکر مقبول عام ہوچکی ہیں یہ موصوف کی دوسری حسین کوشش ہے۔ حق تعالی سے دعا ہے کہ یہ کتاب عام ہو اور زیادہ سے زیادہ لوگوں کے لیے نافع ہو۔ یہ اسلام کی بڑی خدمت ہے جو حق تعالیٰ نے اس کم عمری میں موصوف سے لی اللہ اس کاوش کو شرف قبولیت سے نوازے اور عام مسلمانوں کو اس سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

فضیل احمد قاسمی

جنرل سکریٹر مرکزی جمعیۃ علماء ہند

نظم

منکروں کے سوالوں کا جواب تو خوب ہے
اس لیے لاریب کتاب ہر نظر محبوب ہے

کیوں نہ منکر خوف کھائیں اس کاوش کو دیکھ کر
اہل باطل کے لیے دنداں شکن یہ توپ ہے

یونس وطیب کی محنت کا حسین ثمرہ ہے یہ
اور جمیل ونعیم کے کشکول کا مشروب ہے

عبدالصمد اور عبدقیوم کی عنایت بیکراں
اور عمرفاروق صاحب جاہد وکاروپ ہے

اکبروخورشید کا طرز بیاں ہیں مشکبار
لحن قاری شمس دین کا کس قدر مرغوب ہے

منکروں کو بھسم کرنے فرزند دیوبند آگیا
باطلوں کا پورا زمرہ خائف ومبہوت ہے

حق کا علم بردار تو بس ایک ہے فردفرید
اہل باطل ان کی جرأت دیکھ کر مرعوب ہے

غلام نبی کی شفقتوں نے برملا دل سے کہا
قابل تحسین تیرا بالیقین مکتوب ہے

نسیم اختر شاہ قیصر کی رہنمائی کے بنا
اہل حق کی نمائندگی کا یہ کتاب مندوب ہے

فیضیاب ہو اس سے دنیا وچشمۂ ہدایت بنے
یہ التجا ہے تجھ سے یارب اور یہی مطلوب ہے

خلوص کا دامن نہ چھوٹے اتنا یاد رکھنا دوست
کیوں کہ رب دوجہاں کو یہ ادا معیوب ہے

نسیم کی محنت کو یارب نجات ذریعہ بنا
واسطے اس مصطفیٰ کے جو تیرا محبوب ہے

اپنی جستجو کو سرور انعام ربانی سمجھ
اس میں تیری بندگی وکامرانی خوب ہے

نذر قلم: یعقوب سرور بھاگلپوری

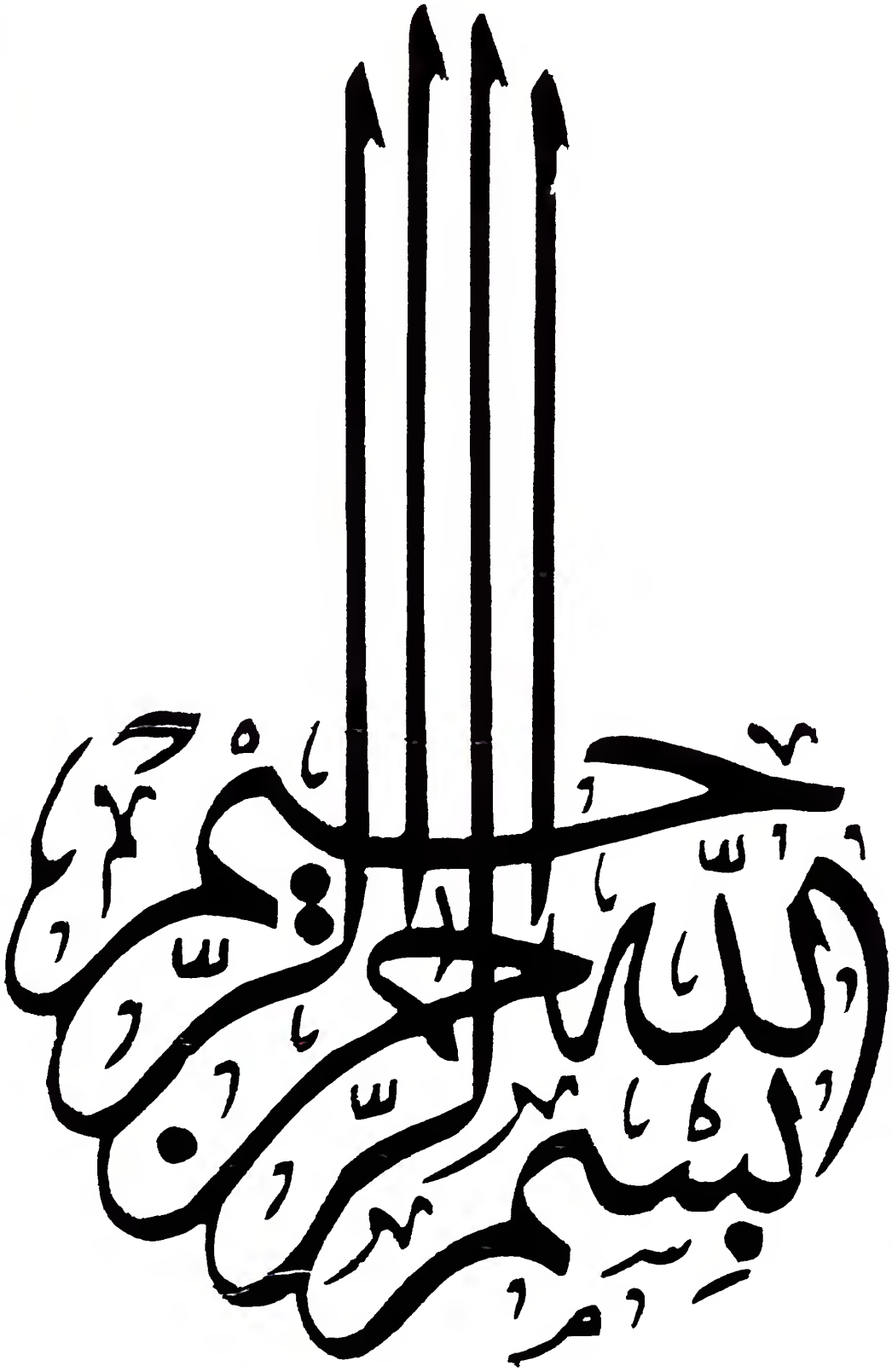
بسم الله الرحمن الرحيم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اسلام میں روحانیت

حق کو باطل سے الگ یوں عقلاء کرتے ہیں
جس طرح پھول کو کانٹوں سے جدا کرتے ہیں

نحمدہٗ ونصلی علی رسولہ الکریم اما بعد فاعوذباللہ من الشیطن الرجیم.

بسم اللہ الرحمن الرحیم. وقل جاء الحق وزھق الباطل

سامعین کرام !اسلام ایک معتدل مذہب ہے جس کے اندر افراط وتفریط کی گنجائش نہیں اوراس مذہب کو غیر مسلموں نے بھی پسند کیا ہے اور مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ چنانچہ سائنس نے بھی اس مذہب کو تسلیم کیا اور ترقی کی راہ پر گامزن رہے بہرحال جب کبھی روحانیت معجزہ کرامت کے رنگ میں چمکی تو فلسفی حکیم اور فاضل ششدر وحیران رہ گئے اور ان کی عقلیں اس گتھی کو سلجھانے میں ناکام رہیں کیوں کہ یہ ناواقف ہیں ورنہ حاملان قوت روحانی کی آواز پر وخوش الحان طائر ساکت ہوگیا اور پانی کی روانی پر جمود طاری ہوگیا۔ جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کی آواز کی کیفیت منقول ہے جس کو لحن داؤدی کہا جاتا ہے۔ ہاتھوں میں عصا نے اژدہام کی صورت اختیار کی قم باذن اللہ کہنے پر مردے زمین سے گرد جھاڑتے ہوئے اٹھ بیٹھے انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوئے اور کنکروں اور پتھروں نے بات چیت کی یہ اسی قوت کا ادنی کرشمہ تھا جس نے ظالموں کو رحم اور بخیلوں کو کرم کا سبق دیا تمدن بخشا اور حکماء فلاسفہ اور تاریک دل رکھنے والوں کو مادیت سے علیحدہ کر کے روشنی دکھائی اور اس روحانی گروہ کا سردار وہ ہے جس کو خلق اللہ، محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام سے

یاد کی جاتی ہے، چنانچہ اس مبارک ہستی کی صفت زبور میں ان الفاظ کے ساتھ مرقوم ہے، تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے بادشاہ آپ کے تابع ہیں، میں سارے سینوں میں تیرا نام نقش کروں گا، بس سارے لوگ تیری ستائش ابدالآباد تک کریں گے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کتاب غزل الغزلات، میں اسی برگزیدہ ہستی کا سراپا مبین ہوں آپ فرماتے ہیں، میرا محبوب گندم گوں ہزاروں میں سردار ہے اس کا سر ہیرے کا سا چمکدار ہے ان کی زلفیں واللیل اذا یغشیٰ ہیں روئے انور شمس الضحیٰ ہے اور پھر فرماتے ہیں کہ ان کا قد خوش نما اور ان کا سر موتیوں کے سر سے زیادہ چمکدار اور چہرہ چودھویں کے چاند جیسا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خبر دی ہے۔ اور خداوند قدوس نے مجھ سے کہا وہ جو کچھ فرمائیں گے وہ سچ ہی کہے گا اور دل میں ان کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے دل میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ آگے اور فرماتے ہیں کہ وہ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) فاران کی چوٹی سے جلوہ گر ہوگا (فاران مکہ معظمہ کو کہتے ہیں) حضرت مسیح علیہ السلام فرماتے ہیں اب میں اسی ذات کے پاس جس نے مجھے بھیجا ہے جاتا ہوں لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اب تمہارے لیے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیوں کہ اگر میں نہ جاؤں تو تسلی دینے والا تمہارے پاس نہ آئے گا میری اور بہت سی باتیں ہیں کہ تمہیں کہوں پر اب تم اس کو برداشت نہیں کر سکتے لیکن جب وہ یعنی روح حق آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی باتیں بتائے گی اس لیے کہ وہ اپنی نہ کہے گی جو کچھ خدا تعالیٰ سے سنے گی وہ کہے گی اور تمہیں آئندہ کی خبر دے گی بہر حال پوتھی راماسانگ بارہویں اسکنڈ چھٹے کانڈ جس کے حاشیہ پر گوشائیں تلسی کی زبان بھاکا میں ترجمہ موجود ہے۔ چوپائی ۳/۵/۵ و ۵/۵ و ۶/ عرب کی سرزمین پہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ستارے کی طرح اچھے ہیں اور اس ستارے کا مقام مغربی ملک سے جو بہت ہی عمدہ اور شاندار ہے اور آپ کے ظہور کے بعد (معجزات) ظاہر ہوں

گی اور یہاں ان کا ولی قائم کیا جائے گا اور وہ ایسے ہوں گے کہ جس طرح اندھیری رات میں چاند اور وہ بادشاہی قاعدے سے ڈرائے گا محبت وخلق دیکھائے گا اور اپنا دین سب کو سمجھا جائے گا جن کا نام نامی تاجدار کونین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ ہوں گے اس کے بعد پھر ایک مرد کامل ظاہر ہوگا یعنی سیدنا حضرت عیسیٰ علیہ السلام نیز حضرت مسیح کوئی نیا دین نہ لائیں گے اور نہ نبی بن کر آئیں گے بلکہ تاجدار بطحی ﷺ کے دین کو پھیلائیں گے۔

قارئین کرام :اسلام کے اندر ایسی روحانیت ہے جس کو دیکھ کر کے بڑے بڑے پادریوں نے بھی اسلام قبول کیا ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ اسلام جیسا دنیا کے اندر کوئی مذہب نہیں ہے چنانچہ ہندوستان کے مشہور ومعروف راجہ بھوج نے اپنے گھر بار واولاد کو تیاگ دیا اور بلا جھجک اسلام قبول کیا اور اپنے گذشتہ تمام عملوں پر توبہ واستغفار کیا مزید اپنے عزیز واقارب کو اسلام کی دعوت دی اسی طرح آج کل بھی بہت سارے لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ اسلام احسن مذہب ہے اور قبول کرنے پر آمادہ رہتے ہیں لیکن ان کا جاہ وجلال واولاد اس آمادگی کو مسل دیتی ہے۔

ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ

اسلام ایک معتدل مذہب ہے

اسلام قابل مدح مذہب ہے

اسلام اچھے کام کی طرف امادہ کرتا ہے

اسلام برے کاموں سے روکتا ہے

اسلام غریبوں اور مالداروں کا پسندیدہ مذہب ہے

اسلام حسن اخلاق کا سبق دینے والا مذہب ہے

اسلام ظالم کو دفع کرنے والا مذہب ہے

اسلام دشمنی کو روکنے والا مذہب ہے

اسلام دوستی کا حکم دینے والا مذہب ہے

اسلام جہنم سے بچانے والا مذہب ہے

اسلام جنت کی طرف لے جانے والا مذہب ہے

اسلام خداوندقدوس کا دیدار کرانے والا مذہب ہے

اسکے علاوہ اسلام کے اندر بہت ساری خاصیتیں ہیں جو حسن خوبی پر شاہد ہیں۔

کیوں کہ اگر ان کی خصوصیات اور اچھائی کو بیان کیا جائے اور دنیا کے تمام باغات کو قلم اور تمام دریاؤں کو روشنائی کی شکل میں ڈھال کر لکھی جائے پھر بھی اسلام کی اچھائی کما حقہٗ بیان نہیں ہو سکے گی۔

اشکال وجوابات

(بحوالہ حضرت تھانویؒ)

فی باب الصوم

اشکال: آپ کا مذہب عجیب وغریب ہے کہ انسان کو پریشانی میں ڈال دیتا ہے اور پورے دن بھوک و پیاس کی حالت میں تڑپاتا ہے ایسا کیوں؟ حالاں کہ آپ کا یہ دعویٰ ہے کہ انسان جب اسلام قبول کرلیتا ہے تو اس کی پوری زندگی اطمینان وسکون کے ساتھ گذرتی ہے نیز آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ ایذاء مسلم حرام ہے لہٰذا آپ کی شریعت خود حکم دے رہی ہے نا قابل اعمال کا۔

جواب: فطرت کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی عقل کو اس کے نفس پر غلبہ اور تسلط دائمی حاصل رہے مگر خواہشاتِ بشریت بسا اوقات اس کی عقل پر غالب آجاتی ہے۔ لہٰذا تہذیب وتزکیہ نفس کے لیے اسلام نے روزہ کو ایک رکن قرار دیا کیوں کہ نفس کی ساری بدیوں کا سبب کھانے پینے اور جنسی خواہشات کا بھڑکنا ہے لہٰذا یہ روزہ سے کم ہوں گی تو نفس مغلوب اور عقل غالب ہوگی۔ بہر حال معلوم ہوا کہ اس شریعت معتدلہ کے اندر انسان کو پیاسا تڑپانا نہیں ہے اور نہ ایذاء مسلم ہے بلکہ مفادِ انسان اور ہدایت انسان ہے کیوں کہ جو بھی حکم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے نافذ ہوتا ہے تو انسان ہی کے فائدے کے لیے ہوتا ہے۔

سوال: جب لوگ اپنی نفسانی خواہشات کو دبانے کے لیے روزے رکھتے ہیں تو یہ عمل پورے سال میں کبھی کبھی کرسکتے ہیں خواہ ماہ شوال ہو یا ماہ محرم ہو وغیرہ ذلک۔ تو پھر ماہ رمضان ہی میں سب سے زیادہ یہ عمل کیوں کیا جاتا ہے۔

جواب: جناب یہ مہینہ برکت کا مہینہ ہے اور اس مہینے کو تمام مہینوں پر فضیلت حاصل

ہے کیوں کہ اس مہینے کے اندر قرآن کا نزول ہوا جو لوگوں کی ہدایت کے لیے ہے لہٰذا اس مہینے کی برکت اور افضلیت کو مدنظر رکھتے ہوئے روزہ رکھتے ہیں۔

سوال: آپ روزہ اسلئے رکھتے ہیں تا کہ خواہشات نفسانی مغلوب اور عقل غالب ہو تو اس عمل کو آپ رات میں بھی کر سکتے ہیں یعنی رات کو بھی روزہ رکھ سکتے ہیں لہٰذا رات میں روزہ کیوں نہیں رکھتے ہیں حالانکہ رات کی عبادت اچھی ہوتی ہے اور ریاکاری نہیں ہوتی۔

جواب: جناب ہاں ہاں آپ کا اشکال صحیح ہے لیکن رات میں روزہ نہ رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ رات کا وقت بالطبع ترک شہوات اور لذات کا ہے لہٰذا اگر رات کا وقت روزہ کے لیے قرار دیا جاتا تو لوگ خواب غفلت کے میدانوں میں ڈوب کر سو جاتے اور پھر دن کو کھانے پینے سیر و تفریح کے بعد خواہشات نفسانیہ میں مصروف رہتے۔

سوال: اسی طرح آپ سال میں ایک ہی مہینہ کی تخصیص کیوں کرتے ہیں کہ ایک مہینہ روزہ رکھتے ہیں اور ایک ماہ سے نہ کم کرتے اور نہ زیادہ آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: (۱): وجہ اسکی یہ ہے کہ روزہ کے قانون کو عام ہونا چاہیے اس لیے کہ اس میں سب کی اصلاح و تہذیب مقصود ہے لہٰذا ہر شخص اس بات کا مجاز نہ ہو کہ جس مہینے میں آسانی سمجھے روزہ رکھ لے اسلئے کہ اس میں باب معذرت کے وسیع ہو جائیگا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے انسداد کا اور اسلام کی ایک عظیم عبادت میں سستی ہونے کا اندیشہ ہے۔

جواب: (۲): دوسرا جواب یہ بھی دیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ کی ایک وقت میں کسی ایک چیز کی پابندی کرنے سے ایک دوسرے کو اس کام میں مدد ملے گی اور آسانی ہوگی اور کام کرنے کی ہمت پیدا ہوگی۔

سوال: آپ کہتے ہیں کہ روزہ نام ہے امساک کا حالانکہ اگر کوئی حالت صوم میں بھول کر کھا پی لیا تو بھی روزہ ہو جائیگا اس سے معلوم ہوا کہ روزہ امساک کا نام نہیں ہے۔

جواب: اگر روزے دار بھول کر کسی ناقض صوم چیز کا استعمال کرے تو بھی امساک و ترک شرعی اس کے حق میں موجود ہے کیوں کہ شارع نے اس فعل کو اپنے طرف منسوب کیا

ہے چنانچہ ارشاد ہے۔ان اللہ اطمعہ سقاہ یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کو کھلایا پلایا۔

سوال: آپ قطب جنوبی اور شمالی کے باشندگان کے سلسلے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں کہ یہ لوگ روزہ رکھیں گے یا نہیں نماز پڑھیں گے یا نہیں کیوں کہ ان لوگوں کی رات چھ ماہ اور دن چھ ماہ کا ہوا کرتا ہے لہٰذا اگر یہ لوگ عبادات کریں گے تو بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور اگر عبادات نہ کریں گے تو کیا قرآن وحدیث خاص ہے اگر خاص ہے تو پھر آپ دین کی دعوت عامۃ الناس کو کیوں دیتے ہیں۔

جواب: شریعت مطہرہ نے ان باشندگاں سے صرف نظر نہیں کیا جو قطب شمالی یا قطب جنوبی میں قیام پذیر ہیں نماز اور روزے ان پر بھی اسی طرح فرض ہیں جس طرح خط استویٰ میں رہنے والے پر ہیں ان باشندگان کے لیے لازم ہے کہ ان مملکت سے اوقات کی تعین کریں گے جو قریب ہیں اور قریبی مملکت میں لیل وخمسہ کے درمیان جو وقفہ ہے اسی وقفہ کے اعتبار سے نمازیں ادا کریں گے اور جو وقفہ دور مضان کے درمیان ہے وہی وقفہ ساعات کے اعتبار سے ان علاقوں میں بھی معتبر ہوگا۔ چنانچہ قطب جنوبی کے باشندگان یا شمال کے باشندگان چھ مہینے کے شب وروز کی بناء پر یہ تعامل نہیں کہ چھ مہینے بھر سوتے ہی رہتے ہیں اور چھ مہینے تک جاگتے ہی رہتے ہیں بلکہ انہوں نے بھی نظام اوقات اسی طرح متعین کئے ہیں جس طرح ہمارے یہاں چوبیس ساعات میں قائم ہیں لہٰذا فمن شھد منکم الشھر کا مخاطب وہ بھی ہو گئے جس طرح ہم اسی طرح اوقات صلاۃ کی تعین اس کے لیے بھی ہوگئی جس طرح ہمارے لیے ہے۔

●●●

اشکال وجوابات

(بحوالہ:المصالح العقلیہ،ص:۱۳۱)

فی باب الحج

سوال: آپ لوگ ہم پہ کیوں اشکال کرتے ہیں کہ تم لوگ لال لال کپڑے پہن کر گنگا ندی پوجا کرنے جاتے ہو حالاں کہ آپ لوگ بھی ایسا ہی معاملہ کرتے ہیں کہ جب حج کرنے جاتے ہیں تو احرام باندھتے ہیں پھر پتھر کا چکر لگاتے ہیں لہٰذا یہ بھی ایک شرک ہے اگر شرک ہے تو حج وطواف کرنے کی کیا وجہ ہے۔

جواب: دراصل حق جل مجدہٗ نے انسان کو پیدا کیا تا کہ میری عبادت کرے اور عبادت کی دو قسم ہیں۔(۱) انکسار وتذلل (۲) محبت وایثار، انکسار تذلل کے لیے نماز کا حکم ہے جو جسمانی رنگ میں انسان کے ہر عضو کو خشوع وخضوع کی حالت میں ڈالتی ہے حتی کہ بندہ پورے جسم وجثہ کے ساتھ سجدہ ریز ہو جاتا ہے۔

دوسری قسم ہے محبت وایثار یعنی بندہ حق جل مجدہ کی محبت میں تڑپتا ہے اس وقت ان کی ضرورت ہوتی ہے کہ کس طرح اپنا شوق پورا کریں تو سوائے حج وطواف کے اور کوئی ایسی چیز نہیں مل سکتی جس سے انسان اپنی محبت کا اظہار کرے۔

سوال: آپ ہمیں یہ کیوں کہتے ہیں کہ تم لوگ صبح سویرے صرف شرمگاہ چھپاتے ہو اور غسل کرنے کے بعد ستر کو صحیح طریقے سے چھپاتے بھی نہیں اور عبادت کے لیے مندروں میں داخل ہو جاتے ہو۔ حالاں کہ یہ طریقہ آپ کے مذہب میں بھی رائج ہے بلکہ آپ کے مذہب میں یہ کارنامہ سب سے زائد ہیں کہ مرد وعورت حالت احرام

میں فقط بے سلی ہوئی دو چادروں پر اکتفا کر کے حج ادا کرتے ہیں اور یہی بے سلے کپڑے پہن کر دورتے بھی ہیں۔

جواب: آپ کو یا تو مسائل احرام کا علم ہی نہیں نہ آپ نے مطالعہ کی زحمت فرمائی حالت احرام اور غیر احرام میں کپڑے ایک ہی ہوتے ہیں عورتوں کے کپڑے یکساں ہوتے ہیں اس میں کوئی تفاوت نہیں ہوتا رہی بات مردوں کی تو وہ کپڑے بغیر سلے تو پہنتے ہیں لیکن ستر نہیں کھولتا کیوں کہ ان کے پاس دو دو چادریں پانچ پانچ میٹر کی ہوتی ہیں ایک چادر ناف سے لے کر نصف ساق تک ہوتی ہے دوسری چادر بدن پر رکھی جاتی ہے جس سے ستر کھولنے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ستر علی حالہ مستور رہتا ہے مکشوف نہیں ہوتا۔

سوال: اہل ایمان خود شرک و بت پرستی میں مشغول ہیں جیسا کہ دوران حج حجر اسود کو پوجتے ہیں اور پتہ نہیں کہ ان کی عورتیں ان پتھر سے کیا کیا طلب کرتی ہیں۔

جواب: ارے نادان پنڈت؟ (نعوذ باللہ) پتہ نہیں تیری عقل کس نے سلب کر لی کیا تمہیں معلوم نہیں کہ معبود کسے کہتے ہیں معبود اس سے کہتے ہیں کہ جس کی عبادت کی جائے اور اس کی حمد وستائش بھی کی جائے اور ہم اہل ایمان آج تک اس حجر اسود کی کبھی بھی حمد وستائش نہیں کی ہے اور نہ معبود ہونے کی نیت سے اس کو پوجا ہے بلکہ ایک نسبت و محبت میں اس کو بوسہ دیتے ہیں۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ جب آپ گھر جاتے ہیں تو بیوی کو بوسہ دیتے ہیں وغیرہ ذلک۔ تو کیا یہ آپ کی معبودہ ہوگئی؟ لہٰذا جس طرح آپ محبت میں بوسہ دیتے ہیں اور معبود نہیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح ہم ان کی محبت و عشق میں بوسہ دیتے ہیں نہ کہ عبادت کرتے ہیں۔

سوال: اسی طرح آپ ہم لوگوں کو بدنام کرتے ہیں کہ تم کندھے پر ڈنڈے اٹھا کر ہر بڑے مندروں میں جاتے ہو اور شرک کرتے ہو حالانکہ آپ خود ایسا عمل کرتے ہیں کہ دوران حج صفا و مروہ کا بار بار چکر لگاتے ہیں اور ہم تو فقط ایک ہی مرتبہ مندروں اور گنگاؤں

مین داخل ہوتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ آپ سب سے زیادہ شرک کرتے ہیں۔

جواب: صفا و مروہ کے درمیان جو کہ خانہ کعبہ کا چوک ہے ہم اس لیے سعی کرتے ہیں تا کہ حق تعالیٰ جل مجدہ کی نظر رحمت کی بارش ہو اور اس میں یہ بھی راز ہے کہ مثلاً کوئی بادشاہ کے پاس داخل ہو اور پھر باہر نکلے اور نہ جانتا ہو کہ بادشاہ میرے بارے میں کیا حکم کرے گا منظوری فرمائے گا یا نہیں تو بادشاہ کے دروازے پر بار بار آتا جاتا ہے اس امید سے کہ اگر اوّل دفعہ رحم نہ کرے گا تو دوسری بار میں رحم کریگا۔

بخلاف تمہارا خدا مورتی ہے کہ نہ تو سنتا ہے اور نہ کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے اور نہ نفع و نقصان کا مالک ہے حتی کہ اگر اس کے بدن پر کتے پیشاب کرے تو بھگا بھی نہیں سکتا تو ایسوں کے پاس چکر لگانے سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔

سوال: جناب ہم کسی اہم پوجا پاٹ کے موقع پر اگر سر منڈاتے ہیں تو آپ ہنستے اور مذاق اڑاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ دیکھو کافر کو؟ حالاں کہ یہ عمل آپ بھی کرتے ہیں اور دوران حج میں حلق کراتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ آپ بھی کفر و شرک میں مبتلا ہیں۔

جواب: جناب ہم لوگ سر عبادت کے مقصد سے منڈواتے نہیں ہیں (البتہ اس پر اللہ اجر دیتا ہے) بلکہ بہت دنوں سے سر نگار رہا ہے ہو سکتا ہے کہ بالوں کے نیچے ضرر دینے والی کنکریاں موجود ہوں جو آگے چل کر نقصان دے۔ دوسرا جواب ہمارے یہاں سر منڈوانا ضروری نہیں بلکہ بالوں کو چھوٹا کرلیا تو کافی ہے بخلاف تمہارے یہاں کہ سر جڑ سے منڈوانا ضروری ہے۔

سوال: تم یہ کہتے ہو کہ دودھ مٹی پھول مورتیوں پر چڑھا کر کفر و شرک میں مبتلا ہو حالاں کہ تم بھی اسی عمل کا ارتکاب کرنے والے ہو اور دوران حج رمی جمار کرتے ہو ہم تو صرف پھول، دودھ ہی چڑھاتے ہیں اور تم تو پتھر کو پوجتے بھی ہو اور پتھر چلاتے بھی۔

جواب: ارے پنڈت! تم پھول، دودھ اور کیا کیا لے جاتے ہو تا کہ شیاطین کی پوجا کریں اور منائیں لیکن ہم شیطان کے سر و جسم توڑنے کے لیے پتھر مارتے ہیں چڑھاتے نہیں گویا تم

محبتاً واعتقاداً یہ عمل کرتے ہو اور ہم ضرباً لغضاً اعداء یہ عمل کرتے ہیں اب جناب پنڈت جی بات ذہن نشیں ہوگئی کہ اور کوئی خلجان ہے انشاء اللہ دندان شکن جوابات دیئے جائیں گے۔

سوال: آپ کا مذہب کیسا ہے کہ کبھی تو جانوروں کا شکار کرنا حلال ہوتا ہے اور کبھی حرام ہوتا ہے مثلاً حرم کے بعض جانوروں کا شکار نہیں کرتے ہیں آخر اس کی وجہ کیا ہے۔

جواب: ہم لوگوں کو اللہ تعالیٰ سے سب زیادہ محبت ہے چنانچہ ان کی محبت میں ان کے یہاں کے جانوروں سے بھی محبت کرتے ہیں یعنی ہم اپنے محبوب کے کوچہ کے جانوروں کو باجودیکہ گوشت کھانا جائز ہے لیکن کچھ نہ کرتے ہیں اور انکی محبت میں چھوڑ دیتے ہیں۔

سوال: جب انکی محبت میں ماکول اللحم جانور کو چھوڑ دیتے ہیں اور کچھ نہیں کرتے تو اسی طرح چیل کوے، بچھو، سانپ، چوہے، بھیڑیے، سگ دیوانہ، کو کیوں قتل کرتے ہیں اس کو بھی چھوڑ دو کیوں کہ وہ بھی تمہارے محبوب کے کوچے کے باشندے ہیں۔

جواب: یہ جانور ضرر دینے والا اور عاشقانِ الٰہی کو تکلیف پہنچانے والے اور کوچۂ محبوب سے روکنے والے ہوتے ہیں لہٰذا محبوب حقیقی خداوند تعالیٰ کی نظر میں اسی وجہ سے مردود ٹھہرے کہ اس کے عاشقوں کے لیے اس کے کوچہ سے مانع ہوتے ہیں اور یہ امر اس کو ناپسند ہے پس جو امر محبوب حقیقی کی نظر میں مبغوض ہو بالضرور اس کے عاشقوں اور محبوب کی نظر میں بھی وہ مبغوض ہوگا یہی وجہ ہے کہ اگر ان جانوروں کو حرم میں مار ڈالے تو اس پر کوئی تاوان ان کے بدلے میں دینا لازم نہیں ہوتا بلکہ کار ثواب رضائے محبوب ہے۔

اشکال و جوابات

(بحوالہ: المصالح العقلیہ، ص:۱۰۱)

فی باب الزکاۃ

سوال: آپ کا عجیب مذہب ہے کہ ایک آدمی سے مال و دولت لے کر کسی دوسرے سست آدمی کو دینے کا حکم کرتا ہے سراسر یہ غلط عمل ہے کیوں کہ جس کے پاس مال و دولت آتی ہے وہ محنت و مشقت سے کام کرتا ہے لہٰذا کسی محنتی آدمی کے کاموں کو لے کر دوسرے کو دینا گویا ایک کو تکلیف دینا ہے اور دوسرے کو فائدہ پہنچانا ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب غلط ہے۔

جواب: میرا مذہب غلط نہیں ہے بلکہ آپکے تصورات و گمان و عقل و فہم غلط اور باطل ہیں کیونکہ ہمارے مذہب میں اتحاد و اتفاق و محبت ہے کہ ایک غریب بھائی بھوکا پیاسا اپنے بچوں کیساتھ تڑپ رہا ہے اسی کے تعاون کے لیے ہر صاحب نصاب پر زکوٰۃ واجب ہے۔

جواب: نعمت الٰہی کی یاد آوری ہوتی ہے جس سے بندہ یہ محسوس کرتا ہے کہ مال کا وصول اپنا ذاتی کمال نہیں اور نہ ہی اپنی تگ و دو کا ثمرہ ہے بلکہ یہ تو عطیہ خداوندی ہے میں اپنا کچھ کسی کو نہیں دے رہا ہوں بلکہ جو اللہ نے مجھے دیا ہے اسی کو دی ہوئی نعمت کو دوسرے تک پہنچا رہا ہوں۔

سوال: اگر آپ کہتے ہیں کہ زکوٰۃ اس لیے دیتے ہیں تا کہ اقرب الٰہی اور غریبوں کی خیر خواہی ہو اور یہی مقصد ہے تو آپ سال میں ایک ہی مرتبہ زکوٰۃ کیوں ادا کرتے ہیں یعنی سال میں دو یا تین مرتبہ کیوں ادا نہیں کرتے ہیں۔

جواب: مذکورہ عمل کو تکمیل تک پہنچانے کے لیے ایسا ایک وقت کا مقرر کرنا لازم وضروری ہے کہ جس میں تمام لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرسکیں اور یہ بات بھی شریعت نے صحیح نافذ کی کہ وہ مدت بہت کم نہ ہو کہ جلد ان کو زکوٰۃ دینی پڑے اور اس کا ادا کرنا اس کو دشوار ہو اور اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے لیے اتنی مدت دراز نہ ہوئی کہ اس کے اندر صاحب نصاب کا بخل کچھ کم نہ ہو اور فقراء ومساکین شدت کے ساتھ منتظر رہیں۔ لہٰذا انہیں تمام باتوں پر شریعت نے دھیان دیا اور مذکورہ صورت تجویز کی۔

سوال: جناب مولوی صاحب۔ آپ کے سید الشریعت محمد ﷺ نے اپنے آپ کو بہت بڑے پاک تصور کیا اور اپنے اوپر زکوٰۃ کو ناجائز کہا اور فرمایا کہ یہ انسان کا مالی میل کچیل ہے تو دوسروں کو میل کچیل دینے کا حکم کیوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو بہت بڑا آدمی تصور کیا اور دوسروں کو گھٹیا شمار کیا آخر ایسا کیوں۔

جواب: (۱) جی ہاں پنڈت صاحب؟ یہ بات تو حقیقت ہے کہ محمد ﷺ سب سے اچھے وافضل بہت آدمی ہیں اور حق جل مجدہ کے بعد محمد ﷺ کا نمبر ہے اب رہا آپ کا سوال کہ نبی اکرم ﷺ کے لیے زکوٰۃ کیوں حلال نہیں جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ اگر زکوٰۃ کی رقم لیتے تو آپ جیسے پنڈت پھر اشکال کرتے کہ دیکھو محمد ﷺ دوسروں کا مال ٹھگ رہے ہیں (نعوذ باللہ) چوں کہ آپ ﷺ خود نافذ شرع تھے۔ اسی احتمال کو دور کرنے کے لیے آپ ﷺ نے اپنے لیے زکوٰۃ کی رقم کو جائز نہیں کہا۔

جواب: (۲) یہ دیا جائے گا۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زکوٰۃ مال کا میل کچیل ہوا کرتی ہے اور انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ کے نفوس قدسی ہوتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مقدس نبی آخرت الزماں ﷺ کی روح مطہرہ ہے لہٰذا آپ کی تقدیس اس مانع زکوٰۃ کو قبول نہیں کرسکتی۔ نیز یہ منافی نبوت بھی ہیں عامۃ الناس چوں کہ عظمت نبوت سے آراستہ نہیں ہوتے اس لیے ایسے مال کا استعمال ان کے لیے موجب ذلت نہیں۔

اشکال وجوابات

(بحوالہ:المصالح العقلیہ:ص:۱۵۲)

فی باب النکاح

سوال: آپ کے مذہب کے اندر عجیب وغریب معاملہ ہے کہ ایک مرد چار عورتوں کو بیک وقت نکاح میں رکھ سکتا ہے اور آگے چل کر فقر وفاقہ کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت فقر وفاقہ کا حکم دیتی ہے۔

جواب: پنڈت جی؟ یہ معاملہ ہرگز نہیں ہے کہ ہماری شریعت فقر وفاقہ کا حکم دے لہٰذا آپ کے سوال کا پہلا جواب یہ ہے کہ عورتیں بمقابل مرد کے سب سے زیادہ ہوتی ہیں چنانچہ اس کی تفصیل یوں ہے کہ یورپ میں جس کو سب ممالک سے بڑھ کر تعداد ازواج کی ضرورت سے منزہ ومبرہ سمجھا جاتا ہے عورتوں کی تعداد مردوں سے کس قدر زیادہ ہے جس کی انتہا نہیں چنانچہ برطانیہ میں ایک جنگ سے پہلے بارہ لاکھ انہتر ہزار تین سو پچاس (1269350) عورتیں ایسی تھیں جن کے لیے ایک بیوی والے قاعدہ کی رو سے کوئی مرد مہیا نہیں ہوسکتا اسی طرح فرانس میں 1900 کے اندر عورتوں کی تعداد مردوں سے چار لاکھ تیس ہزار سات سو نو سے زیادہ تھی اسی طرح جرمن میں 1900 کے اندر ہر ایک ہزار مرد کے لیے کئی کئی ہزار عورتیں تھیں۔ اسی طرح سوڈان میں 1901 کے اندر ایک لاکھ بائیس ہزار آٹھ سو ستر عورتیں اور ہسپانیہ میں 1890 کے اندر چار لاکھ ستاون ہزار دو سو باسٹھ عورتیں اور آسٹریلیا میں 1890 کے اندر چھ لاکھ چوالیس ہزار سات سو چھیانوے عورتیں مردوں سے زیادہ تھیں اب ہم پنڈت جی سے دریافت

کرتے ہیں کہ اس بات پر فخر کر لینا تو آسان ہے کہ ہم تعداد ازواج کو برا سمجھتے ہیں مگر یہ بتا دیا جائے کہ ان کم از کم چالیس لاکھ عورتوں کے لیے کونسا قانون تجویز کیا گیا ہے کیوں کہ ایک بیوی کے قاعدے کے رو سے ان کو تو یورپ میں خاوند نہیں مل سکتے اسی طرح کا حال دیگر ممالک کا بھی ہے جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے لہٰذا ایسی صورت میں اب ضرورت پڑی کہ ایک مرد کی تو شادی کرنا چار عورتوں سے درست ہے۔ بقولہ تعالیٰ: مثنی وثلاث ورباع۔

سوال: جناب تو پھر مردوں کو چار ہی شادی پر کیوں اکتفا کرنے کا حکم ہوا ایسا بھی ہو سکتا تھا کہ ۳ر کا حکم کرتے۔

جواب: اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جو حکم دیا ہے اپنی کمال حکمت وتمام نعمت ومصلحت کی بنیاد پر چوں کہ مخلوقات میں لوگ ایسے بھی ہیں جو زیادہ قوت وطاقت نہیں رکھتے لہٰذا ان کے لیے کہا گیا کہ ایک یا دو یا تین شادی کریں یعنی حق جل مجدہ نے اختیار دیا اسی طریقے سے وہ آدمی جس کے اندر کثرتِ قوت کی بنیاد پر زیادہ طاقت ہے اور نفسانی خواہشات ابھرتی ہیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت کے لیے کہا کہ چار شادی کرو لہٰذا یہ عدد قانون حق کے موافق ہے۔ (احکام اسلام عقل کی نظر میں) عزیز ساتھیو! نبی کریم ﷺ کے ازواج کے سلسلے میں جو اشکالات کیے گئے ہیں ان کا مدلل جواب اگلے صفحہ میں آئے گا۔

سوال: جب مردوں کو ۴ر شادیاں کرنے کی اجازت ہے تو اسی طرح عورتوں کو بھی چار شادیاں کرنے کی اجازت ہونی چاہیے تھی کیا عورت انسان نہیں یعنی جس طرح مرد کو خواہشات ابھرتی ہیں اسی طرح تو عورتوں کو بھی خواہشات ابھرتی ہیں لہٰذا عورتوں کے لیے بھی جائز ہونا چاہیے کہ ۴ر شادیاں کریں۔

جواب: پنڈت صاحب؟ آپ کے اس سوال سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ اپنی عقل کو کسی دور دراز گوشہ میں رکھ دیا ہے۔ بہر حال اس کا جواب یوں لیجیے مثال کے طور پر

آپ ۴/عورتوں کو جمع کرلیں اور ہر ایک عورت کو آپ یہ کہیں کہ تم لوگ کسی ایک برتن میں اپنا اپنا دودھ دوہ کر کے رکھو جب یہ عمل عورتیں کرگزریں تو آپ ان عورتوں سے کہیں کہ اب تم لوگ اپنا اپنا دودھ الگ کرلو اگر یہ عورت اپنا اپنا دودھ الگ کرلیتی ہیں تو میری جانب سے یہ اجازت ہے کہ عورتوں کے لیے چار نکاح درست ہیں اگر الگ نہیں کرتی ہیں تو چار نکاح کرنا حرام ہے۔ کیوں کہ جب عورتیں چار شادیاں کریں گی اور اس سے بچہ پیدا ہوگا تو ایک شوہر کہے گا کہ میرا بچہ ہے دوسرا کہے گا کہ نہیں نہیں میرا ہے۔ لہٰذا یہ بچہ حرامی کہلائیگا اسی بنا پر یہ شریعت نے حکم دیا کہ عورتیں صرف ایک شادی کرسکتی ہیں۔

اشکال وجوابات

(بحوالہ: ایضاً۔ص: ۱۵۵)

فی باب الطلاق

سوال: آپ کا مذہب عجیب ہے کہ ایک کام مرد کو کرنے کا حکم دیتا ہیتو دوسرا کام عورت کو کرنے کا حکم دیتا ہے یعنی مرد کو طلاق دینے کا حق دیتے ہیں اور عورت کو نہیں حالاں کہ جب قرآن کا نزول ہوا تو ان کے مخاطب تمام آدمی تھے خواہ عورت ہو یا مرد تو اسی طرح شریعت کو چاہیے کہ جب بھی کوئی حکم نافذ کرے تو مرد وعورت دونوں کو حق دے لہٰذا جس طرح مرد کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے اسی طرح عورت کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔

جواب: (۱) جناب پنڈت جی! میری شریعت عجیب نہیں ہے بلکہ آپ کا فہم وعقل عجیب وغریب ہے کیوں کہ قرآن کے اندر مرد ہی کو طلاق دینے کا حکم کیا گیا ہے لہٰذا ان کے مخاطب صرف مرد ہی ہوں گے دوسری بات یہ ہے کہ اگر عورت کو طلاق دینے کا حق حاصل ہوتا تو ایک بھی عورت صحیح طریقے سے کسی مرد کے پاس نہیں رہتی کیوں کہ نساء کے معنی آتے ہیں خوب خوب انسیت رکھنے کے اسی وجہ سے عورت ایک دوسرے سے خوب خوب انسیت رکھتی ہیں جب عورت کو اپنے خاوند کے علاوہ دوسرے سے انسیت خوب ہو جاتی اور یہی مرد اس کو بھا جاتا تو فوراً اپنے اوّل خاوند کو طلاق دیتی اور پھنس کر کے دوسرے کے پاس چلی آتی۔ اسی بنا پر شریعت نے حکم دیا کہ فقط مرد ہی کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے نہ کہ عورت کو۔

جواب: (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ عورتیں ناقص العقل ہوتی ہیں اس کے پاس مرد کی

طرح کامل ومکمل عقل نہیں ہوتی اور یہ قاعدہ اظہر من الشمس ہے کہ جس کے پاس کامل عقل ہو اسی کو جانبین میں اہم ذمہ داری سونپنی چاہیے لہٰذا میاں بیوی کے درمیان سب سے زیادہ عقل مرد ہی کو ہے اسی وجہ سے مرد ہی کو یہ طلاق کی ذمہ داری سونپی گئی۔

جواب: (۳) تیسرا جواب یہ ہ کہ پنڈت جی اگر عورت کو چھوڑنے کا حق ہوتا تو آپ کی امی بھی آپ کے والد کو چھوڑ کر بھاگ جاتی تو آپ کہاں سے پیدا ہوتے اور یہاں مناظرہ کرنے آجاتے۔

سوال: جب کوئی مرد اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے تو اس عورت کو عدت گزارنی پڑتی ہے وہ بھی فقط اس لیے تا کہ اس عورت کا رحم خالی ہوجائے اور دو مردوں کی منی خلط ملط نہ ہوجائے تو اسکے لیے فقط ایک حیض گزارنا کافی ہے تین حیض گزارنے کی کیا ضرورت تھی۔

جواب: مطلقہ عورت ایک حیض اس لیے گزارتی ہے تا کہ رحم خالی ہوجائے اور زائد تین حیض اس لیے گذارتی ہے تا کہ مرد نادم وشرمندہ ہو کہ ہم نے واقعی بیکار کام کیا ہے نیز طویل مدت گذارنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ مرد اپنے قول وفعل سے رجوع کرلے۔

سوال: آپ کا مذہب قابل تردید ہے کہ مرد کو زنا کاری کرنے پر ابھارتا ہے کیوں کہ جب کسی کی بیوی حائضہ ونفساء ہوجاتی ہیں تو آپ کی شریعت منع کرتی ہے کہ مرد عورت کے پاس ہرگز نہ جائے۔ چنانچہ جب مرد عورت سے الگ تھلگ ہوجائیگا تو اب آپ خود بتایئے کہ مرد اپنی خواہشات کو کہاں پورا کریگا! آخر کار وہ زنا کاری پر آمادہ ہوجائے گا۔

جواب: (۱) پنڈت جی آپ ہی جیسے پنڈتوں کی تردید میں آیت کریمہ نازل ہوئی ارشاد باری ہے: ویسئلونك عن المحیض قل ھو اذی فاعتزلوا النساء فی المحیض وتقربوھن حتی یطھرن۔

یعنی اے محمد ﷺ ونائبین رسول ﷺ جب آپ سے کوئی شخص خواہ پنڈت ہو یا یہودی یا نصرانی ہو سوال کرے تو آپ ﷺ فرمادیجئے کہ وہ ناپاک ہے سو تم حیض میں عورتوں سے کنارہ کرو اور صحبت نہ کرو ان سے جب تک پاک وصاف نہ ہوجائے۔

جواب: (۲) یہ ہے کہ شریعت نے اس لیے منع کیا کیوں کہ اس عمل سے طرح طرح کی بیماریاں منتشر ہوتی ہیں مثلاً خارش، نامردی، جلن، جریان، جذام، یعنی جب بھی بچہ پیدا ہوگا تو اس سے جذام کی بیماری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح عورتوں کو بھی اس عمل کو کرنے سے بیماریاں ہوتی ہیں مزید ڈاکٹر سے رابطہ قائم کریں۔

سوال: آپ جب عورتوں کو طلاق دیتے ہیں تو تین ہی طلاق کیوں دیتے ہیں یعنی آپ کی شریعت نے تین ہی طلاق کو کیوں محدود رکھا ہے۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ وہ تین طلاق کثرت کی شروع حد ہے یعنی عددوں میں زیادہ ہونے کا پہلا عدد ہے جو جمع کہلاتا ہے۔ نیز طلاق میں فکر کرنا اور سوچنا اور سمجھنا ضروری ہے سو تین تک سوچتے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

سوال: جب آپ میں سے کوئی عورت کو تین طلاق دے دیتا ہے اور پھر اس عورت کو اپنے نکاح میں رکھنا چاہتا ہے تو کسی دوسرے شوہر سے نکاح کروانا پڑتا ہے اور پھر شوہر اوّل نکاح کرتا ہے آخرت ایسا کیوں؟ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی شریعت بے حیائی کو فروغ دیتی ہے۔

جواب: معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ میری شریعت حیا کو فروغ دیتی ہے کیوں کہ اگر یہ حکم نافذ کر دیا جائے کہ جب جب شوہر طلاق دے اور فوراً بعد العدۃ نکاح کر لے تو اس سے طلاق کا رواج معاشرے میں عام ہو جائیگا اور عورت کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا اسی بنا پر شریعت نے حکم نافذ کیا کہ جب بھی مرد تین طلاق دے تو عدت گذارنے کے بعد کوئی دوسرا مرد اسکا مزا چکھے پھر بعد العدۃ شوہر اوّل نکاح کرے تا کہ شوہر اوّل کو شرم دلائی جائے کہ دیکھو تم کو رہتے ہوئے تمہاری بیوی دوسرے کے پاس رات گذار رہی ہے۔ پھر آئندہ ایسی حرکت نہیں کرے گا۔

☆☆☆

اشکال و جوابات

(ایضاً، ص: ۲۴۸)

فی باب الاکل والشرب

سوال: آپ جملہ درندوں پرندوں کو حرام کہتے ہیں اور کھانے سے اعراض کرتے ہیں آخر ایسا کیوں جب کہ اسی جانور کے مانند ہرن اور گورخر، خرگوش، شتر مرغ و مرغی وغیرہ ذلک ہیں تو اس کو کھاتے ہیں اور درندوں اور شکاری پرندوں کو حرام کہتے ہیں۔

جواب: اوّل جواب تو یہ دیا جائے گا کہ جملہ درندوں اور شکاری پرندوں کے گوشت کا کھانا حرام کیوں ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ یہ تمام درندے جانور جن کی شریر وفطرت میں پنجوں سے چھیلنا اور اس سے زخم پہنچانا ہے اور جس کے اندر جس کی وجہ سے یہ سخت دلی ہے سب حرام ٹھہرائے گئے ہیں کیوں کہ نبی اکرم ﷺ نے بھیڑیئے کے بارے میں فرمایا ایاکلہ احد یعنی کیا بھیڑیئے کو بھی کوئی انسان کھاتا ہے یہاں یہ اللہ کے رسول ﷺ توبیخاً فرمایا کہ کیا کوئی انسان بھی بھیڑیئے کو کھاتا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کو کوئی نہیں کھاتا، حرمت کی وجہ یہ ہے کہ ان جانوروں کے کھانے سے انسان میں درندگی پیدا ہو جاتی ہے کیوں کہ ان کی طبیعت اعتدال سے خارج ہوتی ہے اور ان کے دلوں میں رحم نہیں ہوتا اسی واسطے ہر شکاری پرندے کے کھانے سے بھی آنحضرت ﷺ نے منع فرمایا اسی طرح آپ نے بعض جانوروں کو فاسق سے بھی تعبیر فرمایا ہے کیوں کہ ان جانوروں کو کھانے سے ان جیسی خصلت پیدا ہو جاتی ہے یہ جواب تھا درندوں اور شکاریوں کی حرمت کا۔

جواب: (۲) دوسرا جواب لیجئے ہرن، خرگوش، شتر مرغ کی حلت کی وجہ، چوں کہ وہ جانور جو جنگل میں رہتے ہیں بہیمۃ الانعام کے مشابہ ہیں وہ سب حلال ہیں کیوں کہ ان میں بہیمۃ الانعام کے پاک وستھرے اوصاف موجود ہیں اور وہ مزاج انسان کے موافق اور مطابق ہیں مثلاً ہرن گورخر، خرگوش، کا گوشت بھیجا تو آنحضرت ﷺ نے اس کو قبول فرمایا (بخاری ومسلم) اسی طرح مرغ ومرغابی وکبوتر اور اس کے مانند جانور ہیں ان کی حلت کی وجہ یہ ہے کہ ان پرندوں کا گوشت انسان کے مزاج کے موافق ومفید ہے لہٰذا حلال ٹھہرے۔

سوال: آپ وہ جانور کیوں نہ کھاتے ہیں جو خود بخود مرتا ہے اور وہ جانور کیوں کھاتے ہین جس کو آپ خود سے ذبح کرتے ہیں اور آپ کا اعتقاد مستحکم بھی ہے کہ جب تک جانور کا خون نہ نکلے گا حلال نہ ہوگا آخر اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: (۱) مردار کا حرام ہونا عین حکمت ہے کیوں کہ جانور کے بدن کو پاک کرنے والی روح ہے جب روح اس سے جدا ہوجائے تو اس کی عفونت کو دور کرنے والا نہیں رہتا لہٰذا وہ عفونت اس کے سارے بدن کو فاسد کردیتی ہے اور بہت بدمزہ اور بدبودار ثابت ہوجاتا ہے اسی بنا پر جو لوگ بچپن سے مردار خور ہوتے ہیں ان کی صورت وشکل واخلاق ایسے قبیح ہوتے ہیں کہ گویا ان کا مزاج ہی انسانیت سے خارج ہوجاتا ہے۔

جواب: (۲) دوسرا جواب یہ ہے کہ جانوروں کے خون کے اندر ایک قسم کا زہر ہوتا ہے جو انسان کے جسم کو بیکار کردیتا ہے مثلاً فالج اور استرخاء کی بیماری ہوتی ہے۔

سوال: جب آپ کے مذہب میں کسی جانور کو کھاتے ہیں تو خون نکالنا ضروری ہے تو اس طرح کا جانور مچھلی اور ٹڈی بھی ہے تو اس کا خون کیوں نہ نکالتے ہیں اگر آپ مچھلی کے اندر سے خون نہیں نکالتے ہیں تو آپ بھی حرام کاری کا ارتکاب کرتے ہیں۔

جواب: مچھلی کو اسی وجہ سے ذبح نہیں کیا جاتا اور خون نہیں نکالا جاتا کیوں کہ اس کے بدن کا اصلی مادہ پانی ہے اور پانی بالطبع طاہر ومطہر ہے لہٰذا جس طرح نجاست پانی میں

اثر نہیں کرتی ایسا ہی آبی جانور کی روح جدا ہونے سے اس میں اثر نہ کرے گی بہر کیف مچھلی کے اندر ذبح کرنے کی حاجب نہ رہی اب رہی بات ٹڈی کی اس کو ذبح کیوں نہیں کیا جاتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ خون جاری نہیں رکھتی یعنی اس کی روح کا تعلق بدن سے ہے نہ کہ خون سے پس اس کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔

سوال: میرے عزیز ساتھیو! دیکھئے پنڈت جی کا احمقانہ سوال کہ وہ اسٹیج پر آئے اور سوال کیا کہ مولوی صاحب! اوّلاً تو آپ ہمیں یہ بتلائیں کہ انسان کے لیے گوشت کھانا کیوں جائز ہوا۔

جواب: انسان کو مثل شیر و چیتا و بھیڑیا وغیرہ کچلیوں کا عطا ہونا اس جانب مشیر ہے کہ اس کی غذا اصلی گوشت ہے اور اہل عقل کے نزدیک یہ بات مخفی نہیں بلکہ ظاہر ہے کہ انسان کو جتنی چیزیں دی گئیں کسی نہ کسی کام کے لیے دی گئی ہیں آنکھ، کان جسے دیکھنے سننے کے لیے ہیں اس کے ان سے صاف عیاں ہے کہ یہ دیکھنے سننے کی اجازت ہے ایسے ہی کچلیوں کو بھی خیال فرما لیجئے۔ ہاں یہ بات مسلم ہے کہ سارے حیوانات یکساں نہیں ہر کسی کے گوشت جدا جدا اثر رکھتا ہے۔ لہٰذا جس جانور کا گوشت مفید ہوگا وہی جائز ہوگا اور جس جانور کا گوشت مضر ہوگا بقدر مضرت ناجائز ہوگا۔

اشکال وجوابات

(ایضاً،ص:۲۸۵)

فی باب الجنایات والحدود

سوال: چوری کرنے پر سارق کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے اور زنا کرنے والوں پر زانی اور زانیہ کا عضو کیوں نہیں کاٹا جاتا حالاں کہ مشاہدتاً یہ معلوم ہو رہا ہے کہ زانی وزانیہ ہی کا اوّلاً عضو کاٹا جائے اور سارق کو چھوڑ دیا جائے۔

جواب: حق جل مجدہ کا بہت بڑا احسان وکرم ہے کہ انہوں نے چوڑی کرنے والوں پر ہاتھ کا کاٹنا متعین کیا اور زنا کرنے والوں پر فقط حد کو متعین کیا کیوں کہ اگر زنا کرنے والوں پر بھی اگر عضو کا کاٹنا متعین ہوتا تو روزانہ ۱۰۰/۱۰۰۰/آدمیوں کی آنکھ نکالی جاتی اسی طرح ہاتھ کاٹا جاتا اسی طرح پاؤں کاٹا جاتا چوں کہ انسان اس کے ذریعہ بھی زنا کرتا ہے۔اور چوری زنا کے مقابلہ میں کم ہوتی ہے وہ بھی اس چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا جو کم از کم ۱۰/درہم یا اس کی قیمت کی نقد کوئی چیز چوری کی ہو۔

سوال: اسی طرح اگر کوئی شخص شراب کا ایک قطرہ بھی پیتا ہے تو اس کے اوپر حد جاری کی جاتی ہے اور اگر کوئی شخص پیشاب ایک لیٹر بھی پی لے تو حد جاری نہیں کی جاتی ہے۔حالاں کہ پیشاب بھی پینے کی صورت میں حد جاری ہونی چاہیے۔

جواب: وجہ اس کی یہ ہے کہ پیشاب کو انسان خود نہیں پیتا ہے چوں کہ طبیعت اس کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے لہٰذا جس عمل کا ورود ہو ہی نہ سکتا ہو تو اس کے اوپر حد کا جاری کرنا بیکار ولغو ہے اور شراب کو انسان بہت ہی دلچسپی کے ساتھ پیتے ہیں اس لیے کہ

ایک قطرہ شراب پینے پر بھی پابندی لگائی گئی تا کہ انسان سرے سے اس کو چھوڑ دے۔

سوال: اسی طرح آپ کی شریعت عجیب ہے کہ انسان کے پہنے اڑھنے کے سامان پر بھی پابندی لگاتے ہیں چوں کہ آپ کے مذہب کے اندر مردوں کو سونا اور ریشم پہننے کو منع کر دیا گیا ہے۔

جواب: اگر سونا کا پہننا عام قرار دیا جائے تو اوّلاً معاشرے کے اندر ایک کھلبلی مچ جائیگی اور جہیز میں لڑکے والے سونے کی مانگ کرنے لگیں گے جس سے دوسرے مسلمان بھائی کو مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ عورتوں کے لباس وتشبیہ سے مردوں کو متمیز کرنا ضروری تھا لہٰذا سونا و چاندی و ریشم پہننا بالعموم عورتوں کیلئے مخصوص ہوا اور مردوں کیلئے حرام ہوا۔

اشکال و جوابات

(آریوں کا سوال اور اس کے جوابات، ص:۹۹)

فی باب عذاب قبر

سوال: قبر دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا یا بہشت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے تو کیوں کر کشادہ اور تنگ ہوسکتی ہے جب کہ میت نہ اس میں بیٹھ سکتی ہے اور نہ کھڑی ہوسکتی ہے اور جب ہم قبر کھودتے ہیں تو اس میں نہ تو اندھے اور گونگے فرشتے دیکھتے ہیں جو مردوں کو لوہے کے کندوں اور ہتھوڑوں سے مارتے ہوں اور نہ وہاں سانپ اور ازدہے دیکھتے ہیں اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ محسوس کرتے ہیں اور اگر میت کے اہل وعیال میں سے کوئی فرد قبر کھود کر معلوم کرے تو میت کو اسی ایک حالت غیر متغیر پر پاتے ہیں اور ہم اگر اس کی آنکھ پر اور اس کے سینے پر رائی کا دانہ رکھیں تو ہم اسکو اسی ایک حالت غیر متغیرہ پر پاتے ہیں تو مردہ پر تا حد نظر قبر کس طرح فراخ ہوسکتی ہے حالاں کہ اس کو اسی ایک حالت پر دیکھتے ہیں اور قبر کی کشادگی کو اسی حد پر پاتے ہیں جس حد پر ہم نے اس کو کھودا تھا نہ زیادہ ہوتی ہے اور نہ تنگ ہوتی ہے اور فرشتے اور وہ صورت جو مردہ کو گرفت میں لیتے ہیں یا اسکو ڈراتے ہیں تو وہ قبر میں کس طرح سما سکتے ہیں اور ہر ایک بات جو عقل ومشاہدہ کے برخلاف ہو وہ کہنے والے کی قطعی خطا ہے وہ کہتے ہیں کہ مصلوب کو ہم مدت دراز سے لکڑی پر آویزاں دیکھتے ہیں وہاں پر اس سے نہ منکر ونکیر کا سوال ہوتا ہے اور نہ اس کے جسم پر آگ دھکتی ہوئی دیکھی جاتی ہے اور جس کو درندوں نے پھاڑ کھایا ہو اور پرندوں نے نوچ لیا ہو اور اس کے ٹکڑے درندوں

کے پیٹوں اور پرندوں کے پوٹوں اور سانپوں کے شکموں اور ہواؤں کے طبقوں میں الگ الگ ہوجاتے ہیں اس کے ٹکڑوں سے باوجود الگ الگ ہونے کے کس طرح سوال وجواب ہونا ممکن ہوسکتا ہے اور جس کے جسم کے ٹکڑوں کی یہ حالت ہوجاوے اسکے ساتھ دو فرشتوں منکر ونکیر کا سوال وجواب کرنا کس طرح ممکن ہے اور ایسے شخص پر قبر بہشت کے باغوں میں سے یا دوزخوں کے گڑھوں میں سے گڑھا کسی طرح ہونا ممکن ہے اور کسی طرح قبر اس پر تنگ ہوسکتی ہے یہاں تک کہ مردے کی پسلیاں قبر کے ملنے سے ادھر کی اُدھر ہوجاویں۔

جواب: ملاحظہ کرنے سے قبل ہم چند باتیں بطور تمہید کے پیش کرتے ہیں تاکہ جواب کالشمس علی نصف النہار ہوجائے جیسا کہ حکیم الامت سیدنا حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے بیان کیا ہے۔ چنانچہ انبیاء کرام علیہم السلام نے کوئی ایسی بات نہیں بتلائی جس کو عقلیں محال جانیں اور وہ اس کے محال ہونے پر قطعی حکم دے سکیں بلکہ رسولوں کی خبر دینا دو قسم کی ہوتی ہے ایک تو وہ جس پر عقل وفطرت گواہی دے دوسرے وہ جس کو محض عقلیں دریافت نہ کرسکیں مثلاً غیب کی باتیں جو انبیاء علیہ السلام نے عالم برزخ اور قیامت اور عذاب کے متعلق مفصل بیان فرمائی ہیں باقی ہر حال میں انبیاء کرام کی خبریں اور از روئے عقل وسلیم محال نہیں ہوتی ہیں اور اگر وہ ظاہراً محال ہو اور سند صحیح سے نسبت بھی اس ثابت ہو تو اس موقع پر دوسرے قواعد شرعیہ کے موافق تاویل واجب ہوگی پس قبر کے واقعات دوسری قسم کی خبر ہے جو عقلاً محال تو نہیں مگر وہاں تک عقل کی خود رسائی ہیں وہ وحی الٰہی کی محتاج ہے باقی جو شخص اس کو محال سمجھتا ہے وہ محض اس شخص کا ایک خیال اور وہم ہے جس کو صاحب خیال اپنے فہم غلط میں معقول صریح جانتا ہے۔

دوسرا امر یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مراد کو بدون افراط وتفریط کے سمجھا جاوے آپ کے کلام سے وہ مراد نہ سمجھی جاوے جس کا آپنے ارادہ نہ کیا ہو جو شخص آپ کی مراد ومطالب سے اور طرف پھیر گیا اور اس کے واقعی معنی سمجھنے میں غفلت اور

کوتاہی کی تو سیدھے راستے بھٹک جاوے گا اور خدا اور رسول ﷺ کے کلام میں لوگوں کی غلط فہمیاں واقع ہونے سے اسلام میں بہت سے گمراہ اور بدعتی فرقے پیدا ہو گئے ہیں مثلاً قدریہ خارجہ معتزلہ، جہمیہ، رافضیہ، وغیرہ یہاں تک کہ دین اسلام کو اکثر لوگوں نے ترک کر دیا ہے اس کی جانب بہت کم ہیں جو التفات کرتے ہیں۔

تیسرا امر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تین مقام انسان کے لیے ٹھہرائے ہیں دنیا، برزخ، و دار قرار، اور ہر ایک مقام کے لیے علیحدہ علیحدہ کچھ احکام ٹھہرائے ہیں جو اسی سے مخصوص ہیں اور انسان کو بدن اور نفس سے مرکب کیا اور دنیا کے احکام بدنوں پر ٹھہرائے اور روحوں کو بدنوں کے تابع کیا اس لیے شرعی احکام ان حرکات سے مرتب کئے جو زبان اور بدنوں سے ظاہر ہوتے ہیں اگرچہ دل میں کچھ اور باتیں چھپی ہوں، اور خدا تعالیٰ نے برزخ کے احکام روحوں پر ٹھہرائے اور جسموں کو روح کے تابع کیا۔ پس جیسا کہ روح دنیا کے احکام میں بدنوں کے دردناک ہونے سے دردناک ہوتی اور بدن کے لذت پانے سے لذت پاتی ہے قبر یعنی عالم برزخ میں جسم دکھوں اور سکھوں میں روح کے تابع ہو جاتا ہے اور روح دکھ و سکھ کو برداشت کرتی ہے تو بدن بھی اسی دکھ و سکھ کے تابع ہو جاتا ہے اس جگہ بدن ظاہر ہے اور روح پوشیدہ اور برزخ کے احکام ارواح پر جاری ہوں گے یعنی دکھ و سکھ روح کو جب پہنچے گا تو وہ صاحب روح کے جسم میں بھی سرایت کرے گا جیسا کہ دنیا میں جسم کو کچھ راحت یا دکھ پہنچے تو اس کا اس کی روح پر بھی سرایت کر جاتا ہے۔ تو ان واقعات کا ظاہری جسم پر ظاہر ہونا ضروری نہیں وہ سب احکام روحانی ہیں جن کو روح مدرک کرتی ہے اور وہ سب واقعات بھی اس عالم کے ہیں پس ان کا محسوس ہونا بھی ضروری نہیں بلکہ عادتاً ممکن بھی نہیں خدا تعالیٰ نے اپنی رحمت و لطف و احسان سے اس امر کا نمونہ دنیا میں بھی سونے والے کے حال سے ظاہر و باہر فرمایا ہے کیوں کہ خواب میں جو دکھ اور سکھ سونے والے کو پہنچتا ہے وہ اس کی روح پر جاری ہوتا ہے اور اس میں بدن اس کے تابع

ہوتا ہے ایسا بھی عالم برزخ میں بھی جسم اور روح کے لیے دکھ اور سکھ کے طریقے جاری ہیں بلکہ اس خواب سے بھی بڑھ کر ہوگا کیوں کہ اس عالم برزخ میں روح کا ظاہر ہونا بہت کامل ہے اور روح کا تعلق بدن سے ہے گویا عام حالات میں ظاہر نہیں لیکن ایک غیر معصوم وجہ پر یہ بھی رہتا ہے بدن سے اس کا بالکل انقطاع وجدائی نہیں ہوتی۔ اب رہا تیسرا مقام یعنی آخرت سو جب حشر آباد ہوگا اور لوگ قبروں سے اٹھیں گے تو اس دن سکھ اور دکھ کا حکم روح اور جسم دونوں پر غالب اور ظاہر و باہر ہوگا مذکورہ بالا مضامین سے آپ حضرات کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ جو کچھ رسول اللہ ﷺ نے عذاب قبر اور اس سکھ اور دکھ ثواب وعذاب اور تنگی اور کشادگی یا دوزخ کے گڑھا ہونے یا بہشت کے باغ ہونے کی خبر دی ہے وہ مطابق عقل کے ہے مناقض نہیں اور اس میں کچھ شک وشبہ نہیں کہ اگر کسی پر یہ بات سمجھنی مشکل ہو تو یہ اس کی غلط فہمی ہے۔

اشکال وجوابات

(بحوالہ: مناظرۂ تحصیل، ص:۱۳۲)

ثم استویٰ علی العرش

پارہ ع ۱۱ سورۂ یونس: آیت:۲

سوال: سامعین کرام! ابھی میں نے قرآن کریم کی ایک آیت کریمہ کا ٹکڑے کی تلاوت کی جس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ حق جل مجدہ عرش پہ مقیم ہے اور آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ قائم وہ شخص ہوسکتا ہے جو ذو جسم ہو اور ذی روح ہو۔ نتیجتاً محدود ہونا لازم آتا ہے اور جو جسم مادہ سے مرکب ہوتا ہے تو وہ مادہ محدث وتجدد کا متقاضی ہے اور یہی دونوں تعدد الٰہ کو مستلزم ہے۔

جواب: پنڈت جی آپ نے استویٰ کو تو سمجھا ہی نہیں استویٰ سے وہ مراد قطعاً نہیں جو آپ نے سمجھا ہے استویٰ کے معنی متمکن ہونا نہیں جیسا کہ آپ نے ترجمہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مقیم ہے حق جل مجدہ کا یہ فرمان کہ ثم استویٰ علی العرش کا مفہوم حقیقی یہی ہے کہ حق تعالیٰ عرش پر محیط ہے اب یہ احاطت غلبیت پر دال ہے اب یہ بات واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ عرش پر مقیم نہیں بلکہ حاوی علی العرش ہے ذات الٰہی کا عرش پر حاوی ہونا عدم جسم ومحدود لازم آتا ہے اور جب آپ کی ذات جسم وجہات سے اور تحدید سے بالاتر ہوگئی تو تحدث وتجدد اس پر لازم نہیں آتا چنانچہ اس صحت معنی کے ساتھ آپ کے سوال کی دیوار منہدم ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

اشکال و جوابات

ان اللہ علی کل شئ قدیر

سوال: اس آیت کے اندر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز کے اندر زنا، اسی طرح بچہ کا پیدا کرنا لازم آتا ہے تو اس آیت کی روشنی میں معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ زنا کرنے پر قادر ہیں اسی طرح بچہ پیدا کرنے پر قادر ہیں نعوذ باللہ الفاً الفاً الی یوم القیامۃ جب بچہ پیدا کرنے پر قادر ہیں تو ان کے مولود کا متفرق ہونا لازم آتا ہے جب ان کے مولود متفرق ہوں گے تو وہ بھی قادر مطلق ہوں گے جب وہ بھی قادر مطلق ہوں گے تو کئی کئی معبود کا ہونا لازم آتا ہے تو لہٰذا متعدد معبود کا ہونا ثابت ہو گیا۔

جواب: اے نادانوں تم نے آیت کریمہ کا مفہوم سمجھا ہی نہیں کیوں کہ اس بات کا میں بھی قائل ہوں کہ حق جل مجدہ ہر چیز پر قادر ہیں لیکن خداوند قدوس کے جانب زنا کا سپرد کرنا سراسر یہ غلط ہے اس کی مثال یوں لیجئے تا کہ آیت کا مفہوم کالشمس علی نصف النہار ہو جائے جیسے ایک آدمی ہے ان کے پاس لڑکیاں ہیں اور بہو بھتیجی بھی ہیں اب یہ شخص اپنی لڑکیاں اور بہو بھتیجی سے زنا کرنے پر قدرت رکھتا ہے لیکن پھر بھی زنا نہیں کرتا کیوں کہ یہ عمل نہایت حقیر اور قابل ملامت عمل ہے اب بھلا بتایئے کہ اس حقیر عمل کو کرنے سے بندہ شرماتا ہے تو خداوند قدوس سے کیسے صدرور ہو سکتا ہے۔ جب خدا سے مذکورہ عمل کا صدرور نہیں ہو سکتا ہے تو ان کے حادث ہونے کا عقیدہ رکھنا سراسر غلط ہے اب رہی بات کہ بچہ پیدا کرنے پر قادر ہیں تو اگر آپ ان کے لیے بچہ کا پیدا کرنا تسلیم کریں گے تو واجب المتعدد ہ لازم آتا ہے جو کہ محال اور باطل ہے۔

اشکال وجوابات

حروف مقطعات

سوال: الٓمٓ، یٰسٓ، طٰہٰ، وغیرہ ذالک یہ ایسے حروف ہیں جن کے معنی ومفاہم کو کوئی بھی شخص نہیں جانتا ہے اور کسی کام کا نہ جاننا اور پھر بھی اس کام کا کرنا لغو اور بے کار ہے لہٰذا مفسرین کرام کا قول کہ الم، یسن، طہ وغیرہ قرآن کا جز ہے اور اس کی تلاوت کرنی چاہیے سراسر بندوں کو لغو باتوں میں مشغول کرنا ہے لہٰذا قرآن کے چند جز کا لغو ہونا پورے قرآن کا لغو ہونا لازم آتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ پورا قرآن لغو ہے۔ (نعوذ باللہ)

جواب: کلام لغو اس وقت ہوتا ہے جب خود متکلم اپنے کلام کے مرادات سے ناواقف ہو اور یہ کلام کلام الٰہی ہے جس کا متکلم خود اللہ کی ذات ہے خود آپ معترف ہیں کہ اس کے مرادات کو اللہ جانتا ہے جو خود ابطال لغو ہے رہی بات بندے کی تو بندے بغیر سمجھے اس کی تلاوت کرتا ہے تو بندے کے اس فعل کو عبث قرار دیا جائے اس میں اللہ نے اپنے بندوں کا امتحان لیا ہے کہ آیا میرے بندے صرف میری باتوں پر ایمان رکھتا ہے جو اس کے عقل میں آتی ہے اور جو ان کی سمجھ سے بالاتر ہو اس پر ایمان رکھتا ہے یا نہیں الغرض اس میں ایمان بالغیب کی دعوت ہے اور آمنا باللہ وبما انزل الینا کی ترغیب ہے۔

اشکال وجوابات

کلمۂ طیبہ

سوال: لاالہ الا اللہ محمدالرسول اللہ ۔اہل ایمان کا دارومدار مذکورہ کلمہ طیبہ کے اوپر ہے اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی معبود نہیں مگر اللہ، اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں محترم غور کیجئے کہ اس کلمہ کے اندر خود شرک کی بو موجود ہے کیوں کہ اللہ کے ساتھ ساتھ محمد ﷺ کا بھی ذکر ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد ﷺ تو اللہ کے ہم مثل نہیں ہیں البتہ ان کے معاون ومددگار ہیں۔

جواب: اس کلمہ میں جس کے دو جز ہیں جز اوّل لا الہ الا اللہ اور جز ثانی محمد الرسول اللہ جز اول میں اثبات توحید ہے اور جز ثانی میں اثبات رسالت ونبوت ہے اس میں ایمان کا تکملہ ہے نہ کہ اشتراک۔

اشکال وجوابات

لاتبدیل لخلق اللہ (الآیۃ)

سوال: اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ خداوند قدوس کی خلقیت کے اندر کوئی تبدیلی نہیں ہے لیکن یہ لوگ زمانہ ازل سے لیکر اب تک یہ عمل کرتے آرہے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتا ہے۔ تو ۲ر یا ۴ر سال کے بعد ختنہ کردیتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ خدا کی خلقیت کے اندر شک کرتے ہیں گویا کہ تم تغیر خلق اللہ کے عامل ہوتو خود خدا کیمنکر ہوں۔

جواب: ختنہ سے تغیر خلق اللہ لازم نہیں آتا اس لیے کہ حق جل شانہ نے اپنے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسی۸۰ سال کی عمر میں ختنہ کا حکم فرمایا چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس حکم کی تعمیل فرمائی کہ یہ عمل حق تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے نہ کہ خالق کی خلقت پر کسی طرح کا تغیر وتبدل اور نہ ہی شک وشبہ ہے۔

دوسرا جواب یوں دیا جاسکتا ہے کہ ختنہ کے اندر ناپاک شی کو خارج کرتے ہیں یعنی جس طرح ناخن اور زیر ناف کے بال، اور بگل کے بال، کو کاٹتے ہیں تاکہ انسان گندگی سے مبرہ ومنزہ رہے بعینہٖ یہی حال بچہ کا ہے۔

اشکال وجوابات

لوانزلنا هذا القرآن علی جبل لرایته خاشعاً

(پارہ:۲۸:سورۂ حشر)

اللہ آبرو رکھنا بڑا نازک زمانہ ہے ۔ دلوں میں عقیدہ رکھتے ہیں بظاہر توحیدانہ ہے

سوال: مذکورہ آیت مبارکہ کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ قرآن کو اگر پہاڑ کے اوپر نازل کیا جاتا جو دنیا کی سب سے زیادہ طاقت ور مخلوق ہے تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو جاتا اب بھلا بتایئے کہ کیا بشر یعنی محمد ﷺ اس عظیم کتاب کے اوزان وثقالت کو برداشت کر سکتے ہیں اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ ہاں محمد ﷺ اس کتاب کی ثقالت کو برداشت کر سکتے ہیں تو محمد ﷺ کے بشریت کا انکار لازم آتا ہے حالاں کہ قرآن نے اعلان کر دیا انما انا بشر مثلکم بہر حال جب محمد ﷺ اس کتاب کو برداشت نہیں کر سکتے ہیں تو گویا یہ کتاب اصل کتاب نہیں ہے بلکہ گھڑی ہوئی کتاب ہے لہٰذا اس کتاب کے اندر جتنے بھی احکامات ہیں تمام کے تمام گھڑے ہوئے ہیں۔

جواب: قال رسول اللہ ﷺ هل من خلقك اشد من الجبال قال اللہ تعالیٰ نعم! وهو الحديد فقال الملائكه هل من خلقك اشده من لحديد قال اللہ عزوجل نعم! وهو النار ثم قالت الملائكة هل من خلقك الامة من انه قال عزوجل نعم! وهو الماء فتحريرته الملائكة وسألت هل من خلقك من الماء قال عزوجل نعم! وهو الهواء فتحيرت الملائكة اشدت تحير وقالت هل من خلقك من الهواء قال عزوجل نعم! وهو الانسان.

خلاصہ یہ کہ رب کریم نے سب سے بڑی عقلمندی وطاقتور قوم انسان کو پیدا کیا۔

☆☆☆

اشکال وجوابات

یٰاَیُّھَا النَّبِی لِمَ تُحَرِّمُ ما احل اللّٰہ الخ

(الآیۃ) پارہ:۲۸،سورۂ تحریم

سوال: آپ ﷺ کی عادت مبارکہ یہ تھی کہ نماز عصر کے بعد تمام ازواج کے پاس تشریف لے جاتے اور ان کی مزاج پرسی فرماتے۔لیکن حضرت زینبؓ کے پاس کچھ زیادہ وقت لگاتے جس سے دوسرے ازواج کو حسد ہوتا کہ ہمارے پاس صرف ۵رمنٹ وقت دیتے اور حضرت زینبؓ کے یہاں ۱۰رمنٹ وقت دیتے ہیں آخر ایسا کیوں چنانچہ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کوئی ایسی تدبیر کی جائے تا کہ آپ ﷺ آئندہ ازواج کے درمیان برابر کا معاملہ کریں چنانچہ حفصہ اور دوسرے ازواج نے یہ طے کیا کہ جب آقائے رحمت ﷺ ہمارے سامنے تشریف لائیں گے تو ہم سب اب یہ کہیں کہ آپ ﷺ کے منھ سے مغافیر کی بو آرہی ہے اس پروگرام کے تحت سب نے یہی بات کہی اس پر آپ نے شہد نہ کھانے کی قسم کھائی۔تو کیا کوئی برحق نبی ﷺ اپنی بیوی کی بات پر حلال کو حرام کرسکتا ہے ہرگز نہیں اس سے یہ معلوم ہوا کہ یا تو مذکورہ آیت صحیح نہیں یا محمد ﷺ برحق نبی نہیں۔(نعوذ باللہ)

جواب: پنڈت جی! آپ ﷺ نے ازواج کی خوش نودی کے لیے قسم کھائی تھی چنانچہ اللہ نے وحی کی پھر آپ ﷺ نے قسم کو توڑ کر شہد کو اپنے اوپر حلال کرلیا چنانچہ مذکورہ آیت نازل ہوئی۔

☆☆☆

اشکال و جوابات

اذقال ربک للملئکۃ الخ

سوال: اذقال ربُّك لِلْمَلٰٓئَكَةِ انی جَاعلٌ فی الارضِ خَلِيفَةً. قَالَ لمْ التجعل فيهِمَا من يفسد فيهَا يسفِكُ الدِّمَاء .اس آیت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے مشورہ کیا ہے اور مشورہ اسی سے لیا جاتا ہے جو معاون و مددگار ہو لہٰذا اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونا لازم آتا ہے (نعوذ باللہ) اور جو خود محتاج ہو بھلا آپ بتائیں وہ کیسے رب ہوسکتا ہے (نعوذ باللہ) چنانچہ فرشتوں سے مشورہ لیا تو فرشتوں بجواب میں کہا کیا آپ ایسی مخلوقات کو پیدا کریں گے جو خوں ریزی کریگی۔

جواب: پنڈت جی؟ حق جل مجدہ کا مشورہ لینا مقصود نہیں بلکہ اظہار خیال مقصود تھا کہ فرشتوں کا خیال کیا ہے۔ لہٰذا آپ کا اعتراض صحیح نہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ عالم الغیب ہیں کیوں کہ وہ فرشتوں کے دلوں کی بات کو جانتے تھے کہ انہوں نے اپنے آپ کو اہم مخلوق شمار کیا جس کی وجہ سے اس کے اندر بڑائی آگئی تو اللہ نے ان کی بڑائی کو مردود کرنے کے لیے انسان کو پیدا کیا اور امتحاناً ان سے خداوند قدوس نے دریافت کیا - نہ کہ مشوراً۔

اشکال وجوابات

انی جاعلٌ فی الارض خلیفه

(پارہ،۱،سورۂ:بقرہ)

سوال:انی جاعل فی الارض خلیفة. جاعل کے معنی آتے ہیں نائب بنانے کے مطلب ہوگا کہ زمین میں اپنا نائب منتخب کرتے ہیں تا کہ میرے بعد وہ عالم کو چلائے (نعوذباللہ) اب خلیفہ سے مراد ہمارے کرشن، بھگوان، ہونا ثابت ہوگیا۔

جواب: آپ نے نائب کا مفہوم سمجھا ہی نہیں کیوں کہ نائب کا مفہوم یہ ہے کہ حق جل مجدہ بادشاہوں کے بادشاہ ہیں اب جب خدا تعالیٰ کوئی حکم اپنے بندوں پر نافذ کرے گا تو کسی وزیر کا ہونا ضروری ہے لہٰذا اسی وزیر کا کام انجام دینے کے لیے انسان ہی میں سے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا کیوں کہ یہ حق تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے کہ براہ راست اپنا حکم بندوں پر نافذ کرے۔ چنانچہ خود آپ دنیا کے اندر تجربہ کرلیں کہ جس کی حکومت رہتی ہے تو وہ کئی کئی وزراء رکھتا ہے کہ کچھ امور کا انجام دیں تو جب دنیا کا بادشاہ وزیر رکھتا ہے تو کیا بعید ہے کہ حق جل مجدہٗ اپنے احکام نافذ کرنے کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث کیا اور انبیاء کرام انسان ہی میں سے ہوا کرتے ہیں نہ کہ مٹی، اور پتھروں، میں سے اور مذکورہ آیت کے اندر خلیفہ سے مراد انسان ہے نہ کہ مٹی اور پتھر اور آپ بھگوان مٹی، پتھر میں سے ہوتے ہیں نہ کہ انسان میں سے۔

☆☆☆

اشکال و جوابات

سیدنا حضرت آدم علیہ السلام پر

سوال: اسی طرح اللہ تعالیٰ ہر چیز پر جب قادر ہے تو شیطان کو اتنی جرأت کیسے ہوگئی کہ اللہ کے حبیب حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو بہکایا، بہکانے کے لیے آدم علیہ السلام کے پاس کیوں گیا لہٰذا شیطان کا حضرت حوا کو بہکانا اس بات پہ دال ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پہ قادر نہیں ہیں (نعوذ باللہ) گویا کہ شیطان خود طاقتور رب ہے (نعوذ باللہ)

جواب: ارے بھائی پنڈت۔ جیسے تمہارا معبود شیطان ہے اسی طرح تم سمجھتے ہو کہ دوسروں کا بھی معبود شیطان ہے ایسا عقیدہ ہرگز نہیں بہر حال تمہارا جواب یہ ہے کہ جب شیطان مردود ہوگیا تو شیطان نے اللہ سے مہلت مانگی کہ میں آپ کے بندوں کو بہکاؤں گا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا کہ میرا خاص بندہ تا قیامت تمہارے پھندے میں نہیں آئے گا۔ چنانچہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت سیدنا آدمؑ کو جنت میں رکھا تو باری تعالیٰ نے ایک درخت کو مستثنیٰ کیا اور باقی تمام باغات سے میوے کھانے کی اجازت دیدی لیکن جس درخت کو مستثنیٰ کیا گیا تھا اس درخت کے پھل کو کھانے پر شیطان نے آمادہ کیا لہٰذا حضرت حوا نے ممنوع پھل کو چکھ لیا گویا کہ آپؑ سے ایک چوک ہوگئی۔ اس بناء پہ آپ کو جنت سے نکالا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ انبیاء کرامؑ سے غلطی کبھی بھی نہیں ہوئی ہے بلکہ انبیاء کرامؑ معصوم عن الخطا ہیں لیکن کچھ فرقہ باطلہ کہتے ہیں کہ غیر معصوم عن الخطاء ہیں۔

☆☆☆

اشکال وجوابات

عقیدۂ فرقۂ فلاسفہ پر

سوال: انہی لوگوں کا ایک فرقہ ہے فرقۂ فلاسفہ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ عالم کو عقول عشرہ چلا رہی ہے اور خدا آرام فرما ہیں۔ اب بھلا بتایئے کہ جو عالم کو چلائے وہ معبود ہوں گے یا جو آرام کر رہے ہیں وہ معبود ہیں بہر حال فرقہ فلاسفہ کے عقیدے سے بھی یہ بات ثابت ہوگئی کہ عالم کو چلانے والے متعدد معبود ہیں۔

جواب: پہلا جواب تو یہ ہے کہ فلاسفہ کا عقیدہ باطل ہے جب اس کا عقیدہ باطل ہو گیا تو ان سے بحث ہی نہیں کرنی ہے۔ دوسرا جواب تو یہ ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ عقیدہ صحیح ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ عقل اوّل کو کس نے پیدا کیا؟ تو جواب یہی دیں گے کہ اللہ نے پیدا کیا اور یہ بات برحق بھی ہے لہٰذا اسی عقل نے عالم کو چلایا تو عالم کو عقول کا چلانا گویا کہ اللہ کا چلانا ہے۔ لہٰذا مذکورہ سوال صرف صغریٰ کو لے کر ہے اور کبریٰ کو ترک کر دیا لیکن ہم اہل ایمان نے صغریٰ اور کبریٰ دونوں کو اخذ کیا اور تو نتیجہ یہی نکلے گا کہ اللہ ہی دنیا کو چلانے والے ہیں۔ یعنی پنڈت جی نے قاعدہ کے خلاف سوال کیا اور اگر قاعدہ کو سمجھ لیں تو وہ بھی وحدانیت کے قائل ہو جائیں گے۔

اشکال وجوابات

فی ام الکتاب پر

سوال: فی اُم الکتب ای اصل الکتاب لدینا: اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ دنیا کے اندر جو قرآن کا نزول ہوا ہے یہ اصل قرآن نہیں بلکہ فرع ہے لہٰذا اس پر یہ ایمان لانا کوئی ضروری نہیں ہے۔

جواب: جناب آپ نے جو مفہوم تصور کیا ہے وہ مفہوم نہیں ہے بلکہ خداوند قدوس نے اوّلاً پورا کا پورا کلام لوح محفوظ پر آتارا پھر نجماً نجماً حسب ضرورت آپؐ پر نازل کیا گیا گویا کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تم میں سے کوئی بھی شخص قرآن کے اندر تخفیف وترمیم نہیں کرسکتا ہے کیوں کہ اصل ..... میرے پاس موجود ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے شک وشبہ کو دور کرنے کے لیے مذکورہ قول ارشاد فرمایا کیوں کہ انسان یہ شک کرسکتا تھا کہ جبرئیل علیہ السلام جو کلام الٰہی لارہے ہیں ہوسکتا ہے کہ دوران سفر گڑھ لیتے ہوں اسی شبہ کو دور کرنے کے لیے ارشاد فرمایا فی ام الکتاب ای اصل الکتاب لدینا۔

اشکال وجوابات
عـــذاب قبـــر پـــر

ٹیلی ویژن

سوال: جب مردہ کو دفن کر کے لوگ واپس لوٹتے ہیں تو (قرآن وحدیث کے مطابق) گنہگار مردہ کو عذاب دیا جاتا ہے سو یہ سراسر ایک امر موہوم چیز ہے کیوں کہ قبر ایک چھوٹا سا طاقچہ ہے جس کے اندر زیادہ جگہ کی فراوانی نہیں ہے اب بھلا بتایئے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مردہ کے علاوہ دو فرشتے ہتھوڑا لے کر آئیں گے اور وہ اتنا بڑا ہتھوڑا ہوگا کہ ایک مرتبہ مارنے سے مردہ ستر گز زمین کے اندر دھنس جائے گا بہر حال یہ ایک امر موہوم چیز ہے۔

جواب: اس اشکال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ پورے عالم کے خالق ومالک حق جل مجدہ ہیں تو ان کے نزدیک کیا یہ بعید بات ہے کہ مردہ کو قبر میں رکھنے کے بعد قبر وسیع ہوجائے یقیناً باذن الٰہی قبر وسیع ہوجاتی ہے۔ دوسرا جواب آج کل کے ٹیلی ویژن نے دے دیا کہ ایک ٹیلی ویژن پر آپ پورے عالم کی خبریں اور تصویریں دیکھتے ہیں تو یہ کون سی محال بات ہے کہ ایک قبر میں ۲/۴ آدمی کی جگہ نہ ہو۔ بہر حال یہ بات متحقق ہوگئی کہ عذاب الٰہی برحق ہے۔

☆☆☆

اشکال و جوابات

حضرت یونس علیہ السلام پر

سوال: قرآن کے اندر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ حضرت یونسؑ مچھلی کے پیٹ میں گئے اور پھر زندہ واپس آئے۔ لہٰذا حضرت یونسؑ کا مچھلی کے پیٹ میں صحیح وسالم جانا اور زندہ رہنا یہ ناممکن اور محال بات ہے کہ کوئی شخص صحیح وسالم کسی جانور کے بطن میں جائے اور پھر واپس ہو جائے کیوں کہ بطن ایک ایسی جگہ جہاں نہ تو کوئی کھڑکیاں ہیں اور نہ کوئی کھانے پینے کا سامان ہے لہٰذا یہ واقع ایک امر موہوم پر محمول کیا جائے گا۔

جواب: پنڈت جی! سب سے پہلے میں یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ دنیا کے اندر کس چیز کے ذریعہ آئے کیا آپ یکا یک زمین سے نکل آئے یا درخت سے نکلے یا آسمان سے آئے آخر آپ کا وجود سب سے پہلے کہاں اور کس جگہ ہوا آپ جواب یہی دیں گے کہ ایک ناپاک قطرے سے" تو جب آپ باپ کی ریڑھ اور ماں کے بطن میں مہینوں ٹھہر سکتے ہیں تو کیا حق جل مجدہ اپنی مخلوق مچھلی کے بطن میں اپنے حبیب حضرت یونسؑ کو نہیں ٹھہرا سکتے ہیں۔ یقیناً ٹھہرا سکتے ہیں یہی نہیں بلکہ اگر وہ چاہتے تو پورے عالم کو ایک چونٹی کی شکل میں بھی ٹھہرا سکتے تھے۔ اس کے علاوہ اور بہت سارے جوابات دیئے گئے ہیں لیکن وقت اس بات کی مہلت نہیں دے رہا ہے۔

☆☆☆

اشکال وجوابات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر

سوال: کیا وہ نبی ہو سکتے ہیں کہ خود سے جھاڑو دے اور خود سے کپڑے صاف کرے حالاں کہ آپ ﷺ کے پاس ازواج موجود تھیں۔

جواب: پنڈت جی! آپ بہکے بہکے اعتراض کیوں کرتے ہیں۔ بہر کیف یہ عمل آپ ﷺ نے اس وجہ سے کیا تا کہ دنیا والوں کو نصیحت ہو کہ جب اللہ کا محبوب بندہ یہ عمل کر سکتا ہے تو ہم لوگوں کو کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ نے جھاڑو اس لیے لگایا تا کہ لوگوں پر یہ اثر ہو کہ نبی ﷺ کے اندر کبر و تکبر نہیں ہے بلکہ عاجزی وانکساری ہے کیوں کہ تکبر و کبر فقط حضرت حق جل مجدہٗ کے لیے زیبا ہے نہ کہ شفیع امت ﷺ کے لیے اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنے کے لیے نبی ﷺ نے جھاڑو لگایا۔

تیسرا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ ازواج مطہرات کو خوش کرنے کے لیے جھاڑو لگایا تا کہ لوگوں کو یہ نصیحت ہو کہ کوئی شخص اپنی بیوی کو غلام بنا کر نہ رکھے بلکہ ہم سفر زندگی بنا کر رکھے۔

اشکال وجواب

شادی وبیاہ پر

سوال: ان کے مذہب کے اندر یہ بات مذکور ہے کہ چچا کی لڑکی (یعنی بہن) سے شادی جائز ہے حالاں کہ قرآن اس بات پر شاہد ہے کہ تمام کے تمام بہنیں حرام ہیں بقولہ تعالیٰ حرمت علیکم امھاتکم وبنتکم واخواتکم اس کی دوصورت نکلتی ہے یا تو آپ کہیں کے چچیری بہن سے شادی کرنا جائز اگر جواز کے قائل ہیں تو آپ کا قرآن جھوٹا ہے اگر ناجائز کے قائل ہیں تو اب تک جو بھی مسلمان اپنی چچیری بہنوں سے شادیاں کی وہ نکاح لغو ہوگا (اشرف الہدایہ جلد:۴،ص:۱۵) پر لکھا ہے کہ محرمہ ہونے کے سات اسباب ہیں ان میں سے ایک قرابتِ خاصہ بھی ہیں لہٰذا چچیری بہن کے اندر قرابت خاصہ پایا جاتا ہے جب قرابت خاصہ پایا گیا تو چچیری بہن حرام ہوگئی۔

جواب: یہ آیت جو نازل ہوئی ہے اپنی بہن کی نفی کے لیے یعنی ہر مسلمان پر صلبی بہن حرام ہے نہ کہ چچیری بہن۔ لہٰذا خواہ چچیری بہن ہو یا خلیری بہن ہو یا پھوپھیری بہن ہو آپ کے لیے درست ہے آپ ان سے نکاح کریں۔

اشکال و جواب

زید بن حارثہ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر

سوال: (۱) زید بن حارثہؓ یہ محمد ﷺ کی خدمت میں رہا کرتے تھے اور محمد ﷺ ان کو اپنے لڑکے کا درجہ دیئے ہوئے تھے چنانچہ جب زید بن حارثہ کہیں تفریح کے لیے جایا کرتے تھے تو لوگ ان کو حارثہ بن محمد ﷺ سے پکارا کرتے تھے تو اس سے معلوم ہوا کہ زید بن حارثہ محمد ﷺ کا لڑکا تھا لیکن جب زید ابن حارثہ نے شادی کی اور ان کی بیوی نہایت جوان تھی اتفاق سے زید بن حارثہ نے طلاق دے دیا تو محمد ﷺ نے نکاح کر لیا حالاں کہ محمد ﷺ عند الناس حارثہؓ کے باپ تھے تو پھر آپ ﷺ نے نکاح کیوں کیا۔

سوال: (۲) اسی طرح ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ہمارے نبی ﷺ آج تک کسی سے بھی عشق نہیں کیا کیوں کہ عشق ان کے منافی ہے جب عشق ان کے منافی ہے تو پھر انہوں نے حضرت سیدنا عائشہؓ سے عشق کیوں کیا اس کی دو حالت نکلتی ہے کیوں کہ اگر نبی ﷺ نے عشق نہیں کیا تو پھر آپ ﷺ نے وضو کے بعد (جو کہ عصر کا وقت تھا) کیوں کر حضرت عائشہؓ کو بوسہ لیا اور اگر عشق کیا تو محمد ﷺ فقط حضرت عائشہؓ کے عاشق ہو سکتے ہیں نہ کہ خدا کے جب خدا تعالیٰ کے عاشق نہیں ہو سکتے ہیں تو رب کریم اپنے احکام ان کو کیسے سپرد کر سکتے ہیں۔

جواب: (۱) اسی اشکال کے جواب میں حق جل مجدہ نے ارشاد فرمایا: و حلائل ابناء کم الذین من اصلابکم کہ انسان پر ان کے صلبی بیٹے کی بہو کو حرام کیا گیا ہے نہ کہ متبنّٰی بیٹے کی بہو کو لہٰذا زید بن حارثہ آپ ﷺ کے متبنّٰی بیٹے تھے پس ان کی بہو

سے نکاح جائز تھا اسی لیے آپ ﷺ نے ان سے نکاح کیا۔

جواب: (۲) یہاں عشق سے مراد غلط عشق ہے اور غلط عشق نبی ﷺ ہی نہیں بلکہ ہر ہر اہل ایمان پر حرام ہے اور نبی اکرم ﷺ نے جو حضرت عائشہؓ سے عشق کیا وہ عشق صحیح اور باذن خداوندی تھی۔ اسی طرح آپ ﷺ نے حق جل مجدہ سے بھی عشق کیا اور ہمیشہ ہمیش کرتے رہیں گے کیوں کہ یہ عشق حقیقی ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا جائے گا کہ دراصل عشق کی دو قسمیں ہیں (۱) عشق مجازی (۲) عشق حقیقی، عشق مجازی اس عشق کو کہتے ہیں جو عام لوگوں سے عشق ہو جاتا ہے جیسے کہ نبی اکرم ﷺ اپنی جملہ ازواج مطہرات سے عشق کیا کرتے تھے اور دوسری عشق حقیقی، عشق حقیقی اس عشق کو کہیں گے جو صرف ایک ہی سے عشق کی جائے جس طرح نبی اکرم ﷺ نے فقط اللہ ہی سے عشق حقیقی کیا۔ خلاصہ کلام یہ نکلا کہ آپ ﷺ نے اپنے ازواج سے عشق مجازی کیا اور رب حقیقی سے عشق حقیقی کیا۔

دوسری بات یہ ذہن نشیں کرلیں کہ نبی اکرم ﷺ کو اللہ کا عاشق کہہ سکتے ہیں لیکن اللہ کو نبی اکرم ﷺ کا عاشق نہیں کہہ سکتے ہیں ورنہ کہنے والا کفر کا مرتکب ہو جائے گا۔

اشکال وجواب

لااکراہ فی الدین

(پارہ بقرہ: آیت: ۲۵۵)

سوال: لااکراہ فی الدین الآیہ کہ دین کے اندر کوئی زور وزبردستی نہیں ہے حالاں کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے دین کے اندر زور وزبردستی ہی کیا بلکہ خون ریزی کی جارہی ہے جیسا کہ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ جہاد ہر عاقل بالغ مسلم پر فرض ہے اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب اسلام صحیح نہیں کیوں کہ مذہب اسلام خون ریزی کا حکم دیتا ہے بخلاف میرے مذہب کے کہ میرے مذہب کے اندر کوئی خون ریزی نہیں ہے جب آپکے مذہب کے اندر خون ریزی اور میرے مذہب کے اندر خونریزی نہیں تو میرا مذہب صحیح ہے۔

جواب: جناب یہ کس نے کہا کہ اسلام کے اندر خونریزی۔ معاملہ ایسا نہیں بلکہ ہم جہاد اس لیے کرتے ہیں تا کہ تم لوگ حق جل مجدہ کی وحدانیت کو تسلیم کرلو۔ اگر تم ان کی وحدانیت کو تسلیم کر لیتے ہو تو ہم تم بھائی بھائی ہیں تمہارا مال ہمارا تمہاری عزت، اور ہماری عزت برابر ہے۔ کیوں کہ وہی خالق حقیقی ہے اور لا اکراہ فی الدین میں تمہارا اشکال اس وقت صحیح ہوتا جب ہم موحدین سے جنگ کرتے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم جہاد انہی لوگوں سے کرتے ہیں جو جہاد کے قابل ہیں یعنی صرف نوجوان سے کرتے ہیں نہ کہ بوڑھے اور عورتوں سے۔

☆☆☆

اشکال وجواب

بعوضة فما فوقها

(پارہ:۱: سورۂ بقرہ)

سوال: سامعین کرام! اہل ایمان کا کہنا ہے کہ خداوند قدوس تمام اشیا سے اعلی وافضل ہے اور تمام بادشاہوں کا بادشاہ ہے تو کیا کوئی بادشاہ اپنے کلام کے اندر حقیر سے حقیر چیز کا ذکر کرسکتا ہے ہرگز نہیں۔ یہی نہیں بلکہ حدیث کے اندر بھی کئی کئی روایات مذکور ہیں کہ قرآن محمد ﷺ کو تحفہ میں پیش کیا گیا تو کیا کوئی محبوب اپنے حبیب کو بیکار سے بیکار چیزوں کو تحفہ میں پیش کرسکتا ہے ہرگز نہیں اس کی مثال یوں لیجئے کہ ہمارے مہنت جی ہیں اگر وہ کسی کو تحفہ پیش کریں گے تو کیا مچھر کیڑے مکوڑے کو پیش کریں گے جب بندہ مچھر کیڑے مکوڑے کو تحفہ میں پیش نہیں کرسکتا ہے تو یہ گویا محال اور باطل ہے لہٰذا قرآن کا لغو ہونا لازم آیا۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ جب کسی حقیر وذلیل چیزوں کی مثال دینی ہو تو کسی ایسی ہی حقیر چیز سے مثال دینا مقتضائے عقل وبلاغت ہے اس غرض کے لیے کسی حقیر گھناؤنی چیز کا ذکر کرنا شرم وحیا کے قطعاً منافی نہیں اس لیے اللہ تعالیٰ نے ایسی چیزوں کے ذکر سے نہیں شرماتے اور یہ بھی بتلا دیا کہ ایسے احمقانہ شبہات صرف ان لوگوں کو پیدا ہوا کرتے ہیں جنکے قلوب اور دماغوں سے انکے کفر کی وجہ سے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت مفقود ہوگئی ہو ایمان والوں کو کبھی ایسے شبہات دامن گیر نہیں ہوتے (معارف القرآن) اور حق جل مجدہ نے یقیناً قرآن تحفہ میں پیش کیا لیکن اسی مذکورہ مثال کو تحفہ میں دیکر اپنے حبیب ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے یہ سمجھایا کہ آپ مخلوقات کو یہ کہہ دیں کہ اللہ تعالیٰ ایسی مثالوں سے شرماتا نہیں۔

دوسرا جواب یہ دیا گیا کہ مچھر جب موٹا ہوتا ہے تو فوراً مرجاتا ہے اسیطرح جب کفار ومشرکین ومنافقین کو جب فراوانی ہوتی ہے تو متصلاً اسلام کے خلاف بغاوت کرتے ہیں۔

☆☆☆

اشکال وجواب

معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر

سوال: میں اہل ایمان سے توجہ طلب کروں گا کہ آپ کے مذہب کا دارومدار موہوم چیزوں پر ہے کیوں کہ کون شخص ایسا ہوسکتا ہے کہ جو راتوں رات ساتوں آسمانوں کا سفر کر کے آجائے اتنے ہی پر بس نہیں بلکہ دورانِ سفر انبیاء کرام کی امامت بھی کرے اور موسیٰ علیہ السلام سے تین تین بار گفتگو کر کے خدا کے پاس گئے تو بھلا بتایئے کہ کون شخص ایسا ہوسکتا ہے جو فقط ایک رات کے کم حصے میں اتنا عظیم سفر طے کر لے حالاں کہ ابھی بھی دورِ ترقی کے باوجود کوئی انسان آسمان پر نہ جاسکا۔ بہرحال ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ آپ کے مذہب کی بنیاد فقط موہوم چیزوں پر ہے۔

جواب: جب اللہ تعالیٰ کن فیکون کے ذریعے سکنڈوں میں عالم قائم کرسکتا ہے تو کیا بعید ہے کہ حق جل مجدہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو راتوں رات آسمان وزمین وعرش معلیٰ کی سیر کرائے دوسرا جواب آج کل کے دورِ ترقی نے دے دیا کہ جب ہم سعودیہ میں بیٹھ کر ہندوستان والوں کو دیکھ سکتے ہیں اسی طرح بات چیت کرسکتے ہیں تو کیا بعید ہے کہ حق جل مجدہ اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو راتوں رات بلا کر اعزاز واکرام سے نوازے اسی طریقے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم بذریعہ براق تشریف لے گئے تھے براق اس کا مادہ ہے برقٌ جس کے معنی آتے ہیں بجلی تو جب آج کل کی بجلی ایک منٹ میں کروڑہا کروڑ میل کا سفر طے کرسکتی ہے تو کیا یہ محال بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو راتوں رات سفر کرا سکتے ہیں معلوم ہوا کہ ہمارا دین امر موہوم نہیں ہے بلکہ آپ کا فہم امر موہوم شی پر مبنی ہے۔

☆☆☆

اشکال و جواب

حضرت عائشہؓ کا ہار گم ہونے پر

سوال: نبی کریم ﷺ نے اپنی اہلیہ کے ہار کی گمشدگی کی بنا پر پوری قوم کو تکلیفیں دی حالانکہ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ ایذائے مسلم حرام ہے جب ایذائے مسلم حرام ہے تو نبی ﷺ کیونکر صحابہ کرام کو تکلیف دی اگر تکلیف دی ہی تو ایذائے مسلم کو حرام کیوں کہا گیا۔

جواب: یہ کس نے کہا کہ نبی اکرم ﷺ تمام صحابہ کرامؓ کو پریشان کیا بلکہ خود بخود صحابہ کرامؓ بیتاب و پریشان ہو گئے کیوں کہ حضرت عائشہؓ امہات المومنین میں سے تھیں تو کیا اگر کسی کی ماں کسی جگہ کھو جائے تو لڑکے تلاش نہیں کر سکتے ہیں ضرور بالضرور تلاش کر سکتے ہیں تو یہاں پر صحابہ کرامؓ نے ماں ہونے کی نسبت سے تلاش کیا تھا نہ کہ آپ ﷺ کی جانب سے پریشان کرنا مقصود تھا۔

سوال: اسی طرح اہل ایمان کا یہ عقیدہ ہے کہ کسی اجنبی عورت کے ساتھ کسی غیر محرم مرد کا سفر کرنا ناجائز ہے حالاں کہ صفوان بن معطلؓ نے حضرت عائشہؓ کے ہمراہ سفر کیا اس سے معلوم ہوا کہ صفوان بن معطلؓ نے غلطی کا ارتکاب کیا اگر غلطی نہیں کیا تو یہ عقیدہ تم لوگوں کو رکھنا چاہیے کہ اپنی عورت کا کسی غیر محرم مرد کے ساتھ سفر کرنا جائز ہے اگر جائز ہے تو تم لوگ ناجائز کہاں سے کہتے ہو۔

جواب: حضرت صفوان بن معطلؓ نے مستقل طور پر سفر نہیں کیا بلکہ ام المومنین سیدہ حضرت عائشہؓ اپنی جماعت سے پیچھے رہ گئی تھیں اور جماعت آگے نکل گئی تھی تو آپؓ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئیں چنانچہ حضرت صفوان بن معطلؓ کی نظر آپؓ پر پڑی تو حضرت صفوان بن معطلؓ نے ام المومنینؓ کو اونٹ پر بٹھلایا اور خود پا کے بل چلنے لگے لہٰذا اس کو سفر کرنا نہیں کہیں گے بلکہ مجبوری کے تحت پردے کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچانا کہیں گے۔

☆☆☆

اشکال وجواب

حرمت شراب پر

سوال: انما الخمر الخ الآیۃ ۔ پارہ:۲، بقرہ۔ ان کی شریعت کا عجیب ماجرا ہے کہ جنت کے اندر شراب جائز ہے لیکن دنیا کے اندر شراب حرام ہے ایسا کیوں اگر آپ یہ کہتے ہیں کہ شراب حرام ہے تو پھر جنت کے اندر جائز کیوں اگر آپ کہتے ہیں کہ شراب جائز ہے تو پھر حرام کیوں؟

جواب: ارے جناب؟ دنیا اور جنت کی شراب کے اندر زمین وآسمان کا فرق ہے کیوں کہ دنیا کی شراب کے اندر نشہ ہے جس کی وجہ سے عقل وفہم مفقود ہو جاتی ہے اور انسان غلط کاری میں مصروف ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس جنت کی شراب ہے کہ جس کے اندر نہایت ہی لذت اور سیرابی ہوگی ۔ اور بغیر نشہ کے ہوگی ۔ لہٰذا اسی فرق کی وجہ سے دنیا کی شراب کو حرام کہا اور جنت کی شراب کو حلال کہا۔

سوال: ان کا یہ کہنا ہے کہ ہمارے مذہب کے اندر کوئی افراط وتفریط نہیں اور کسی بھی جاندار چیز کو تکلیف دینا جائز نہیں اور جو بھی شخص دنیا کے اندر کسی جاندار کو تکلیف دیتا ہے تو اسکا حشر قیامت کے دن برا ہوگا۔ تو پھر قربانی کے ذریعہ کسی جاندار چیز کو ہلاکت میں ڈالنا کیسا ہے؟

جواب: جو اشکال تم ہم پر کرتے ہو وہی اشکال تم پر عائد ہوتا ہے تم بھی اپنے معبود کے یہاں جانوروں کو بلی دیتے ہو، لہٰذا تم نے جو کام کیا وہی ہم نے کیا البتہ تمہارے کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے کوئی حجت نافذ نہیں کی اور ہمارا عمل اس خالق کے حکم کی اطاعت ہے۔

☆☆☆

اشکال و جواب

شیطان کے بھکانے پر

سوال: شیطان کا وجود فرضی ہے کیوں کہ کسی انسان کو شیطان گمراہ نہیں کرتا ہے بلکہ انسان خود بخود گمراہ ہوتا ہے اگر تھوری دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ ہاں شیطان ہی انسان کو گمراہ کرتا ہے تو پھر شیطان کو کس نے گمراہ کیا اگر اللہ تعالیٰ ہی نے شیطان کو گمراہ کیا تو شیطان نے بندے کو گمراہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے بندہ کو گمراہ کیا۔ اگر شیطان کو اللہ تعالیٰ نے گمراہ نہیں کیا تو معلوم ہوتا ہے کہ شیطان بھی قادر مطلق ہے۔

جواب: یہ بات تو متحقق ہے کہ شیطان نے حکم عدولی کی جس کی وجہ سے اس کو راندۂ درگاہ کیا گیا چنانچہ جب اس معلون کو راندۂ درگاہ کیا جارہا تھا تو اس نے کہا کہ جس کی وجہ سے ہم کو مردود کیا جارہا ہے میں اس کو دنیا میں گمراہ کروں گا تو حق مجل مجدہ نے فرمایا کہ میرا اصل بندہ تمہارے جال میں کسی بھی صورت میں پھنس نہیں سکتا وہی تمہارے جال میں پھنسے گا جو تمہاری صف کا ہوگا۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ بندہ کا امتحان بھی لینا چاہتا ہے کہ کون بندہ صراط مستقیم پر قائم ودائم ہے۔

اشکال وجواب

آتوالزکاۃ الایہ پر

سوال: آتوالزکاۃ۔اس آیت کے اندر یہ حکم کیا جاتا ہے کہ زکوٰۃ ادا کرو گویا کہ کسی مالدار آدمی کو مشقت میں ڈالنا ہے اور غرباء کو مفت خوری کا عادی بنانا ہے اور یہ سراسر عقل کے خلاف ہے پس یہ بات ثابت ہوگئی کہ مذہب اسلام عقل کے خلاف ہے۔

جواب: ایتاءالزکوٰۃ خلاف عقل نہیں بلکہ مطابق عقل ہے اور یہ اعتراض بربنائے عداوت ہے ورنہ خیرات کرنے کا حکم ہر مذہب میں موجود ہے خود تمہاری مذہبی کتابوں میں اس کی وضاحت موجود ہے کہ اچھا کرم کرو گے تو اگلے جنم میں اچھا پاؤ گے غریبوں یتیموں کا تعاون کرنا اچھا کرم ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ اصل میں مال انسان کا اپنا نہیں بلکہ مال (اللہ) کا دیا ہوا ہے اور دینے والے کا حکم ہے کہ تم سارا مال اپنے پاس نہ رکھو بلکہ کچھ اپنے غریب بھائی کو بھی دو جس سے انسانی ہمدردی اور بھائی چارگی پیدا ہو اب خود بتاؤ معقول ہے یا غیر معقول۔ اسی طریقے سے تیسرا جواب یہ دیا جائے گا کہ ہر انسان یہی سوچتا ہے کہ ہم پاک وصاف کھانا کھائیں تو ہمارے مذہب کے اندر معاملہ یہ ہے کہ جب تک مال ودولت میں زکوٰۃ نہ نکالیں گے تو اس وقت تک مال دولت پاک نہیں ہوگا۔ یہی پاکی حاصل کرنے کے لیے زکوٰۃ نکالتے ہیں۔

اشکال و جواب
نماز پر

سوال: ان الصلوٰۃ تنھی عن الفحشاء الخ: (پارہ:۲۰-سورہ نمل) قرآن یہ کہتا ہے کہ نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے حالاں کہ میں دیکھتا ہوں کہ بعض نمازی غلط کاریوں میں مصروف رہتے ہیں یہی نہیں بلکہ ایک بزرگ جن کا نام برصیصہ ہے نہایت ہی عبادت گزار اور گناہوں سے مبرہ ومنزہ تھا لیکن انہوں نے آخری وقت میں ایک بادشاہ کی لڑکی سے زنا کرلیا جس کی بناء پر اس کو بادشاہ کے لڑکوں نے قتل کر دیا۔ (سوانح پادری ہس:۸۷)

جواب: اوّلاً جس بزرگ کا نام لیا گیا ہے اس کا تعلق غلامان مصطفیٰ سے نہیں ہے بلکہ یہ تو ایک عیسائی تھا لہٰذا آپ کے اشکال کی جڑ کٹ گئی۔ اب غور کرو کہ جو نماز میں قائم ہے وہ برائی سے محفوظ ہے یا نہیں۔

پنڈت جی! ایک بات اور ذہن نشیں کرلو کہ نماز ہی ایک ایسی عبادت ہے جو بے حیائی سے روکتی ہے اور جنت تک پہنچا دیتی ہے لیکن تمہاری عبادت کیسی قبیح ہے جو دنیا ہی کے اندر ذلیل ورسوا کر کے جلا دیتی ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ تمہاری عبادت قابل تردید اور ہماری عبادت قابل تسلیم ہے۔

اشکال وجواب

نبی کے قول کے پر

سوال: یہ بات قرآن وحدیث کے اندر کثرت سے وارد ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کو آج تک بددعا نہیں دی لیکن قرآن وحدیث کے برخلاف ایک بات یہ ہے کہ جب یہودی نے آپ ﷺ کو السام علیکم کہا تو آپ ﷺ نے بددعا دی حالاں کہ حدیث میں یہ بات مذکور ہے کہ آپ ﷺ نے کسی کو آج تک بددعا نہیں دی۔

جواب: یہ بددعا نہیں بلکہ جیسے کو تیسا ہے (جیسی کرنی ویسی بھرنی) یہود جان بوجھ کر آپ ﷺ کی مخالفت کرتے اور قولا وفعلاً آپ کو اذیت پہنچاتے چوں کہ اس یہودی کو آپ کے نبی برحق ہونے کا علم تھا مگر عناد کی بناء پر کلمہ سُوء کا استعمال کیا کرتے تھے اور آپ ﷺ نے جواباً یہ ارشاد فرمایا بہر حال اگر ابتداءً یہ بات ہوتی یا اور کسی انجان کے لیے ہوتی تو آپ ﷺ کی طرف سے بددعا پر محمول کرتے وہ یہاں مفقود ہے لہٰذا آپ کا دعویٰ غیر مقصود ہے۔

سوال: نبی ﷺ کو سحر کیا گیا تھا جیسا کہ اس بات پہ قرآن وحدیث شاہد ہے کہ جب آپ ﷺ کو سحر کیا گیا تھا تو قرآن کی آیت مبارکہ کا نزول ہوا (سورۂ معوذتین) تو اس سحریت کے بنا پر جملہ احکام مشکوک ہو گئے جب احکام مشکوک ہو گئے تو انہی مشکوک احکامات پر عمل کرنا بھول اور بے جا ہے۔

جواب: سحر آپ ﷺ کی ذات پر کیا گیا لیکن سحر آپ کی عقل ودماغ کو مختل نہ کر سکا اس سے آپ کو جسمانی اذیت پہنچی لیکن قلب ودماغ آپ کے بالکل محفوظ رہے۔

اشکال و جواب
حضرت عائشہؓ پر

سوال: ان لوگوں کے مذہب میں ہے کہ تین دن سے زائد گفتگو بند رکھنا یا کسی سے بغض وعناد رکھنا یہ ناجائز ہے حالاں کہ روایات میں آتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے کثیر مدت تک ابن زبیرؓ سے گفتگو نہیں کی۔

جواب: تکلم نہ کرنا ذاتی مفاد پر خلاف شرع ہے اور اگر دینی بنیاد پر ہے تو صرف مباح ہی نہیں بلکہ موجب ثواب ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہؓ کا قطع کلام اس بنیاد پر تھی کہ حضرت ابن زبیرؓ نے اپنی خالہ کو جو ہدیہ دیا تھا انہوں نے ایک ہی دن میں صرف کر ڈالا اسی بناء پر ابن زبیرؓ سے عدم تعاون کا معاملہ کیا گویا انہوں نے اپنی خالہ کو کار خیر سے روکنا چاہا یہی عمل انقطاع کلام کا سبب بنا اس لیے حضرت عائشہؓ کے اس عمل کو مطعون کرنا غیر دانشمندی ہے۔

سوال: اہل ایمان کے یہاں یہ بھی مسئلہ موجود ہے کہ کوئی عورت بے پردہ کہیں باہر نہ جائے اس سے فتنہ پھیل سکتا ہے حالاں کہ اس عقیدے کے خلاف میں دیکھتا ہوں کہ حضرت عائشہؓ نے جنگ صفین میں شرکت کی جس سے لازمی طور پر آپ کی بے پردگی ہوئی اب بھلا بتاؤ کہ ام المومنین بے پردہ باہر نکلیں اور دیگر عورتوں پر پردے کا حکم نافذ ہو۔ بہر حال اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پردے کا حکم نا قابل درست ہے۔

جواب: یہ سوال تاریخ سے عدم تعلق پر مبنی ہے۔ حضرت عائشہؓ کی شرکت بغرض قتال نہیں تھی اور نہ ہی آپؓ نے میدان میں اتر کر تیر اندازی فرمائی آپؓ کا وجود صرف مخالف کو خاموش کرنے اور یہ بتانے کے لیے تھا کہ حضرت عائشہ کی حمایت دلیل

صواب ہے۔آپ ہمہ وقت ہودج کے اندر ہی بیٹھی رہیں باہر نہیں آئیں۔

سوال: قرآن نے پیغمبر ﷺ کی بیوی کو امہات المومنین کہا ہے لیکن اس کے برخلاف آیت کریمہ مذکور ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جب دیگر مومنین ازواج مطہرات کے یہاں آئیں تو بغیر اجازت نہ آئیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ازواج امہات المومنین نہیں ہیں اگر ہوتی تو بغیر اجازت آنے کا حکم کیا جاتا۔

جواب: یہ تعلق نسبی پر موقوف نہیں بلکہ روحانیت کے طور پر ہے جو احترام کو مستلزم ہے مقصود ان کا احترام کرانا ہے۔

سوال: گمشدہ شوہر کے بناء پر عورت کا طویل عرصہ تک انتظار میں رہنا یہ سراسر غلط ہے اور اس حکم سے یہ بھی لازم آتا ہے کہ عورت زنا کرانے پر آمادہ ہو جائے تو گویا کہ شریعت نے عورت کو طویل عرصہ تک روک کر زنا پر آمادہ کیا لہٰذا یہ شریعت ناقابل برداشت ہے۔

جواب: ہمارے یہاں تو چار سال کے بعد نکاح کی اجازت دی جاتی ہے لیکن تمہارے یہاں تو شوہر کے انتقال پر تاحیات عورت شادی نہیں کر سکتی اس سے واضح ہو گیا کہ امر قبیح کو تم فروغ دیتے ہو نہ کہ ہم۔

سوال: جس آدمی کی حیات شریک ہی ایمان نہ رکھتی ہو تو دوسرا شخص بدرجہ اولی ایمان نہ رکھے گا بہر کیف اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ شریعت میں نقص ہے۔

جواب: نام نہ لینا عدم ایمان کو مستلزم نہیں بلکہ یہ صرف اظہار ناراضگی تھا۔

اشکال و جواب
ازواج مطہرات پر

سوال: اب میں ایک سوال ایسا کروں گا جس سے یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ جتنی بھی ازواج مطہرات تھیں تمام کے تمام کا ایمان غارت و بیکار تھا کیوں کہ قرآن نے اعلان کر دیا جیسا کہ آیت کریمہ مذکور ہے ''اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْن'' (پارہ:۲۶۔سورۂ احزاب) اے لوگو اپنی آواز کو رسول ﷺ کے پاس بلند نہ کرو ورنہ تمہارے ایمان برباد ہو جائے گا لیکن ازواج مطہرات اپنی آواز کو نبی ﷺ کے پاس بلند کیا کرتی تھیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ازواج مطہرات کا ایمان حبط کر لیا گیا۔

(شبستھ یارتھ پرکاش، ص:۷۵)

جواب: مذکورہ آیت کریمہ سے قبل ازواج مطہرات لطفاً آواز کو تھوڑا سا بلند کیا کرتی تھیں لیکن جب مذکورہ آیت نازل ہوئی تو ازواج مطہرات بالکل ہی اپنی آواز کو عند النبی ﷺ پست کر لی تھیں۔

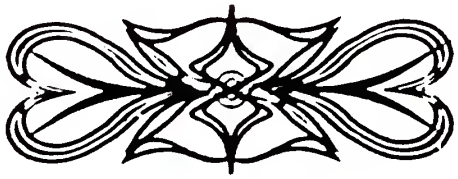

وید کلام الٰہی نہیں بلکہ مقولات ہے

بحوالہ: مناظرۂ تحصیل، ص:۱۳۱

وید اپنی اندرونی شہادت سے ثابت کرتا ہے کہ وہ ازلی و کلام الٰہی نہیں بلکہ انسانی مقولات ہے۔ ان ہی کے کتب وغیرہ میں بیان کیا گیا ہے کہ جس طرح لسان جسم انسانی سے باہر آتی اور پھر اس میں سما جاتی ہے اسی طرح وید سے ظاہر ہوتا ہے اور پھر اس میں سما جاتے ہیں یعنی چند مرتبہ سے ظاہر ہوئے اور پھر فنائے دنیا پر اس میں سما جائے گویا وید لغو اور بیکار شئ ہے۔

اسی طرح فقرہ (۲) میں بیان کیا گیا ہے کہ جس نے برہمہ کو پیدا کیا اسی نے شروع دنیا میں برہما کو وید کی تعلیم دی جس کا مطلب صاف یہ ہے کہ وید منتر کا الہام برہما کو آغاز دنیا میں ہوا۔ پنڈت صاحب نے یہ فقرہ بحوالہ سوتیا شوتر اب اُپ ادھیائے ۴ منتر لکھا ہے اور اس فقرہ میں بلحاظ اپنی معمولی عادت کے یہ الفاظ خط ہلالی میں لفظ برہما کے آگے لکھ دیئے اصل عبارت کا مطلب تو صاف تھا کسی تعبیر و تفسیر کی ضرورت نہیں تھی مگر چوں کہ پنڈت جی کے خلاف مطلب و مقصد تھا لہٰذا ایجادِ بندہ کرنے کی ضرورت واقع ہوئی اصل فقرہ تو پنڈت جی کے مفروضہ ملہمان وید اگنی وایو ادیتہ کا وجود ہی کالعدم ہے۔

فقرہ (۳) میں شرتی کی تعریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ شرتی اس کو کہتے ہیں جس کو ابتداء آفرینش سے رشی یا عالم چلے آئے ہوں اور وجہ شرتی نام قائم ہونے کی یہ ظاہر کی گی ہے کہ چوں کہ کسی انسان نے کبھی کسی جسم والے انسان کو وید تصنیف کرتے ہوئے نہیں دیکھا لہٰذا اس کا نام شرتی رکھا گیا یہ فقرہ زیادہ قابل لحاظ ہے اوّل تو پنڈت صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ شرتی کے لیے سند مسلسل کی ضرورت ہے کہ جس سے معلوم ہو کہ ابتداءِ دنیا سے رشی یا عالم اس کو سنتے چلے آئے ہیں حالاں کہ دوبارہ

مضامین وید ایسی کوئی سند پنڈت جی پیش نہیں کر سکتے اس کے بعد آپ فرماتے ہیں کہ چوں کہ کسی انسان نے کسی جسم والے شخص کو وید تصنیف کرتے نہیں دیکھا لہٰذا اسکو شرتی کہتے ہیں بوجہ امتداد زمانہ اور تاریخ نہ ہونے قدیم کے پنڈت جی کو مصنفان وید کا صحیح پتہ نہیں لگ سکا لہٰذا پنڈت جی اس پر اسی وجہ کے قائم کرنے پر مجبور ہوئے اگر کسی قدر غور کریں تو معلوم ہو جاتا جس جس وید منتر کا جو جو مصنف ہے اس کا نام اس منتر پر لکھا ہوا ہے مگر بیچارے کیا کریں ہجوم افکار نے دماغ کو صحیح نہیں رکھا تھا اپنی ہی تحریر سابقہ بھول گئے میں یاد دلاتا ہوں ستارتھ پرکاش صفحہ ۲۶۹ کو ملاحظہ کر لیجئے مصنفان وید کا پتہ آپ کو معلوم ہو جائے گا۔

فقرہ (۴) میں آپ کا دعوی ہے کہ موجودہ الفاظ و معنی و حروف وید قدیمی ہیں اور اس موجودہ دنیا سے پہلے بھی اسی طرح تھے مگر افسوس جو سند آپ اپنے دعوی کی تائید میں پیش کرتے ہیں وہی آپ کے دعویٰ کو ساقط کرتی ہے تائید دعویٰ میں رگوید کا یہ فقرہ (سب کائنات کے قائم رکھنے والے پرمیشر نے سورج اور چاند وغیرہ سب چیزوں کو مثل سابق بنایا ہے) پیش کیا گیا ہے اس فقرہ کے الفاظ صاف صاف اسی امر پر دلالت کرتے ہیں کہ رگوید سے پیشتر سورج اور چاند وغیرہ سب چیزیں کائنات کی بنائی تھیں اور رگوید ان کے بعد کا ہے کوئی انصاف پسند اس فقرہ کو پڑھ کر کبھی نہیں سوچا کہ الفاظ و حروف و معانی وید ازلی ہیں یا نہیں۔

فقرہ (۵-۶) میں صریحاً ملہم وید برہما جی کو تیار کیا گیا ہے دیانند فرض رشی ملہمان وید کا کہیں وجود نہیں اور تائید ازلی و ابدی ہونے وید میں یجروید ادھیائے (۴) کو پیش کیا گیا ہے میں نے یجروید کے ادھیائے (۴۵) کو منتر اسے لغایتہٗ (۱۷) بغور دیکھا اس میں ایک لفظ بھی ایسا نظر نہ آیا جو مصنف پرکاش کا مؤید ہو۔

اب ہم چند وید منتر لکھتے ہیں جن کو پڑھنے سے مجبوراً تسلیم کرنا ہوگا کہ یہ کلام انسانی اور فانی ہے زرا توجہ کی ضرورت ہے۔

(۱) اے جوگی فقیر تو جوگ کے وسائل حاصل کرنے والا ہے یہ تیری عادت سکھ

کا گھر ہے تو جہل وغیرہ عیبوں سے الگ ہو فیض سے بھرپور ہو تو فقیری کے طریقوں پر بھرا ہوا ہے اور سب کے سب پرانے بزرگوں زمانے گذشتہ کے فقیروں اور زمانہ حال کے جوگیوں کے مانند ہے الخ۔ (یجروید ادھیائے ۷۔ منتر ۱۲)

(۲) اے پرمیشر تم آریوں کو جانتے ہو کہ اپنے دھرم کرام میں مشغول ہیں اور جتنے ویشوں ہیں ان سے بھی واقف ہو کر بڑے کاموں کا شغل رکھتے ہیں اس لیے ان پاپیوں کا ناش کرو۔

(۳) روشنی سے ظاہر ہوئی بجلی ہمیں جلانے والی ہوتی ہے اور جملہ سادھوؤں کے ذریعہ ہوائیں ہمیں سکھی کرنیوالی ہیں اسلئے سب کاموں کے لیے انہیں اچھی طرح جاننا چاہیے۔

(۳) اے اندر پرمیشر تو ہمیں دق نہ کر ہم سے الگ مت ہو ہمارے بہوگون کو مت چرا اور مت چودا ہماری عورتوں کے حمل گرا ہماری اولاد کو قتل مت کر ہمارے برتن مت پھوڑ ہمارے دوستوں کو سلامت رکھ۔ (اسی طرح اور کا بہت سارے قبیح کلام میں اگر تفصیل سے دیکھنا ہو تو (تکذیب وید اور تصدیق) کو ملاحظہ کیجئے) بہر حال ان منتروں کو ذرا غور سے پڑھئے اور انصاف سے کہئے کہ آیا یہ خدا کا کلام ہے یا انسانی مقولات ہر ایک ادنیٰ سے ادنی انسان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ کوئی دیوانہ پاگل کا کلام ہے کلام الٰہی ہو ہی نہیں سکتا ہے۔

آریوں کے اخلاقی مذہبی احکام پر ایک سرسری نظر

منوسمرتی پردھانند جی جابجا استدلال کرتے کہ اگر حوالہ جات منوسمرتی سیتارتھ پرکاش سے علیحدہ کردیئے جائیں تو وہ محض ایک بیکار کتاب قالب بیجان ہو جائے گی لہٰذا ہم نے بھی منوسمرتی ہی کا انتخاب کیا ہے اور سمرتیوں کو چھوڑ دیا ہے۔

جھوٹ بولنا جائز ہے۔ جہاں سچ بولنے میں برہمن کشتری دلسہ شودر قتل ہوتا ہو وہاں جھوٹ بولنا سچ سے بھی زیادہ اچھا ہے (منو ۴-۸)

جھوٹ بول کر گھر میں آکر سرموتی دیبی کی مکیہ کرے تب جھوٹ بولنے کے پاپ سے چھوٹے۔ (منو ۱۰۵-۸)

☆☆☆

چوری کی اجازت

بحوالہ: شبد ستھیارتھ پرکاش

پرُلطف بات یہ ہے کہ ہمارے اسلامی قوانین پر یہ اعتراض کرتے ہیں اور اپنے گریباں نہیں جھانکتے چنانچہ ان کے دیوتا لکھتے ہیں کہ چوری کرنا جائز ہے۔ کھلیان سے یا کھیت سے یا گھر سے جہاں سے ملے غلہ چراوے۔ منو (۱۷-۱۱) اسی طرح آج آریہ سماج یہ چیخ چیخ کر کہتا ہے کہ کسی بھی جانور کا گوشت کھانا درست نہیں ہے بالخصوص پنڈت لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں حالاں کہ انہیں کے دھرم میں لکھا ہے جانوروں کو کھانے سے کھانے والے کا دوش نہیں ہوتا کیوں کہ کھانے لائق جانور کو اور کھانے والے جاندار کو برہما جی نے ہی پیدا کیا ہے۔ (منو ۳۰-۵)

اسی طرح ان کے وید کے اندر لکھا ہے کہ عورت محض بیوقعت اور نا قابل اعتبار ہے یعنی رات دن عورتوں کو شوہر وغیرہ کے وسیلے سے بے اختیار کرنا مناسب ہے۔ اور (شبد ستھیارتھ ص:۱۱) لکھتے ہیں کہ عورتیں محض غلام ہیں۔ (منو ۲-۹) لڑکپن میں باپ اور جوانی میں شوہر اور بڑھاپے میں بیٹا عورتوں کی حفاظت کرے کیوں کہ عورتیں خود مختار ہونے کے لائق نہیں ہیں۔

آریوں نے دلیل پیش کیا کہ جب حوا اور آدمؑ جنت میں تھے تو اس وقت حوا ہی نے ممتنع شئ کو کھالیا تھا انکو جنت سے نکالا گیا جن سے معلوم ہوا کہ عورتوں کی کوئی حیثیت نہیں۔

جواب: اس اشکال کا جواب دیا گیا کہ کیا آپ اللہ اور اس کے رسل کو مانتے ہیں کہ آپ نے ایک نبی علیہ السلام کی مثال پیش کی ہے بہر حال اس مثال سے معلوم ہوا کہ آپ نبی ﷺ اور اللہ کو مانتے ہیں جب مانتے ہیں تو کوئی جھگڑا ہی نہیں رہا۔

بہر حال مذکورہ تمام بیانات سے معلوم ہوا کہ وید غلط اور لغو چیز ہے۔

اعتراضات اور اس کے جوابات

بحوالہ: مناظرہ تحصیل، ص:۳۷

من جانب آریہ

سوال: قرآن کریم کی تعلیم ہے کہ خدا مکار ہے خدا مکار وفریب ہے۔ آل عمران:۵۴ میں مذکور ہے۔

جواب: یہ ہے کہ یہ اعتراض والزام ہی محض بے بنیاد وکم علمی وناسمجھی کی وجہ سے ہے کیوں کہ ذرا بھی اگر کوئی شخص عربی محاورات کو سمجھنے والا ہوگا تو اس کے دل میں یہ خیال آ ہی نہیں سکتا۔ اب اس جواب اوّل کو دوسرے جواب سے سمجھو وہ یہ کہ لفظ مکر زبان عرب میں خفیہ تدبیر کو کہتے ہیں اگر وہ اچھے کام کے لیے ہے تو اچھا ہے اور برے کام کے لیے ہو تو برا ہے محض مکر کو برا نہیں کہہ سکتے اسی لیے قرآن پاک میں ہے وہ **ولا یحیق المکر السیئ** یہاں پر مکر کے ساتھ سیئہ کی قید لگادی ہے اور خود آپ کو غور کرنا چاہیے تھا اعتراض سے قبل کہ اس جگہ بھی خیر الماکرین فرمایا۔ اور جس کو آپ نے مکار کہا ہے وہاں تو اس لفظ کے ذریعہ اچھی تدبیر کے معنی لیے گئے ہیں اور پھر اعتراض کرنا اور کہنا تو کفر ہوگا اس لیے کہ مکار اردو زبان میں اس کو کہتے ہیں کہ جو اعلیٰ درجہ کا جھوٹا ہو ظاہر ہے کچھ کہے اور باطن میں اس کے خلاف کرے۔

سوال: یہ بے رحمی ہے کہ روحانی بیماروں کی بیماری اور بڑھا دے اور عذاب بھی دے۔ **فی قلوبھم**۔ (بقرہ: آیت:۱۵)

جواب: حق جل مجدہ نے حقیقتاً مرض کو بڑھایا نہیں بلکہ خود انسان اتنی برائیاں کرتا ہے کہ ان کے دلوں پر ایک کالا سا نقطہ پڑ جاتا ہے اور جب جب وہ برائیاں کرتا ہے تو وہ

نقطہ ترقی کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ اللہ تعالیٰ اس کو موت کے بعد عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہر حال اس سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ خود اللہ نے اس کو بیماری میں مبتلا کر دیا بلکہ اللہ نے اس کی بیماری کو دور کرنے کے لیے انبیاء کرام کو مبعوث کیا لیکن خود انہوں نے بیماری کو اختیار کیا۔

سوال: توبہ سے معافی دینا انصاف کے خلاف۔ (سورۂ: بقرہ)

جواب: جس نے یہ سوال کیا ان کی نہایت ہی کم علمی ہے کیونکہ اگر اللہ معاف نہ کرے تو کوئی بھی انسان جنت میں نہیں جاسکتا اور جب بھی کوئی شخص جنت میں جاتا ہے تو انکے فضل کی بناء پر نہ کہ عدل کی بناء پہ اور توبہ کا معاف کرنا یہ فضل کے قبیل سے ہے۔

سوال: خدا غفار ہے مگر دوزخیوں کی آہ وزاری پر رحم نہیں کریگا۔ (سورۂ نساء)

جواب: جہاں خداوند قدوس غفار ہیں وہیں یہ بھی اعلان کر دیا انا قہار کہ میں قہار بھی ہوں اب رہا سوال کہ دونوں چیزوں کا یک بیک پایا جانا تو تضاد ہے تو جواب یہ ہے کہ غفار ان لوگوں کے حق میں ہیں جنہوں نے کچھ نیکیاں کی ہوگی اور قہار ان لوگوں کے حق میں ہے جنہوں نے کھلم کھلا شرک کیا ہوگا کیوں کہ شرک کی بخشش کہیں بھی نہیں ہے بہر حال انہیں تمام باتوں پر مدنظر رکھتے ہوئے خداوند قدوس نے اعلان کر دیا اے لوگو جہاں میں غفار ہوں وہی قہار بھی ہوں۔

سوال: یہ بات ثابت ہے کہ ہر کام خدا کے حکم سے ہوتا ہے اس میں زنا وغیرہ بھی شامل ہے۔ (یونس)

جواب: ہر کام خدا کے حکم سے ہوتا ہے اس کا مطلب آپ سمجھے ہی نہیں مطلب اس کا یہ ہے کہ اللہ نے ہر ایک کے وجود کو دیکھ کر اس کے کچھ اثرات اور اس کے کچھ کام متعین کر دیئے ہیں مثلاً آگ کی تاثیر گرم اور جلانا ہے اور پانی کی تاثیر سرد اور ڈبانا ہے اسی طرح ہر ایک شئ کو اس کی تاثیر اور کام دیدیا ہے انہیں میں سے یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اعضاء کو بھی حکم دیدیا کہ وہ تابع بنا کر رہے انسان جہاں چاہے

اور جو کام لینا چاہے وہ کر گذرتا ہے اب جو کچھ گناہ کبیرہ یا صغیرہ کا ارتکاب انسان کرتا ہے وہ حکم خداوندی سے نہیں بلکہ خود اپنے اختیار سے کرتا ہے اللہ تعالیٰ نے تو قرآن میں جگہ جگہ ہر ہر برائی سے منع کیا ہے تو پھر وہ حکم کیسے کرے گا اگر کرے گا تو دو نقیضوں کا جمع ہونا لازم آئے گا اور یہ اللہ کے یہاں تو محال در محال ہے لہٰذا یہ بات ثابت ہوگئی کہ گناہ کا مرتکب انسان خود ہی بنتا ہے۔

سوال: جیسا کہ خدا خود لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ تو آدمیوں کو کیوں دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ (مائدہ بنی اسرائیل)

جواب: (۱) پہلا جواب تو یہ دیا جائے گا کہ انسان کی غلطی اور اشد گستاخی کے بناء پر اللہ تعالیٰ ان کو خوب خوب چھوٹ دے دیتے ہیں کہ اور گمراہی کا عمل کرو۔

جواب: (۲) جہاں یہ سوال اٹھتا ہے وہاں خداوند قدوس نے اپنے نبی ﷺ کو مخاطب کیا کہ اے میرے حبیب جس کو میں چاہتا ہوں گمراہ کرتا ہوں اور جہنم رسید کر دیتا ہوں آپ اس کے ذمہ دار نہیں ہیں اور نہ یہ کام آپ کا ہے کہ آپ بھی جس کو چاہیں گمراہ یا ہدایت دے دیں بلکہ آپ ﷺ کا صرف ایک کام ہے وہ اراء الطریق ہے نہ کہ ایصال الی المطلوب۔

سوال: نبی کیوں بھیجے فرشتہ کیوں نہیں۔

جواب: تا کہ لوگوں کو اسی کے طور طریقہ پر سمجھائے اور لوگوں کے دلوں میں خلجان نہ ہو کہ میں اللہ کا کلام سمجھ نہیں رہا ہوں اور یہ دنیا کا رواج بھی ہے کہ تبلیغ کرنے والے اگر اسی کی زبان میں بات کرتے ہیں تو بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے اور کسی طرح کی شکایت نہیں ہوتی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر فرشتے نبی بنکر آتے تو لوگ یہ کہہ کر ایمان قبول کرنے سے منحرف رہ جاتے کہ یہ تو فرشتہ ہے ان کو وہ ضرورتیں لاحق نہیں جو ہم انسانوں کو ہے۔

سوال: خدا نے شیطان کو بھی گمراہ کیا حالانکہ ان کی مخلوق ہے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ (اعراف)

جواب: میں یہ کہتا ہوں کہ شیطان کو بھی سجدہ سے انکار نہیں کرنا چاہیے تھا کیوں کہ

مالک کا حکم تھا پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا معاف بھی کر دیتا اگر وہ معافی مانگتا لیکن اس نے بجائے معافی مانگنے کے اور ضد اپنا لیا لہٰذا اس کا گمراہ ہونا اس کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ ہاں یہ بات تو قابل تسلیم ہے کہ مخلوق ہیں لیکن ان لوگوں نے حکم کو تو ادا اور حضرت آدمؑ کو سجدہ نہ کیا جب کہ دنیا کی عظیم سے عظیم مخلوق نے سجدہ کیا لہٰذا جو شخص خدا کے حکم پر نہ چلا تو اس کی بخشش کیسے ہو سکتی ہے اسی طرح ابلیس کے اندر تکبر بھی آ گیا تھا کہ میں سب سے بڑا ہوں اور افضل ہوں حالاں کہ تکبر فقط خداوند قدوس کے لیے ہے اس لیے ان کے تکبر کو توڑنے کے لیے اللہ نے کہا اسجدوا لیکن ان لوگوں نے ان سے انکار کیا پس ان کے لیے یہی گمراہی کا سبب بن گیا۔

سوال: جب خدا کن فیکون کے ذریعہ سب کچھ پیدا کر سکتا ہے تو چھ دن میں زمین و آسمان کیوں بنائے۔ (مریم)

جواب: اس کا صحیح جواب تو ہماری عقل یہ دیتی ہے کہ یہ مصالح خداوندی ہے اسکو وہی خوب جانتا ہے۔ لیکن جس طرح سے آپ کو یہ سوال پیدا ہوا تو یہی سوال اس وقت میں بھی پیدا ہوتا اگر ایک ساعت میں بنا دیتا یا ایک طویل عرصہ میں وجود بخشتا تاہم یہ جواب اس کا دیا گیا ہے کہ بندوں کو اللہ تعالیٰ نے تعلیم دی ہے کہ ہر کام تدریج سے کیا کریں اور یہ کہ عجلت عند اللہ محمود و مستحسن نہیں ہے احادیث میں بھی متعدد جگہ تدریج کی طرف رہنمائی کی گئی ہے نیز مقولہ ہے ہر چہ آید دیر نہ یابد ان تمام مصالح کے پیش نظر یہ تخلیق کی گئی۔

سوال: جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے پیدا فرمایا جس سے قانون شریعت پر آنچ آتی ہے۔ (انبیاء)

جواب: خداوند قدوس نے ایسا اس لیے کیا تا کہ لوگوں کو یہ عبرت و نصیحت ہو کہ اے لوگو اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے چنانچہ بغیر باپ کے بھی اولاد پیدا کر دیا ہے اور جنہوں نے حضرت مریمؑ پر الزام دیا اس کا جواب خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے چھوٹے ہونے کے باوجود جواب دیا انا نبی اللہ کہ میں اللہ کا نبی ہوں جنہوں نے مجھ کو مبعوث کیا ہے۔

سوال: اپنے رسولوں کو آسمان پر بلانا دنیا میں اپنا قاصد اور پیام بھیجنا اس بات کی دلیل ہے کہ خدا زمین پر نہیں ہے کیا خدا کا گھر چہار دیواری میں محدود ہے۔ (مائدہ)

جواب: نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ ہر ایک جگہ حاضر و ناظر ہیں اب رہا سوال کہ انبیاء کرام کو مبعوث کیوں کیا گیا تو اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء ورسل کو اس لیے بھیجا گیا تا کہ لوگ قیامت کے دن یہ نہ کہے کہ ہمارے پاس کوئی پیغام دینے والا نہیں پہنچا تھا کہ ہم ایمان لاتے بہر حال اللہ تعالیٰ نے انہی تمام باتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے انبیاء کرام کو مبعوث کیا۔

سوال: سب سے پہلے خدا نے فرشتوں کو شرک کی تعلیم دی۔ (بقرہ:۳۴)

جواب: درحقیقت اللہ تعالیٰ نے شرک کی تعلیم نہیں دی بلکہ بابل کے اندر جادو کا سب سے زیادہ چرچا ہو گیا تھا اور ہر ایک آدمی جادو سیکھنے سکھانے پر آمادہ ہو گیا تھا اسی جادو گری کے ازالے کے لیے حق جل مجدہ نے دو فرشتے ہاروت و ماروت کو بابل کے اندر مبعوث کیا تا کہ لوگوں کو راہ راست پہ لائے اور ان دونوں فرشتوں کو کچھ جادو کا عمل بھی آتا تھا جس کے ذریعہ اہل بابل کو کفر و شرک سے روکا گیا۔

سوال: خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا مگر نوحؑ کی خاطر تمام دنیا کو غرق کر دیا۔ (المومنون)

جواب: اللہ تعالیٰ نے مخلوقات کو اس لیے پیدا کیا تا کہ میری فرمان برداری و اطاعت و بندگی کرے اور اس لیے پیدا نہیں کیا کہ میری نافرمانی کرے لیکن قوم نوحؑ نے نافرمانی ہی نہیں کی بلکہ اللہ کے نبی نوح علیہ السلام کے ساتھ ظلم و زیادتی کی اور نوح علیہ السلام بار بار اپنی قوم کو راہِ راست پر لانے کی کوششیں کیں لیکن وہ اپنے شر اور ضد سے باز نہ آئے سو انہی کی شرارت نے ان لوگوں کو ہلاک کر دیا۔

سوال: جب دلوں پر مہر لگا دی تو وہ خطاوار کیوں ہے۔ (بقرہ)

جواب: وجہ اس کی یہ ہے کہ ان لوگوں نے شرارت و عناد کر کے باختیار خود اپنی استعداد کو برباد کر لیا ہے اس لیے تباہی انہی کے اعمال سیئہ کا نتیجہ ہے البتہ اللہ تعالیٰ

نے بندوں کے تمام افعال کے خالق ہونے کی حیثیت سے اس جگہ مہر لگانے کو اپنی طرف نسبت کر کے یہ بتلا دیا کہ جب ان لوگوں نے قبول حق کی صلاحیت واستعداد کو اپنے اختیار سے تباہ کرنا چاہا تو سنت الٰہیہ کے مطابق ہم نے وہ بد استعداد کی کیفیت ان کے قلوب اور حواس میں پیدا کر دی۔

سوال: آدم کو بی بی کیسے پیدا ہوگئی حالاں کہ ان کے پاس مرد نہ گئے۔ (زر)

جواب: ان اللہ علی کل شئ قدیر کے تحت حق جل مجدہ ہر چیز پر قادر ہیں کہ جس طرح بغیر باپ کے بیٹا پیدا کر سکتا ہے تو بغیر ماں کے بھی اولاد پیدا کرنے پر قادر ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اللہ جس طرح ایک ناپاک قطرے سے انسان کو وجود میں لاسکتا ہے تو یہ بات کیا محال ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ بغیر ماں یا بغیر باپ کے انسان کو پیدا کرے ان کے لیے ہر چیز آسان ہے۔

سوال: صور کی آواز قیامت کے دن کیسے پوری دنیا میں پہنچ جائے گی میں قبول نہیں کرتا۔

جواب: کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ قوم عاد نے خدا تعالیٰ کی نافرمانیاں کیں تو ان کے درمیان انبیاء کرامؑ مبعوث ہوتے رہے لیکن یہ لوگ اپنی سرکشی سے باز نہ آئے۔ حتی کہ انبیاء کرام کا استہزاء کرانے لگے تو حق جل مجدہ نے اس بد بخت قوم کو ہلاک و برباد کیا حضرت جبرئیلؑ کی آواز کے ذریعہ، لہٰذا جس طرح جبرئیل امین کی آواز بلند تھی اور پوری قوم ہلاک و برباد ہوگئی۔ اس سے بھی زیادہ صور کی آواز بلند ہوگئی اور پوری دنیا تباہ و برباد ہو جائے گی۔

سوال: یہ عجیب بات ہے کہ اس سے پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز ادا کیا کرتے تھے پھر پتہ نہیں اپنے رخ کو کیسے بدل دیئے اور مسجد حرام کا رخ اختیار کر لیے یعنی ان کا کوئی صحیح مذہب نہیں ہے حالاں کہ دعویٰ کرتے ہیں کہ میرا مذہب صحیح ہے۔

جواب: یہ دیا گیا کہ دنیا کی ساری جہتیں اللہ ہی کے لیے ہے خواہ بیت المقدس ہو یا مسجد حرام ہو اور وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر اور تمام کے تمام سمت اسی کے لیے ہے پھر آخر میں تعین کیوں کر دی گئی کہ آپ مسجد حرام کی طرف رخ کر کے نماز ادا کریں۔

جواب: اس لیے منجانب اللہ تعین کر دی گئی تا کہ لوگوں کے اندر اختلاف و نزاع طاری نہ ہو یعنی اگر اللہ کی جانب سے تعین نہ ہوتا تو بعض حضرات کہتے کہ ہم مشرق کی جانب رخ کر کے نماز ادا کریں گے اور بعض کہتے مغرب بعض کہتے جنوب بعض شمال کو رخ بنائیں گویا کہ لوگوں کے درمیان نزاع و اختلاف لاحق ہو جاتا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو تکلیف دینے پر آمادہ ہو جاتا اور ہمارے مذہب میں ایذا مسلم حرام ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے تعین فرما دی۔

سوال: آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ میرا مذہب یکتائی کا مذہب ہے یعنی میرا مذہب تمہارے مذہب کی طرح متفرق نہیں ہے حالاں کہ میں دیکھتا ہوں کہ تم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد متفرق مذہب کر چکے ہو مثلاً کوئی فرقہ امام ابو حنیفہؒ کو مانتا ہے تو کوئی فرقہ امام شافعیؒ کو مانتا ہے کوئی فرقہ امام مالکؒ کو مانتا ہے کوئی فرقہ امام جنبلؒ کو مانتا ہے اسی طرح لوگ مختلف ائمہ کرام کو مانتے ہیں اسی سے معلوم ہوا کہ تمہارا مذہب صحیح نہیں ہے۔ یعنی جس طرح تمہارا رب ایک ہے اسی طرح تمہارا مذہب بھی ایک ہونا چاہیے تھا۔

جواب: دیکھو میرا مذہب میرا رب حقیقت میں ایک ہے اس میں کسی کو شک و شبہ کی گنجائش نہیں رہی بات کہ مختلف ائمہ کرام کی تقلید تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا اشکال اس وقت قابل قبول ہو سکتا ہے جب ائمہ کرام کے درمیان اور ان کی تقلید حق اور باطل کی ہوتی اور ان لوگوں کے درمیان حق اور باطل کی تقلید نہیں ہے بلکہ افضلیت اور غیر افضلیت کی تقلید اور اختلافات ہے لہٰذا تمہارا اشکال لغو اور بیکار ہے۔

جواب الزامیؒ بخلاف تمہارے مذہب کہ کے تم میں سے کوئی رام کو پوجتا ہے تو

کوئی کرشن کوتو کوئی راون کو وغیرہ ذلک لہٰذا تمہارا مذہب یقیناً باطل ہے۔

سوال: آپ کے قرآن مجید کے اندر یہ کہا گیا استوی علی العرش کہ حق جل مجدہ عرش پر قائم ودائم ہیں۔اور قائم ودائم وہی چیز ہوسکتی ہے جس کے لیے جسم ہوتو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ رب العزت کیلئے جسم ہے یعنی مادہ اور ہر مادی چیز حادث ہے لہٰذا (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ حادث ہیں حالاں کہ آپ لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ حادث نہیں ہیں۔

جواب: آپ نے اعتراض میں صریح غلطی کی ہے کہ استوی کا ترجمہ قائم کیا ہے اور پھر اگر قائم کا ترجمہ کر ہی لیا تو عربی زبان کی گہرائی سے واقفیت نہ ہونے کی بنا پر قائم کا ترجمہ قائم ہی تک سمجھا ہے حالاں کہ قائم سے مراد موجود ہونا ہے یعنی واجب الوجود جس کو وجود ہی وجود ہے فنا وحدوث نہیں ہے۔

نیز استوی کا ایک ترجمہ یہ بھی ہوگا کہ قصد کیا یعنی زمین وآسمان سے بنانے کے بعد عرش کا ارادہ کیا اب رہا یہ کہ استوی کیلئے جسم ضروری ہے سو اسکو تو ہماری عقل کہتی ہے کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ استوی مختلف صورتوں میں بغیر جسم کے ہو ہاں اتنی بات تو ہم کو تسلیم ہے کہ استوی علی العرش ثابت ہے اور وہ اسی طرح ثابت ہے جیسا کہ خدا کے شایان شان ہے ہماری عقل وفہم سے بالاتر ہے وہاں تک اجسام عنصری کی رسائی ممکن نہیں ہے اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کو واضح کر کے نہیں بتلایا تو ہم اس کو اور واضح کر کے نہیں بیان کر سکتے ہیں۔کیوں کہ یہ ہمارے عقائد وایمان کا مسئلہ ہے اگر ہم تحقیق کر کے ایمان لائیں تو مومن کس بات کیہوں گے جب کہ قرآن میں مومن کی صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ یومنون بالغیب بس ہم اس مسئلہ میں صرف اتنا کہیں گے۔ کہ انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر ونواہی تمام پر ایمان رکھیں۔

دوسرے یہ کہ استواء کے معنی محیط ہونے کے ہیں اور حاوی ہونے کے ہیں تو اب مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ عرش پر حاوی ہوا، اب آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ جب وہ عرش پر حاوی ہے تو جب اتنے بڑے عرش پر حاوی ہے پھر تو دنیا کی کیا حقیقت ہے۔

اشکالات انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام پر

سوال: جب حق جل مجدہ تمام جہاں کا بادشاہ ہے تو چاہیے کہ بادشاہ کا وزیر بھی اچھے اور اونچے خاندان کا ہو لیکن یہ عجیب بات ہوگئی کہ جب حق جل مجدہ نے اپنا وزیر بنایا تو گھٹیا خاندان والوں کو جس کے پاس نہ صحیح طریقے سے مکان ہے اور نہ کھانے پینے کا اچھی طرح سے کوئی نظام ہے تو پھر ایسے شخص کو اہم نبوت ورسالت کا کام کیسے سپرد کیا۔ ان مباحث سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وسلم ہیں) صاحب ہیں۔

جواب: او بھائی پنڈت جی آپ کو میں اس بات سے متنبہ نہیں کیا تھا کہ دنیا وآخرت کی جتنی بھی مخلوقات اور احکامات ہیں سب اللہ تعالیٰ کی مخلوقات ہیں۔ جس کو چاہے، جو چیز عطا کرے خواہ خاندان کے اعتبار سے گھٹیا ہو یا اس کے گھر میں فاقہ کشی ہو اس کی مثال یوں لیجئے کہ دنیا کے اندر بعض شخص ایسے ہیں جس کے بدن پر صحیح طریقے سے کپڑے نہیں ہوتے اسی طرح کھانے پینے کو ترستے ہیں لیکن کچھ عرصہ گذرنے کے بعد حق تعالیٰ فوراً اسے مال ودولت سے نوازتا ہے تو کیا یہ مال ودولت کسی مالدار ہی کو عطا کرنا چاہیے تھا۔ آپ خود انصاف کیجئے بہرحال اسی طرح اللہ تعالیٰ ہیں کہ جس کو چاہتے ہیں نبوت ورسالت سے نوازتے ہیں اور جسے چاہتے ہیں کچھ بھی نہیں دیتے خواہ کتنا ہی بڑا سے بڑا خاندان سے تعلق رکھنے والا ہو۔

سوال: جب محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) صاحب اللہ کے حبیب ہیں اور خدا تعالیٰ ہر جگہ حاضر وناظر ہیں تو پھر اپنے حبیب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے طائف والوں کے ذریعہ تکلیف کیوں دلائی حتی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لہولہان ہوگئے۔ بہرکیف اس قول کی بھی دو صورتیں ہیں یا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے حبیب ہیں اگر اللہ کے حبیب

ہیں اور اللہ محبوب ہے تو کیا کوئی محبوب اپنے حبیب کو پٹائی کھلا سکتا ہے ہر گز نہیں۔ اگر محمد ﷺ اللہ کے حبیب نہیں ہیں تو پھر محمد ﷺ پر کس نے احکام نازل کیا تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنے بھی احکامات اور کتب دین ہیں تمام کی تمام کو محمد ﷺ گڑھ کر لائے ہیں۔ (نعوذ باللہ)

جواب: او بھائی نادان یہ بات تو متحقق اور متعین ہے کہ حق جل مجدہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں لیکن اللہ کے رسول ﷺ کو جو پریشانیاں مذکورہ صورت میں لاحق ہوئی تھی وہ اس لیے کہ خداوند قدوس نے اپنے حبیب ﷺ کا امتحان لینا چاہتے تھے کہ میرا محبوب کیا ہے اور ہم سے کتنا محبت کرتا ہے چنانچہ امتحان میں نبی اکرم ﷺ اوّل پوزیشن سے کامیاب ہوئے جس کے نتیجے میں خداوند قدوس نے اپنے حبیب کو بشکل انعام معراج میں بلایا اور عزت و اکرام سے سرفراز کیا۔ اس کی مثال یوں بھی لے سکتے ہیں کہ دنیا کا بھی رواج و دستور ہے کہ معشوق اپنے عاشق کو طرح طرح کی پریشانیوں سے آزماتا ہے کہ دیکھوں میرا عاشق مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے تو جب دنیا کے اندر ایک معشوق اپنے عاشق کا امتحان لے سکتا ہے تو کیا خدا اپنے حبیب ﷺ کا امتحان نہیں لے سکتا ہے بہر حال طائف والوں کا برا معاملہ کرنا حق جل مجدہ کا امتحان لینا تھا۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں تو انبیاء کرام کو یعنی حضرت زکریاؑ اور حضرت یحییٰ وغیرہ کو یہودیوں کے ہاتھوں کیوں قتل کروایا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کسی چیز پر قادر نہیں ہے اگر قادر ہوتا تو اپنے بھیجے ہوئے انبیاء کرام کو یہودیوں کے ہاتھ قتل نہ ہونے دیتا۔

جواب: انسان کو ادنیٰ اختیار باعتبار دینوی حاصل ہے اسی ادنیٰ اختیار کی بناء پر یہود قاتل قرار پائے جیسا کہ صاحب بیضاویؒ نے رحمٰن اور رحیم کی تفسیر کے تحت ذکر کیا، ص:۵۔

سوال: عالم کے اندر کہیں بارش ہوتی ہے اور کہیں بارش نہیں ہوتی تو کسی جگہ بارش ہونا اور کسی جگہ نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ (نعوذ باللہ) خدا کے علاوہ متعدد معبود

ہیں حالاں کہ معاملہ ایسا نہیں ہے۔

جواب: یہ ہے کہ کہیں بارش ہونا اور کہیں نہ ہونا وہ اس لیے ہے کہ جہاں حق جل مجدہ بندوں کا فائدہ محسوس کرتے ہیں وہاں بارش برساتے ہیں اور جہاں بندوں کے لیے فائدہ نہ ہوتا ہے وہاں بارش نہیں برساتے ہیں۔

سوال: اسی طرح کوئی شخص شدید بیماری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور الٹا سانس چلنے کے باوجود نجات پالیتا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا متعدد ہیں۔

جواب: یہ دیا گیا ہے کہ جو شخص اشد بیماری میں مبتلا ہونے کے باوجود بیماری سے نجات پالیتے ہیں اور دنیا کے اندر باحیات رہتے ہیں یہ درحقیقت حق جل مجدہ کا کرشما ہے دوسری بات یہ ہے کہ ان مریضوں سے اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر کچھ اور نیک کام لینا چاہتے ہیں اس لیے اس کو بیماری سے نجات دیتے ہیں۔

حقانیت اسلام

مقالات عثمانی

بحوالہ: حضرت نانوتویؒ

اوّل حضرت نانوتویؒ نے خدا کی تعریف اور اپنے عجز و نیاز کے مضامین اور کلمۂ شہادت جو اکثر اہل اسلام کے خطبوں کے شروع میں ہوا کرتے ہیں بیان فرمایا اس کے بعد ایک تقریر فرمائی جس کا حاصل یہ ہے کہ مذہب کی بھلائی، برائی، حقانیت، بطلان، عقائد کی بھلائی، برائی، حقانیت، بطلان، پر موقوف ہے احکام کی بھلائی، برائی کو اس میں دخل نہیں، کیوں کہ بحیثیت حکومت حاکم کو ہر قسم کے احکام کا اختیار ہوتا ہے اگر ہر قسم کے احکام کا اختیار نہ ہوا کرے یعنی ہر قسم کے احکام اسی سے بمطابق رعیت و محکومین صادر نہ ہو سکیں تو وہ حاکم نہیں محکوم ہے برے احکام کی تخصیص بحیثیت عدل و انصاف و رحمت و فضل و متانت و حکومت وغیرہ اوصاف جمیلہ ہوئی ہے بنظر حکومت نہیں ہوتی اور ظاہر ہے کہ بناء معبودیت فقط حکومت پر ہے عبادت و اطاعت اور نیاز قلبی کو کہتے ہیں بشرطیکہ اس کے سامنے ہو جس کو اپنے اعتقاد میں ہر طرح سے مختار اور اوروں کو اس کے سامنے محض بے اختیار سمجھے سو ظاہر ہے کہ اسی کو حکومت کہتے ہیں۔ غرض منشاء معبودیت معبود حقیقی اس کی وہ حکومت عالیہ ہے جس کے سبب وہ احکم الحاکمین کہلایا اسی صورت میں اس کا تجسس کہ یہ حکم اچھا ہے یا برا ہے مقتضاء اخلاص عبادت نہیں گو اس کا کوئی حکم مخالف رحمت و حکمت وغیرہ اوصاف مشار الیہا نہ ہوا اگر تجسس ضروری ہے تو اس بات کا تجسس ضروری ہے کہ یہ حکم خدائے تعالیٰ کا حکم ہے کہ نہیں یعنی یہ بات دیکھنی چاہیے کہ جس مدعی نبوت و رسالت کے وسیلہ سے یہ حکم ہم تک پہنچا ہے اس میں اخلاق و افعال

پسندیدہ معجزات خارقہ پائے جاتے ہیں یا نہیں پھر اگر وقت ارشاد احکام ہم کو اس کی زیارت میسر آئی علاوہ بریں احکام کی کوئی انتہا نہیں ہر ہر حکم کی تحقیق کیجئے تو ایک زمانہ دراز چاہیے پندرہ منٹ کے عرصہ میں یہ بات متصور نہیں۔ ہاں اتنی بات ہے کیوں کہ اوّل تو عقیدہ ایک قسم کی خبر ہوتا ہے اگر صحیح عقیدہ ہے تو یوں کہو مطابق واقع ہے اور اگر غلط ہے تو یوں کہو ایک جھوٹی بات ہے بہر حال خدا کی حکومت اور اس کا احکم الحاکمین ہونا اور وہ باتیں جو حکومت کو لازم ہیں اگر مسلم ہوں تو اس کا معبود ہونا بھی مسلم ہوگا ورنہ معبود ہونا ہی مسلم نہ ہوگا جو بندوں کے ذمہ اطاعت لازم ہو پھر اس پر عقائد ضروریہ ہر مذہب میں دو چار ہی ہوتے ہیں ایسا لمبا چوڑا قصہ نہیں ہوتا جس کی تحقیق دشوار ہو مگر عقائد کی رو سے دیکھئے تو مذہب اسلام سارے مذہبوں سے عمدہ معلوم ہوتا ہی نہیں بلکہ حقیقتاً ہے۔ اہل اسلام کا پہلا عقیدہ جس پر بنائے اسلام ہے یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ﷺ جس کے معنی ہیں سواء اللہ تعالیٰ کے اور کوئی لائق عبادت نہیں اور حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔

اب مشرکین کے عقیدے کو ملاحظہ فرمایئے۔ بہر حال اوّل جملہ جن کا خلاصہ توحید ہے کسی ملت اور مذہب والوں کو اس سے انکار نہیں زیادہ تر منکر توحید مشرک ہوتے ہیں ان سب میں بڑھ کر تین فرقے ہیں ایک تو جاہلان عرب یعنی قبل بعثت محمد ﷺ جو لوگ عرب میں تھے دوسرے ہنود ملک ہند تیسرے عیسائی لوگ جاہلان عرب کی سنئے باوجود کثرت شرک و بت پرستی خالق زمین و آسمان ایک خدا ہی کو سمجھتے ہیں چنانچہ قرآن شریف میں ان کے اقوال و افعال کو فرماتے ہیں۔ ولئن سالتهم من خلق السموٰت والارض ليقولن الله جس کے معنی ہے کہ اگر تو ان سے پوچھے کہ کس نے پیدا کیا ہے آسمان اور زمین کو تو ضرور بالضرور کہیں گے کہ اللہ تعالیٰ اور ہنود کی کیفیت پوچھئے تو ان کو بھی ایسا ہی سمجھئے وہ گو بت پرست اور اوتاروں کو پوجنے والے ہیں۔ اب رہی بات نصرانی مشرک ذات ہے یعنی ذات کے مرتبہ میں تین خداؤں

کے قائل ہیں لیکن بایں ہمہ توحید کو انہوں نے بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا وہ کہتے ہیں کہ جیسے ہمارے نزدیک حقیقت میں تین خدا ہیں ایسے ہی وہ تینوں حقیقت میں بھی ایک ہی ہیں القصہ اس امر حال کو اختیار کیا کہ وحدت بھی حقیقی ہو اور جب توحید مسلم اور اصل ٹھہری تو پھر باتیں مخالف توحید ہوں گی وہ خود غلط ہوں گی یعنی شرک اور بت پرستی اور کثرت معبودان اپنے آپ غلط ہوں گی۔

اس تمہید کے بعد حق جل مجدہ کے وجود حقیقی پر دلائل ملاحظہ فرمائیے کیوں کہ عقل سلیم بھی اس بات پر شاہد ہے کہ معبود حقیقی ایک ہی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام عالم وجود میں شریک ہے اور ایک لفظ موجود ہے سب پر بول سکتے ہیں اور سب کے وجود کو وجود ہی کہتے ہیں کچھ اور نہیں کہتے غرض ایک چیز سب میں مشترک ہے پھر اس پر عالم کا یہ حال ہے کہ اکثر موجودات قدیم نہیں حادث ہیں ایک زمانہ میں موجود نہ تھے اور بعد وجود ایک زمانہ میں معدوم ہو جاتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیاء کا وجود ایسا ہے جیسے کہ گرم پانی کی حرارت اور زمین کی روشنی یعنی ایک زمانہ میں وہی ٹھنڈک اور اندھیرا ہے سو جیسے اس آمد وشد حرارت ونور سے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حرارت ونور آب وزمین کے خانہ زاد نہیں کسی سے مستعار ہیں جس کے یہ خانہ زاد ہیں اور اس پتے پر آخر آتش اور آفتاب کا سراغ نکل آتا ہے ایسا ہی بوجہ آمد وشد وجود اشیاء حادثہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وجود ان کا خانہ زاد نہیں کسی نے مستعار عنایت کیا ہے اس میں یہ وصف خانہ زاد ہی مستعار نہیں۔

اور جو موجودات ایسے ہیں کہ ہمیشہ سے ایک حال پر چلے آتے ہیں اور کسی نے آج تک ان کا زمانہ عدم نہیں دیکھا جیسے زمین آسمان آفتاب قمر کواکب تو گو بظاہر اس تقریر سے ان کے لیے کسی معطی وجود کا پتا نہیں لگتا پر غور سے دیکھئے تو وہاں بھی یہی بات عیاں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ باوجود اشتراک وجود ہر ایک کی حقیقت کو ہر کوئی جدا سمجھتا ہے یہ نہ ہو تو ایک دوسرے سے تمیز نہ کر سکتے اس لیے خواہ مخواہ یہ کہنا پڑیگا کہ وجود اور چیز

ہے اور اشیاء مذکورہ کی حقیقت اور چیز ہے اور ظاہر ہے کہ دو چیزوں کا جیسا اجتماع ممکن ہے ایسا ہی ان کا افتراق بھی ممکن ہے اور جدائی ممکن ہوئی تو پھر خانہ زاری کہاں لاچار ہوکر یہی کہنا پڑیگا کہ ان کا وجود بھی مستعار مگر چونکہ ہر مستعار ہے چیز کے لیے ایک ایسے دینے والے کی ضرورت ہے جس کے پاس کسی کی دی ہوئی نہ ہو بلکہ اصلی ہوگا جو خود بخود موصوف بالوجود یعنی وجود ہو وہی خدا ہے اور اسی کو بے نیاز مطلق کہنا چاہیے اس کو ان کی حاجت نہیں اور سب کو اس کی حاجت ہے اب وحدانیت کی دلیل لیجئے۔

ابھی ماقبل کی تقریر کے دوران یہ بیان کیا گیا تھا کہ حق جل مجدہ کو کسی شئ کی یا جاندار کی ضرورت نہیں مگر خداوند قدوس کا ہر اشیاء جاندار کی ضرورت ہے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا موجود سوائے ایک کے متصور نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ جب وجود کی وحدت مانی گئی چنانچہ اوپر معروض ہو چکا تو موجود اصل بھی یعنی جس کے حق میں وصف وجود خانہ زاد ہو ایک ہی ہوگا علاوہ بریں وجود سے زیادہ کوئی عام نہیں اس لیے اس بات کا اقرار ضروری ہے کہ وجود ایک امر غیر محدود ہے ورنہ محدود ہوتو اسکے اس پر ضرور ایک مرتبہ نکلے گا نسبت اسکو محدود کہیں اور وہ اس سے بھی زیادہ عام ہو مگر جو وجود غیر محدود ہوگا تو یہ معنی ہوں گے کہ تمام مواقع وجود کو محیط ہیں پھر اگر دوسرا بھی ایسا ہی ہوتو وہ کہا جائے یہ احتمال نہیں کہ دو ہوں پر دونوں مل کر ایسی طرح شدید ہو جائیں جیسے وہ چراغ کا نور مل کر زیادہ تر چمک کا باعث ہو جاتا ہے کیوں کہ موصوف اصلی سے زیادہ اور کوئی موصوف نہیں ہوسکتا نہ اس کے وصف سے زیادہ کسی کا وصف ہو سکے خاص کر وجود اصلی کیوں کر اس سے اوپر کوئی مرتبہ نہیں اسی وجہ سے وہ غیر محدود ہوا اور نہ محدود ہوتا آخر یہ بھی ایک حد ہے کہ اس سے زیادہ شدید ہوسکتا ہے بالجملہ بروئے دلیل عقلی بھی خدا کی واحدانیت ضروری التسلیم ہے۔ البرھان الثانی علی الواحدانیۃ۔ وحدانیت کے اس پر دوسری دلیل ملاحظہ کیجئے کہ ایک غیر مسلم عورت چرکھا کاٹ رہی تھی اور اس سے دھاگے نکل رہے تھے چنانچہ اسی دوران کچھ مسلم لوگ

تشریف فرما ہوئے وہ عورت بولنے لگی جناب میں ایمان لانا چاہتی ہوں لہٰذا وہ عورت باواز بلند کلمۂ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ پڑھ لیا اس کے بعد کچھ پنڈت لوگ آئے اور دریافت کیا کہ آخر تم کیسے اور کیوں ایمان لائی ہو حالاں کہ تمہارے اس معبود سے بہتر معبود میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں جو تمہارا خیر خواہ ہے۔ عورت نے جواب دیا کہ ارے یار جا جا..... اگر عالم کے اندر چند معبود ہوتے تو عالم درہم برہم نیست و نابود ہو جاتا جیسے کہ چرکھا ہے کہ اگر چرکھا کاتنے والا دو آدمی ہوں گے تو بالیقین چرکھا نیست و نابود ہو جائے گا اس کی مثال ایسی ہی سمجھو کہ اگر عالم کو چلانے والا دو آدمی ہوتا تو عالم درہم برہم نیست و نابود ہو جاتا بہر حال اس سے معلوم ہوا کہ عالم کو چلانے والا فقط حق جل مجدہ کی تنہا ذات ہے لہٰذا وہ پنڈت اپنا منہ کالا کر کے واپس ہوا۔ اسی طرح دنیا کے اندر جو بھی اشیاء ہوں خواہ جاندار ہو یا غیر جاندار جملہ اشیاء اس بات پر دال ہے کہ عالم کو چلانے والا فقط تن تنہا خداوند قدوس کی ذات ہے۔ البرھان الثالث علی الوحدانیۃ تیسری دلیل وحدانیت کے اوپر یہ لیں جیسا کہ حضرت مولانا محب اللہ بہاریؒ نے اپنی کتاب سلم العلوم کے اندر بیان فرمایا ہے کہ سبحانہ ما اعظم شانہ لا یحدو لا یتصور و لا نیتج و لا یتغیر تعالیٰ عن الجنس و الجھات ان تمام عبارت کے ذریعہ بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ تن تنہا ہے کیوں کہ ان کی ذات پاک صاف ہے اور بلند ہے اور حق جل مجدہ کی نہ خوبیاں بیان کی جاسکتی ہیں اور نہ ان کا تصور کیا جاسکتا ہے اور نہ وہ جنتا ہے اور نہ اس نے کسی کو جنا ہے اور وہ متغیر نہیں ہوتا یہی نہیں بلکہ وہ جہات ثلثہ سے مبرا اور منزہ ہیں اس عبارت کے اندر فقط ایک مثال کو ملاحظہ فرمایئے (لا ینتج) کہ اگر آپ اللہ تعالیٰ کے لیے لڑکا ہونا ثابت کریں گے تو وہ لڑکا یا ممکن ہوگا یا واجب ہوگا اگر ممکن ہے تو والد اور مولود میں مماثلت نہیں اور اگر واجب ہے تو مولود ہونا واجب کے منافی ہے جب یہ دونوں احتمال باطل ہیں تو اللہ تعالیٰ کے لیے والد یا مولود کا ثابت کرنا

باطل ہے اور جب ان کے لیے والد یا مولود نہ ہوگا تو وہ پاک ذات تن تنہا ہیں۔

مستحق عبادت فقط حق جل مجدہ ہیں: کیوں کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل جتنے بھی انبیاء کرام دنیا کے اندر تشریف لائے تمام کے تمام نے یہی دعوت دی کہ مستحق عبادت فقط اللہ تعالیٰ ہیں چنانچہ انبیاء سابقین کی تبلیغ کے دوران بہت سارے کفار ومشرکین نے دعوی کیا کہ میں معبود ہوں اور تم لوگ عابد ہو لہٰذا میری پرستش کرو مثال کے طور پر فرعون نے دعوی کیا اسی طرح نمرود نے دعویٰ کیا اور یہ تمام کے تمام ہلاک وبرباد ہو گئے اب بھلا بتایئے کہ جو معبود ہو تو کیا وہ ہلاک وبرباد ہو سکتا ہے ہرگز نہیں۔ اسی طرح اس زمانہ میں کفار نے یہ بھی کہا کہ ہمارا معبود لات وعزیٰ ہے چنانچہ وہ ہلاک وبرباد ہو گئے بہر حال یہ تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ خداوند قدوس کے علاوہ اور کوئی معبود نہیں جب ان کے علاوہ معبود نہیں تو ان کے علاوہ کوئی اور مستحق عبادت نہیں ہو سکتا۔ مستحق عبادت فقط حق جل مجدہ ہیں اس پر دوسری دلیل اور لیجئے کہ جب کارنامۂ وجود سب اس کی ذات سے متعلق ہوا تو اس کا دینا لینا اسی کا کام ہوگا جیسے آفتاب ہے زمین کو نور عطا کرتا ہے اور ہر کسی کی ذات وصفات کا وجود اسی کی عطا ہوگا اور ہر ایک کا لعدم اسی کی طرف سے ضبطی وجود سمجھا جائے گا اور ظاہر ہے کہ اطاعت کا باعث یہی نفع کی امید یا نقصان کا اندیشہ ہوا کرتا ہے نوکر اپنے آقا کی خدمت تنخواہ کی امید پر کرتا ہے اور رعیت اپنے حاکم کی اطاعت یا مظلوم ظالم کی تابعداری نقصان کے اندیشہ سے کیا کرتا ہے خداوند عالم میں جب یہ قدرتیں بدرجہ تمام موجود ہوں تو پھر اس کی اطاعت نہ کی جاوے تو اور کس کی جاوے اور سوائے اس کے اسی طرح اور کسی کی اطاعت کی جائے کیوں؟ کی جائے اور کون ہے جس کو نفع یا نقصان کا اصل میں اختیار ہو یہ اختیار تو جب ہو جب کہ وجود خانہ زاد ہو۔ ہاں اس کے نائبوں کی تابعداری یعنی ان لوگوں کی اطاعت جو اس کے حکم سناتے ہیں خود اسی کی اطاعت ہے وہ محض پیغام رساں ہیں اور سب احکام اسی کے ہیں۔

بہر حال خدا تعالیٰ محتاج و مجبور نہیں ہوسکتا وہ ہر طرح سے غنی اور بے نیاز ہے اس صورت میں سوا خدا کے اوروں کی عبادت جیسے ہنود و نصاریٰ کرتے ہیں بالکل خلاف عقل و نقل ہوگی اس کا مستحق سوائے خدا تعالیٰ کے اور کوئی نہیں ہوسکتا خاص کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور شری رام، شری کرشن، کو معبود کہنا یوں بھی عقل میں نہیں آسکتا کہ وہ کھانے پینے کے محتاج تھے پاخانہ پیشاب مرض اور موت سے مجبور تھے خداوند قدوس وہ ہوگا جو ہر طرح سے غنی اور بے نیاز ہو محتاج اور مجبور اور وہ بھی ایسی ایسی چیزوں کے سامنے جیسے پاخانہ پیشاب خدا تعالیٰ سے کسی بھی صورت میں نہیں ہوسکتا۔

اس بات پر ''پادری تولس صاحب'' اثناء تقریر کھڑے ہوکر مولوی صاحب سے فرمانے لگے آپ پاخانہ پیشاب کا لفظ نہ فرمائیں؟ مولوی صاحب نے کہا کیا آپ کو احتمال توہین ہوا اگر اس لفظ میں ایماں توہین ہوتا تو ہم ہرگز نہ کہتے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی توہین بھی ہمارے نزدیک مثل توہین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم موجب کفر و ارتداد ہے مولوی محمد طاہر عرف موتی میاں صاحب نے فرمایا آپ پاخانہ پیشاب نہ کہئے بلکہ بول براز کہئے۔

مولوی صاحب نے فرمایا بہتر یوں ہی سہی خیر مولوی صاحب نے فرمایا جو ایسا محتاج و مجبور ہو اس میں خدائی کجا..... نصاری کا یہ قول کہ خدا تعالیٰ تین ہوکر پھر ایک ہے ایسا ظاہر البطلان ہے کہ کوئی عاقل اس کو تجویز نہیں کرسکتا یہاں تک کہ خود نصاری بھی بروئے عقل اوروں ہی کے ہم سفر ہیں اگر کہتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ من جملہ اسرار خداوندی ہے ہماری عقول ناقصہ میں نہیں آسکتا مگر یہ جب معلوم ہوگیا کہ مستحق عبادت بجز خداوند وحدہ لاشریک لہ اور کوئی نہیں تو اور سنئے عبادت بمعنی اطاعت ہے اور اطاعت دوسروں کی رضا کے موافق کام کرنے کو کہتے ہیں پر دوسرے کی رضا عدم رضا کے اس کے بتلائے معلوم نہیں ہوسکتی اگر وہ خود کسی طرح اظہار نہ کرے تو پھر اس کے ظہور کی کوئی صورت نہیں ہم باوجودیکہ جسمانی ہیں کثافت ہماری ذات کے ساتھ ہے

ہماری مافی الضمیر اور ہماری رضا اور غیر رضا کی بات تو بے ہمارے اظہار کے ہو ہی نہیں سکتی خواہ سینے سے سینہ ملاویں خواہ دل کو چیر کر دکھلا دیں خداوند عالم جو لطیف اور خبیر ہے اس کے مافی الضمیر اور اس کے دل کی بات کو بے اس کے بتلائے کوئی کیا جانے غرض اطاعت خداوندی کے لیے اس کی ضرورت ہے کہ وہ خود اپنے احکام سے مطلع فرمائے عقل نارسا سے اس بات میں کام نہیں چل سکتا کیوں کہ اگر بالفرض ہزار باتوں میں سے کسی ایک بات کی بھلائی برائی ہزاروں میں سے کسی ایک دو کو معلوم بھی ہو جائے تو کیا ہوا اس کی خود مختاری سے یہ کیا بعید ہے کہ وہ اپنے احکام میں ان باتوں کا پابند نہ رہے اگر کسی بات کی تخصیص بوجہ کسی مجبوری کے ہے تو حاکم نہیں محکوم ہے اور محکوم کی خدائی اور معبودیت معلوم اور مجبور نہیں تو اختیار تغیر و تبدل احکام ضروری ہوگا جس سے حسن و قبیح کی پابندی نہ رہے گی بالجملہ دوبارہ احکام انتظار اظہار خداوندی ضرور ہے۔ مگر جب سلاطین دنیا اپنے احکام بذاتِ خود ہر مکان و دکان پر جا کر ہر کسی کو نہیں سناتے وہ خداوند احکم الحاکمین جس کی شوکت و حکومت کے سامنے سلاطین، دنیا کی حکومت اور شوکت کو کچھ نسبت ہی نہیں کیوں کہ ہر کسی سے کہتا پھرے گا جیسے بادشاہان دنیا اپنے مقربین سے اپنے احکام کہا کرتے ہیں اور وہ اوروں کو پہنچا دیا کرتے ہیں خداوند کریم بھی اپنے احکام کو اپنے مقربین کے ذریعہ اوروں کو پہنچایا ہے۔

حضرت نانوتویؒ کی تقریر وحدانیت پر

اوّلاً حضرت مولاناؒ نے پادری کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ جناب آپ کا دعویٰ آسمان سے بات کر رہا ہے اور آپ کا استدلال زمین سے بات کر رہا ہے ایسے بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپکا کوئی مذہب نہیں ہے کیوں کہ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ جیسے ہمارا خدا واحد حقیقی ہے ایسے ہی وہ باوجود احد حقیقی کے کثیر بھی حقیقی ہے یعنی وہ بھی حقیقی کے اعتبار سے تین ہے۔ سو اس اجتماع وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی کے لیے پادری صاحب نے دلیل بیان کی جس سے کثرت حقیقی اور وحدت اعتباری کا اجتماع ثابت ہوتا ہے نہ کہ اصل مطلب کا اثبات پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان فرمائی سب اس قسم کی ہیں توضیح کے لیے اوّل ایک مثال عرض کرتا ہوں سنئے اگر شکر ایک برتن میں ہو اور کیوڑہ ایک برتن میں اور پانی ایک برتن میں اور پھر ان تینوں اشیاء کو ایک کٹورے میں ڈال کر شربت بنائیں تو گو دیکھنے میں وہ تینوں فی الحال ایک چیز نظر آتی ہیں مگر عقل صائب ہنوز ان تینوں چیزوں کو بدستور کثیر مختلف الحقیقت سمجھتی ہے غرض ان تین چیزوں تین مزوں کے ملایا ہے اگر وہ تینوں شربت بن جانے کے وقت تین نہ رہتی تو وہ تین یا تین جو مطلوب تھیں یعنی شیرنی اور خوشبو اور تسکین حرارت یا یوں کہئے رفع تشنگی کا ہے تو حاصل ہوتی کچھ اور ہی بات ہو جاتی۔

لہٰذا جس طرح یہاں تین چیزیں ایک ظرف میں اکٹھی ہو گئی ہیں اور اس وجہ سے باوجود کثرت اور تثلیث حقیقی کے مشاہدہ کے وقت ایک نظر آتی ہیں اور آنکھ سے ہر ایک جزو کو جدا جدا تمیز نہیں کر سکتے ایسے ہی پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان فرمائی ان سب میں تین تین چیزیں ایک جا اکٹھی ہیں اور نظر سرسری اجمالی میں ہر جگہ وہ تینوں ایک نظر آتی ہیں اور باہم متمیز نہیں ہوتیں ورنہ حقیقت میں سب مثالوں میں

مضامین مختلفہ مجتمع ہیں عقل حقیقت کے نزدیک ہنوز بدستور ایک دوسرے سے متمیز ہے یعنی ہر ایک کے آثار ولوازم جدا جدا ہیں ہر ایک کے لیے سیدھی بات مطلوب ہیں خواہش نفسانی کا مثلاً کچھ اور کام اور قوت خیالیہ کا کچھ اور کام ہے اور اگر بعد اجتماع کثرت نہ رہتی وحدت ہو جاتی تو یہ تین مطلب کا ہے گو حاصل ہوتے اسی طرح اور مثالوں کو تصور کر لیں۔ بہر کیف طول عرض عمق تین مضمون ایک جا اکٹھے ہو گئے ہیں وراسی طرح جڑ اور شاخیں اور پتے تین جدا جدا باتیں ایک جا اکٹھی ہو گئی ہیں چنانچہ ظاہر ہے اہل فہم کو معلوم ہوگا کہ درخت کی مثال میں ہر ایک کی جدائی ظاہر ہے کہ آنکھوں سے معلوم ہوتی ہے۔ علاوہ بریں اگر یہی اتحاد اور وحدت ہے تو ایسا اتحاد اور حدث تو اور اعداد میں بھی پایا جاتا ہے تین ہی کی کیا خصوصیت ہے جو تثلیث کا تو اعتقاد ہے اور تربیع وتخمیس وغیرہ سے انکار پادری صاحب نے جتنی مثالیں بیان فرمائیں انہیں کو غور کیجئے تو تین سے زائد مضمون مجتمع ہیں ایک کا ہندسہ اگر لکھتے ہیں تو سوا طول وعرض وعمق موہوم کے اس میں سیاہی اور سیاہی کی چمک اور خوبصورتی وغیرہ بھی پائی جاتی ہے ایک جان میں کتنی صفات اور احوال ہوتے ہیں ایک پادری صاحب میں کس قدر اخلاق حمیدہ ہیں ایک خدائے تعالیٰ میں کتنی صفات کمال ہیں ایک درخت میں ہزاروں شاخیں ہزاروں پتے ہیں اور پھر ہر شاخ و برگ اور پھل وپھول میں کس قدر رگیں اور نکتیں ہیں علیٰ ہذا القیاس۔ یہ ایک خیمہ ہے اور اس میں کتنی چوبیں ہیں اور کتنے آدمی ہیں ایک کے ہندسہ میں یہ سب کچھ ہے اور پھر ایک کا ایک روح انسانی میں یہ سب کچھ ہے اور پھر ہر ایک ذات خداوندی میں غیر متناہی صفات کمالیہ ہیں اور پھر ایک کی ایک پادری صاحب میں یہ سب کچھ اور پھر ایک کے ایک درخت میں یہ سب کچھ ہے اور پھر ایک کا ایک اگر یہی اجتماع کثرت حقیقی اور وحدت ہے تو پادری صاحب نے تثلیث ہی پر کیوں قناعت فرمائی تربیع اور تخمیس بلکہ تسدیس وتسبیع وتثمین بلکہ تالیف وغیرہ کا اعتقاد بھی پادری صاحب کو ضرور تھا۔ پھر اس پر پادری

نے یہ کیسی الٹی بات کہی کہ توحید بے تثلیث کے نہیں ہوسکتی اگر کہنا تھا تو یہ کہتا کہ تثلیث بے توحید سمجھ میں ہیں آتی اور ممکن ہی نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ ثلثہ تین واحدوں کو کہتے ہیں تین واحدوں کے اکٹھے ہوجانے سے ثلثہ بن جاتا ہے یعنی تین واحد کے اجتماع سے تین کا عدد حاصل ہوتا ہے سو اس سے ظاہر ہے کہ تین کا سمجھنا اور تین کا وجود بے واحد ممکن نہیں اور ایک کا وجود ایک سمجھ لینا بے تین کے متصور ہے۔

اور ان سب باتوں کو قطع نظر کیجئے وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی کا ایک شے میں مجتمع ہونا محال ہے جیسے ایک وقت میں ایک شئ کا ہونا اور نہ ہونا کی عقل اور ایک وقت میں ایک جا پر دھوپ اور سایہ کا ہونا اور گرمی و سردی کا ہونا محال ہے کسی عاقل اسکو تجویز نہیں کرسکتی ایسے ہی وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی اجتماع کو کسی کی عقل تجویز نہیں کرسکتی علاوہ بریں جاہلوں کو ہر فن میں اس فن کو اہل کمال کا اتباع اور تقلید ضروری ہے اس نظر سے بھی اس اجتماع کے محال ہونے کو ماننا لازم تھا کیوں کہ ہر مسئلہ منجملہ مسائل معقول ہے سو تمام معقولیوں کا اس پر اتفاق ہے کہ اجتماع النقیضین اور اجتماع الضدین محال ہے پھر جب وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی دونوں باہم متضاد ہوں تو ان دونوں کا ایک پر اعتراض کیوں کر تسلیم کی جائے۔

حاصل تقریر تو ہو چکا لیکن بغرض توضیح راقم کی یہ گذارش ہے کہ اگر کوئی کم عقل بھی یہ تجویز بھی کرسکے کہ وحدت حقیقی اور کثرت حقیقی میں تضاد نہیں تو البتہ معتقدان تثلیث کو اہل عقل نہ سہی دیوانوں ہی کے سامنے منہ کرنے کی گنجائش ملتی مگر جب کوئی شخص بھی اس مضمون کو تجویز نہ کرسکے تو پھر خدا جانے کس بھروسہ اس مسئلہ کو اہل توحید کے سامنے پیش کیا کرتے ہیں۔ تمام جہاں کے مذاہب کو دیکھئے تو گویا کوئی مذہب کتنا ہی باطل کیوں نہ ہو پر اس میں بھی ایسا مسئلہ مخالف عقل نہ ہوگا جیسا کہ مسئلہ تثلیث مخالف عقل ہے مگر افسوس صد افسوس ایسی بات تو قبول کرلیں اور ایسے ایسے پوچ اعتراض کریں جن کے لیے اہل عقل کے نزدیک جواب کی حاجت ہی نہ ہو۔

شفقتِ خداوندی کی کوئی حد نہیں

بحوالہ: حجۃ اللہ البالغہ، مصنفہ: حضرت شاہ صاحبؒ

قرآن کریم کی مختلف جگہوں پر حق جل مجدہ نے اپنے ایمان والے بندوں کو دو چیزوں کے نقصان پر اطلاع دی ہے اور یہ حق تعالیٰ کی نہایت شفقت ہے کہ وہ اپنے بندوں کو ایسا چاہتے ہیں جیسے ماں باپ اولاد کو چاہتے ہیں بلکہ اس سے بھی زیادہ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ماں باپ کو بھی اپنے بچوں کیساتھ اتنی محبت نہیں ہوتی جتنی اللہ کو اپنے بندوں کے ساتھ ہے کیونکہ والدین کو اولاد کیساتھ جو کچھ محبت ہے وہ بھی خدا ہی کی دی ہوئی ہے اور جب وہ بھی خدا ہی کی دی ہوئی ہے تو اس سے سمجھ لیجئے کہ خود خدا تعالیٰ کے پاس کتنی محبت ہوگی کیوں کہ جو کوئی کسی شئ کو منتقسم کرتا ہے تو اسکے پاس وہ چیز دوسروں سے زیادہ ہوا کرتی ہے اور اگر وہ چیز صفت کمال ہو تو ایک درجہ میں انصاف بھی ہوگا اور دوسروں کی تو یہ حالت ہے کہ کسی چیز کے بانٹنے اور اور دینے دلانے سے ان کے پاس وہ چیز کم ہوجاتی ہے مگر خدا تعالیٰ کے یہاں کمی نہیں ہوتی اور کمی ہوسکتی ہے تو خدا تعالیٰ نے جو اتنے بندوں میں ماں باپ کو محبت دی ہیں اس سے خدا کے یہاں یہ صفت کی کچھ کمی نہیں رکھتا کیوں کہ اوّل تو صفت کمی کا احتمال نہیں دنیا میں بھی دیکھا جاتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کے اخلاق حمیدہ دوسرے پر زیادہ ہوتے ہیں مثلاً شاگرد ہیں استاذ کی صفت کا اثر پہنچتا ہے نیز دوسرے اخلاق حمیدہ بھی صحبت کے اثر سے اس میں پیدا ہوجاتے ہیں مگر اس سے استاذ کی صفت میں کمی نہیں ہوتی حالانکہ استاذ کی صفات حادث اور ممکن ہیں صفت حادثہ ممکنہ میں بھی دوسرے کے افادہ سے کمی نہیں آتی ہیں تو حق تعالیٰ کی صفات میں جو کہ قدیمہ اور واجبہ ہیں یہ احتمال کیوں کر ہوسکتا ہے دوسری بات یہ ہے کہ بیان کر چکا ہوں کہ

حق تعالیٰ کے یہاں ہر چیز کے خزانے بے انتہا اور غیر متناہی ہے بس اگر بفرض محال صفت میں افادہ سے کمی کا احتمال بھی ہوتا تو لامتناہی کی وجہ سے وہ احتمال مرتفع ہو جاتا ہے بہر حال خدا تعالیٰ کی محبت جتنی بندوں کے ساتھ تھی دوسروں کو اس میں سے کچھ حصہ دیتے اس میں کمی نہیں آتی اور جب ماں باپ کی محبت کا یہ حال ہے جو رات و دن مشاہدہ ہوتا رہتا ہے اور وہ خدا ہی کی دی ہوئی شئی ہے تو خود خدا تعالیٰ کو اپنے بندوں کے ساتھ کیسی محبت ہوگی اس کا تو اندازہ بھی نہیں ہو سکتا بہر حال اس محبت کا مقتضا یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو ہر قسم کے نفع و ضرر پر مطلع فرما دیا جو کام کی بات تھی وہ بھی بتا دی اور جو نقصان کی چیز تھی اس پر بھی مطلع فرما دیا اسی طریقے سے قرآن کریم کی دوسری آیت کے اندر دو چیزوں کا بیان ہے جو انسان کو پیاری تھیں اور ان میں انسان کا کچھ نقصان بھی ہے مگر نقصان کے ساتھ ان میں کچھ نفع بھی ہے اس لیے یہاں ایسا لفظ استعمال فرمایا ہے جو لغۃً نفع کے لیے بھی بولا جا سکتا ہے اور نقصان کے لیے بھی گو عرف میں اس کا استعمال ضرر میں زیادہ ہے پس بات تو یہ کہئے کہ اس جگہ دو محبوب چیزوں کے نفع و ضرر دونوں پر مطلع کیا ہے یا عرف کے اعتبار سے یوں کہئے کہ صرف انکے ضرر پر مطلع کیا ہے اور ایسی چیزوں کے نقصان پر مطلع کرنے کی ضرورت بھی زیادہ تھی جو محبوب کیلئے باعث تکلیف نہ ہو گرچہ کبھی مکروہات میں بھی انہماک ہو جاتا ہے مگر محبوب چیزوں میں انہماک زیادہ ہوتا ہے اسی لیے طبیعت بیمار چیزوں سے زیادہ روکتی ہے جو مرغوب نہیں اور ان میں ہر مریض کا نقصان ہے اب سمجھئے کہ وہ چیزیں کیا ہیں جن کا بیان اس آیت میں ہے سو وہ دو چیزیں ایک مال اور ایک اولاد اور ان میں دو باتیں ہیں ایک تو ان کا مرغوب و محبوب ہونا سو یہ بہت ظاہر ہے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں مرغوب ہیں انسان مال و اولاد کے واسطے کیا کیا کرتا ہے اور ان کے لیے کیسی کوشش کرتا ہے سب کو معلوم ہے جس سے ان دونوں کا محبوب ہونا ایسا ظاہر ہو گیا ہے کہ اس میں کچھ بھی خفا نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ دنیا میں جتنے محبوب مشاغل اور جس قدر دھندے ہیں۔ سب انہی دو کے واسطے ہیں بہر

حال وعظ میں حضرت حکیم الامتؒ نے بعض لوگوں کو دیکھا کہ وہ روشنی کا زیادہ اہتمام کرنے میں مشغول ہیں تو اس سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ (بقدر ضرورت روشنی کافی ہے زیادہ کی کیا ضرورت ہے اس میں علاوہ اسراف کی کھلا ہوا نقصان یہ ہے کہ سامعین کا دل وعظ میں پوری طرح نہیں لگتا ہر ایک کی نظر اس پر رہتی ہے کہ اب وہ چراغ گل ہوا اور وہ بھڑکا اسی لیے میں بھی علاوہ اسراف کے اتنا حرج تو کھلا ہوا ہے کہ کسی کا دل نماز میں اور قرآن میں نہیں رہتا خصوصاً ان لوگوں کا جو روشنی کے مہتمم ہوتے ہیں وہ تو بس یہی دیکھتے رہتے ہیں کہ اب فلاں فانوس بھڑک اٹھا اسے کم کرنا چاہیے۔ اب دوسرے گل ہو گیا اسے جلانا چاہیے اور جو چیز اصل مقصود ہیں یعنی قرآن سننے میں حارج ہو جس پر ختم قرآن موقوف ہے تو بتلایئے وہ قابل ترک ہے یا نہیں یقیناً یہ سب چیزیں قابل ترک ہیں مگر آج کل رسم پرستی کا سپر اتنا اثر غالب ہے کہ باوجود ان کے کھلے نقصانات کے پھر بھی ان کو کیا جاتا ہے اور جو شخص منع کرے اس سے خفا ہوتے ہیں، کہ اس سے اصل کام میں خرچ ہوتا ہے یعنی عقائد کا قصہ تو الگ رہا (لوگوں نے اس کو لازم اور ضروری سمجھ رکھا ہے چنانچہ بدوں مٹھائی کے ختم قرآن ان کے نزدیک معیوب ہو گیا ہے اور مباح کا اتنا التزام جو فساد عقیدہ کو مستلزم ہو جائے ناجائز و بدعت ہے مگر اس سے قطع نظر کر کے میں یہ کہتا ہوں کہ اس سے اصل کام میں بھی حرج ہوتا ہے چنانچہ بارہا دیکھا ہو گا کہ کسی مسجد میں نمازیوں کی تعداد کے موافق مٹھائی گئی مگر درمیان میں نمازی بڑھ گئے اور مٹھائی تھوڑی معلوم ہوئی تو اس وقت ایک دو آدمیوں کو بازار بھیجا جاتا ہے کہ ایک دو روپیوں کی مٹھائی اور لے آؤ پھر یہ آدمی تو جماعت سے بالکل محروم رہے اور جو جماعت میں شریک رہے وہ بھی ہر دو رکعت پر سلام پھیر کر دیکھتے رہتے ہیں کہ وہ آ گئے یا نہیں اگر ان کو کسی وجہ سے دیر ہو گئی تو اب امام صاحب سے کہا جاتا ہے کہ ذرا نماز ٹھہر ٹھہر کر سکون سے پڑھیں جلدی نہ کریں تا کہ ختم تک مٹھائی لانے والے پہنچ جاویں انکی نماز بھی ساری مٹھائی کے مراقبہ میں ختم ہوتی ہے آخر یہ حرکت خرافات میں سے ہے یا نہیں۔

اسلام میں توحید کامل

بحوالہ: اصلاح ظاہر، ص: ۲۵۸۔

ایک جاہل ہندو سنیاسی نے خود واقعہ مجھ سے بیان کرتا تھا کہ اس کو خدا تعالیٰ کا دیدار کا شوق غالب ہوا اور یکے بعد دیگرے ہندو پنڈتوں سے اس شوق کا ظاہر کیا کہ مجھے خدا تعالیٰ کو دکھلا دو سب نے اس سے انکار کیا مگر ایک مہنت نے وعدہ کیا کہ جب سورج چھپے گا تو دریا کے کنارے پر دکھلا دیں گے اس کو شوق غالب تھا وقت پر پہنچا مہنت نے یہ حرکت کی تھی کہ ایک کچھوے کو گرفت کر کے اس پر چراغ جلا کر رکھ دیا تھا جب آفتاب غروب ہو گیا تو اندھیرے میں دور سے روشنی نظر آئی مہنت نے کہا دیکھو وہ خدا ہے اس نے بھی دیکھا کہ روشنی تو نظر آتی ہے مگر اس کی یہ حالت ہے کہ اچھلتی ہوئی حرکت کر رہی ہے یہ تحقیق کے لیے روشنی کی طرف دوڑا مہنت نے کہا کہ ہائے ہائے وہاں مت جانا ورنہ جل جاؤ گے خدا کا دیدار دور ہی سے کرنا چاہیے اس نے کہا کہ اگر مر گیا تو کچھ پرواہ نہیں میں تو خدا کو پاس ہی سے دیکھوں گا اگر اس کی روشنی سے جل بھی گیا تو اس سے اچھا اور کیا عمل ہو سکتا ہے جب نزدیک پہنچا تو دیکھا کہ کچھوے پر چراغ رکھا ہوا ہے اب تو اس نے مہنت کو خوب لتاڑا کہ یہ کیا حرکت تھی وہ کہنے لگا کہ بھائی خدا کو بھی کوئی دکھلا سکتا ہے مگر میں نے تیری تسلی کے واسطے یہ ایک ترکیب کی تھی یہ تو ہندو کا واقعہ ہے ایک مسلمان صاحب کا واقعہ سنئے کہ اس نے ایک ڈاکٹر مشاغل کے سامنے وہ دعویٰ کیا کہ میں خدا تعالیٰ کو دکھلا سکتا ہوں (نعوذ باللہ) وہ بے چارا مشتاق دیدار آمادہ ہو گیا ہمارے قصبہ کے پاس ایک گاؤں ہے غوث گڑھ وہاں ایک مسجد کی عمارت بہت عالیشان ہے اب وہاں مسلمان کوئی بھی نہیں اور مسجد بھی ویران ہے مگر۔ ''از نقش و نگار در و دیوار شکستہ آثار بد بدست صنایود عجم را''

نقش و نگار اور شکستہ دیوار سے شاہان عجم کے آثار کا پتہ چلتا ہے اس مدعی نے

دیدار کے لیے اس مسجد کو تجویز کیا اور ان صاحب کو رات کے وقت لے گیا اور مسجد میں پہنچ کر اس نے کچھ وظیفہ بتلا دیا کہ آنکھیں بند کر کے پڑھتے رہنا اور جب میں ہو کروں اس وقت آنکھیں کھول دینا چنانچہ تھوری دیر میں آپ نے ہوں کی اور اس شخص نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو واقعی سارے مسجد میں روشنی ہی روشنی تھی مگر اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا کہ روشنی کے ساتھ اپنا سایہ بھی ہے پڑھے لکھے آدمی تھے ان کو فوراً خیال ہوا کہ نور حق کے ساتھ یہ سایہ کیسا۔

جب محبوب حقیقی کی تجلی قلب پر وارد ہوتی ہے سب چیزیں فنا ہو جاتی ہیں تجلی حق کے ہوتے ہوئے ظلمت کا نشان کہاں رہ سکتا ہے اس کے بعد اس نے پیچھے کو جو نظر کی تو دیکھا کہ وہ مدعی دیا سلائی ہاتھ میں لیے کھڑا ہے اس وقت دیا سلائی اوّل اوّل چلی تھی دیہات میں نہ پہنچی تھی اس کم بخت نے دیہات میں دیا سلائی سے کام لیا کہ لوگوں کے ایمان کو جلانے لگا یہ دیکھ کر اس شخص نے جوتا نکال کے خوب مرمت کی کہ نامعقول اب میں تجھے خدا دکھلا دیں۔ تو مخلوق کے ایمان کو برباد کرتا ہے ایسے ہی اس مہنت نے کیا تھا کہ کچھوے کے اشتیاق میں مسلمان ہو گیا میں نے اس لیے کہا کہ جب تو خدا تعالیٰ کے دیکھنے کے واسطے مسلمان ہوا ہے تو یہ بات تو اسلام سے بھی دنیا میں حاصل نہیں ہو سکتی ہاں ان شاء اللہ آخرت میں یہ دولت حاصل ہو گی تو جب تو دنیا میں خدا کو دیکھے گا نہیں تو مسلمان ہی کیسے رہے گا اس نے کہا مجھے اسلام میں ایک ایسی خوبی ثابت ہوئی ہے کہ چاہے دنیا میں خدا کا دیدار ہو یا نہ ہو مگر اسلام کو چھوڑوں گا نہیں اس کے بعد میں نے کہا وہ خوبی کیا ہے کہنے لگا کہ اسلام میں توحید بہت کامل ہے میں عرض کیا تجھے اسلام کی توحید کا کامل ہونا کس بات سے معلوم ہوا کہا اس طرح معلوم ہوا کہ جب کوئی دوسرے مذہب کا آدمی اسلام لاتا ہے تو مسلمان اسکو اسی وقت سے اپنے سے افضل جاننے لگتے ہیں اور اس کے ساتھ کھانے پینے لگتے ہیں تو یہ اتحاد اسلامی توحید ہی کا اثر ہے یہ بات کسی مذہب میں نہیں میں نے کہا شاباش تو نے خوب سمجھا۔

سیتا اگر ست رہتی تو راون کے ساتھ نہ جاتی

بحوالہ: شبد ستھیارتھ پرکاش، ص:۹۴۔

رام و لچھمن یہ دونوں بھائی ہیں اور رام کی بیوی سیتا یہ نہایت ہی پاک دامن عورت تھی لیکن اس پر راون عاشق ہوگیا۔ چنانچہ کچھ دنوں کے بعد رام کو حکم ہوتا ہے کہ آپ جنگل میں ۱۲ سال زندگی بسر کریں تو رام نے اپنی بیوی سیتا اپنے بھائی لچھمن کو ہمراہ لیا اور جنگل کی طرف چل پڑا اس کے دونوں بھائی نے چہار دیواری کے مثل زمین یہ خط کھینچا اور سیتا کو وصیت کی کہ آپ اس خط سے باہر کسی بھی صورت میں نہ نکلیں۔

چنانچہ رام اور لچھمن کی موجودگی میں راون نے ایک آدمی کو ہرن کی شکل میں سیتا کے مکان کے پاس بھیجا جب سیتا کی نظر ہرن پر پڑی تو سیتا نے رام، اور لچھمن سے کہا اس کا آپ لوگ شکار کرین بہتر ہے۔ تو دونوں بھائی مذکورہ وصیت کر کے گھر سے باہر نکل پڑے۔ (یعنی آپ اس خط سے آگے نہ بڑھیں گی) چنانچہ اسی دوران راون سیتا کے پاس فقیر بن کر گھر آتا ہے اور آواز لگایا کہ کوئی ہمیں بھیک دے دے۔ اس آواز کو پورا کرنے کے لیے سیتا نے بطور ثواب کے کچھ اسباب لے کر نکلی کہ اس فقیر کو دے دیں لہٰذا سیتا نے اس فقیر کی طرف اس اسباب کو بڑھا تو فقیر راون نے کہا کہ جب تک آپ اس ''خط'' سے آگے نہ بڑھیں گی اس وقت تک ہم آپ کا بھیک نہ لیں گے چنانچہ بھیک نہ لینے کی بناء پر سیتا خط کے احاطے سے آگے بڑھ گئی جب سیتا آگے بڑھی تو فوراً راون سیتا کو گھوڑے پر چڑھایا اور لے کر بھاگ گیا۔ جب رام اور لچھمن گھر واپس آئے تو دیکھا کہ سیتا گھر میں موجود نہیں لہٰذا دونوں بھائی سیتا کی تلاش میں مشغول ہو گئے حتی کہ پتہ چل گیا کہ راون لے کر بھاگا ہے۔

بہر حال یہ واقع بہت طویل ہے میں طوالت کو ترک کرتے ہوئے اس بات کو

ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ ہندو مذہب قطعاً صحیح اور قابل قبول نہیں خود ایک پنڈت نے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ اگر سیتا ست ہوتی تو راون کے ساتھ نہ جاتی راون کے ساتھ جانا اس بات پر دال ہے کہ سیتا ست نہیں۔ کیوں کہ راون کے ساتھ کئی کئی سال گذاری ہے یہ یقیناً راون نے اس کے ساتھ بدفعلی کی ہوگی اس کی مثال یوں لیجئے کہ جس پر کسی مذہب کا دارومدار ہو اور وہ خود مذہب کو ترک کر کے کسی اور مذہب کو اختیار کر لے تو اس کو مرتد کہا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے لہٰذا جس پر ہندومت کا دار و مدار تھا وہ خود اس مذہب کو پسند نہ کیا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہب صحیح نہیں۔

عقیدۂ آریہ

اس کا عقیدہ ہے کہ دیگر معبود کے علاوہ تین معبود اصل ہیں اور ان تینوں کے اسماء یہ ہیں، (۱) برہما (۲) وشنو (۳) شیو۔ اور ان تینوں کے کام بھی الگ الگ ہیں کیوں کہ برہما، یہ ساری مخلوق کو پالتا ہے کسی قسم کی کسی پر پریشانی لاحق ہونے نہیں دیتا ہے اسی طرح وشنو، ہے یہ مخلوق کی روح قبض کرتا ہے یعنی جب کسی مخلوق کی زندگی ختم ہوجاتی ہے تو اسکو متعینہ وقت کے بعد روح قبض کرلیتا ہے اس کے بعد تیسرا شیو ہے مخلوقات کو پیدا کرنے والا ہے یعنی جب جب مخلوقات کی ضرورت پڑتی ہے تو پیدا کرتا ہے یہ تینوں معبود ہیں اپنے اپنے امور کو انجام دیتے ہیں اس کے علاوہ اور معبود ہیں جو طرح طرح کے امور انجام دیتے ہیں۔ (وید)

(حدیث : خیر القرون قرنی ثم الذین یلونهم ثم الذین یلونهم الخ)

مذکورہ حدیث کی طرح ان لوگوں کا بھی عقیدہ ہے کہ جب عالم کو پیدا کیا گیا تھا تو اس وقت کا زمانہ نہایت ہی خیر خواہی اور قابل مدح تھا اور کسی قسم کی برائی نہ تھی اور خرافات نہ تھے اور لوگ اپنی زندگی انتہا ہی خوشحالی کے ساتھ گذارا کرتے تھے کسی کو شکوہ وشکایت کا موقع نہ تھا تو اس زمانے کا نام 'ست یگ (सतयुग)' تھا اسکے بعد دوسرا زمانہ ہے جس کے اندر مذکورہ خیر خواہی کم تھی اور کچھ کچھ برائی کی بو پائی جارہی تھی تو اس زمانہ کا نام پریک تھا اس کے بعد آیا تیسرا زمانہ جس کے اندر مذکورہ خیر و برکت اور بھی کم ہوگئی اور کچھ کچھ برائی پائی جانے لگی اس زمانے کا نام برائی کی کثرت اور خیر خواہی کی قلت اور ہر ہر گھر میں برائی پائی جارہی اس زمانے کا نام ہے ''(कलयुग) کل یوگ'' رکھا جاتا ہے۔

☆☆☆

رمائن سے بھی ہم اہل ایمان کی تائید ہوتی ہے

رامائن یہ کہتا ہے کہ 'ایشور'' ایک ہے، دھرم ایک ہے (مناۃ دھرم) اسی طرح گرنتھ بھی ایک ہے ایشور سے مراد ہے خدا یعنی پورے عالم کو پیدا کرنے والا اسی طرح چلانے والا ایک ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں اس کے بعد رمائن نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ دھرم ایک ہے یعنی انسان فقط اللہ اور رسول پر ایمان رکھیں اس کے علاوہ کسی پر بھی ایمان نہ رکھا جائے۔ اور آگے کہا گیا کہ گرنتھ بھی ایک ہے گرنتھ سے مراد کتاب الٰہی ہے (قرآن شریف) جیسا کہ آگے رمائن کے اندر عبارت مذکور ہے ''ایشور وانی ویووانی'' کہ کلام الٰہی فقط ایک ہے۔

وید چار ہیں۔ رگ وید۔ اطہر وید، سام وید، یجر وید۔

اور ہندو لوگ جو عبادت کرتے ہیں خاص کر وید ہی کو لے کر عبادت کرتے ہیں اور وید کے اندر حقیقت احمدی کا بھی ذکر ہے جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ذکر وید کے اندر تقریباً ۳۱ رجگہ ہوا ہے اسی طرح سنسکرت کے اندر بھی تقریباً ۷۵ رجگہ ذکر آیا ہے کہ احمد نام کا شخص ہے جو ایک اہم مذہب پر قائم ودائم ہیں اور وہ مذہب سب سے عمدہ مذہب ہے یعنی یہ کہ ایک عبارت ہے ''نارا شنس'' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ احمد ﷺ اللہ کا ایک اہم پیغمبر ہیں جو لوگوں کو ہدایت کا راستہ دکھلاتے ہیں۔ اسی طرح وید کے اندر ایک عبارت اور مذکور ہے جو حق جل مجدہ کی وحدانیت پر دلالت کرتی اور یہ عبارت کئی جگہ موجود ہے کہ پورے عالم کا خالق ومالک فقط ایک اللہ ہی ہے جس کی نہ کوئی مثیل ہے اور نہ کوئی نظیر ہے بہر حال وید کی عبارت یہ ہے کہ (کیچن) اس کے لفظی معنی آتے ہیں کہ جس کی کوئی نظیر ومثیل نہ ہو اور یہ بات دنیا کے تمام لوگوں کو کا لشمس علی نصف

النہار کی طرح معلوم ہے کہ فقط حق جل مجدہ کی نہ کوئی نظیر ہے اور نہ کوئی مثیل۔

اسی طرح اس وید سے ہمارے قرآن پاک کی کئی کئی جگہ تائید آئی ہے ایک تورگ وید کی عبارت ''گرنت'' کے ذریعہ جو ماقبل میں مذکور ہے دوسری عبارت ''مشال'' کے ذریعہ اور مشال کے معنی آتے ہیں ایک قسم کے روشن کے اور اس کا ذکر قرآن میں مذکور ہے وہ ''سراجا منیرا'' اسی طرح وید کے اندر گوشت کھانے کا بھی ذکر ہے خود وید نے ذکر کیا ہے کہ زمانے کے شروع میں ہر ایک چیز کا گوشت کھانا جائز تھا جیسا کہ رام اور لچھمن نے ہرن کا شکار کیا تھا۔ لیکن جب ہندوؤں کا نیا دور آیا تو جانوروں کا گوشت کھانا بند کر دیا گیا۔ یہ جدید پنڈتوں کا خود ساختہ عمل ہے۔ ''اندہن تمائیرے ویشتتی تتو بھیاؤتے تتو سمجھوتی مپاستے'' جو آدمی ہوا پانی مٹی وغیرہ کے عبادت کرے گا وہ دوزخ کے تاریک حصے میں پہنچے گا اور آگے عبارت مذکور ہے منڈا مانوشی تنو ماشرتم پرمبھاؤ جنتو مم بھوت مہیشورم (گیتا) میرے خیالات کو نہ جاننے والے مرکھ لوگ مجھ کو جسم والا سمجھنے لگے ہیں حالاں کہ یہ ان کی نہایت ہی بیوقوفی ہے کیوں کہ میرے پاس جسم نہیں۔

بہر حال ان تمام مباحث سے معلوم ہوا کہ ہمارا مذہب یقیناً قابل تسلیم اور برحق ہے اور پنڈتوں کا مذہب قابل تردید اور ناحق ہے۔ نیز ان پنڈتوں نے اپنی عصبیت کی بناء پر مٹی پتھر، گھاس، بھوس، سانپ، بچھو، کو پوجتے ہیں۔

☆☆☆

اشکالات وجوابات

سوال: کیا کوئی آدمی اپنی بیوی کو بہن کہہ سکتا ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو بہن کہا ہے؟۔

جواب: کلہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بہن کہا تھا تو وہ دینی نسبت سے کہا تھا (بقولہ تعالیٰ انما المومنون اخوۃ الخ) نہ نسبی اعتبار سے جسے آج ہم سب یہ کہتے ہیں کہ سارے انسان بھائی اور ساری عورتیں بہنیں ہیں۔

سوال: یہ بات قرآن وحدیث کے اندر کثرت سے وارد ہوتی ہے کہ حضرت لوطؑ کی بیوی منافقہ کافرہ تھی یہی نہیں بلکہ لوطؑ کے خلاف اپنی قوم کو اکساتی تھی اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کافرہ سے نکاح کرنا جائز نہیں۔

جواب: آپ کے سوال ہی میں اس اعتراض کا جواب موجود ہے کیوں کہ جب آپ نے یہ خود اقرار کرلیا کہ منافقہ تھی تو پھر اعتراض کس بات کی اس لیے کہ ظاہر میں تو وہ مومنہ تھی جب ظاہر میں اس کے اندر ایمان تھا تو نکاح درست ہے اس لیے کہ شریعت کا فتویٰ ظاہر پر ہے اور باطن کا علم صرف خدا کو ہے تو نکاح درست ہے اور دوسری بات تو یہ کہ یہ نکاح قبل از نبوت ہوا اور ممکن ہے کہ بعد نبوت فسخ کا جواز ان کے دین میں موجود نہ ہو اور یہ بھی کیا عجب ہے کہ انبیاء سابقین کے دین ومذہب میں کافرہ عورت سے نکاح درست رہا ہو اور دین محمدی میں ممنوع ہو۔

سوال: جس طرح تم یہ کہتے ہو کہ ہم خانہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں تا کہ حد درجہ کی تعظیم ہو تو ہم لوگ بھی اس لیے مورتی رکھ کر پوجا کرتے ہیں تا کہ بھگوان کی تعظیم ہو۔ حالاں کہ تم سب سے زیادہ بت پرستی میں مبتلا ہو کیوں کہ اگر تم خانہ کعبہ

کی طرف رخ کر کے نماز نہیں پڑھو گے تو تمہاری عبادت قابل قبول نہ ہوگی۔ اور اگر ہم بغیر مورتی کے بھی پوجا کریں گے تو بھی میری عبادت میرے بھگوان کے یہاں قابل قبول ہے۔

جواب: پنڈت جی؟ اگر آپ اس مورتی کی عبادت اس لیے کرتے ہیں تا کہ حد درجہ کی تعظیم ہو تو پوجا کرنے کے بعد مورتیوں کو دریاؤں اور ندیوں میں کیوں پھینک دیتے ہیں۔ بخلاف میرے۔ خانہ کعبہ کہ ہم لوگ ازل سے اب تک اسی کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے ہیں۔ اور اس کی رخ کے علاوہ دوسری طرف اس لیے نماز ادا نہیں کرتے ہیں تا کہ لوگوں کے درمیان دشواری پیدا نہ ہو مزید حق جل مجدہ نے اسی کی طرف رخ کرنے کی اجازت دی۔ اور آپ کو مورتی پوجنے کی کس نے اجازت دی۔ فہو باطل۔

سوال: تمہارا یہ بھی کہنا ہے کہ حضور ہر چیز سے افضل ہیں حتی کہ خانہ کعبہ و عرش و کرسی تو پھر تم حضور کی طرف رخ کر کے نماز کیوں نہ پڑھتے ہو۔

جواب: ہم یہ بالکل درست کہتے ہیں کہ ہمارے نبی سب سے افضل ہیں ہمارے نبی کا مرتبہ ہر ایک شئ سے افضل ہے لیکن نبی سے بڑھ کر بھی خدا کا مقام ہے تو ہم اسی خدا کی عبادت کرتے ہیں اور در حقیقت ہم اس کی طرف اپنے دل کا رخ کرتے ہیں نماز میں کعبہ کی طرف رخ کرنے سے یہ مقصد نہیں ہے کہ اس کی عبادت کرتے ہیں بلکہ اس میں سب سے افضل و بالاتر اللہ رب العزت کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں اور اگر کسی نبی یا رسول یا اپنے جناب محمد رسول ﷺ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہیں تو کتنے ہی لوگ ایسے گذرے ہیں اس دنیا میں کہ ان کی نماز کبھی درست نہ ہوتی اس لیے کہ انہیں کیا معلوم ہے کہ اس وقت ہمارے نبی کہاں موجود ہیں اس لیے کہ کبھی جنگ میں تشریف لے جاتے تھے اور کبھی مدینہ میں کسی اور غرض سے جاتے تھے کبھی بتقاضہ بشری کسی طرف جایا کرتے تھے تو جو لوگ پاس میں موجود ہوتے ان کی نماز تو

ہو جاتی اور جو موجود نہ ہوتے ان کی نماز کبھی بھی نہ ہوتی۔اور یہ بات بھی مسلم تھی کہ نبی ﷺ کو ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا ہے تو آپ کی رحلت فرمانے کے بعد امت کس طرف رخ کر کے نماز ادا کرتے اس صورت میں حاضر و غائب کسی کی بھی نماز نہیں ہوتی نیز عاجز آ کر قبر پرستی شروع ہو جاتی جیسا کہ تمہارے دھرم میں ہے اور اس امت کا شیرازہ بکھر جاتا حالاں کہ ہمارا امتیاز ہی دوسری قوموں پر یہی ہے کہ ہم خدا کے علاوہ کسی کو سجدہ نہ کریں اور نہ ہی قبروں کی پوجا کریں۔ نیز اسی طرح اگر ہم نبی کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو شیطان دل میں یہ خیال پیدا کرتا اور ضرور پیدا ہوتا کہ یہ خدا کے قائم مقام ہے ان سے حاجتوں کو کہو مرادیں مانگو۔ اسی طرح سے ہم خدا کو بھول جاتے اور تمہاری طرح ہم بھی کبھی کسی کو خدا مانتے اور کبھی کسی کو۔ بعد ہمارا یہ سجدہ خانہ کعبہ کی طرف کرنا کسی افضل و غیر افضل کی بنا پر نہیں ہے بلکہ حکم خداوندی پر موقوف ہے اگر وہ کسی درخت کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے کو کہتے تو ہم اسی طرف رخ کر لیتے وہی ہمارے لیے افضل ہوں گی۔

سوال: اگر تم یہ کہتے ہو کہ آپ کا کرپا کرم یعنی بال چھیلانا کہ جب کوئی رشتہ دار مر جاتے ہیں غلط ہے تو میں بھی یہ کہتا ہوں کہ تم بھی تو کسی کے نام پر روزہ رکھتے ہو اور تیجا دسواں بیسواں کراتے ہو۔اور اور بغداد، اجمیر، چادر چڑھانے جاتے ہو۔آخر ایسا کیوں؟

جواب: پنڈت جی آپ کا یہ اعتراض غلط ہے۔اعتراض میں آپ نے یہ کہا کہ کسی کے نام پر روزہ رکھتے ہو تیجا چالیسواں کرتے ہو اور اجمیر چادر چڑھانے جاتے ہو۔

یہ اعتراض بھی محض بے علمی و نافہمی و کم فہمی پر مبنی ہے اگر آپ کو ہمارے دین کا مطالعہ ہوتا تو آپ ہرگز یہ سب اشکال نہ کرتے کیوں کہ ہمارے دھرم میں روزہ صرف اللہ کے لیے رکھا جاتا ہیں نہ کہ کسی انسان کے نام پر اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ بھی اس دھرم سے نکل کر تمہارے دھرم میں داخل ہو جاتا ہے۔

یہ تیجہ چالیسواں بھی یہ سب ہمارے دھرم میں نہیں ہیں اگر کسی نے کہیں سے

سیکھا ہے تو تمہارے ہی دھرم میں سے آئی ہے اور تمہارا دھرم بالکل غلط ہے لہٰذا یہ بھی غلط ہے لہٰذا اسلام کی خوبی اور تمہارے دھرم کی کجی ثابت ہوگئی۔

سوال: ہمارے پنڈت شری لال برہما نے ۱۰۰ رشادیاں اس لیے کی تا کہ آدمی کی زیادتی ہو کیونکہ اس زمانے میں آدمی کی بہت ہی اقلیت تھی۔ اور تمہارے رسول ﷺ نے گیارہ گیارہ شادیاں کیوں کی حالاں کہ اس زمانے میں آدمی کی کثرت تھی۔

جواب: اس کا جواب تمہاری کھوپڑی میں خود آجاتا اگر تم غور کرتے اس لیے کہ تم نے اپنے علم میں (۱۰۰) سو شادیاں کی علت قلت انسان کو جانا اور مانا ہے تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ اسی طرح سے جواب دیں اب تم خود ہی غور کر سکتے ہو کہ برہما کے زمانے میں قلت تھی تو ۱۰۰ رشادیاں کی مگر جب حضور ﷺ کا زمانہ آیا تو انہوں نے صرف گیارہ پر اکتفاء کرلیا اسکو تو ہم بھی یہی کہیں گے کہ نبی کے زمانے میں ذرا تعداد کچھ زیادہ ہوگئی مگر ابھی بھی کم ہی تھی تو اتنی کمی تھی کہ صرف گیارہ سے کام پورا ہوسکتا تھا لہٰذا گیارہ پر اکتفا کرلیا۔ یہ تو تمہاری عقل کے مطابق جواب ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے ہمارے نبی ﷺ بہت شفیق و مہربان تھے ان کا کام مصلحت سے خالی نہیں ہر ہر نکاح میں انسانوں کا بہت بہت فائدہ چھپا ہوا تھا بیوہ سے عقد اس لیے کر کے دکھاتے تھے کہ بعد کے لوگ بیوہ سے نکاح کرنے میں عار محسوس نہ کریں اسی طرح خود لمبی عمر ہونے کے باوجود کنواری سے بھی نکاح کیا تا کہ لوگ یہ بھی سمجھ لیں کہ اس عمر میں ایسی لڑکی سے نکاح بھی درست ہے نیز حضرت زینبؓ سے نکاح کیا تا کہ لوگ اس عقد نکاح کو بھی جائز سمجھ لیں۔

سوال: امہات المومنین کو امہات المومنین کیوں کہتے ہیں اگر تم امہات المومنین کہتے ہو تو حضرت علیؓ کی بھی مائیں ہو جائیں گے اور ان کی لڑکی بہن ہو جائے گی تو پھر ان پر پردہ کرنے کا حکم کیوں نازل کیا گیا کیوں کہ ماں سے پردہ نہیں کیا جاتا۔

جواب: مسئلہ بالکل واضح ہے کہ ازواج رسول ﷺ کو امہات کہنا اور ماننا یہ ازراہ

ظاہر و حقیقت نہیں ہے بلکہ یہ رشتہ تو روحانی رشتہ ہے اور حرمت نکاح تو حقیقت و ظاہر کی وجہ سے ہے نہ کہ روحانی تعلق کی وجہ سے۔

یہی وجہ ہے کہ ان سے پردہ کا بھی حکم کر دیا گیا ہے کہ یہ حقیقی رشتہ ماں و اولاد کا نہیں ہے مگر یہ تو محض توقیر و تعظیم کی بنا پر ثابت کیا گیا لہٰذا ان کا رشتہ خونی نہ ہونے کی بنا پر حضرت علیؓ فاطمہؓ کے بھائی نہیں ہو سکتے اور نکاح درست ہے اور پردہ کرنا واجب ولازم ہے نیز نبی ﷺ کو باپ کا درجہ کیوں دیا گیا اس کا جواب یہ ہے کہ باپ شفیق ہوا کرتا ہے اور نبی ﷺ بھی باپ سے زیادہ شفیق امت کے لیے ہیں اور ان سے زیادہ شفیق تو کوئی ہو ہی نہیں سکتا اسی غایت درجہ کی شفقت کی وجہ سے ان کو باپ کا درجہ دیا گیا ہے۔ لہٰذا تمہارا اعتراض حقیقت کو لے کر ہے اور ہم حقیقت کو اس جگہ مانتے نہیں تو اس قاعدے سے آپ کا اعتراض یہاں واقع نہیں ہوگا۔

سوال: تم کہتے ہو کہ انبیاء کو معجزہ دیا گیا ہے میں کہتا ہوں کہ یہ جادوگر ہے کیوں کہ وہ جادو اب بھی موجود ہے تو پھر وہ انبیاء کہاں رہے بلکہ وہ (نعوذ باللہ) جھوٹے ہیں۔

جواب: مذکورہ شبہ کا جواب تو بالکل عام فہم ہے وہ یہ کہ اگر آپ کے پاس کچھ عقل دانش ہوتی تو غور کر لیتے کہ جادو اور معجزہ میں فرق کیا ہے۔ اگر آپ یہ فرق جانتے تو شبہ پیدا نہ ہوتا فرق۔ جادو اور معجزہ میں یہ ہے کہ جادو کا اثر آسمان کے نیچے صرف انہیں چیزوں میں ہوتا ہے جن چیزوں میں انسان تصرف اپنے اختیار سے کرتا ہے اور معجزہ اس کرامت مخصوصہ کو کہتے ہیں جو اس زمین کے نظام سے بلند و بالا ہو کر چاند و سورج تک سرایت کر جاتا ہے جہاں کسی جادوگر کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔ نیز معجزہ جب جادوگروں کے مقابلہ میں آتا ہے تو جادو ہباء منثورا ہو جاتا ہے اور معجزہ غالب ہو جاتا ہے۔ نیز معجزہ دکھلانا کسی نبی کے اختیار میں نہیں ہے کہ جب چاہے دکھا دے بخلاف جادو کے کہ وہ جادوگر کے اختیار میں ہوتا ہے جب چاہے دکھا دے۔ ہر ایک کی مثال ہی سامنے میں ہے جیسا کہ شق القمر کا مسئلہ جادو وہاں تک نہیں پہنچ سکتا۔ نیز

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ ہوا تو جادوگروں کا جادو مغلوب ہوگیا اور معجزہ غالب آیا نیز اگر معجزہ نبی کے قبضہ میں ہوتا تو حق کی فرمائش پر فوراً پیش کردیا جاتا جبکہ ہر نئے معجزہ کے سوال پر یہی جواب دیا کہ یہ کام خدا کا ہے اور اگر کبھی دکھانا ہوا تو خدا سے دعا کی نہ کہ اپنے اختیار سے دکھایا۔ بہر حال یہی تمام امتیازات جادو اور معجزات میں ہے۔

سوال: الانسان حریص فی مامُنع عنہٗ ۔ کہ انسان حریص ہر ان چیزوں سے جس سے اس کو روکا جائے لہٰذا عورتوں کے مسئلے میں پردے کا حکم نافذ کر کے انسان کو اس کا حریص بنایا جارہا ہے اب بھلا بتایئے کہ یہ اللہ کا کلام کیسے ہوسکتا ہے۔

جواب: جناب معترض صاحب ہمیں تو آپ سے جواب پر جس درجہ تعجب ہے وہ قابل بیان اس طرح کہ جب آپ کو کچھ پتہ نہیں ہے کہ حدیث کیا ہے قرآن کیا ہے اقوال بزرگان کیا ہیں تو آپ کو لب کشائی کرنے کا کیا حق ہوتا ہے اعتراض کرنے کے لیے تو کم از کم کچھ علم ہونا ضروری ہے جب کہ آپ بالکل بے بہرہ ہیں علم سے۔ آپ نے الانسان حریصٌ فی ما منع عنہٗ کو قرآن ثابت کیا ہے یہ تو ہمارے قرآن میں کہیں ہے ہی نہیں لہٰذا اس کو لے کر اعتراض کرنا بالکل نا قابل قبول ہے۔ دوسرے یہ کہ جو عبارت مذکور ہے یہ تو تجربات کی بنا پر لوگوں نے کہہ دیا ہے اور تجربات کا ہمارے دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نیز اگر ہم اس تجربات کو اگر تسلیم کرلیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے دین کی بنیاد جو ہے وہ خلوص پر ہے نہ کہ نفس پرستی پر اور اسلام میں تو نفس پرستی کے لیے ایمان لانا بھی نا قابل قبول ہے۔ کما قال تعالیٰ قالت الاعراب آمنّا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔

اگر انسان منع کی ہوئی چیزوں کا حریص ہے اس اعتبار سے ان کو یہ حرص ہوگا کہ ہم پردہ نہ کریں تو یہ بات ذہن نشیں کر لیجئے کہ جو منع شدہ اشیاء کا حرص ہے اور وہ ثواب محض نفسانی ہو کر رہ گیا نہ کہ ضرورت زندگی جب یہ نفسانی ہوگیا تو اب اس نفس

کی مخالفت میں یعنی پردہ کرنے میں عورتوں کا مرتبہ خدا تعالیٰ کے یہاں اور بھی بلند ہو جائے گا اوزان کی نیکیوں میں اضافہ ہو جائے گا اور ایمان مضبوط ہوگا جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہمارے دین میں خلوص مطلوب ہے تو اب اس خواہش اور حرص کے باوجود اگر وہ پردہ کریں گی تو وہ محض اللہ کے خوف سے کریں گی اللہ کی رضا کے لیے کریں گی اور یہی عنداللہ مقبول ہے اور اسی میں کامیابی ہے اور کامیابی ہی میں جنت ہے۔ لہٰذا آپ کا اعتراض لغو ہو گیا۔

دوسرے یہ کہ اگر منع کی ہوئی چیزوں سے مردوں کی حرص بڑھ جاتی ہے تو اس کا بھی پہلا جواب تو یہی ہے کہ وہ مذکورہ عبارت کوئی نص کا درجہ نہیں رکھتی ہیں۔ پھر بھی اگر ہم اس کو تجربات کی بنا پر صحیح قرار دیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جب پردہ کا حکم ہو گیا ہے تو اب ان کی حرص کیسے ہوگی جب وہ دیکھیں گے ہی نہیں جبکہ یہ بات شاہد ہے کہ دیکھی اور چکھی ہوئی چیز کی حرص باعتبار غیر دیدہ و چشیدہ کے زیادہ ہوتی ہے لہٰذا پردہ میں عفت ہے اور بے پردگی میں کچھ اور نہیں تو کم از کم زنائے تو ہونا لازم ہی ہے لہٰذا اسلام نے دور ہی سے ایک حد قائم کر دی ہے۔ کہ لوگ اس سے اجتناب کریں۔

بناء بریں وجہ اسلام کے اس قانون کو لے کر اعتراض کرنا یا تو ہٹ دھرمی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے یا پھر اعلیٰ درجہ کی عصبیت کی وجہ سے ہو سکتا ہے۔

براهین الوحدانیۃ

پہلی دلیل یہ ہے کہ خداوندقدوس نے ارشادفرمایا: **وللہ خزائن السمٰوٰت والارض** ۔ اللہ ہی کے لیے آسمان وزمین کے خزانے ہیں، اور دنیا کے اندر جو کچھ کسی کو ملتا ہے اسی کی عطا کردہ اشیا ہیں خواہ وہ کسی بھی فرقہ سے تعلق رکھنے والا ہو، اس لیے کہ وہی حاجت روا اور مشکلکشا ہے یہ ہے اسلام کا نقطۂ نظر اس کے برخلاف رمائن اور منتر کا ہے کہ خیالی اور فرضی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور ایک دو دیوتاؤں ہی نہیں بلکہ ایک جم غفیر کو خدا مانتے ہیں جو کسی کی حاجت روا نہیں کرسکتا حتی کہ اگر اس کے اوپر کوئی جانور پیشاب پاخانہ کرتا ہے تو اس کو بھی دفع نہیں کرسکتا۔ اور ان کے معبودان باطلہ کے اندر یہ بھی شامل ہیں مثلاً زمین دریا، پہاڑ، جانور، سانپ، بچھو، چوہے، بیل، بھینس، گدھے، سور، درخت فقیر، اور حقیر تمام چیزوں کو خدا مانتے ہیں اور اسکی طرف رجوع کرتے ہیں تاکہ میری حاجت روائی کرے حالاں کہ یہ ان کی نہایت ہی کم فہمی ہے۔ کیوں کہ سور، پہاڑ، بیکار شئ ہے کہ یہ لوگ جس کے سامنے سر جھکاتے ہیں جس کو نہ کھانے کا شعور ہے اور نہ پینے کا اور نہ حاجت کو پوری کرنے کا اب بھلا بتایئے کہ وہ کیسے خدا ہوسکتا ہے بہر حال چاند ستارے اور سورج وغیرہ ذالک خدا ہونا باطل ہوگیا لہٰذا حقیقی معبود خداوندقدوس کا معبود ہونا ثابت ہوگیا اب مناظرین اسلام سے میں درخواست کروں گا کہ جب بھی آپ کسی سے مناظرہ کریں تو اولاً انکے دلائل کے اوپر روشنی ڈال کر باطل کردیں خود بخود آپ کی بات ثابت ہوجائیگی اور انشاء اللہ آپ فاتح کہلائیں گے۔

بقولہ تعالیٰ : لو کان فیھما آلھۃ الا اللہ لفسدتا الخ.

حق تعالیٰ کے علاوہ اگر کوئی دوسرا معبود ہوتا تو یقیناً دنیا کے اندر فساد مچ جاتا

کیوں کہ دو خدا ہونے کے بنا پر ایک کہتا کہ بارش ہو تو دوسرا کہتا بارش نہ ہو اسیطرح عالم کے اندر ایک ولولہ مچ جاتا۔ بہر حال عالم کا صحیح وسالم رہنا اس بات پر دال ہے کہ خدا ایک ہے دو نہیں۔ اسی طریقے سے آگے اور ارشاد ربانی ہے،:

قل هو الله احدالله الصمد لم يلد ولم يولد ولم يكن الله كفواً احد.

محمد ﷺ آپ اعلان کر دیجئے کہ وہ نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی کوئی اولاد ہے کیوں کہ یہ تمام کے تمام چیز ان کے لیے باطل ہیں۔

اسی طرح خداوند قدوس نے اعلان کر دیا: **واذاسالك عبادى عنى فانى قريب اجيب دعوة الداع اذا داعانى الآية** ۔اس آیت کے سبب نزول کے سلسلے میں مفسرین کرام کی رائے یہ ہے کہ چند یہودی نبی اکرم ﷺ کے پاس تشریف لائے اور انہوں نے کہا کہ اللہ کہاں ہے اس سوال کرنے کے بناء پر مذکورہ آیت کریمہ نازل ہوئی کہ اے محمد ﷺ جب آپ سے کوئی سوال کرے کہ اللہ کہاں ہیں آپ کہہ دیجئے کہ اللہ تم لوگوں سے نہایت قریب ہیں یعنی تمہارے شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہیں اور تم جو بھی بات کہتے ہو ہر ایک بات سنتے ہیں اور جو بھی تم نیک و بد کی باتوں کا گمان کرتے ہو ہر ایک باتوں کا جاننے والا ہے، اور فرمایا کہ: **وما كان لنفس ان تموت الا باذن الله كتاباً مؤجلا** ۔اور کسی شخص کو موت نہیں آسکتی جب تک اللہ کا حکم نہ ہو یہ موت ایک مقدر چیز ہے۔ یعنی انسان جو بھی عمل کرتا ہے اللہ کے حکم سے کرتا ہے اگر اللہ روک دے تو انسان ایک بالشت بھی آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔

اسی طریقے سے قرآن نے اعلان کر دیا **ان الحكم الا لله امر ان الا تعبدوا الا اياه** ۔کہ حکم اور حکومت صرف اللہ کی ہے کسی اور کے لیے نہیں پس اسی کی عبادت کرو اور اس کے علاوہ کسی دوسرے کی عبادت کرنا اور متعدد معبود کے سامنے سر جھکانا گویا کہ اپنے سر کو خاک میں ملانا ہے بہر حال وحدانیت کے اوپر احقر نے چند آیتِ کریمہ پیش کی ورنہ پورا کا پورا قرآن اس بات پر دال ہے کہ حق جل مجدہ "ایک"

اس کا کوئی دوسرا نہیں اسی بناء پر شاہ عبدالعزیز صاحبؒ نے نقطہ بیان فرمایا ہے کہ پورے قرآن کا خلاصہ کلام سورۂ بقرہ کے اندر ہے اور سورۂ بقرہ کا خلاصہ کلام سورہ فاتحہ کے اندر ہے اور سورۂ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ کے اندر ہے اور بسم اللہ کا خلاصہ کلام بسم اللہ کے ب کے اندر ہے اور ب کا خلاصۂ کلام ب کے نقطہ کے اندر ہے اور نقطۂ با ایک ہے لہٰذا حق جل مجدہ ایک ہیں معلوم ہوا کہ پورا کا پورا قرآن اس بات پہ دال ہے کہ حق جل مجدہ ایک ہیں اسی طریقے سے مختلف زمانے میں مختلف انبیاء کرام کو دنیا کے اندر مبعوث کیا تا کہ دین کی دعوت دیں اور جاہل قوم کو راہِ راست پر لائیں اور دین کی دعوت کا دارومدار قوم کی ہدایت پر ہے اور ہدایت کا دارومدار حق جل مجدہ کی وحدانیت ثابت کرنا بہر حال دنیا کے اندر کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام اور مختلف کتب سماویہ کو اس لیے بھیجا گیا کہ حق جل مجدہ کی وحدانیت ثابت ہے۔

البرهان الثانی علی الوحدانیۃ

ان مذکورہ دلائل کے علاوہ یہ سمجھیں کہ عالم کے پیدا کرنے والے اگر دو یا دو سے زائد ہوں گے تو ہرگز کوئی چیز بھی وجود میں نہ آسکے گی اور یہ عالم درہم برہم ہو جائے گا کیوں کہ یہ بات تو یقینی طور پر تسلیم کی جا چکی ہے کہ جس چیز کو خدا کہا جائے اس میں کسی طرح کی کمی اور نقصان نہ ہونا چاہیے اگر ایسا ہو تو عام بندوں میں اور اس میں کوئی فرق نہیں رہ سکتا اس لیے کہ بندے خدا بننے سے اس لیے محروم ہیں کہ ان میں قسم قسم کے نقصانات پائے جاتے ہیں اور وجود کی بات ان کے قبضے میں نہیں ہے کہ جو خوبی اور جو کمال چاہیں اپنے واسطے موجود کر لیں۔ اب اگر خدا بھی ایسا ہی مجبور و ناقص ہو تو اس کو کیا استحقاق ہے کہ ہمارا خدا بن بیٹھے جب یہ بات ثابت ہو گئی تو اب یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا کہ آدھی مخلوق ایک خدا کی اور آدھی مخلوق ایک خدا کی عبادت کرے ورنہ ہر خدا میں نصفا نصف خدائی کی کمی اور کسر ہو گی اس بنا پر یہی کہنا پڑے گا کہ ہر ایک خدا پوری پوری خدائی کا مالک ہے مگر اس صورت میں جیسا وہ کامل ہو گا دوسرے پر اس کی تاثیر بھی کامل ہی واقع ہو گی کیوں کہ ممکنات اور خالق کی ایسی مثال ہے جیسے آفتاب یا چاند اور زمین و آسمان وغیرہ کو آفتاب سے آفتاب کی طرح کا اور چاند سے چاند کی طرح کا نور پھیلتا ہے اور زمین و آسمان در و دیوار، کوہ، اشجار، وغیرہ میں سے ہر ایک شئی کو حسب قابلیت منور کر دیتا ہے اور چیزیں تو فقط نظر ہی آنے لگتی ہیں لیکن اتنے کا اتنے ہی نور سے کچھ اور حال ہو جاتا ہے الغرض، جتنا چاند و سورج میں فرق ہے۔ اتنا ہی ان کی شاعوں میں اور چیزوں کے منور ہونے میں فرق ہے تو جب خدا کا وجود بڑا ہی کامل ٹھہرا اور مخلوقات کے موجود کرنے میں اس کی تاثیر بھی کامل ہوئی اب اگر ایسے ایسے دو یا کئی خدا ہوں گے اور مخلوقات مشترک ہو نگی، تو ہر طرف سے کامل فی کامل وجود ہر مخلوق کے

پیمانے اور حوصلے کے موافق آئے گا، گز میں گز بھر اور بالشت، بالشت بھر، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ایک سانچے میں دو چیزیں اور ایک سیر بھر کے برتن میں دو سیر اناج، اور ایک جوتی میں ویسے ویسے دو قدم، اور ایک اچکن میں اس کے موافق دو بدن، اور ایک نیام میں اس مقدار کی دو تلواریں، اور ایک مکان میں اسی کی گنجائش کے موافق دو چند اسباب نہیں سما سکتے، اور اگر ایک طرف میں دو مظروف رکھے جائیں تو جبر ہوگا جس کا نتیجہ ٹوٹ پھوٹ ہوگا اسی طرح اگر دونوں خداؤں کی طرف سے پورا پورا وجود ایک مخلوق میں سمانے لگے، تو بیشک وہ مخلوق معدوم اور نیست و نابود ہو جائے گی۔

ہاں اگر خدا کے وجود کا کامل ہونا ثابت نہ ہوتا بلکہ اس میں نقصان اور کمی کا احتمال ہوتا تو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جیسے دو چراغوں کا نور مل کر کامل نور ہو جاتا ہے تو دو خدا کے واسطے کامل الوجود اور تامّ الصفات لازم ہے اور تمام اہل مذاہب کو اسکا اعتراف کرنا پڑا ہے۔

اسکے علاوہ ہم یہ کہتے ہیں وہ دو وجود جو دو خداؤں کی جانب سے مخلوق کو عطا ہوئے اگر ایک ہی خدا کے خزانے میں ہوتے ہیں اور جو زور و قوت اور شوکت و حشمت دوسرے کو حاصل ہے وہ سب بھی اسی ایک خدا کے پاس ہوتے تو بلاشبہ یہ سب ملکر اس ایک تنہا خدا کی انفرادی قوت میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا اس سے ثابت ہوا کہ ہر ایک خدا کے وجود میں فی الجملہ کوتاہی اور نقصان ہے جس کی مکافات دوسرے کے وجود سے کی جا سکتی ہے باوجودیکہ اسی کا اقرار کیا جا چکا ہے کہ خدائے پاک کی ذات ہر قسم کے قصور و فتور سے مبرا و منزہ ہے وہ بے عیب و بے نقصان ہے سب چیز اسکے بھروسے پر قائم ہے وہ کسی کے سہارے کا محتاج نہیں وہ سب کی اصل ہے اور سب اسکی فرع ہیں۔

اور کیوں نہ ہو جس سلسلے کو دیکھئے ایک ہی اصل پر قرار پکڑتا ہے، نور آفتاب اگرچہ ہزاروں مکانوں اور ہزار ہا روشن دانوں میں جدا جدا جلوہ گر ہے، لیکن ان سب متفرق انوار کو اسی ایک آفتاب کے ساتھ رابطہ ہے عدد کا سلسلہ گو ایک سے الیٰ غیر النہایۃ پھیلا ہوا ہے، کہیں دو ہیں، کہیں تین، چار، پانچ، بیس، سو، ہزار، اور اس پر کہیں مد جذر

کہیں مجذور، کہیں حاصل ضرب کہیں مضروب فیہ، کہیں حاصل قسمت کہیں مقسوم علیہ وغیرہ لیکن ان سب کی اصل وہی ایک کا عدد ہے اگر ایک نہ ہوتو یہ سارا سلسلہ اعداد کا نیست ونابود ہوجائے موجوں اور پہاڑوں کے کارخانے کو دیکھئے تو سب کی اصل وہی ایک پانی ہے شاخوں کو دیکھئے تو سب کی اصل وہی ایک جڑ ہے آدمی وغیرہ کو دیکھئے تو سب کے سب ایک اصل میں جس کو انسانیت وغیرہ کہتے ہیں، مشترک ہیں۔

اسی طریقے سے جہاں بھی نظر پڑتی ہے، کوئی ایسا سلسلہ نظر نہیں آتا جس کا کوئی سرمنشانہ ہو اور پھر ان سرمنشاؤں کو دیکھئے تو ان کا کوئی سرمنشا ہے تو اسی طرح یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ہندو، مسلمان، یہود ونصاری وغیرہ میں آدمیت سرمنشا ہے اسی طرح گھوڑوں میں کوئی اور سرمنشا ہے اور گدھوں کی اور اصل ہے اور کتوں کی اور اصل ہے ان سب اصلوں کی اصل جان دار ہونا ہے ادھر نباتات کی علاحدہ اصل ہے اور ان کا جدا ہی سلسلہ اور جدا ہی سرمنشا ہے پھر ان کی اصل اور جانداروں کی اصل جمیت کی زیر حکومت ہے اسی طرح اوپر تک چلے چلو آخر میں جا کر سارے عالم کا اشتراک وجود میں نکلتا ہے لیکن چوں کہ شی مشترک، عین اشیائے متعدد نہیں ہوسکتی، اس لیے یوں سمجھ میں آتا ہے کہ وجود عین عالم اور عین موجودات نہیں بلکہ بہ ایں الفاظ کہ ایک شی کبھی موجود ہوسکتی ہے اور کبھی معدوم یہ کہا جائے گا کہ وجود عالم ایک خارجی اور عارضی چیز ہے اصلی اور ذاتی نہیں جیسا کہ پانی اپنی ذات سے گرم نہیں ہے اور آگ کی حرارت سے جو کہ اس کی اصلی اور ذاتی صفت ہے اس میں عارضی گرمی پیدا کر سکتے ہیں یا صاف وصفاف آئینے کا نور، جو آفتاب کے مقابل ہو، اصل نہیں بلکہ آفتاب کا فیض ہے نور اصلی اور ذاتی ہے ٹھیک اسی طرح عالم کے وجودِ عارضی کے لیے بھی ضرورت ہے کہ وہ کسی ایسے موجود اصلی سے مستعار ہو جس کا وجود عرضی ومستعار نہ ہو پھر جیسے آفتاب سے گو ہزار ہا جگہ دھوپ پھیلنے پر سب کی سب ایک ہی آفتاب کا فیض ہے، یوں یقین کرنا چاہیے کہ تمام عالم کا وجود بھی ایک موجود حقیقی اور اصلی کا پرتو ہے اسی کو ہم خدا سمجھتے ہیں اور اسی کی نسبت

ہمارا یہ خیال ہے کہ اس میں تعدد کی گنجائش نہیں۔

''اشکال'' ذکی طالب علم یہ سوال کرتے ہیں کہ میں نے تسلیم کیا کہ موجودات کے وجود میں باہم اس طرح کا فرق نہیں جیسے چاند کی روشنی اور دھوپ کی روشنی مثال کے طور پر یکساں نظر آتا ہے مثال کے طور پر اس میدان کی دھوپ اور اس میدان کی دھوپ جس طرح ہر جگہ کی دھوپ کو، خواہ وہ میدان وسیع اور جنگل میں ہو یا صحن مکان میں، دھوپ ہی کہا جاتا ہے، اسی طرح ہر چیز کے وجود کا نام بھی، خواہ وہ زمین وآسمان کا ہو یا چاند سورج کا یا انسان وحیوان کا، وجود رہتا ہے۔ لیکن اگر فرض کریں کہ آسمان پر ایسے ایسے کئی آفتاب ہوں، تو جس طرح وہ بہت سے ستاروں کا نور مل کر رات کو یکساں نظر آتا ہے، یقیناً آفتابوں کا نور بھی مل کر یکساں نظر آئے گا پس اگر عالم کے واسطے کئی صانع ہوں اور سب کے وجود کا پرتو مل کر اسی طرح یکساں دکھائی دیتا ہو تو کیا بعید ہے۔

جواب: یہ دیا گیا کہ مثال کے طور پر کسی کارخانے کو دیکھئے وہ کسی ایک چیز پر منقطع ہوتا ہے اور کسی سلسلے کو دیکھئے، کسی ایک پر منتہی ہو جاتا ہے، چنانچہ دھوپوں کا آفتاب پر، سلسلہ اعداد کا ایک پر، موجوں کے قصے پانی پر تمام ہونا، اور چند مثالیں ان کے سوا پہلے بیان ہو چکی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں میں جتنے پھیلاؤ ہیں وہ کسی ایک شئ کی طرف سمٹے چلے جاتے ہیں اب ہم پوچھتے ہیں کہ پانی اور آفتاب وغیرہ اشیائے مذکورہ کی وحدت بھی منجملہ موجودات کے ایک شئ موجود ہے اور ان اشیاء میں وحدت کا وجود بھی عارضی طور پر ہے، کیوں کہ آفتاب اور پانی وغیرہ کے بہت سے ٹکڑے ہو سکتے ہیں اگر ان کی وحدت اصلی اور ذاتی ہوتی تو وہ ان سے کسی طرح زائل نہ ہو سکتی نہ ان میں تقسیم جاری ہوتی اور نہ کثرت کی کسی نہج گنجائش نکل سکتی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ جیسا عالم کا وجود عارضی ہے، وحدت بھی اس کی عارضی ہوگی اور یہ وحدت بھی اسی موجودِ اصلی کا فیض ہوگا جس کا فیض خود وجود عالم ہے اور اسکی وحدت بھی اس طرح اصلی ہونا چاہیے جس طرح اس کا وجود اصلی ہے۔

(بحوالہ اسلام کے بنیادی عقائد) مذکورہ بات پر یہ کہا جاسکتا ہے جیسا کہ وحدت اقسامِ وجود میں سے ہے ایسی ہی کثرت بھی ہے اور عالم کا ہر قسم کا وجود عارضی ٹھہرا اور خدا کے وجود کا پرتو ہوا، تو لازم آئے گا کہ وصفِ کثرت بھی خدا کے اندر پایا جاوے اور وہ اس کے واسطے وصفِ اصلی اور ذاتی ہو۔ مگر یہ مغالطہ تم کو اس وجہ سے لگا کہ وحدت کے مانند کثرت کو بھی تم نے اقسام وجود میں شمار کرلیا حالاں کہ کثرت کا مبنیٰ عدم پر ہے دیکھو ہم جانتے ہیں کہ نورِ آفتاب ایک شئ واحد ہے لیکن اگر کسی دیوار میں ایک مکان کے دو روشن دان برابر برابر ہوں تو درمیان میں اندھیرا ہونے کی وجہ سے ہر روشن دان کا نور علاحدہ علاحدہ معلوم ہوگا۔

غرض یہ کثرت اندھیرے کے سبب سے معلوم ہوتی ہے اگر ادھر ادھر نور اور بیچ میں اندھیرا نہ ہو مثلاً دیوار کو مکان میں سے اٹھا ڈالیں تو سب جگہ نور ہی نور ہو جائے گا اور یہ فرق وامتیاز وتعدد جس کا نام کثرت ہے ذرا بھی باقی نہ رہے گا اب چوں کہ اندھیرا نور کے نہ ہونے کو کہتے ہیں اور نہ ہونا ہی عدم ہے تو معلوم ہوا کہ کثرت عدم کے باعث پیدا ہوتی ہے وجود کے اقسام میں سے نہیں۔

بہر حال اس تقریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ جو اوصاف وجودی ہیں اور عالم میں پاء جاتے ہیں وہ ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ میں بھی ہوں جو اوصاف عدمی ہیں وہ لازم ہے خدا میں نہ ہوں اور یہ بھی ثابت ہوا کہ موجودِ اصلی ہوگا اسی میں کسی قسم کی تقسیم کی گنجائش نہ ہوگی، ورنہ وحدت جو اوصاف وجود میں سے ہے جیسا کہ ابھی مذکور ہوا اسی میں اصلی نہ رہے گی حالاں کہ یہ محال ہے کہ وجود تو اس کا اصلی ہو اور سب قسم کا وجود مخلوقات کو اس سے پہنچے اور ہر طرح کے وجود کا منبع اور معدن ہو، اور پھر اس میں بعض انواع وجود کی اصلی نہ ہو۔ اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ وجود اس کا عین ذات ہے اور ذات اس کی عین اوصاف ہے اور اوصاف ان کے عین وجود ہیں ورنہ وحدتِ اصلی اور وجود ذاتی باقی نہیں رہ سکتا۔

☆☆☆

البرهان الثالث علی الوحدانیۃ

وحدانیت کے اوپر تیسری دلیل یہ ہے کہ کم از کم دو صانع ایجاد عالم میں شریک ہوں گے تو وہ دونوں جیسا کہ مانع ہونے اور موجودِ اصلی ہونے میں شریک ہوں گے، ایسے ہی کسی نہ کسی امر میں علاحدہ بھی ہوں گے کیوں کہ جہاں اشتراک کیساتھ تعدد پایا جاوے تو وہاں لازمی بات ہے کہ کسی حیثیت سے ایک کو دوسرے علاحدہ اور ممتاز بھی سمجھا جائے مثلاً دو آدمی باوجودیکہ آدمیت میں شریک ہیں مگر بعض اوصاف میں مختلف بھی ہیں جیسا کہ شکل وصورت، قد وقامت، مکان وزماں، رنگ وروپ، خاصیت مزاج وغیرہ میں، اگر یہ علاحدگی اور فرق نہ ہوتو تعدد ہرگز نہ ہو، وہی ایک آدمی رہے۔ اسی وجہ سے ضروری قرار پایا کہ جو دو چیزیں کسی امر میں مشترک ہوں تو ان میں سے ہر ایک کے اندر بعض ایسی خصوصیات ہونی چاہئیں جو دوسری اشیاء میں نہ پائی جائیں انہی خصوصیات کے مجموعے کو ہم اپنی اصطلاح میں ذات تغیر کہتے ہیں مگر ذات بے وجود کے معدوم محض ہے کیوں کہ دنیا کی ہر ایک چیز وجود کے ذریعہ سے موجود کہلاتی ہے البتہ خود وجود کو اپنے موجود ہونے میں کسی دوسرے وجود کی حاجت نہیں اور یہ بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ ہر شئ کو اپنی روشنی ہونے میں تور کی حاجت ہے مگر خود نور کو اپنی نورانیت میں دوسرے نور کی حاجت نہیں۔ اب اگر دو یا کئی صانع ہوں اور وہ دونوں وجود میں اشتراک رکھتے ہیں تو ان دونوں وجود کی ذات (یعنی وہ خصوصیاتِ خاصہ جن سے ایک کو دوسرے سے امتیاز حاصل ہے) وجود کے ماسوا کوئی اور چیز ہوگی اور چوں کہ وجود کے سوا سب چیزیں اصل سے معدوم ہیں اس لیے ہر ایک خدا فی حد ذاتہ وجود سے بالکل خالی ہوگا اور ان پر وجود اسی طرح عارضی ہوگا جس طرح زمین وآسمان سب چیزیں تاریک تھیں مگر آفتاب کے نور نے ان سب کو روشن کر دیا اس

صورت میں ہم دونوں خداؤں کو کسی طرح بھی موجود اصلی نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ دونوں بھی کسی ایسے موجود اصلی کے محتاج ہوں گے جن کا وجود خود ان کی ذات کے اندر داخل ہو اور ہمارا مقصد بھی توحید سے صرف اتنا ہی تھا کہ موجودات کا سلسلہ ایک موجود اصلی پر ختم ہوتا ہے چنانچہ یہ بات اس بات سے بخوبی حاصل ہوگئی کیوں کہ جب موجودات دو خداؤں سے مثلاً پیدا ہوئے اور وہ دونوں ایک موجود اصلی میں شریک اور اصل سے معدوم ٹھہرے تو یہ معنی ہوئے کہ موجود اصلی کا فیض ان دونوں کے واسطے سے اوروں کو پہنچتا ہے جیسے پرنالے کے وسیلے سے چھت کا پانی نیچے آتا ہے اور آتشی شیشے کے طفیل سے آفتاب کی شعاعیں دوسری چیزوں کو پہنچتی ہے اور قلعی دار آئینے کے صدقے سے آفتاب کا نور ان در و دیوار کو پہنچتا ہے جو آفتاب کے مقابل نہیں ہوتے ان تمام صورتوں میں سب کو معلوم ہے کہ چھت کا پانی پرنالے کی راہ سے آتا ہے پرنالے سے پیدا نہیں ہوتا آفتاب کی سوزش آتشی شیشے کی راہ سے آتی ہے آتشی شیشے میں کچھ حرارت نہیں، آفتاب کا نور، آئینے کی راہ سے اشیاء کو پہنچتا ہے آئینے میں ذرہ برابر نور نہیں۔ لہٰذا اسی طرح سے اگر بہت سے موجودِ اصلی اور بکثرت صانع موجود ہوں تو توحید میں کچھ رخنہ نہیں پڑ سکتا، بلکہ اور زیادہ مضبوط اور مستحکم ہو جاتی ہے کیوں کہ فلک یا زمانہ جو باعتبار شہرت کے وقائع عالم کا فاعل گنا جاتا ہے یا انسان و حیوان وغیرہ جو ظاہر بینوں کو افعالِ اختیاریہ کے خالق معلوم ہوتے ہیں یا دوا اور دعا وغیرہ جو بنسبت اپنی تاثیروں کے موثر حقیقی سمجھے جاتے ہیں یہ سب چیزیں اس وقت، بحیثیت اپنے فیوض کے وسیلۂ فیض اور واسطۂ ایجاد سمجھی جائیگی اور ان کے خالق ہونے کا شبہ جو ظاہر پرستوں کو پڑا ہوا ہے بے محنت حل ہو جائے گا اور اس وقت ہم بآواز بلند یہ ندا دے سکیں گے کہ ماسوا خالق بزرگ کے جو چیزیں ظاہر میں مصدر افعال یا مصدر تاثیرات نظر پڑتی ہیں وہ سب خدائے اکبر کے سامنے ایک کاریگری کے آلات کی طرح ہیں بادی النظر میں ان چیزوں سے کام ہوتا ہے اور حقیقت میں خدا کرتا ہے اعلی

طبقے کے حضرات جیسے نبیؑ ہو یا ولی اور ادنی درجے کے مثلاً دیو ہوں یا پری، یا اوتار ہوں یا فلک دوّار، دوا ہو یا دعا، پتھر ہو یا کوئی جاندار چیز، زماں ہو یا مکان، چاند ہو یا سورج، ستارے ہوں یا اور کوئی چیز، سب کے سب خدا کے سامنے ایسے ہیں جیسے بڑھئی کے سامنے بسولا نہانی، برما وغیرہ فرماں بردار ہوتے ہیں، کہ بلا حرکت اس کے نہیں ہلتے اور بغیر اس کی مرضی کے کوئی کام نہیں کر سکتے۔ اور اس سارے سلسلہ عالم کی مثال ایسی ہے جیسے کہ مشینوں اور کلوں کے کارخانے اور گھڑیوں وغیرہ میں بہت سی کلیں اور پرزے آگے پیچھے ہوتے ہیں، پھر اگر کوئی کام لینا منظور ہوتا ہے تو اوّل کو ہلاتے ہیں اور پھر سب کلیں بترتیب ہلتی ہیں اور آخر میں جو کام مقصود ہوتا ہے وہ اخیر کی کلوں سے حاصل ہوتا ہے اب ظاہر ہے کہ یہ کلیں خود بخود نہیں ہلتیں کیوں کہ وہ بے حس و حرکت جمادات میں سے ہیں ان کے واسطے جب تک کوئی ذی عقل اور صاحب ارادہ اور کام لینے والا نہ ہوگا تو کام نہ چلے گا اسی طرح سلسلہ عالم کے واسطے علت العلل اور فاعل حقیقی ایک خدائے تعالیٰ ادنی سے ادنی فعل اور حقیر سے حقیر سی چیز بھی اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی اور کسی شئی کو اس کی سطوت وحکومت کے آگے دم مارنے کی مجال نہیں جو کچھ وہ چاہے اس میں کوئی مزاحمت نہیں کر سکتا اور مقرب سے مقرب بندے بھی اس کے بارے میں بغیر اس کی اجازت کے لب نہیں ہلا سکتے ہیں۔

یہی وہ عقیدہ ہے جس کی طرف اسلام نے نہایت زور وشور کے ساتھ دعوت دی ہے یہی خیال حضور ﷺ کی تعلیم کا سنگِ بنیاد ہے اور اس مضمون کی اشاعت تمام انبیاء کرامؑ کی بعثت کا مقصدِ اولین ہے اس میں شک نہیں کہ دنیا کے تمام مذاہب میں توحید کی فی الجملہ جھلک پائی جاتی ہے اور جن مذاہب میں شرکِ صحیح کی تعلیم موجود ہے وہ بھی توحید کے بالکلیہ ترک کرنے پر راضی نہیں ہوئے بلکہ توحید کو چھوڑنے سے یہ بہتر سمجھتے ہیں کہ شرک کو توحید کے ساتھ جمع کر لیا جاوے اگرچہ یہ اجتماع اجتماع نقیضین

ہی کیوں نہ ہوں، لیکن یہ عزت خاص مذہب اسلام کو حاصل ہے کہ اس نے بالکل خالص اور بے لوث توحید کی طرف لوگوں کو رجوع کیا اور شرک جلی یا خفی کا تسمیہ باقی نہیں رکھا اس جہالت اور تاریکی کے زمانے میں جب کہ دنیا میں خالص توحید سے بڑھ کر کوئی گناہ نہ تھا، ہزاروں بندگانِ خدا کو توحید سے مانوس بنادیا اور آج تک کروڑہا کروڑ انسانوں کے دلوں سے شرک فی الذات شرک فی الصفات اور شرک فی العبادۃ کی ظلمتوں اور کدورتوں کو دھوڈالا۔ کیا اسلام کی اس بے غل وغش توحید کا مقابلہ اس قوم کی توحید کرسکتی ہے جس نے خدا کے سوا ہر ہر اینٹ پتھر کے سامنے گردن ڈال دی اور آگ وغیرہ کو بھی قابل پرستش سمجھا اور اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی صورتوں کو حاجت روا اور مشکل کشا تصور کرلیا یا اس قوم کی جن کے خدا کی تکمیل مادہ اور روح سے ہوتی ہے اور ان کا کم زور خدا ان دونوں کے منشا کے خلاف نہ کبھی کوئی کارروائی کرسکتا ہے اور نہ ان سے بگاڑ کر ایک دم اپنی خدائی کو قائم رکھ سکتا ہے۔ اس قوم کی جن کا مثلث خدا اپنی کرسی عظمت سے اتر کر تمام حوائج بشری خصوصیات کا محکوم بنا اور بنی آدم کی خطائیں معاف کرنے کے واسطے اس کو سخت تکالیف اور مشقتین کرنا پڑیں یا اس قوم کی جن کا خدا خلقت کے بے سوچے سمجھے پیدا کرنے پر سخت نادم ہوا اور دنیا میں طوفان آجانے سے اسے بے حد ملول ہونا پڑا۔ یہاں تک کہ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئیں اور ملائکہ کو ان کی عبادت کرنا پڑی اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے جب اس کی کشتی ہوئی تو انہوں نے اس کو زمین پر ٹیک دیا منصفو! کیا ایمان سے کہہ سکتے ہو کہ آج صحیح اور مکمل توحید، ان میں سے کسی مذہب کی بدولت دنیا میں نظر آرہی ہے۔

(بحوالہ: اسلام کے بنیادی عقائد افادات حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، ص: ۴۵)

☆☆☆

عبارة الوید علی الوحدانیة

قارئین کرام! قرآن وسنت وشریعت واجماع وقیاس اس بات پر تو دال ہے ہی کہ حق جل مجدہ ایک ہیں لیکن ہندو دھرم کی مختلف کتب بھی اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ خداوند قدوس ایک ہیں چنانچہ وید کی عبارت ہے۔

एकम ब्रहम द्वितीय नास्ते नेट ना नास्ते किंचन

ترجمہ: ایک ہی خدا ہے دوسرا نہیں ہے کسی بھی صورت میں دوسرا خدا نہیں ہے ثانی خدا کا جز بھی نہیں۔

اسی طرح ایک دوسری جگہ حق جل مجدہ کی وحدانیت کے سلسلے میں کہا گیا ہے ایکم برہم ادویئتم کہ وہ ایک ہے اور اس کے ساتھ کوئی بھی شریک نہیں۔ اب میں دریافت کرتا ہوں ان ملعون غیر مسلموں سے کہ تم کسے کہتے ہو کہ حق جل مجدہ کے ساتھ ساتھ دوسرا خدا ہے یا بھگوان کیوں کہ یہ ظاہر سی بات ہے کہ اگر دو خدا ہوتے تو دنیا کے اندر تمہارا وجود نہ ہوتا لہٰذا تمہارا وجود ہونا اس بات پہ دال ہے کہ خدا ایک ہے اور دیگر مورتی باطل ہے جیسا کہ تمہارا رمائن اور وید خود اس بات پر شاہد ہے کہ خدا کے علاوہ کسی اور کو نہ پوجو (رگ وید) اسی طرح اور کہا گیا کہ جو لوگ باطل وجود والے دیوی دیوتاؤں کی عبادت کرتے ہیں وہ (جہالت کے) اندھا کر دینے والے گہرے اندھیرے کنویں میں ڈوب جاتے ہیں (یجروید) خیر ان تمام عبارات کے باوجود ایسی ایسی عبارتیں وحدانیت پر شاہد ہیں کہ خدا ایک ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں لیکن پھر بھی جاہل غیر مسلم بت پرستی میں ملوث ہیں۔

(بحوالہ: اگر اب بھی نہ جاگے تو)

انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام

قارئین کرام! وحدانیت کے اثبات کے بعد نبوت ورسالت کو ثابت کروں گا۔ چنانچہ ہر شخص پر یہ فرض ہے کہ وہ اسبابِ اطاعت پر غور کرے یعنی یہ کہ ایک آدمی کی اطاعت دوسرے پر عقلاً کن حالتوں میں اور کن وجوہات سے ضروری سمجھی جاتی ہے اس بارے جہاں تک تامل سے کام لیا گیا ہے کل تین سبب ہیں (۱) جلب منفعت (۲) دفع مضرت (۳) عشق ومحبت چنانچہ نوکر اپنے آقا کی اطاعت ملازمت کی امید پر اور رعیت اپنے حاکم کا اندیشۂ تکالیف سے اور عاشق اپنے معشوق کی بتقضائے محبت کرتا ہے اور اطاعت کا کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان تینوں وجوہات سے خالی ہو اب اگر یہ تینوں سبب ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں، تو فطرتِ انسانی یقیناً اس کی خدمت واطاعت کہ فرض عین سے بھی بڑھ کر فرضِ عین قرار دے گی پس جب کہ پچھلے اوراق میں حق تعالیٰ شانہ کی نسبت مدلل طریقے سے یہ طے ہو چکا ہے کہ دنیا کے تمام کام اسی کے ارادہ اور اختیار سے انجام پاتے ہیں اور ہر قسم کا کمال اور حسن وخوبی اسی کی ذاتِ اقدس میں موجود ہے اور اس کے سوا کوئی عالم کا مربی اور محسن بھی نہیں ہے تو بے شبہ عقل کے نزدیک ایسے خدا کی اطاعت سے سرمو انحراف جائز نہ ہوگا اور یہ لازم ہوگا کہ اس کی خدمت گزاری میں آدمی مصروف رہے اس کا ہر دم دھیان رکھے اور اس کی محبت میں اپنے کو دیوانہ بنائے جیسا کہ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے۔

جیوں تو تیرے ہی نام پر جیوں ☆ مروں تو تیرا ہی کلمہ پڑھتا مروں

غرض کہ کسی بھی حالت میں اس سے جدا نہ ہو اور ظاہر و باطن میں اسی کے تابع فرمان بنا رہے باطنی فرماں برداری تو یہی ہے کہ دل میں خدائے تعالیٰ کے متعلق یہ یقین ہو کہ ہماری ہستی اس کی ہستی کے سامنے بالکل حقیر اور اس کا وجود ہر طرح سے عظیم اور کامل و مکمل ہے ہماری ہر قسم کے نفع و نقصان کا اختیار اسی کو ہے وہ ہمارا حاکم اور ہم اس کے محکوم ہیں ان میں اعلیٰ درجہ کی شانِ محبوبیت موجود ہے۔

اور ظاہری فرماں برداری، وہ افعال و حرکات ہیں جن سے ہماری انہی اندرونی جذبات اور باطنی اعتقادات کا سراغ ملتا ہے اور خدا کی حکومت اور محبوبیت کا خیال ان سے مترشح ہوتا ہے مثلاً خدائے تعالیٰ کے سامنے اس کی خاص تجلی گاہ کی طرف ہاتھ باندھ کر کھڑا ہونا اس سے اپنے حال کے متعلق عرض و معروض کرنا ادھر سے کوئی حکم آجانے پر سر نیاز جھکا دینا اور اسی آستانے پر اپنے آپ کو ذلیل و حقیر سمجھ کر ناک اور پیشانی رگڑنا یہ سب آثار محکومیت اور آداب شاہی کے قائم مقام ہیں۔ اپنے مال و دولت کو خدا کے بتلائے مصارف میں خرچ کرنا اور ہر آمد و صرف میں اس کے حکم کا منتظر رہنا یہ بھی سراپا اطاعت ہونے کے لوازمات میں سے ہے۔ پھر اگر خدا تعالیٰ کو محبوب حقیقی سمجھتا ہے تو اس کے قرب و وصل کی فکر میں ہر ایک ماسوا سے بے زار ہو جاتا ہے آب و طعام اور لذتِ جماع کو ترک کر دینا اس کے بعد تجلی گاہ ربانی کی طرف پا برہنہ سر برہنہ لبیک لبیک کہتے ہوئے دوڑنا اور وہاں پہنچ کر کبھی حالتِ شوق میں اسی تجلی گاہ کے گرد گھومنا کبھی جنگلوں میں بھٹکتے پھرنا کبھی دشمنِ محبوب کے خاص مقام پر سنگ باری کرنا اور کبھی جان و مال فدا ہونے کے لیے تیار رہنا یہ سب محبت قلبی کی علامات اور عشق حقیقی کے ظاہری نشانات ہوں گے۔

الغرض یہ امر تو اب عقلاً پایۂ ثبوت کو پہنچ گیا ہے کہ دل سے زبان سے ہاتھ و پاؤں سے جس طرح بھی بن پڑے آدمی اپنے خالق کی اطاعت کی طرف متوجہ رہے اور ہرگز اپنا اعضاء بنا جبین نیاز کسی دوسری جانب نہ پھیرے لیکن سخت مشکل یہ تھی کہ

کسی کی اطاعت بغیر اسکے مقصود نہیں کہ ہم کو اس کی پسندیدہ اور ناپسندیدہ باتوں کا علم ہو اور خدا تعالیٰ کی نسبت یہ دریافت کرنا کہ وہ کن امور سے خوش اور کن امور سے ناخوش ہوتا ہے ہر شخص کی قدرت سے باہر تھا کیوں کہ محض اپنی عقل سے اگر ہم نے چند احکام معلوم کرلیا تو اوّل تو تمام احکام کی تفصیل اس سے معلوم نہیں ہوسکتی دوسرے یہ کہ خدائے تعالیٰ شانہ ہماری عقل کی ہر بات میں پابند بھی نہیں ہوسکتا اس بنا پر خدائے تعالیٰ کا اطاعت وعبادت بغیر اس کے ممکن نہیں کہ خود خدائے برتر اپنی رضا وعدم رضا سے بندوں کو مطلع فرمائے اور یہ خوب معلوم ہے کہ جب سلاطین دنیا اس تھوڑی سی تکبر اور ذراسی استغنا پر ہر مکان در مکان اپنے احکام سناتے نہیں پھرتے اور نہ ان کو یہ گوارا ہے کہ ہر کس وناکس کو اپنے مافی الضمیر کی اطلاع کے واسطے شرف ہم کلامی بخشیں تو کیا وہ احکم الحاکمین جس کو تمام عالم سے بالکل استغنا اور سب چیزوں کو اس کی احتیاج ہے ہر ایک عام وخاص اور ہر ایک گرے پڑے کو منہ لگانا اور اپنی حضوری یا ہم کلامی سے باریاب فرمانا پسند فرمائے گا؟۔ ہرگز نہیں مگر جس کو چاہیں۔

جب ایسا نہیں تو بیشک خدا کے یہاں بھی کچھ لوگ ایسے خاص ہوں گے جیسے کہ بادشاہوں کے یہاں وزیر یا نائب السلطنت اور تمام سرکاری احکام رعایا کے پاس انہی صاحبوں کے توسط سے پہنچتے ہیں ایسے ہی خدا کے پیام اور اوامر ونواہی ان معتمدین کے ذریعے سے ہم تک موصول ہوں گے ہم انہی معتمدین کو انبیاء رسل اور پیغمبر کہتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ جس زمانے میں خدا تعالیٰ ضرورت سمجھتے ایسے ہی رسل کو اسی زمانے کے مناسب ہدایت دیکر مبعوث فرمادیتے ہیں۔

اشکال: یہاں پر ایک اشکال ہوسکتا ہے کہ مختلف قرون میں جب انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے اور ظاہر ہے کہ ان میں سے موخر کی شریعت مقدم کی شریعت کے واسطے ناسخ ہوگی تو وہم یہ ہوتا ہے کہ پہلے نبی کے بھیجنے میں شاید خدا تعالیٰ سے کچھ سہو ہوگیا تھا (نعوذ باللہ) یا بھول چوک سے اس کو نامناسب احکام دے دیئے

تھے جو دوسرے نبی کے ذریعے سے اس غلطی کی اصلاح کرائی گئی۔ (نعوذ باللہ)

جواب: مگر یہ اشکال آپ کا سراسر کم فہمی اور نادانی پر مبنی ہے نسخ کے معنی صرف تبدیل احکام کے ہیں یہ آگے آپ کا قیاس ہے کہ وہ تبدیلی پہلی غلطی کی اصلاح کی وجہ سے واقع ہوئی ہوگی خدائے برتر کی نسبت ایسا خیال باندھنا سخت گستاخی ہے آپ نے بارہا دیکھا ہوگا کہ طبیب اگر کسی مریض کو مسہل دینا چاہتا ہے تو اسکے لیے منضج کا نسخہ تجویز کرتا ہے چند روز بعد وہ نسخہ بدل کر مسہل کا نسخہ بتلاتا ہے تو کیا آپ نے اس طبیب کی نسبت کسی غلطی یا سہو کی طرف کریں گے کہ اس سے منضج کا نسخ دینے میں غلطی کی تھی جس کی مکافات وہ دوسرے نسخے سے کر رہا ہے۔ جب یہاں آپ نے ایسا نہیں سمجھا تو خدائے تعالیٰ کے معاملے میں آپکو کس چیز نے مجبور کیا ہے کہ بلاوجہ ایک ایسا مہمل خیال پیدا کرلیں۔ بہر حال خداوند قدوس کی وحدانیت ثابت اور برحق ہے اور آپ کا تصور و گمان باطل ہے۔

شبہ: یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ کیا خدا تعالیٰ برتر اس پر قادر نہ تھا کہ ابتدائے عالم میں ہی کوئی ایسی مکمل کتاب ہدایت کیلئے نازل فرمادیتا جس میں ہر زمانے کے تغیرات کی رعایت کرلی جاتی اور اسکی حاجت نہ رہتی کہ بار بار وہ اپنے سچے الہام میں دست اندازی کرے؟

جواب: میں عرض کرتا ہوں کہ بے شک خدا اس پر قادر تھا تو کیا اس پر قادر نہ تھا کہ بغیر نطفہ اور خون کے، رحم مادر میں پرورش پانے والے بچے کو بتدریج نشو ونما کرنے کے بعد ایک کامل و مکمل انسان بنادیتا ہے یا بغیر تخم ریزی اور آب پاشی وغیرہ سامان زراعت کے خود بخود نباتات کو زمین سے اگادیتا ہے اگر اس نے باوجود قدرت کے ان جسمانیات میں (نعوذ باللہ) یہ درد سر اٹھائی تو روحانیت میں بھی اس کو اپنی اسی عادت سے مغرور سمجھنا چاہیے اور اگر وہاں اس تدریجی ترقی میں کچھ خاص حکمتیں اور مصلحتیں متعلق ہوسکتی ہیں تو یہاں اسی قسم کی مصلحتوں کا لحاظ کرنے سے کون چیز مانع ہے۔

بہر حال اس میں کچھ حرج نہیں بلکہ عین حکمت اور رحمت ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ

ان مختلف تخم ہائے اخلاق کی تربیت اور نشو ونما کے واسطے اپنی رحمت کے بادل بھیجے اور ان بادلوں کے برسنے سے جس زمین میں جیسا کچھ اچھا یا برا بیج بویا گیا ہے اس کی ترقی اور نشو ونما حاصل ہوا وہ ابر ہائے رحمت جیسا کہ بلالؓ کے کھیتوں کو سرسبز وشاداب کریں ایسے ہی ابوجہل وغیرہ کے دلوں میں جو کفر وشقاوت کا بیج بکھیرا گیا ہے اس میں بھی جان تازہ ڈال دیں انہی سحاب ہائے معارف کو انبیاء کہا جاتا ہے ان کے اثر کو تقویت پہنچانے والوں کا نام ملائکہ ہے اور ان کی تدابیر میں زیادتی کرنے والوں کو شیاطین کا لقب دیا جاتا ہے۔ (بحوالہ: الاسلام، ص:۴۹)

رسالت

شفیع امت نبی برحق ﷺ نہایت ہی غریب تھے کیوں کہ نہ تو آپ بادشاہ تھے اور نہ بادشاہ کے گھرانے میں پیدا ہوئے اور نہ زیادہ آپ نے مال و دولت جمع کر رکھا تھا اور نہ آپ کے باپ دادا نے کوئی میراث جمع کیا تھا اور نہ آپ کے پاس کوئی تنخواہ دار فوج تھی اور نہ اہل وطن آپ کے ہمراہ تھے اور نہ قبیلہ والوں کو آپ کے مذہب سے ہمدردی تھی ایسی بے بسی کی حالت میں آپ نے تند خو گنواروں کو ایک صدائے نامانوس سے مخاطب کیا کہ جس سے بڑھ کر اس وقت ساری دنیا میں کوئی آواز نہ تھی اور نہ ایسی صدا دینے والے سے زیادہ ان کے نزدیک کوئی شخص ان کا دشمن اور بدخواہ سمجھا جا سکتا تھا یہ وہی لا الہ الا اللہ کی آواز تھی کہ جس نے دفعتاً تمام عرب میں تہلکہ ڈال دیا جس سے باطل معبودوں کی حکومت میں بھونچال آنا شروع ہو گیا اور جس کی چمک سے اس کفر و جہالت کی تاریکیوں میں بجلی سی آواز گونجگئی گویا وہ ایک زور و شور کی ہوا تھی جس کے چلتے ہی شرک و بت پرستی کے بادل چھٹ گئے اور آفتاب توحید ابر کے پردے سے باہر نکل آیا ابابیل رحمت تھی جس کی بوچھار نے مخلوق پرستی کے سیاہ ہاتھوں کے پرخچے اڑا دیئے۔ اور خدا کے گھر کو ان کی زد سے بچا لیا۔ غرض کہ ایک ایسے بے یار و مددگار نے ایسی سخت قوم کو ایسی ظلمت کے زمانے میں ایسے اجنبی مضمون کی طرف ابھارا اور چند عرصے میں ان سب کو مسخر اور گرویدہ بنا لیا کہ جہاں آپ کو پسینا گرے وہاں خون بہانے کے لیے تیار ہو گئے گھر بار کو ترک کر دیا زن و فرزند سے بگاڑ پیدا کی مال و دولت کو سنگ ریزوں سے زیادہ حقیر سمجھا اپنے رشتہ داروں اور بے گانوں سے آمادۂ جنگ و پیکار ہوئے کسی کو آپ نے مارا کسی کے ہاتھ سے آپ مارے گئے پھر دو چار روز کا

ولولہ نہ تھا بلکہ آپ اس کے بعد بھی اسی حالت پر استقلال کے ساتھ جمے رہے حتی کہ قیصر وکسریٰ کے تخت الٹ دیئے فارس وروم کو تہہ وبالا کر دیا اس پر معاملات میں وہ شائستگی رہی کہ کسی لشکری نے سوائے مقابلۂ جہاد کے اور کوئی عمل نہ چھوڑا اب بھلا خود بتلایئے کہ اس سے پہلے زمانے میں بھی کسی سے ظاہر ہوئی۔ اس پر بھی اگر کوئی یہی کہے کہ نہیں اسلام بزور شمشیر ہی پھیلا ہے تو فی الواقع اس سے زیادہ کور چشم اور تنگ دل متعصب کوئی نہیں ہوسکتا کاش کے رسول اللہ ﷺ کے اخلاق کو یہ لوگ حضرت عمرؓ سے پوچھتے اور اپنے اسلام کا واقعہ ان کے سامنے بیان فرماتے یا سلمان فارسیؓ سے جاکر ان کی داستان سنتے یا عبد بن سلام کی خدمت میں اپنا اشکال پیش کرتے اور ان کو اس کا جواب سمجھاتے یہ تمام کے تمام آپ ﷺ کے اخلاق کی حالات تھی باقی آپ ﷺ کے علم وفہم کا نشان سب سے بڑا یہی ہے کہ آپ ﷺ بذاتِ خود امی محض تھے اور جس ملک میں پیدا ہوئے جہاں ہوش سنبھالا بلکہ ساری عمر گذاری اور اس جگہ علم کی جو بھی نہ تھی، نہ وہاں علوم دینی کا پتہ نہ علوم دنیاوی کا نشان پھر اس پر ایسا دینی آئین ایسی کتاب لاجواب اور اسی ہدایات بینات لائے کہ آج تک بڑے بڑے حکماء اس کا جواب نہیں لاسکے بلکہ بڑے بڑے مدعیان عقل وفہم نے اس کی داد دی ہے۔

اور نبی اکرم ﷺ خاتم الانبیاء ہیں یعنی آپ ﷺ کے بعد کوئی نبی تا قیامت نہیں آسکتے ہیں (مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قرب قیامت فی الدنیا نزول بھی ہوگا تو آپ ﷺ ہی کی دین کو پھیلائیں گے نہ کہ وہ نبوت کا دعوی کریں گے) اور اگر کوئی جھوٹا نبی آیا اور نبوت کا دعوی کیا تو سراسر وہ کافر ہے جیسا کہ مسیلمہ کذاب نے کچھ زمانہ قبل نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو حق جل مجدہ نے اس کو حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھوں جہنم کا راستہ دکھلا دیا اسی طرح ہندوستان کے اندر مرزا غلام احمد قادیانی نے نبوت کا دعوی کیا تھا تو حق جل مجدہ نے علماء ہند کے ہاتھ ان کا سر کچل دیا خیر آپ کے خاتم الانبیاء ہونے میں اگر کسی کو ذرہ برابر بھی شک وشبہ ہو تو اس کا ایمان ناقص ہے

مکمل نہیں ہوسکتی حتی کہ آپ ﷺ کی خاتمیت کا مکمل عقیدہ نہ رکھے کیوں کہ قرآن وحدیث اس بات پر صراحۃً وارد ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں بقولہ تعالی۔ اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دینا۔ اس آیت کے اندر کہا جارہا ہے کہ اے محمد ﷺ میں نے آپ پر دین مکمل کردی اب آپ ﷺ کے بعد کوئی نئی دین ونئی شریعت آنے والی نہیں ہے اور لفظ نعمتی کے اندر شریعت ودین کے تمام کے تمام شرائط وموجود ہیں مثلاً قرآن، معجزہ وغیرہ یعنی ان تمام چیز کی تکملہ وتتمہ ہوگئی ہے اب کوئی نئی چیز دنیا کے اندر آنے والی نہیں ہے اور اگر کوئی کذاب اپنے جانب سے گڑھ کر کے لاتا ہے تو وہ سراسر ملعون ہے۔ اسی طرح حدیث بھی اس بات پر شاہد ہے کہ نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا: انا خاتم النبیین و لا نبی بعدی کہ میں خاتم نبوت ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے بہر حال ان کے علاوہ بہت ساری حدیث وقرآن اس بات پر دال ہے کہ آپ ﷺ خاتم الانبیاء ہیں آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے۔

(بحوالہ: مقالات عثمانیؒ، ص:۶۱)

اشکالات اور اس کے جوابات

فی باب الصلاۃ

﴿ظہر﴾

سوال: جب اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود اور جملہ اوقات کو محیط ہے تو عبادت کرنے کے اوقات جدا جدا کیوں؟

بلکہ بندہ پانچوں وقت کی نماز کسی ایک ہی وقت میں ادا کر لیتے تو بہتر تھا نیز دیگر پریشانیوں سے بھی نجات مل جاتی اور تضیع وقت بھی لازم نہیں آتا کہ ۲۴ر گھنٹے میں پانچ پانچ مرتبہ تکلیف اٹھاتے۔

وجہ اوّل: نماز ظہر کے وقت کی تعین کی وجہ یہ ہے کہ ظہر کی نماز سے قبل زوال کا وقت ہوتا ہے اور اس وقت شیاطین کا وسوسہ عام رہتا ہے کہ کس وقت کس کا بیڑا غرق کردے بہر حال جب آدمی اس وسوسہ سے محفوظ رہ جاتا ہے تو اسی خوش حالی کے بنا پر انسان بارگاہ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتا ہے لہٰذا نماز ظہر کی تعین ہوگئی۔

وجہ ثانی: دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ وقت کاروبار کی باہمی کا ہے صبح سے اس وقت تک دنیا میں مشغول رہی تو اس وقت خدا تعالیٰ سے غفلت ہو جاتی ہے تو اس غفلت کو دور کرنے اور خدا تعالیٰ کے ذکر و عبادت سے اسکی طرف توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔ (ترمذی)

وجہ ثالث: تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ عام طور پر انسان ۱۲ر یا ۱۱ر بجے بعد سو جاتا ہے اور زوال کے بعد اس کی نیند ختم ہوتی ہے تو اس وقت اس کے پورے بدن

پر حیلولہ چھایا رہتا ہے یعنی نسیان کا مرض پیدا ہو جاتا ہے تو اس مرض کو دور کرنے کے لیے نماز ظہر کی تعین ہوگئی۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ ہر چیز کو پیدا کرنے والے ہیں خواہ گرمی ہو یا سردی تو پھر ظہر کے وقت ٹھنڈا کر کے نماز ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے کیوں کہ اللہ ہی تو گرمی کو بھی پیدا کیا ہے تو گرمی ہی کے اندر نماز ادا کرنی چاہیے۔ بلکہ اس کے اندر بدرجہ اولی نماز ادا کرنی چاہیے تا کہ گرمی کے اندر اللہ تعالیٰ تخفیف کر دے کہ میرا بندہ ذکر اللہ میں مصروف ہے۔

جواب اوّل: یہ دیا گیا کہ موافق اور مخالف کیفیتوں کا جاری ہونا ہوتا ہے اس لیے گرمی سے بچنا بہتر ہے اور یہ کہ نمازیوں کو گرمی کی شدت سے کوئی تکلیف نہ پہنچے کیوں کہ مصلین اللہ کا پیارا بندہ ہوا کرتا ہے چنانچہ اگر ان محبوب بندے کو تکلیف پہنچے گی تو اللہ تعالیٰ کا عذاب اور زیادہ ہوسکتا ہے لہٰذا الٰہی تمام وجوہات کے بنا پر ٹھنڈک کر کے نماز پڑھا جائے۔

جواب الثانی: نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: **اذاشتد الحر فابردو بالظهر فان شدة الحر من فيح جهنم** ۔یعنی جب گرمی کی شدت ہو تو ظہر کو ٹھنڈا کر کے پڑھا کرو کیوں کہ گرمی کی شدت جہنم کا جوش ہے۔

(بحوالہ: المصالح العقلیہ: ص:۷۹)

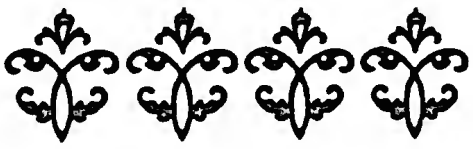

وجہ تعین صلوٰۃ عصر

وجہ اوّل : پہلی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی ایک بہت بڑا زبردست کمال مخلوق ہے اور وہ اس وقت کم ہوتا جارہا ہے تو اس قدرتِ الٰہی میں یہ بھی ہے کہ ہمارے سارے کمالات وایمان اس کی مانند کہیں ہونے لگے اس لیے توبہ ودعا اور عبادت ضروری ہوئی لہٰذا اپنی کمالات وایمان کو محفوظ رکھنے کے لیے نماز عصر ادا کر کے دعا کرتے ہیں کہ یا اللہ ہمارے کمالات اور ایمان کو محفوظ رکھنا۔

وجہ ثانی : دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دن ختم کے قریب ہے کاروبار کا نچوڑ ہے ہر شخص اسی میں انہماک چاہتا ہے تو خدا تعالیٰ سے غفلت کا بہت بڑا خطرہ ہے اس لیے نماز عصر مقرر ہو گئے تا کہ انسان ذکر اللہ سے غفلت نہ برتے۔

وجہ ثالث : یہ بھی ہے کہ عصر کی نماز کے وقت حضرت حق جل مجدہٗ کے مخصوص فرشتے بحکم الٰہی زمین پر تشریف فرما ہوتے ہیں اور جو شخص جیسا عمل کرتا ہے ویسا ہی معاملہ فرشتے خدا تعالیٰ تک پہنچاتے ہیں لہٰذا اس بناء پر بھی انسان عصر کی نماز ادا کرتے ہیں۔ (بحوالہ: ایضاً ص: ۸۲)

وجہ تعین صلاۃ مغرب

وجہ اوّل : یہ ہے کہ جو بلا و مصیبت دن کی روشنی میں آنے والی تھیں وہ مصیبت اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے روک کے رکھا یا اس مصیبت کو روکا نہیں بلکہ بندوں پر نازل کر دیا یا مصیبتیں آنے والی ہیں تو ان تمام مصیبتوں کے ختم ہونے اور آنے والی مصیبتوں سے چھٹکارا پانے کے لیے دعا مغفرت اور نماز مغرب ادا کرتے ہیں کہ یا اللہ ہمیں ہر ایک بلا سے محفوظ رکھ لہٰذا مغرب کی نماز کی تعین ہو گئی۔

وجہ ثانی : دوسری وجہ یہ ہے کہ دن ختم ہو کر رات شروع ہونے پر تمام دن کی کوتاہیوں سے استغفار اور نعمت پر شکر کا وقت عبادت کے لیے مناسب اور احسن ہے۔ اس لیے بھی انسان کو چاہیے کہ صلوٰۃ مغرب ادا کرے۔

وجہ ثالث : یہ ہے کہ یہ غروب شمس کا وقت ہے اور اس وقت میں شیطان کا کافی وسوسہ ہوتا ہے جس میں بہت سارے انسان ملوث ہو جاتے ہیں اور بہت سارے انسان کو اللہ تعالیٰ نجات دے دیتے ہیں۔ تو اسی شکریئے میں بندہ صلوٰۃ مغرب ادا کرتے ہیں۔ (بحوالہ: ایضاً: ص: ۸۵)

وجہ تعین صلوٰۃ عشاء

وجہ اوّل :رات کا آنا مصیبت کے چھاجانے کے مشابہ ہے قدرتِ الٰہی میں ہے کہ نورِ آفتاب کے بدلہ اندھیرے کی طرح ہم پر بھی خوشی کے نور کے بدلہ غم کا اندھیرا طاری کردیں اس لیے عبادت کی برکت سے ان کو رفع دفع کرنا چاہیے۔ فلھٰذا ان مصیبتوں کو دور کرنے کے لیے نمازِ عشاء متعین ہوگئی۔

وجہ ثانی :دوسری وجہ یہ ہے کہ جب انسان سوتا ہے تو اس کے اوپر عارضی موت ہوا کرتی ہے اور روح مختلف جگہوں کی سیر کرتی ہے تو ہوسکتا ہے کہ اس وقت اللہ تعالیٰ روح قبض کرلے دوسری بات یہ ہے کہ یہ تاریکی کا وقت ہوتا ہے اور برائی کا زیادہ امکان ہوتا ہے لہٰذا الٰہی تمام مشکلات وبلیات وبرائی سے بچنے کے لیے نماز عشاء کی تعین ہوگئی۔

وجہ ثالث :یہ ہے کہ جب تاریکی چھاتی ہے تو بکثرت جوق در جوق شیاطین کا نزول ہوتا ہے تاکہ انسان کو گمراہ کریں یا ہلاک وبرباد کے گھاٹ اتاریں لیکن اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ فرشتے بھیجتے ہیں تاکہ انسان کی حفاظت کرے۔اس لیے بھی صلوٰۃ العشاء تعین ہوئی تاکہ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں۔ (بحوالہ:ایضاً:ص:۸۹)

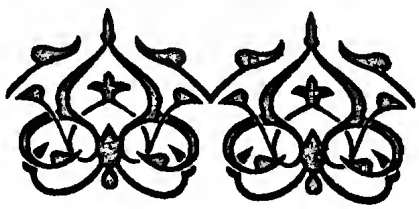

وجہ تعین صلاۃ فجر

وجہ اوّل : پہلی وجہ یہ ہے کہ ایک طویل وقت تک انسان اس مصیبت کی تاریکی میں مشغول رہتا ہے آخر کار رحمت خداوندی جوش مارتا ہے اور تاریکی جاتی رہتی ہے اور پھر حسبِ مطابق صبح کا سہانہ وقت دستیاب ہوتا ہے لہٰذا اس حالتِ روحانی کے مقابل پر نماز فجر مقرر ہے۔

وجہ ثانی : یہ ہے کہ رات کی خیریت سے گزرنے اور تازہ دم ہونے کے شکریہ اور دن بھر کے کاروبار میں برکت کے لیے عبادت اور دعاؤں کی ضرورت ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ فجر کی تعین ہوگئی۔

نیز اس کے علاوہ اور بہت سارے وجوہات (تعین صلوٰۃ کے ہیں) جو عند اللہ والمرسل مخفی ہے جہاں تک ہماری عقل وفہم رسائی نہیں کر سکتی۔

وانا اکتفی بھٰذہ الکلمات العدیدۃ.

(بحوالہ: ایضاً: ص: ۹۰)

مخاطب پنڈت جی

بحوالہ: المصالح العقلیہ، مصنفہ حضرت تھانویؒ

اب ان تمام جوابات کے بعد ہم پنڈت جی سے مخاطب ہوں گے کہ ان باتوں سے معلوم ہوا کہ ذکر اللہ کے اندر رحمت ہی رحمت ہے اور اس عبادات کی بناء پر تمام مخلوقات کو رزق دی جاتی ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم کیوں کہ اللہ تعالیٰ دنیا کے اندر رحمٰن ہیں یعنی مسلم اور غیر مسلم دونوں پر فضل فرماتا ہے اور آخرت کے اندر رحیم ہیں یعنی بروز قیامت فقط اہل اسلام پر فضل فرمائیں گے اور غیر مسلموں پر عدل کا معاملہ کریں گے۔

بہر حال پنڈت صاحب کو چاہیے کہ ایمان قبول کر لے تا کہ آپ اللہ کی نعمت کا شکریہ ادا کر سکیں اور بروزِ قیامت آپ پر فضل کیا جائے۔

سوال: آپ اہل اسلام بعض نماز جہری پڑھتے ہیں اور بعض نماز سری پڑھتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ لوگوں کی باتوں کو اللہ تعالیٰ سننے پر قادر نہیں ہیں۔ (نعوذ باللہ) اس لیے جب جب آپ کی باتوں کو سننے پر قادر ہوتے ہیں تو اس وقت جہری پڑھتے ہیں تا کہ جلد از جلد اللہ کے کانوں میں آپ کی آواز داخل ہو جائے۔ (نعوذ باللہ)

جواب: نماز ظہر و عصر میں خفیہ اور مغرب و عشاء و فجر کی نمازوں میں بآواز بلند قرأت کرنا نہایت مناسب اور حکمت الٰہی پر مبنی ہے کیوں کہ مغرب و عشاء و فجر میں لوگوں کو اکثر شواغل واقوال واصوات وحرکات میں خاموشی اور ان سے سکون وآرام ہوتا ہے اور ان وقتوں میں ان کے افکار وتصورات بھی کم ہوتے ہیں لہٰذا ایسے اوقات کی قرأت دلوں میں زیادہ مؤثر ہوتی ہے کیوں کہ دل تو افکار و ہموم سے خالی اور صاف ہونے سے اور کان شواغل وحرکات واصوات کے نہ ہونے سے سمجھنے اور سننے پر آمادہ

ہوتے ہیں چنانچہ رات کی بات کہی ہوئی کانوں سے گذر کر سیدھی دل پر جا کر لگتی ہے اور پکی اور مؤثر ہوتی ہے اس امر کی طرف خدا تعالیٰ نے بھی قرآن کریم میں ارشاد فرمایا ہے: اِنَّ ناشئة اللیل ھی اشد ..... یعنی رات کے اٹھنے سے نفس خوب پامال ہوتا اور کچلا جاتا ہے اور بات کہی ہوئی دل پر پکی و مستحکم ہوتی ہے۔ غرض کہ یہ امر مسلم ہے اور تجربہ بھی اسی امر کا گواہ ہے کہ خوش حال آدمیوں اور پرندوں اور باجوں وغیرہ کی آواز رات کو بنسبت دن کے دلوں کو زیادہ مؤثر اور خوش معلوم ہوتی ہے لہٰذا ان اوقات میں جہری قرأت پڑھنی مقرر ہوئی جس میں زیادہ مؤثر ہو۔

اسی طرح ظہر و عصر کی نمازوں میں قرآن کے آہستہ پڑھنے میں یہ حکمت ہے کہ دن میں بازاروں اور گھروں کے اندر شور و غل رہتا ہے اس لیے اوقات ظہر اور عصر میں کثرت شواغل و حرکات و اصوات متفرق امور و افکار سے دلوں کو فراغت کم ہوتی ہے اور بات پر توجہ صحیح طریقے سے جمتی نہیں اس لیے ان وقتوں میں قرأت کے اندر جہری مقرر نہیں ہوا چنانچہ قرآن حکیم میں بھی اسی امر کی طرف خدا تعالیٰ نے ایما فرمایا ہے: ان لك فی النھار سبحاً طویلاً . یعنی دن دن میں تجھ کو دور دراز شغل رہتا ہے اور اس وقت پوری توجہ نہیں ہوتی اور رات میں دل کو زبان سے اور زبان کو کان سے پوری موافقت ہوتی ہے یہی وجہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ فجر کی نماز میں ساٹھ سے سو آیات پڑھتے تھے اور حضرت ابوبکر صدیقؓ فجر میں مکمل سورۂ بقرہ اور عمر بن خطابؓ سورۂ نمل، ہود، بنی اسرائیل، یونس، وغیرہ لمبی لمبی سورت پڑھا کرتے تھے۔ یہی وجوہات ہیں نماز کے اندر جہری اور دوسری پڑھنے کی ففھم۔

سوال: جب آپ اہل ایمان کہتے ہیں کہ دن میں کثرت مشاغل رہا کرتا ہے اس لیے نماز سری ادا کرتے ہیں اور رات کے اندر لوگ اطمینان و سکون سے رہتے ہیں اس لیے نماز جہری ادا کرتے ہیں۔ تو پھر آپ نماز جمعہ و عیدین کو دن ہی میں ادا کرتے ہیں اور سری نہیں بلکہ جہری ادا کرتے ہیں آخر ایسا کیوں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ

کے مذہب کے اندر مساوات نہیں ہے کیوں کہ کبھی تو آپ دعویٰ کرتے ہیں صلوٰۃ بالجہر کی اور کبھی دعوی کرتے صلوٰۃ بالسر کی۔

جواب اول :جب دن کے وقت کوئی ایسی نماز پیش آجاوے جو نماز کے علاوہ تبلیغ اسلام وتعلیم ووعظ وترہیب وتلقین کے لیے مقرر کی گئی ہو تو وہاں قرأت دن میں بالجہر پڑھنی چاہیے مثلاً صلوٰۃ جمعہ وعیدین اور استسقاء اور بعض ائمہ کے نزدیک کسوف کی نمازوں میں قرأت جہری پڑھی جاتی ہے کیوں کہ ان وقتوں میں قرأت کا جہر سے پڑھنا لوگوں کے جمع ہونے کے مقصود کو مفید ہوتا ہے یعنی لوگوں کے لیے تعلیم وتبلیغ احکام اسلام ووعظ بھی اغراض ہوتے ہیں لہٰذا ایسے موقعوں کے بڑے بڑے گروہوں کو خدا تعالیٰ کا کلام سنایا جاتا ہے اور ان کی تبلیغ احکام کی جاتی ہے کیوں کہ ان کو ایسے اجتماع کا موقع بہت دنوں کے بعد ملتا ہے اور یہ امر رسالت کے عظیم مقاصد میں سے ہے۔

جواب ثانی :دوسرا جواب یہ دیا جائیگا کہ ایسے ایسے موقعوں پر اکثر لوگ جمع ہوتے ہیں حتی کہ بچے عورتیں تمام کے تمام افراد ایک مکان پر اطمینان وسکون کیساتھ کسی منتخب جگہ پر بیٹھتے ہیں اور شور وشغف نہیں ہوتا ہے اس کے برخلاف دن کے دیگر نمازوں میں شور وشغف ہوتا ہے اس لیے نماز جمعہ وعیدین میں نماز جہری ہوگی نہ کہ سری۔

سوال: اسی طرح آپ جب اہل ایمان نماز پڑھتے ہیں تو حالتِ تشہد میں شہادت انگلی کو کیوں اٹھاتے ہیں اگر آپ کہیں گے کہ خداوند قدوس کی وحدانیت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے تو کیا آپ نفس ہی نفس میں وحدانیت کی طرف اشارہ نہیں کرسکتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا رب آپ کے نزدیک نہیں ہے بلکہ دور ہے اس لیے اشارہ کرتے ہیں کہ ہمارا رب وہ ہے۔

جواب: حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جواب دیا کہ اس عمل میں بھید یہ ہے کہ انگلی کے اٹھانے میں توحید کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے قول وفعل میں مطابقت ہوتی ہے اور توحید کے معنی آنکھوں کے سامنے مشتمل ہوتے ہیں۔

☆☆☆

کیا مورتی کی تصدیق ہوتی ہے

سوال: اسی طرح آپ ابتدا نماز میں دونوں ہاتھوں کو کانوں تک اٹھاتے ہیں اور رکوع سجود کرتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جب آپ نماز شروع کرتے ہیں ا ہاتھ اٹھاتے ہیں اس سے ایک خدا کی طرف اشارہ ہے اسی طرح رکوع کرتے ہیں تو اس سے دوسرے خدا کی طرف اشارہ ہے اسی طرح سجدہ کرتے ہیں تو اس سے تیسرے خدا کی طرف اشارہ ہے اس سے ثابت ہوا کہ آپ کے یہاں بھی متعدد خدا ہیں۔

جواب: جناب معاملہ یہ نہیں ہے بلکہ ہم متفرق عمل کے ذریعہ خدا کو راضی کرتے ہیں اور ہاتھوں کو کانوں تک اٹھانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ میں کسی چیز کا مالک نہیں سب چیزیں تیری ہے ان کا تو ہی مالک اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ ہم تمام طاقتوں سے خالی ہیں اور سب قوتوں اور طاقتوں کا تو ہی مالک ہے۔

سوال: ان لوگوں کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت ہر دم بندوں پر توجہ و نظر فرماتا ہے لیکن انہی کی کتاب ابوداؤد، اور نسائی کے اندر یہ بات مذکور: **لایزال اللہ تعالیٰ مقبلاً علی العبد وھو فی صلوٰتہ مالم یلتفت فاذالتفت اعرض عنہ** ۔یعنی جب تک بندہ نماز میں رہتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں جب بندہ نماز کی حالت میں رہتا ہے تو خدا تعالیٰ اس کی طرف توجہ فرماتے ہیں لیکن جب بندہ حالتِ نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتا ہے تو خدا تعالیٰ بھی توجہ ہٹا لیتے ہیں۔

جواب: اس حدیث کے اندر توجہ ہٹانے سے یہ مراد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ صاف طور پر بندہ کو بھول ہی گیا بلکہ یہاں پر مراد یہ ہے کہ جب کوئی بندہ خدا کی جانب متوجہ ہوتا ہے تو رحمت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور جب نماز میں اِدھر اُدھر دیکھتا

ہے تو دروازے بند ہو جاتے ہیں۔

سوال: آپ اہل ایمان نماز سے فارغ ہوتے وقت سلام کس پر نچھاور کرتے ہیں کیا اللہ تعالیٰ پر سلام نچھاور کرتے ہیں یا فرشتے پر اگر آپ اللہ تعالیٰ پر سلام نچھاور کرتے ہیں تو تحصیل حاصل ہے کیوں کہ اسی کی صفت اور اسی پر بھیجنا یہ تحصیل حاصل ہے اگر فرشتے پر نچھاور کرتے ہیں تو فرشتے نظر کہاں آتے ہیں۔

جواب: ہم فرشتے پر سلام بھیجتے ہیں اور فرشتے مخفی طور پر انسان کی حفاظت کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ دائیں بائیں سلام پھیرنے میں اشارہ ہے کہ حالتِ نماز میں گویا میں اس عالم سے باہر چلا گیا تھا اور ماسوی اللہ سے فارغ ہو کر اس کی درگاہ میں پہنچ گیا تھا اس کے بعد اب پھر آیا ہوں اور موافق اسم آئندگان ہر کسی کو سلام کرتا ہوں۔ (بحوالہ: ایضاً ص: ۸۷)

غیر مسلموں کے اقوال

آریوں نے کہا کہ ہمارے نزدیک بہت سے خدا تو ہیں ہی لیکن یہ تمام کے تمام خدا حقیقت میں ایک ہے القصہ اس امر محال کو اختیار کیا کہ وحدت بھی حقیقی ہو اور کثرت بھی حقیقی ہو مگر پھر بھی توحید کو ہاتھ سے نہ چھوڑا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت سے کسی کو انکار نہیں ہے بلکہ اصل اصول سب کے نزدیک توحید ہی ہے اور جب توحید مسلم اور اصل ٹھہرا تو پھر جو باتیں مخالف توحید ہوں گی وہ خود غلط ہوں گی یعنی شرک اور بت پرستی اور کثرت معبودان اپنے آپ غلط ثابت ہوں گے۔ یہ تو اسی کے قول کے مطابق ثابت ہوا کہ خداوند قدوس ایک ہیں۔

عقلی دلیل :معبود حقیقی ایک ہی ہے وجہ اسکی یہ ہے کہ تمام عالم وجود میں شریک ہے ایک لفظ موجود سب پر بول سکتے ہیں اور سب کے وجود کو وجود ہی کہتے ہیں کچھ اور نہیں کہتے غرضیکہ ایک چیز تمام اشیاء میں مشترک ہے پھر اسی پر عالم کا یہ حال ہے کہ اکثر موجودات قدیم نہیں حادث ہیں مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ میں موجود نہ تھے اور بعد وجود ایک زمانہ میں معدوم ہو جاتے ہیں اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان اشیاء کا وجود ایسا ہے جیسا گرم پانی کی حرارت اور زمین کی روشنی یعنی ایک زمانہ میں پانی ٹھنڈا اور زمین بے نور تھی اور بعد حرارت ونور'' پھر ایک زمانہ میں وہی ٹھنڈک اور اندھیرا ہے سو جیسے اس آمد وشد حرارت ونور سے ہر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ حرارت ونور آب وزمین کے خانہ زاد کسی سے مستعار نہیں ہیں جس کے یہ خانہ زاد ہیں اور اس پتے پر آخر آتش اور آفتاب کا سراغ نکل آتا ہے ایسا ہی ہے بوجہ آمد وشد وجود اشیاء حادثہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وجود ان کا خانہ زاد نہیں کسی نے مستعار عنایت کیا ہے اس میں یہ وصف خانہ زاد ہی مستعار نہیں اور جو موجودات ایسے ہیں کہ ہمیشہ سے ایک حال پر چلے آتے ہیں اور کسی نے آج تک انکا زمانہ عدم نہیں دیکھا جیسے

زمین و آسمان و آفتاب قمر و کواکب تو گو بظاہر اسی تقریر سے ان کے لیے معطی وجود کا پتا نہیں لگتا پر غور سے دیکھیے تو وہاں بھی یہی عیاں ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ باوجود اشتراک وجود ہر ایک کی حقیقت کو ہر کوئی جدا سمجھتا ہے یہ نہ ہو کہ تو ایک کو دوسرے سے تمیز نہ کر سکتے اس لیے خواہ مخواہ یہ کہنا پڑے گا کہ وجود اور چیز اور اشیاء مذکورہ کی حقیقت اور چیز ہے اور ظاہر ہے کہ جیسے دو چیزوں کا اجتماع ممکن ہے ایسے ہی انکا افتراق بھی ممکن ہے اور جدائی ممکن ہوئی تو پھر خانہ زادی ناچار ہو کر رہ جائے گا اور یہی کہنا پڑے گا کہ ان کا وجود بھی مستعار ہے مگر چوں کہ ہر مستعار چیز کے لیے ایک ایسے دینے والے کی ضرورت ہے جس کے پاس کسی کی دی ہوئی نہ ہو بلکہ اصلی ہو تو بالضرور وجود مستعار کے لیے بھی کوئی دینے والا ہوگا یعنی وجود کے لیے کوئی موصوف اصلی ہوگی جو خود بخود موصوف بالوجود یعنی موجود ہو سو وہی خدا ہے اور اسی کو بے نیاز مطلق کہنا چاہیے اس کو کسی کی حاجت نہیں اور سب کو اس کی حاجت ہے مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ اس قسم کا موجود سوا ایک کے متصور نہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ جب وجود کی وحدت مانی گئی چنانچہ اوپر معروض ہو چکا تو موجود اصلی بھی یعنی جس کے حق میں وصف وجود خانہ زاد ہو ایک ہی ہوگا علاوہ بریں وجود سے زیادہ کوئی عام نہیں اس لیے اسی بات کا اقرار ضروری ہے کہ وجود ایک امر غیر محدود ہے ورنہ محدود ہو تو اس کے اوپر ضرور ایک مرتبہ نکلے گا۔ جس کی نسبت اس کو محدود کہیں اور وہ اس سے بھی زیادہ عام ہو مگر وجود غیر محدود ہوگا تو یہ معنی ہوں گے تمام مواقع وجود کے محیط ہیں پھر اگر دوسرا بھی ایسا ہی ہو تو وہ کہاں جائے یہ بھی احتمال نہیں کہ دو ہوں دونوں ملکر ایسی طرح شدید ہو جائیں جیسے دو چراغ کا نور ملکر زیادہ تر چمک کا باعث ہو جاتا ہے کیوں کہ موصوف اصلی سے زیادہ اور کوئی موصوف نہیں ہو سکتا نہ اسکے وصف سے زیادہ کا وصف ہو سکے خاص کر وجود اصلی، کیوں کہ اس سے اوپر کوئی مرتبہ نہیں اسی وجہ سے وہ غیر محدود ہوا ورنہ محدود ہوتا تو آخر یہ بھی ایک حد ہے کہ اس سے زیادہ شدید ہو سکتا ہے۔ بالجملہ بروئے دلیل عقلی بھی خدا کی وحدانیت ضروری تسلیم ہے ارجب عقل و نقل دونوں اس بات پر شاہد ہوں کہ خدا وحدہ لاشریک لہ ہے تو پھر اوروں کی عبادت ظلم عظیم ہوگی۔

وحی الٰہی پر آریوں کا اعتراض

سوال: جب خداوند قدوس ہر ایک چیز کے قریب ہے اور اسکا کوئی خاص مکان نہیں تو جبرئیل کہاں سے پیغام لاتے تھے کیا خدا تعالیٰ پیغمبر پر خود براہِ راست الہام نہیں کرسکتا تھا کہ جبرئیل کی وساطت کی ضرورت پڑی، نیز جب خدا تعالیٰ ہر جگہ موجود ہیں اور تمام خلقت بھی اس کے سامنے حاضر ہے تو اسے رسول (قاصد) بھیجنے کی کیا ضرورت تھی اور انہیں رسول کیوں کہا جاتا ہے کیا خدا کہیں دور ہیں جو اسے اپنے مخلوق کی طرف بھیجے؟۔

جواب: یہ دیا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ کے سارے کام ہی اسباب ظاہری سے مضبوط و مربوط ہیں اور وہ مسبب الاسباب ہیں تو اگر ارسال وحی میں اس نے جبرئیل کو واسطہ ٹھہرالیا تو کیا وساطت لازم آگئی۔

حاضرین مجلس: یہ سوال آریہ لوگ کرتے ہیں جو البتہ اللہ تعالیٰ کے حکم و اسرار ہی نہیں بلکہ قوت ایجادیت ہی سے ناواقف ہیں لیکن کس قدر افسوس کی بات ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے افعال کے لیے تو اسباب کے قائل ہوکر اس کو علت قرار دیتے ہیں پر اس سبب سے منکر یا غافل وہ اسباب کے قائل ہیں کہ مینھ برسانے کے لیے اللہ تعالیٰ پہلے سورج کی کرنیں سمندر پر ڈالتا اور حرارت آفتابی سے پانی کی بخارات مائیہ کی شکل میں منتقل کرتا ہے اور پھر ہواؤں کے ذریعہ سے خشکی میں لاتا اور ٹھنڈی ہواؤں کے جھوکوں سے ان کو کثیف کرکے بادل بناتا اور اتنی وسائط و اسباب سے مینہ برساتا ہے اور اسی طرح غلہ پیدا کرنے میں بلکہ ہر امر کے سرانجام کے لیے کئی امور کو واسطہ ٹھہراتا ہے لیکن اس بات سے تعجب کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ملکی وجود (جبرئیل) کو اپنے الہامات او

پیغام رسائی کا واسطہ بنایا وہ اس بات کے قائل ہیں کہ بغیر کسی توسط کے سوائے آواز کے سن لینا خلاف قانون قدرت ہے مگر وہ ہوا جو روحانی طور پر خدا تعالیٰ کی آواز کو مخلوق کے دلوں تک پہنچاتی ہے اس قانون قدرت سے غافل ہیں وہ اس بات کو مانتے ہیں کہ ظاہری آنکھوں کی بصارت کے لیے آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہے مگر وہ روحانی آنکھوں کے لیے کسی آسمانی روشنی کی ضرورت یقینی نہیں کرتے۔

سوال: جب کہ اسلام کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ شیطان ہر ایک شکل وصورت بدل سکتا ہے اور طرح طرح سے لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اور خیالات بدلتا رہتا ہے تو اس جہت سے ممکن ہے کہ شیطان حضرت جبرئیل کا بھیس بدل کر تمہارے پیغمبر کے پاس آجایا کرتے ہوں پس تم کو اور تمہارے نبی کو کس طرح تسکین ویقین ہوسکتا ہے کہ یہی حضرت جبرئیل ہیں شیطان نہیں۔ بہر حال جب شیطان اپنے بھیس کو بدل سکتا ہے تو تمہارا قرآن غلط لہٰذا تمہارا مذہب بھی غلط۔ (نعوذ باللہ)

جواب: اوّل تو ان کا سوال ہی غلط وباطل ہے کہ شیطان حضرت جبرئیل کی شکل بدل سکتا ہے کیوں کہ قرآن شریف کے کسی مقام سے یہ بات ثابت نہیں کہ ناری کسی نوری فرشتہ کی صورت بدل سکتا ہے یا عالم بالا پر اس کو کچھ دسترس ہو بلکہ برخلاف اس کے قرآن شریف کے کئی مقامات سے یہ ثابت ہے کہ وہ ملائکہ کو دیکھ کر بھاگتا اور ان کے سامنے ٹھہرتا نہیں جیسا کہ اس بات پہ قرآن شاہد ہے بقولہ تعالیٰ:

وَاِذزَیَّنَ لَهُمُ الشَّیْطَانُ اَعْمَالَهُمْ وَقَالَ لَا غَالِبَ لَكُمُ الْیَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّی جَارٌ لَّكُمْ فَلَمَّا تَرَاۤتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلٰی عَقِبَیْهِ وَقَالَ اِنِّی بَرِیْٓءٌ مِّنْكُمْ اِنِّیْٓ اَرٰی مَالَا تَرَوْنَ اِنِّیْٓ اَخَافُ اللّٰهَ وَاللّٰهُ شَدِیْدُ الْعِقَابِ.

اور جب شیطان کفار کو انکی حرکات عمدہ کر کے دکھایا اور کہا کہ آج لوگوں میں ایسا کوئی نہیں جو تم پر غالب آسکے اور میں تمہارا پشت پناہ ہوں پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے آئیں اپنے الٹے پاؤں چلتا بنا اور کہنے لگا کہ میں تم سے بیزار ہوں میں

وہ چیز دیکھ رہا ہوں جو تم کو سوجھ نہیں پڑتی یعنی میں تو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔ ابذرا غور فرمایئے کہ اگر شیطان فرشتہ کا روپ بدل سکتا تھا تو الٹے ہی پاؤں کیوں کر بھاگتا وہ بھی فرشتے کی صورت میں ہو جاتا اور کفار کی رفاقت اور حمایت میں حاضر رہتا لیکن یہ شیطان ان نورانی وجودوں کے آگے ٹھہر ہی نہیں سکتا تو اس کا فرشتے کی شکل اختیار کر کے انبیاء کرام کو بہکانا اور جبرئیلی بھیس بدل کر ان کے پاس وحی لانا یہ تو بالکل ہی غلط ہے ہاں قرآن وحدیث سے اتنا ضرور ثابت ہے کہ شیطان جیسا کہ اس کا خاصا اور اس کی فطرت ہے انسان کے دلوں میں وسوسے اور خیالات بدل ڈالتا ہے اور برے مشورے دیا کرتا ہے لیکن یہ کہیں سے ثابت نہیں کہ وہ نورانی فرشتوں کی شکل بنا کر انبیاء کو دھوکا دے سکے۔

جواب الثانی :بالفرض تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ شیطان ہر ایک شکل وصورت اختیار کر سکتا ہے تو بھی کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتا کہ وہ آنحضرت ﷺ کے سامنے جبرئیل کا بھیس بدل کر ایسی ایسی عمدہ اور اعلیٰ و بے نظیر باتیں پیش کرے اور جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی کتاب ہرگز نہیں کر سکتی اور ایسا کلام جو فصیح و بلیغ سے منور ہو جس کا دعویٰ خود قرآن نے کیا قُلْ لَئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ بھلا بتایئے کہ شیطان ایسا کلام کیوں کر پیش کر سکتا ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ شیطان نہ جبرئیل کا بھیس بدل سکتا ہے اور نہ قرآن کی مثل ایک حرف بھی پیش کر سکتا ہے اور نہ آپ ﷺ کے سامنے لب کشائی کر سکتا ہے۔

سوال: جب کہ قرآن شریف پیغمبر کی وفات مبارکہ کے کتنے عرصہ بعد خلیفہ ثالثؓ کے زمانے میں جمع ہوا ہے تو اتنے عرصہ کے بعد اس کے صحیح اور غیر محرف ہونے کی کیا برہان ہے اگر آپ کے پاس دلائل نہیں ہے تو معلوم ہوگا کہ قرآن غلط ہے کیوں کہ حضور ﷺ کے زمانے کے بعد بہت سارے صحابۂ کرامؓ تھے ہوسکتا ہے کہ اپنے

خواہش کے مطابق قرآن کے اندر تخفیف وترمیم کرلی ہو۔

جواب: قرآن شریف خلیفہ ثالثؓ کے وقت میں نہیں بلکہ خلیفہ اوّل ہی کے وقت میں مدوّن اور مکمل ہو چکا تھا چنانچہ اس کی ایک نقل حضرت حفصہؓ کے گھر میں بھی تھی اور حضرت عثمان غنیؓ نے بھی اسی قرآن شریف کو اصل ٹھہرا کر تمام ممالک اسلام میں کلام الٰہی کی نقلیں جابجا شائع کی تھی۔ اصلی جامع قرآن حضرت ابوبکرؓ ہی ہیں انہوں نے ہی حافظوں اور جلیل القدر صحابہؓ کی زبانی یادداشت سے مقابلہ کر کے ان ہڈیوں وغیرہ پر سے قرآن شریف کو ایک جگہ مین نقل اور مدون کرایا اور تمام دنیائے اسلام میں پھیلایا قرآن شریف کی حفظ وضبط کا سلسلہ حضرت رسول اللہ ﷺ ہی کے زمانے سے شروع ہوا ہے حضرت ﷺ کے سامنے ہی سیکڑوں صحابہ کرام حافظ موجود تھے اس وقت ممکن نہ تھا کہ قرآن شریف کی نقلیں اور زیروزبر کا بھی فرق ہوتا جب کہ قرآن شریف ہی سب مومنوں کا ایمان اور طاقت تھی خود حضرت ابوبکرؓ بڑے قاری تھے تو کس طرح ممکن تھا کہ ایک شوشہ کا فرق بھی پڑنے دیتے قرآن شریف کی حفاظت کی نسبت تو یہاں تک یقین ہے کہ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ بھی جمع کرتے تو بھی خدا اس کا حافظ تھا بقولہ تعالیٰ انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحافظون۔ اس کے حفظ وضبط کا سلسلہ جو حضرت رسول اللہ ﷺ کے زمانہ سے شروع ہوا ہے قرآن شریف کی حفاظت کے لیے اعلیٰ دلیل اور پورا کفیل ہے جس شئ کو متواتر ۱۴۰۰ سو سال سے ایک دنیا حفظ وضبط کرتی آئی ہو اس میں تحریف وتبدیل تو کیا اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔

سوال: سورۂ فاتحہ صرف قرآن شریف ہی میں نازل ہوئی یا پہلے پیغمبر پر بھی نازل ہوئی۔

جواب: اس سلسلے میں مفسرین کرام کی رائے ہے کہ الحمد آپ ﷺ کے علاوہ کسی اور نبی ﷺ پر نازل نہیں ہوئی ایک دوسری روایت میں ہے کہ اگر الحمد یہود ونصاریٰ پر اترتی تو وہ لوگ گمراہ نہ ہوتے۔

☆☆☆

قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے کا ثبوت بالدلائل

برھان الاوّل: سب سے پہلی دلیل قرآن مجید کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ خداوند قدوس نے فرمایا یعنی چیلنج کیا۔ **فاتوا بسورۃ من مثلہ الخ** کہ اس کے مثل ایک سورۃ یا ایک آیت نہ لا سکتے ہو کم از کم ایک حرف لا دو لیکن کسی ماں کے لال کی زبان کھل نہ سکی۔ اس کی بہت زیادہ تفسیر ہے لہٰذا دیگر کتب کا مطالعہ کریں۔

برھان الثانی: دوسری دلیل قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے پر یہ ہے کہ خود خداوند قدوس کا قول ہے سورۂ فاتحہ **الحمد اللہ الخ** کہ بہر حال فقط مذکورہ سورۃ کا ترجمہ ہی کر دینے سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں یہ کلام الٰہی ہے۔ نیز جملہ مخالفین کو ہم بھی چیلنج کرتے ہیں کہ وہ اس اردو عبارت کا ترجمہ کسی فاضل زبان عرب عیسائی یا آریہ وغیرہ سے کرائیں اگر فصاحت و بلاغت و متانت و سلاست و قدرتی ترتیب و تسلسل و شان بیان میں اس کی مثل ہو گیا تو (ہم فوراً قرآن شریف کو انسانی کلام مان لیں گے) ورنہ مخالفین کو مناسب ہے کہ خدا تعالیٰ کے کلام کی بے نظیری کو تسلیم کریں اور اس پر ایمان لائیں۔

محاورہ ترجمہ سورہ فاتحہ: کا سب طرح کی تعریف فقط اللہ ہی کیلئے ہے جو سارے جہاں کا پالن ہار ہے اور تجھی کا رب ہے رحمٰن و رحیم روز جزا کا مختار ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں ہم کو راہ مستقیم دیکھا ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے فضل کیا نہ کہ جن پر تیرا غضب ہوا اور گمراہ ہوا۔

برھان الثالث: قرآن شریف نے جگہ جگہ ڈنکے کی چوٹ سے یہ اعلان کیا کہ یہ

کلام الٰہی ہے اس کے کلام الٰہی ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش باقی نہیں۔ وانه لتنزیل رب العالمین نزل به الروح الامین علی قلبك الخ۔ دوسری جگہ فرمایا وماینطق عن الهوی ان هو الاوحی یوحیٰ تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم. وبالحق انزلناه وبالحق نزل. انا نحن نزلنا علیك القرآن تنزیلا قل یا ایها الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا ذلك الکتاب لا ریب فیه. هدی الناس وبینات من الهدی۔ یہاں قرآن شریف علانیہ طور سے پکار کر ساری دنیا کے سامنے دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا کلام اور خدا تعالیٰ کا الہام ضرور ہے۔

بہر حال ہم آریوں اور عیسائیوں کو زیادہ تکلیف دینا پسند نہیں کرتے اور کلام الٰہی کے نشان بیان کرنے اور اپنی اپنی کتابوں میں ان نشانوں کو ثابت کرنے کے لیے تکلیف دیتے ہیں صرف ہم اس سے گذارش کرتے ہیں کہ براہ مہربانی جس زور وشور کے ساتھ قرآن شریف نے کلام الٰہی ہونے کا دعوی کیا ہے اسی زور وشور کے ساتھ وہ بھی اپنی اپنی کتابوں میں ان کے کلام ربانی ہونے کا دعویٰ پیش کریں۔

البرهان الرابع: چوتھی دلیل اسی طور پر بیان کیا جا سکتا ہے کہ قرآن شریف کے کلام الٰہی ہونے کا ثبوت اور اس کا خدائی طرز بیان اور حاکمانہ اسلوب ہے یعنی کلام الٰہی کا بیان اس طرح ہے کہ اسی طریقے پر دنیا کی کسی بھی کتاب کا بیان نہیں ہے مثال کے طور پر لیجئے کہ ارشاد ربانی ہے تنزیل الکتاب من اللہ العزیز الحکیم یہ تحریر بارگاہ خداوندی کے طرف سے صادر ہوتا ہے جو زبردست حکمتوں والا ہے۔ ولا تقربوا لزنی انه کان فاحشة وساء سبیلا۔ اسی طرح اور ارشاد ہے وقضی ربك الاتعبدوا الا ایاه وبالوالدین احسانا۔ اسی طرح فرمایا قل هو اللہ احد اسی طرح ارشاد فرمایا ووصینا الانسان بوالدیه احسانا اسی طرح آگے ارشاد فرمایا ذلك الکتاب لاریب فیه۔ یعنی سراپا خود قرآن کلام الٰہی کا ثبوت ہے جس جس ورق کو پلٹیں ہر ایک لفظ لفظ میں وحدانیت وکلام الٰہی کا ثبوت ملتا ہے۔

قبلہ پر آریوں کا اعتراض

اعتراض: دیانند نے حضرت نانوتویؒ سے دوران مناظرہ یہ کہا تھا کہ مسلمان ہندوؤں کو بت پرست کہتے ہیں اور آپ خود مکان پتھر اور قبلہ کی پوجا کرتے ہیں یعنی نماز جب پڑھتے ہیں تو خانہ کعبہ کی پوجا کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ بھی تو مٹی کو پوجتے ہیں۔

جواب: حضرت نانوتویؒ نے جواب دیا کہ افسوس ہزار افسوس پنڈت دیانند صاحب کے کمالات کا کہ ہندوؤں میں ایک جاہل مہنت ہیں۔ کیوں کہ اس پر پنڈت جی کا یہ حال ہے کہ آسمان کو خاک میں ملا دیتے ہیں استقبال کعبہ اور بت پرستی کو برابر کر دیا جناب عالی اگر پنڈت جی کو ایسی باتوں میں فرق کرنا نہیں آتا تو یہ شہرہ کمال کس خیال پر مبنی ہے اور اگر دیدہ و دانستہ یہ حال ہے تو پھر اور کچھ احتمال ہے۔ بغرض توضیح حقیقت الحال چند باتیں جن سے یہ معلوم ہو جائے کہ استقبال کعبہ اور بت پرستی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لہٰذا میں پنڈت کے باطل سوال کے جوابات دیتا ہوں کہ تا کہ عقل وفہم والے لوگ یہ سمجھ لیں کہ یہ حقیقتاً باطل ہے اور آخرت کی فکر میں مشغول ہو جائے۔

الجواب الاول: لفظ استقبال کعبہ اور بت پرستی ہی اس پر شاہد ہے کہ حکومت پرستی کو توجہ الی الکعبہ کے ساتھ کچھ مناست نہیں اوّل کا مفہوم فقط اتنا ہے کہ کعبہ کی طرف منہ ہو اور بت پرستی کا حاصل یہ ہے کہ بت معبود ہوں۔ ہاں اگر اہل اسلام بھی دعوی کعبہ پرستی کے کرتے تو پھر پنڈت جی کا اعتراض بجا تھا۔ مگر اہل اسلام میں ایسی بات نہیں ہے۔

الجواب الثانی: اہل اسلام کے نزدیک کعبہ کی طرف منہ ہونا چاہیے نیت استقبال کی بھی ضرورت نہیں چہ جائیکہ ارادہ عبادت اللہ خدا کی عبادت کی نیت اور اس کا ارادہ ہونا ضروری ہے اگر یہ نہ ہو پھر وہ نماز اہل اسلام کے نزدیک معتبر نہیں اس

سے صاف ظاہر ہے کہ اہل اسلام خدا کی عبادت کرتے ہیں کعبہ کی عبادت نہیں کرتے اور بت پرستی کے لیے ارادہ نیت عبادت نہیں کرتے اور بت پرستی کے لیے ارادہ اور نیت عبادت و پرستش بت شرط ہے اگر میری اس گزارش میں شک ہو تو پوچھ دیکھیں ہندوں اتن ہنوز آباد ہے ہزار ہا بت پرست موجود ہیں مگر اہل عقل کو نہ پوچھنے کی ضرورت اور نہ کسی کے بتلانے کی حاجت۔

الجواب الثالث : تیرا جواب یہ فرمایا کہ ابتداء صلوٰۃ سے لے کر آخر تک کوئی لفظ مشعر تعظیم کعبہ نہیں آتا ہر لفظ اور ہر فعل خدا کی تعظیم پر دلالت کرتا ہے اوّل تو دست بستہ کھڑے ہو کر اللہ اکبر کہتے ہیں جس میں خدا کی بڑائی اور کبریائی کا بیان ہے پھر **سبحانك اللّٰھم** میں خدا کی پاکیزگی اور ستودگی اور برکت اور علوشان اور توحید کا ذکر ہے پھر اعوذ باللہ میں خدا تعالیٰ سے اس بات کی استدعا ہوتی ہے کہ شیطان کے شر سے مجھ کو بچالے پھر بسم اللہ میں اللہ تعالیٰ کے نام پاک سے مدد مانگی جاتی ہے اس کے بعد الحمد پڑھتے ہیں اس میں اوّل خدا تعالیٰ کی تعریف اور اس کی تربیت عام اور اس کی رحمت عامہ اور خاصہ اور اس کی مالکیت اور اختیار جزا و سزا کا ذکر کر کے خدا سے ہدایت کی دعا مانگی جاتی ہے اس کے بعد قرأتِ قرآن کی جاتی ہے تا کہ اسی حکم نامہ خداوندی کی قرأت و سماعت سے جو امام و منفرد بکمال ادب کرتے ہیں تا کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے کہ ہم خدا کے مطیع و فرماں بردار ہیں نیز پورے ستر کو ڈھانپتے ہیں تا کہ خداوند قدوس کی تعظیم ہو بخلاف پنڈتوں کے کہ ان لوگوں کا یہ حال ہے کہ اپنے ستر کو منکشف ہی نہیں کرتے بلکہ بعض حضرات ننگے بھی ہو جاتے ہیں اور دیگر غیر مسلم کہتے ہیں کہ اس کے بدن پر دیوی دیوتا سوار ہیں بھلا بتایئے کہ کیا یہ تعظیم بھگوان ہے ہرگز نہیں اگر تمہارے پاس ہمت ہے تو اسکا جواب دینا اس کے بعد رکوع و سجدہ ادا کرتے ہیں تا کہ حضرت حق جل مجدہٗ کی رضامندی حاصل ہو جائے۔

الجواب الرابع: چوتھا جواب یہ دیا کہ اہل اسلام کے نزدیک وقت نماز دیوار

ہائے کعبہ کا مقابل ہونا شرط نہیں اگر بالفرض وہ دیوار ہی منہدم ہو جائیں پھر بھی نماز اسی طرف رخ کر کے ادا کریں گے چنانچہ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں جو حضرت ابوبکر صدیقؓ خلیفہ اوّل کے نواسے تھے اور رسول اللہ ﷺ کے پھوپھیرے بھائی کے فرزند تھے یہ اتفاق ہوا کہ انہوں نے بغرض تکمیل بناء کعبہ بناء اوّل کو یہاں تک منہدم کرایا کہ نیو تک وار ڈالی اور پھر اس کے بعد نئے سرے سے تعمیر کرایا اس اثناء میں نماز بدستور جاری رہی اگر دیوار کعبہ مسجود و معبود اور مقصود ہوتی تو اس زمانے میں نماز موقوف رہتی۔ بہت ہوتا تو یہ ہوتا کہ بعد تعمیر ایام گذشتہ کے عبادت قضاء ہوتا اور بت پرستی میں ظاہر ہے کہ مقصود اور معبود اور مسجود یت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کسی شوالے یا مندر میں سے بتوں کو اٹھا کر کہیں اور رکھ دیں تو پھر سارے فرض وہیں ادا ہوتے ہیں مکان اوّل کو نہیں پوچھتا اس بناء پر حضرت نانوتویؒ بار بار فارسی کی یہ شعر پڑھا کرتے تھے۔ بین تفاوت راہ از کجاست تا کجا۔

الجواب الخامس : پانچواں جواب یہ دیا کہ خانہ کعبہ کو اہل اسلام بیت اللہ کہتے ہیں اللہ خدا نہیں کہتے اور یہ بات ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مکان کی طرف جاتا ہے تو مکین مقصود ہوتا ہے اس کی طرف رخ کر کے آداب نیاز بجالاتا ہے تو آداب و نیاز کو ہر شخص صاحبِ خانہ کے لیے سمجھتا ہے غرض جیسے کسی تخت نشیں کو اگر اسی تخت کی طرف جھک کر سلام کرتے ہیں تو وہ سلام صاحب تخت کو ہوتا ہے نہ کہ سراپا تخت کو اور یہ بات اتنی ظاہر ہے کہ کسی دیوانہ کو بھی تردد نہیں ہوتا۔ ایسے ہی عبادت سمت بیت اللہ کو خیال کیجئے اور دیدہ و دانستہ دوسرا احتمال پیدا نہ کیجئے با جملہ لفظ بیت اللہ بشرط فہم و عقل اس جانب مشیر ہے کہ خانہ مقصود نہیں بلکہ صاحب خانہ مقصود ہے اور بت پرست اپنے بتوں کو خانہ خدا یا کرسی خدا یا تخت خدا نہیں سمجھتے مہادیو یا شب یا گنیش وغیرہ وغیرہ سمجھتے ہیں اور چوں کہ ان بزرگوں اور ان کو بت پرستان ہند مستحق عبادت سمجھتے ہیں اس لیے بت پرستی میں وہ بت ہی مقصود ہوتا ہے۔

الجواب السادس: چھٹا جواب یہ دیا گیا کہ اہل اسلام کے نزدیک مستحق عبادت وہ ہے جو بذاتِ خود موجود ہو اور سوائے اسکے اور سب اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں اور سب کے نفع وضرر کا اس کو اختیار ہو اور اس کا نفع وضرر کسی سے ممکن نہ ہو اس کا کمال و جاہ وجلال ذاتی ہو اور سوا اسکے سب کا کمال و جمال وجلال اسکی عطا ہو مگر موصوف بایں وصف انکے نزدیک بشہادت عقل ونقل سوا ایک ذات خداوندی کے اور کوئی نہیں یہاں تک کہ انکے نزدیک بعد خدا سب سے امین افضل محمد رسول اللہ ﷺ ہیں نہ کوئی آدمی ان کے برابر نہ کوئی فرشتہ نہ تو عرش وکرسی ان کے ہمسر نہ کعبہ اور نہ ان کا ہم پلہ دنیا کی کوئی چیز مگر بایں ہمہ ان کو بھی ہر طرح خدا تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں ایک ذرہ کے بنانے کا ان کو اختیار نہیں ایک رتی برابر کے لیے نقصان کی ان کو قدرت نہیں اور خالق کائنات اہل اسلام کے نزدیک خدا ہے اس لیے کہ کلمہ شہادت میں جس پر ایمان کا مدار ہے یعنی اشهد ان لااله الاالله واشهد ان محمداً عبده ورسوله خدا کی وحدانیت اور رسول ﷺ کی عبدیت اور رسالت کا اقرار کرتے ہیں اس صورت میں اہل اسلام کی عبادت سوائے خدا اور کسی کے لیے مقصود نہیں ان تمام جوابات کا خلاصہ کلام یہ ہوا کہ بت پرستی میں پرستش غیر ہے اور استقبال کعبہ میں پرستش خدا ہے اور چوں کہ پرستش خدا بالاتفاق اچھی ہے اور پرستش غیر تمام اہل عقل کے نزدیک بری ہے لہٰذا پنڈت جی کا اعتراض ہی باطل نہیں بلکہ سراپا ان کا مذہب باطل ہے۔

آریوں کا اعتراض اسلام پر

سوال: قرآن کے اندر جو زکوٰۃ دینے کا ذکر ہے بالکل بے جا ہے کیوں کہ زکوٰۃ لینے کے لیے اہل اسلام خود تیار ہیں کہ جب فقیر لوگ ایک ایک پیسے کے لیے ہندو لوگ جن کو مسلمان کافر کہتے ہیں ان کی دوکان کے روبرو خود اپنے ہاتھ سے ہی سر پھوڑ لینا پڑتا ہے اور اپنے پیٹ کا غار بھرنے کے لیے ادھے پیسے پر ہی اپنی زبان بھی کاٹ لیتے ہیں ایسی مفلسی کی حالت میں جبکہ ان کو اپنا پیٹ پالنے کیلئے اتنی مصیبت جھیلنی پڑتی ہے بھلا آپ ہی بتایئے کہ کس طرح زکوٰۃ دے سکتے ہیں اور قریب قریب یہی حالت اسلام کی ہے یعنی جس وقت ان ظالموں کی حکومت ہوگی تو لوگوں سے مار پیٹ کر پیسہ وصول کریں گے لیکن گورنمنٹ عالیہ کا راج ہونے سے اس وقت ظالم کو ظلم کرنے کے عوض خود اپنی زبان کاٹ لینے کو تیار ہیں تو کیا یہ ممکن ہے کہ ظالموں کی ریاست ہونے سے وہ اپنی خودغرضی کے لیے اوروں پر ظلم کرے کیا یہ بھی اس پر لازم ہے اور دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ اسلام میں کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہے۔

جواب: جناب عالی میں بھی تو کہتا ہوں کہ زکوٰۃ فرض ہے لیکن ہر اس شخص پر جو زکوٰۃ دینے کی وسعت رکھتا ہو جیسا کہ قرآن کریم کا اعلان ہے مما رزقناھم ینفقون۔ یعنی خرچ کریں ان چیزوں کو جس کو ہم نے عنایت کیا ہے یعنی مالک نصاب ہونا، بہر حال زکوٰۃ کی فرضیت ہونے میں اسلام کے اندر بہت سارے آسانات بھی ہیں نہ کہ نقصانات جیسا کہ تم پنڈتوں نے گمان کا ہے آسان تو اس لیے ہے کہ مالداروں کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہوتی تو اگر وہ کچھ روپے سے نکال دیں گے تو اس کا بھی کچھ نہیں بگڑے گا اور غرباء مساکین کا کام بھی بن جائے گا لہٰذا تمہارا اعتراض باطل ہوا۔

سوال: سبز درخت کا کاٹنا قرآن کے رو سے منع ہے یا نہیں اگر منع ہے تو اسے عقل کے دشمنوں جیتے جانوروں کا کاٹنا کس شریعت کے ذریعہ ثواب سمجھتے ہیں۔

جواب: سبز درخت کاٹنا قرآن کی رو سے منع ہے بلکہ جو درخت انسان کے کام آتے ہیں انکا کاٹنا روا ہے اور ایسے پیپل کے کل درخت کہ جن کی آریہ نشان پرستش کرتے ہوں ان کا کاٹ ڈالنا تو اور بھی بھلا ہے لالہ صاحب آپ کو چاہیے تھا کہ پہلے اپنے گھر کی خبر لیتے کہ ستیارتھ پرکاش کے سمولاسی بارہ میں سوامی جی بتلاتے ہیں کہ نباتات میں جیو ہے اور پرتھی کا مترجم نوٹ دیتا ہے کہ نباتات میں سمپورن پودے کے اندر جیو ہوتا ہے اب فرمایئے کہ عقل وفہم کے دشمن کون ہیں جیسا کہ آپ کے نزدیک ذبح حیوان ماکول اللحم ناروا ہے تو درختوں کا کاٹنا باوجود موجود ہونے جیو کے روا ہے اگر آپ یہ کہیں گے کہ سوامی جی فرماتے ہیں کہ کندمول وغیرہ چیزوں میں رہنے والے جیو کو سکھ دکھ محسوس نہیں ہوتا اور جس کی وجہ سے ستیارتھ پرکاش کے مترجم صاف تحریر فرماتے ہیں کہ درختوں کے اعضا کاٹنے سے درخت کے اندر رہنے والے جیو کو تکلیف نہیں پہنچتی کیوں کہ وہ حالت مدہوش پاس ہونے کی وجہ سے محسوس نہیں کرسکتا اس پر اگر آپ سے سوال کیا جائے کہ درخت کے اندر رہنے والے جیو کی مدہوشی یا من ہونے کی آپ کے پاس کیا دلیل ہے۔ سوائے خاموشی آپ کوئی جواب نہیں دے سکتے بفرض محال اگر ہم تسلیم ہی کرلیں کہ آپ بوجہ بیہوشی پاس ہونے کے درختوں کے قربانی جائز جانتے ہیں تو کیا حیوان ماکول اللحم کو بیہوش کرنے کے بعد ذبح کرنے کا فتویٰ آریہ سماج سے دلا سکتے ہیں یاد رکھئے جس نے حیوان پیدا کیا اسی نے انسان کو گوشت پھاڑنے والے اور چیرنے والی دانت پیدا کئے جس سے از روئے فطرت ہی ظاہر ہے کہ انسان گوشت خور ہے پس جس طرح ساگ پات وغیرہ نباتات کو کام میں لانے سے انسان مجرم نہیں ٹھہرتا اسی طرح گوشت سے نفع اٹھانے اور گوشت کھانے سے گنہگار نہیں ہوتا۔

سوال: حلال وحرام کے معنی کیا ہیں اگر کسی جانور کو حلال کرنے کے بعد اس میں روح نہیں رہتی تو اس حالت میں وہ مردہ ہے یا نہیں۔

جواب: دراصل حلال کے معنی کھولنے کے ہیں اور اصلاح شرع میں کسی چیز کے استعمال

کی اجازت دینے کو حلال کہا جاتا ہے کما نطق القرآن وحلل عقدة من لسانی۔ اسی طرح دوسری جگہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے: کلوا مما فی الارض حلالاً طیباً یعنی کھاؤ زمین کی چیزوں سے جو کچھ حلال ہے مطلب وہی ہوا جو میں عرض کر چکا ہوں کہ جن چیزوں کے استعمال کی اجازت خدا نے دی وہی حلال ہے برخلاف اس کے کسی چیز کے استعمال سے روک دینے کا نام حرام ہے اور ذبح کرنے کے بعد ماکول اللحم جانور بیشک وہ بے جان ہو جاتی ہے لیکن اصطلاح عرب میں اسکو میت یعنی مردہ نہیں کہتے ہیں کیونکہ یہ لفظ میت جسکو آپ مردہ کہتے ہیں بلحاظ تعریف اشیاء حلال وحرام زبان عرب میں ہمیشہ غیر مذبوح پر صادق آتا ہے جو خود بخود یا گلا گھونٹی سے یا چوٹ لگنے سے یا گر کر یا سنگ مار نے سے یا درندوں کے پھاڑنے سے مر جائے اور ماسوا اس کے جو حیوان ماکول اللحم کہ موافق تعلیم کتاب اللہ ذبح کیا جائے اسکو ذبیحہ کہتے ہیں۔

فرق: مردار اور ذبیحہ میں بہت بڑا فرق ہے یعنی مردار کی جس قدر اقسام ہیں اس میں سے کسی کا خون نہیں نکالا جاتا اور ذبح کئے ہوئے جانور سے وہ نجاست جو اجزاء پیشاب اور دیگر فضلات کے خون میں شامل ہونے سے پیدا ہوئی ہے بایں لحاظ وہ حرام خون بوقت ذبح بالکل نکالا جاتا ہے پس ایسی حالت میں کوئی ذی ہوش دونوں کو برابر نہیں رکھ سکتا۔ پس مذکورہ بیان سے ثابت ہوا کہ قربانی کا جانور ہو یا کسی میں اس جانور کو ذبح کیا جائے بالکل حلال ہے نہ کہ حرام۔

سوال: قبر کے معنی کیا ہیں مردہ انسان کو کسی غار میں ڈالنا اسی کو قبر کہتے ہیں اگر قبر کے یہ ہی معنی ہیں تو گوشت خوار لوگ مذکورہ بالا بغیر روح کے جسم کو کھاتے ہیں یعنی اس مردہ جانور کے گوشت کو اپنے شکم کے غار میں رکھنے سے ان کا پیٹ بھی مردہ جانوروں کی قبر کیوں نہیں کہلائے گا۔

جواب: شعر

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

دیکھئے جناب عالی! قبر کے وہی معنی تو ہیں جو آپ نے خود بیان کیا کہ مردہ انسان کو کسی غار میں ڈال دینا اس سے ہمیں کہاں انکار ہے ہزار بار کہنے کو تیار ہوں کہ اگر کوئی مردخوار کسی انسان کو کھا جائے تو ضرور اس کے شکم کا غار اس مردہ انسان کی قبر کہلائے گی فی الحقیقت سچ بھی یہی ہے کہ قبر کا اطلاق ہمیشہ انسان ہی کے واسطے صادق آتا ہے جانوروں کے لیے قبروں کا تیار کرانا آپ جیسوں کی ایجاد شدہ ہے اگر آپ کسی لغت میں یا کسی مذہبی کتاب یہودیوں یا عیسائیوں اور مسلمانوں سے دکھلا دیں کہ جانورں کے مدفون کی جگہ کو بھی قبر کہا جاتا ہے تو بیشک مردہ جانوروں کا گوشت کھانے والے کے شکم کا غار مردہ جانوروں کی قبر ہو سکتی ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے کہ حلال جانوروں کا کھانے والا انسان جس کی غذا ہی خاطر فطرت نے ایسی مقرر کی ہو جس کے کھانے سے ایک صالح .....قوم تیار ہوتا ہے اور وہ بھی وہ ہو جو انسان کی قوت قرار رکھنے والا ہو بایں لحاظ یہ امر ناممکن ہے کہ انسان کا معدہ جو جائے طنج قبر کہلائے۔

سوال: اگر گوشت کا کھانا طاقت کے لیے ضروری ہے تو سور جو سب جانوروں میں طاقتور ہے جس کا گوشت بھی نہایت قوت بخشتا ہے تو اس کا گوشت کھانا حرام کیوں رکھا حالاں کہ جو جانوروں کا کھانا حلال ہے اسی کے مشابہت تو سور بھی ہے لہٰذا اس کا بھی کھانا جائز ہونا چاہیے تھا۔

جواب: بیشک حیوان ماکول اللحم کا گوشت کھانا طاقت خداداد برقرار رکھنے کے لیے نہایت ضروری ہے اس کا نہ کھانے والا من جملہ تین قوتوں یعنی اور سبعی اور ملکی کے اپنی ایک قوت سبعی کا ہلاک کرنے والا ہے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں اس کی موت حرام ہے اس میں اور خودکشی کرنے والوں میں ذرا بھی فرق نہیں کیوں کہ جس طرح پانی اور نباتات طبیات وغیرہ کا کھانا قوت بہیمیہ کی زندگی کا موجب ہے اسی طرح قوت سبعی کی زندگی کا مدار صرف گوشت ہی کے کھانے پر ہے سور کا گوشت

جس کی بابت آپ تحریر فرماتے ہیں کہ نہایت قوت بخشتا ہے یہی وجہ تو ہے کہ قوت بھی
کو درجہ اعتدال سے بڑھا کر درجہ انتہا پر پہنچاتا ہے بس وہ قوت ملکی جس کی وجہ سے
انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے خراب ہوتی ہے خدا کے منکر تعلیم روحانیت سے
ناآشنا اسی قسم کی بدپرہیزیاں کر کے خدا کے برگزیدہ رسولوں نبیوں اور اہل اللہ کو
ستانے اور تکلیف دیتے رہے اگر وہ اپنی ہر ایک قوت کو درجہ اعتدال پر رکھتے تو آج
ہمارے مہربان بابو شیونرائن اپنی زبان سے ایسے تعصب آمیز الفاظ کہ سور بھی خدا ہی
ٹھہرتا ہے جو روحانیت کے کم ہونے اور قوت سبعی کے بڑھ جانے کا سبب ہے اور اس
ناپاک جانور کی حرمت کے سلسلے میں ارشاد باری ہے کہ بقولہ تعالیٰ (فانہ رجسٌ) کہ وہ
ناپاک ہے اگر آپ فطرت انسان پر غور کرتے تو کبھی ایسے لایعنی اعتراض زبان سے
نہ نکالتے کیا آپ اپنی روزانہ خورد و نوش میں یہ تغیرات ہوتے ہوئے نہیں دیکھتے کہ جو
غذا آپ کھاتے ہیں اس کے اجزائے مستعلیہ خون لے کر ہر رگ و ریشہ کے ذریعہ
سے جزو بدوں ہوتے ہیں اور وہ فضلات کہ جو جسم انسان کے لئے قدرتاً مضر ثابت
ہیں وہ کسی طرح بھی خارج ہو جاتے ہیں اور اگر باریک ہیں اور خون میں شامل ہو گئی
ہے تو بذریعہ بول (پیشاب) جسم انسان سے رات و دن خارج ہوتے ہیں آپ غور
کر سکتے ہیں کہ اگر یہ تمام فضلات ایک صحیح و سالم انسان میں جزو بدن ہونے کی
قابلیت رکھتے ہیں تو قدرتاً خارج ہی کیوں کئے جاتے پس جو نجاست ہمارے واسطے
مضر ہے اس کو ہم اپنے مذہب سے بالکل ہی نکال دیتے ہیں جیسا کہ آپ دیکھتے ہیں
کہ وہ سور جو تمام جانوروں میں طاقتور جانور ہے ہم جس کو چھونے سے گھن محسوس
کرتے ہیں سوائے اس کے کہ ہم اس کو شوق سے کھاتے کیا یہ بات ممکن ہو سکتی ہے یہ
بات امر یقینی اور بدیہی ہے کہ لحم سور انہی اجزاء مضرت رساں کا ایک تیار شدہ جسم ہے
جو ابتدائی استعمال ہے ہر عاقل غور کر سکتا ہے کہ وہ گوشت کیا مفید ہو سکتا ہے جو محض
ہمارے ہی تمام مضرات کا پرورش یافتہ ہو اس کا کھانا گویا انہیں مضرات خارج شدہ کا

جسم میں داخل کرتا ہے جن سے قوائے اخلاق تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں۔

پیارے شیونرائن جی: سور ہی پر کیا منحصر ہے قرآن پاک کی تعلیم فانه رجس کے بموجب رجس کی علت جس جانور بھیڑ یا گائے وغیرہ پر صادق آئے اسلام میں تو وہ بھی حرام ہی ہوگا۔

سوال: ضرورت کے وقت کوئی چیز کھانے کو نہ ملے تو مسلمان لوگ اس تنگ حالت میں سور کا گوشت کھا سکتے ہیں یا نہیں اگر سور بداخلاق ہے تو کیا مرغی خوش اخلاق ہے۔

جواب: قرآن مجید چوں کہ انسان کی تمام ضرورتوں کے لیے کافی اور روحانی کتاب ہے اس لیے ضرورت تھی کہ کوئی صداقت دینی اور دنیوی اس سے باقی نہ رہ جائے ہر فرد بشر واقف ہے کہ اس کائنات میں انسان کو کبھی اسائش اور کبھی تکلیف ہے جہاں صدہا دولت مند فارغ البالی سے اپنی بسر اوقات کرتے ہیں وہاں ہزاروں مرد وعورت ایسے بھی ہیں کہ جو افلاس اور تکلیف کے بحر ناپید کنارہ میں پھنس کر ہائے روٹی ہائے روٹی پکار رہے ہیں بایں لحاظ اس پروردگار عالم نے اپنے قانون کو اس طرح مکمل کیا کہ ایک حکم دائمی اور ایک اضطراری رکھا بس بحالت مجبوری جب کوئی حلال چیز کھا لینے کو میسر نہ آئے تو بموجب آیت: فمن اضطر غیر باغٍ ولا عادٍ فلا اثم علیه۔ حرام چیزوں کا استعمال اس لیے اختیاری کی حالت میں جائز رکھا کیوں کہ انسان کا اپنے وجود کو محفوظ اور سلامت رکھنا اصلی فطرت کا تقاضہ ہے اور تاکید ہے کہ ولا تلقوا بایدیکم الی التهلکة۔ یعنی اے لوگو! اپنے کو ہلاکت میں نہ ڈالو پس ہلاکت سے بچانے کے لیے پروردگار عالم نے حرام چیزوں کو صرف مجبور ہونے ہی کی حالت میں حلال کر دیا۔

سوال: حضرت محمد ﷺ چالیس برس تک قریشوں کے ساتھ بت پرستی کرتے رہے اور ان کی مکروہ اور نفرت انگیز رسمیات خورد ونوش میں حصہ لیتے رہے اب بھلا بتایئے کہ کیا یہ نبی ﷺ برحق ہیں۔

جواب: قبل از نبوت آپ ﷺ سے ناشائستہ حرکت بت پرستی کی کبھی سرزد نہ ہوئی بلکہ بتوں اور بت پرستوں کی شکل سے بھی سخت بیزار تھے صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت ﷺ غار حرا میں جا کر رسالت بعثت تک ذات واحد کی عبادت کیا کرتے تھے افسوس کہ جن روشن جوہروں کو اس پروردگار عالم نے دنیا پر چمکا کر ایک عالم کو ان کے ہاتھ سے نور خدا پرستی کرنے والا بنایا جن کی پرزور تعلیمات سے شرک اور مخلوق پرستی کو اکثر زمین کے حصوں سے معدوم کیا اور درخت ذکر وحدانیت الٰہی کا جو سوکھ گیا پھر سرسبز اور شاداب ہو گیا اور عمارت خدا پرستی کی جو گر پڑی تھی پھر اپنی مضبوط چٹان پر بنائی گئی ایسے مقبول حبیب خدا کے سلسلے میں آریا صاحبان کا زبان درازی کرنا اور بت پرستی اور مکروہ نفرت انگیز رسمیات میں شامل ہونے کا ناحق الزام لگانا اعلیٰ درجہ کی ہٹ دھرمی اور ظلم ہے۔

بہر حال آپ کا یہ دریافت کرنا کہ کس عمل کے پاداش میں مستحق ملہم و مہربان ہیں سو ایسے سوالات معرض تحریر میں لانا اور عقل خداداد سے کام نہ لینا سخت ناانصافی ہے۔

سوال: قرآن کے نازل ہونے کی کیا ضرورت تھی جب کہ قرآن کے پہلے کئی الہامی کتابیں اتری تھیں اگر وہ کامل نہیں تھی تو قرآن کے کامل ہونے کا کیا ثبوت ہے کیا خدا اپنی عبارتوں کو چھوڑ دے گا جو اپنے احکام کی ترمیم و تنسیخ کرنے پر تیار رہتا ہے۔

جواب: قرآن کے نازل ہونے کی وہی ضرورت تھی جو دیگر کتب کے نازل ہونے کی ضرورت تھی حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ کے زمانے تک جس قدر احکام خدا کی طرف سے حسب اقتضاء ضرورت نازل ہوئے اور انہیں احکاموں کو جس وقت کہ لوگوں نے اپنی یادداشت کے واسطے کتاب کی صورت میں جمع کیا پس وہی مجموعہ احکام الہامی کتاب ہے جو اپنے زمانہ کی ضرورتوں کے لحاظ سے یقیناً کامل ہے کیوں کہ گذشتہ زمانے کی جس جس قوم نے اپنی تربیت ایمان و رحانی کے خراب کرنے والے جس قدر سامان فراہم کئے تھے ان کے دفیعہ کا کافی علاج خدا کے احکام میں موجود تھا اور یہ سلسلہ اصلاح اور درستگی کے طور پر خدائے تعالیٰ نے جاری رکھا کہ

ہر ایک گمراہ قوم کو جو کہ تعلیم الٰہی سے ناواقف تھے انہیں کے ایک ایسے شخص کو جو سلیم الطبع سمجھا گیا نبوت اور رسالت پر معمور فرما کر ایک قانون عطا فرمایا کہ جس میں کامل طور پر ان کی اصلاح کی گئی تھی بایں لحاظ جس قدر کتابیں منزل من اللہ میں وہ یقیناً سب کے سب کامل ومکمل اور اکمل ہیں جن کی وجہ یہ بھی ہے کہ خدا کے تمام کام مطابق عقل وشعور میں گو بوجھ تعصب سے ان کے سمجھنے سے آریہ صاحبان مجبور ہیں بقول آنکہ اندھیروں میں ویدوں کے بے نور ہیں ''اجالے سے قرآن کے دور ہے''۔

میرے دوستو! وحی الٰہی کے مختلف اوقات میں نازل ہونے کی یہی وجہ ہے کہ ایک امت گذشتہ کے بعد جب دوسری قوم نے علاوہ ان گذشتہ شرارتوں کے نئی نئی شرارتیں ایجاد کی اس لیے ضرورت تھی کہ ان کی شرارتیں دور کرنے اور ناواقف لوگوں کو آگاہ کرنے کے واسطے جدید احکام نازل فرمائے جس کی وجہ یہ تھی کہ گمراہ لوگ راہ یاب ہو جائیں اور قرآن کے کامل واکمل ہونے کی دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے فرمایا اکملت لکم دینکم یہ کہ میں نے تمہارے دین اسلام کو مکمل کر دیا۔ نیز قرآن کے کامل ہونے پر مہینوں مہینوں بحث ہو سکتی ہے تب بھی دلائل ختم نہ ہوں گے لیکن وقت ہمیں اجازت نہیں دیتا۔

سوال: دنیا کی پیدائش سے پہلے خدا خالق یا رحیم یا رزاق ومعبود تھا یا نہیں اگر تھا تو کن کا معبود تھا اور سوائے اس کے کوئی نہ تھا تو خالق کن کا تھا اور مالک کن کا تھا۔

جواب: انه تعالیٰ من الجنس و الجهات یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات جنس و جہات سے ماوراء ہے اور اس بات کے معترف آپ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ متجسم نہیں ہیں جسکو آپ اپنی اصطلاح میں نیز اکارہ کہتے ہیں اور جو چیز نیز اکار ہوتی ہے وہ مکان کی محتاج نہیں ہوتی اب رہا سوال کہ معبود کن کا تھا تو اس کا جواب یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا علم ذاتی ہے نہ کہ کسبی تو اس علم ذاتی سے آپ کو تمام مخلوق کا علم حاصل تھا لہٰذا ان مخلوق کا معبود خالق ہونا ثابت ہو گیا۔ (بحوالہ آریوں کے پندرہ سوالات کے جوابات، ص: ۲۴)

غیر مسلموں کی زبان فی معاملۃ القرآن

قرآن کے سوا دنیا میں کوئی کتاب ایسی نہیں جو اپنی آغاز سے آج تک بلاشبہ ویسی کی ویسی ہی ہو اب اس مبارک کتاب کے متعلق عقلاً غیر مسلم کی شہادتیں ملاحظہ ہوں۔

(۱) اعلیٰ سے اعلیٰ توحید کا مذہب جو دنیا میں پایا جاتا ہے وہ اسلام ہے۔

(پروفیسر آرنلڈ ہیکل جرمن)

(۲) گاندھی لکھتا ہے کہ اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فطرت انسانی کے مطابق ہے۔ (۳) رام دیو ایم اے لکھتے ہیں کہ قرآن کا بھاشا بہت سندر ہے اسی میں فصاحت و بلاغت بھری ہے اس سے بھی کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ قرآن کے اندر بہت اچھی باتیں ہیں قرآن کی توحید میں کسی کو شک نہیں صاف بتلایا گیا ہے کہ اللہ ایک ہے عرب کے اندر عورتوں کا کوئی درجہ نہ تھا محمد ﷺ نے عورتوں کے حقوق قائم کئے۔ (پرکاش فروری ۱۹۲۷ء) (۴) ہندو فاضل پروفیسر دہرجی وائس چانسلر ہندو یونیورسٹی نے گروکل کے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا حضرت محمد ﷺ نے جس رنگ میں توحید الٰہی کو قائم کیا وہ ایک بے نظیر طرز تھا۔

(۵) قرآن کی عبارت فصیح و بلیغ اور مضامین کے عالی ولطیف ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ایک امین ناصح نصیحت کررہا ہے اور ایک حکیم فلسفی حکمت الٰہی بیان کرتا ہے (فرک مورخ جرمن)

(۶) قرآن انتہائی لطیف و پاکیزہ زبان میں ہے اس کتاب سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی انسان مثل اس کے نہیں بنا سکتا یہ لازوال معجزہ ہے (مسٹر سیل) (۷) یہ تحریف سے پاک ہے دیباچہ قرآن (مسٹر جلی ایم راوڈیل) (۸) کوئی کتاب بارہ سو برس سے ایسی نہیں ہے کہ اس کی عبارت اتنی مدت طویلتک خالص رہی ہو (سر ولیم مور) (۹) اخلاقی احکام جو قرآن میں ہیں اپنی جگہ پر کامل ہے (پریچنگ آف اسلام) (۱۰) ڈاکٹر لیبان لکھتے ہیں کہ اسلام کی وضاحت

عقادات اور اس کے ساتھ دوسروں کے مقابل میں نیکی اور انصاف جس قدر اس مذہب پر مرتب کی گئی ہے اس کی عالمگیر اشاعت کا بہت بڑا باعث ہے فی الواقع تمام مذاہب عالم میں یہ فخر اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اسی کے اندر حد درجہ کی عزت وعظمت اور وحدانیت کی دلیل بکثرت موجود ہے اور دوسرے مذہبوں کے اندر بہت ساری گربریاں ہیں لیکن اس میں کسی قسم کا کوئی بھید یا معمہ نہیں ہے اور نہ اس میں متضاد چیزوں کے ماننے کی ضرورت ہے جو دوسرے مذاہب میں واقع ہوتی ہیں اور جنہیں عقل سلیم قبول نہیں کرتی ایک خدا واحد مطلق معبود تمام بندے اس کی نظروں میں بہت تھوڑے سے ارکان دین جن کا بجالانا واجب ہے اور ان کے بجالانے کی جزاء بہشت اور نہ بجالانے کی سزا جہنم اس سے زیادہ صاف وسادہ واضح اور غیر مبہم کونسا مذہب ہوسکتا ہے (تمدن عرب) بہر کیف دیگر مذاہب جو دنیا میں رائج ہیں ان میں سے کسی کتاب کو یہ بات نصیب نہیں بائبل کے متعلق علماء نصاریٰ کو خود تحریف کا اقرار ہے۔ کرسٹم اپنی تفسیر نویں باب منی میں لکھتا ہے کہ بہت سے پیغمبروں کی کتابیں نیست ونابود ہوگئیں۔ سر ولیم میور انجیل یوحنا کے متعلق لکھتے ہیں بیشک یہ کتاب مدرسہ اسکندریہ کے کسی طالب علم نے تصنیف کی (تاریخ کلیسا) پارسی مذہب کی کتاب کا بھی ایسا ہی حال ہے زرتشت کی کتاب ۳۲۱ سال قبل مسیح سکندر نے رندواور ستار زرتشت کو جلادیا تھا اب صرف حصہ دیا تھا کہ پانچ گنا الہامی تسلیم کی جاتی ہیں زرتشت اور اس کا دین مصنفہ .....وید کی حالت سب سے زیادہ ناگفتہ بہ ہے کوئی کہتا ہے کہ ریشو پتھر الہام ہوئے کوئی کہتا ہے برہان الہام کوئی کہتا ہے کہ پیاس نے بنائے کوئی مختلف لوگوں کی تصنیف بتلاتا ہے کوئی کہتا ہے دوارب سال ہوئے جب نازل ہوئے تھے کوئی کہتا ہے تین ہزار برس ہوئے جب بنائے گئے۔ اس کے بعد پنڈت کرشن کمار بھٹاچاریہ پروفیسر سنسکرت ریزیڈنسی کالج کلکتہ لکھتے ہیں کہ رگوید کے حصہ اس ملک کے شاعروں اور ریشوں نے تصنیف کیا ہے وہ مختلف زبانوں میں لکھی گئی ہیں پروفیسر ایشوری پرشاد لکھتے ہیں رگوید کے بہت سے منتر عورتوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ (تاریخ ہند حصہ اول) کوئی کہتا وید تین ہیں کوئی کہتا ہے چار ہیں

پھران میں تحریف بھی ہوئی ہے سوامی دیانند لکھتے ہیں کہ سوفن قربانی وغیرہ یہ بائبل سے وید میں آئے البتہ اپنشد وغیرہ متعصب فرقہ والوں نے اکبر کے زمانے میں ملا کر بنادیئے۔ (ستیارتھ پرکاش) جولوگ طشت میں ہے ویدوں کا یہ حال ہے کہ کوئی ان میں سے ایسا نہیں ہے کہ تغیر وتبدل یا کمی بیشی سے خالی ہو اور دواپر میں ویدوں کی ایسی تحریف ہوئی کہ آدھے بھی تحریر میں نہ آئے پھران ویدوں میں جو احکام ہے وہ ایک دوسرے کے خلاف ہیں چنانچہ مرقوم ہے چاروں ویدوں کے احکام باہم متناقض ہیں۔ (الکھ پرکاش) یہ کتاب ایسی زبان میں (وید) جس کو کوئی سمجھ نہیں سکتا اور اسکے الفاظ بے معنی ہیں شرح گیتا میں ہے ویدوں شاستروں پر دنوں کو قدیم زمانے کے لوگوں نے ایسا بنایا ہے کہ لفظوں میں معنی نہیں رکھتے۔

اسی طرح منشی سدا سکھ لال لکھتے ہیں کہ یہاں کی سب نظموں میں وید قدیم ہے مگران میں جو سنسکرت زبان ہے وہ بگڑتے بگڑتے کچھ اور ہی طرح کی ہوگئی ہے۔ (تاریخ ہند، ص:۱۱) لالہ لاجپت رائے لکھتے ہیں کہ سنسکرت الفاظ کے معنی مختلف زبانوں میں رہے ہیں سب فاضلوں کا اتفاق ہے کہ مروجہ سنسکرت پڑھ لینے سے ویدوں کے صحیح معنی سمجھ میں نہیں آسکتے۔ (تاریخ ہند، ص:۷۷) یہی وجہ ہے کہ اسی کتاب کے ترجمہ میں ایسا اختلاف ہے کہ کسی اور کتاب کے ترجموں میں ممکن ہی نہیں ایک منتر سے ایک توحید الٰہی ثابت کرتا ہے تو اسی منتر سے دوسرا ہوائی جہاز بنانے کے اصول نکالتا ہے تیسرا دیوتاؤں کی تعریف لکھتا ہے۔ بہرکیف میں آریہ سماج سے پوچھتا ہوں کہ آپ خود سر پہ ہاتھ رکھ کر بتائیں کہ کیا ایسی کتابیں اس قابل میں ہیں کہ ان پر ایمان کا مدار رکھا جائے ایک مسیحی نامہ نگار لکھتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے مسلمانوں کی قوم کے پھیلنے اور باقی رہنے کے تمام سامان فراہم کردیا ہے کیوں کہ مسلمان جب قرآن وحدیث پر غور کرے گا تو اپنی ہر دینی ودنیوی ضرورت کا علاج اس میں پائے گا۔ (مصری اخبار وطن) شریعت اسلام نہایت اعلیٰ درجہ کے عقلی احکام کا مجموعہ ہے قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانے کے لیے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں اس کو قبول کرلیتی ہیں اور وہ محلوں ریگستانوں اور

شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔ (ڈاکٹر سموئیل جانسن) بہر کیف قرآن کی وہ شریعت ہے اور ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے عظیم الشان قانونی انداز پر مرتب ہوی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہ مل سکتی ہے نہ ملی ہے اور نہ ملے گی۔ ڈاکٹر لیبان لکھتے ہیں کہ ہائنگر نے ایک لمبی چوڑی فہرست ان اخلاق احکام کی کردی ہے جو مسلمانوں میں بطور مقولوں کے رائج ہے ان سے بہتر ہے ان سے بہتر کوئی دستور العمل انسان کے عملاً نیکی کی طرف راغب اور بدی سے محترز کرنے کے لیے نہیں ہو سکتے (تمدن عرب)۔

قارئین کرام! دیگر مذاہب پر نظر کی جائے تو بائبل کے احکامات اور بائبل میں تو ہر سال تغیر وتبدل ہوتا ہے عیسائی مذہب میں صرف بصورت زنا طلاق کا حکم تھا اب ضرورت زمانہ سے مجبور ہوکر اور صورتیں تجویز کرنی پڑیں اسی طرح اکل وشرب کے معاملات میں تغیر واقع ہوا ہندوؤں کی حالت عجیب ہے لکھی رام دیانند وغیرہ طلاق پر معترض تھے آج ہندو طلاق کے لیے قانون بنانا چاہتے ہیں نکاح وغیرہ کا حکم نہ تھا آج اس کو جاری کیا جاتا ہے چھوت چھات مذہب مسئلہ آج چھوڑا جارہا ہے اور سنئے ایک گروہ اس پر راغب ہے کہ پھوپھا چچا وغیرہ قریبی رشتہ داروں کے یہاں شادیاں ہوں نیز اس پر عمل درآمد بھی شروع ہوگیا۔ (ویش سدھارک لاہور) اگر ان کا مذہب خدا کی طرف سے ہوتا تو شریعت مکمل ہوتی اور آج اسی میں تغیر وتبدل کی ضرورت محسوس نہ ہوتی انسانی احکامات حسب ضرورت بدلا کرتے ہیں جیسے قوانین سلطنت ڈاکٹر اے اے فریمن لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ حضرت محمد ﷺ بڑے پکے راست باز اور سچے وفادار مرد تھے دنیا اعمال کی فضا ہستی میں آپ ﷺ ہی ایک وجود نادر پائے جاتے ہیں آپ ﷺ ہی کی ہستی ایسی مفصل پہنچی ہے جس کے حالات ہم تک صحیح اور بالتفصیل ومشرح ہے جس کے حالات ہم تک صحیح اور بالتفصیل پہنچے ہیں انسانی اخلاق کی اصلاح جو آپ ﷺ نے فرمائی ہے اجتماعیات کے اندر جو انقلاب علوی آپ ﷺ کی تعلیم نے پیدا کی ہے سوسائٹی کے تزکیہ اور اعمال کی تطہیر کے لیے جو اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے وہ آپ

کو انسانیت کا محسن اوّل قرار دیتی ہے۔ (مسٹر ایڈورڈ مونٹی) حضرت محمد ﷺ کی حالاتِ زندگی پر نظر ڈالنے کے بعد کوئی انصاف پسند شخص آپ ﷺ کی اولوالعزم، اخلاقی جرأت نہایت خلوص نیت سادگی اور رحم وکرم کا اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح شردھے پرکاش دیو جی لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ من جملہ اس بزرگ اشخاص کے ہیں جنہوں نے قانون قدرت کے مطابق جہالت اور تاریکی کے زمانے میں پیدا ہوکر دنیا میں صداقت کی روشنی پھیلایا تنگ دل اور متعصب لوگ ایسے بزرگ کی نسبت کچھ کہیں لیکن جو لوگ باانصاف اور کشادہ دل ہیں وہ کبھی محمد صاحب ﷺ کی ان بے بہا خدمات کو جو نسل انسانی کی بہبود کے لیے بجالائے بھلا کر احسان فراموش نہیں کر سکتے۔ (سوانح عمری محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

آنحضرت ﷺ کے حالات زندگی کے متعلق تو جیسا کہ میں عرض کیا بے شمار مجلدات ہیں لیکن اسلام تو اپنے ہر پیشوا ہر بزرگ کی سوانح عمری رکھتا ہے اور ان تمام دامانِ عصمت لغویات وخرافات کے بدنما دھبوں سے پاک ہیں دیگر مذاہب کے پیشواؤں کے متعلق اشارتاً التماس ہے کہ یہودی عیسائی موسیٰ وعیسیٰ کی سوانح عمری مکمل نہ پیش کر سکے اگر بائبل سے کچھ مواد جمع کیا جائے تو اس میں اس قسم کی باتیں آتی ہیں کہ وہ صحیح اپنی والدہ صدیقہ سے فرماتے ہیں اے عورت تیرا مجھ سے کیا واسطہ ہے لیکن کسی غیر محرم عورت سے سر مبارک پر تیل کی مالش کرتے نظر آتے ہیں بودھ اور زرتشت کی سوانح عمریوں کا تو کیا ذکر ایک گروہ محققین کو اس میں کلام ہے کہ اس نام کے آدمی دنیا میں تھے بھی یا نہیں یہ فرضی نام ہے آریہ اپنے قدیم رشیوں کے حالات بتلانے سے ساکت ہیں انکے متعلق بھی یہ گمان کیا گیا ہے کہ یہ عناصر اربعہ کے نام ہیں اور قدما کا تو کیا ذکر انکے جو اوتار زمانہ قریب میں گذرے ہیں ان کی مکمل اوصاف نہیں پیش کر سکتے ابھی پچاس ساٹھ برس گزرے سوامی دیانند تھے وہ خود اپنا نام ونسب وغیرہ نہ بتلا سکے اور ان کے متعلق جو کچھ ہندو فاضلوں نے لکھا ہے وہ بھی موجود ہے۔ (آئینہ افعال دیانند)

معجزۂ کلامِ الٰہی

کلام الٰہی کا اک یہ بھی نادر معجزہ ہے کہ سخت متعصب مخالفین اور نکتہ چین عیسائیوں سے بھی اپنا لوہا منوالیا۔

الفضل ماشھدت بہ الا عداء یعنی جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے عنوان بالا پر مولانا عبداللہ صاحب نے نہایت تندہی سے ایک ضخیم رسالہ پیام امین مرتب فرمایا ہے اس میں مخلصاً ناظرین العدل کی دل چسپی کے لیے چند نامور مستشرقین کی صائب آراء جو قرآن کے متعلق ہیں پیش کی جاتی ہیں کونٹ ہنری وی کاسٹری اپنی کتاب ''الاسلام'' میں کونٹ موصوف نے فرنچ میں لکھی تھی جس کا ترجمہ صر کے مشہور مصنف احمد فتحی نیک زاغلول سے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا تھا کہتے ہیں۔ قرآن کی وحی کا مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے کیوں کہ ارباب بحث اس کو مفصل طور پر حل نہیں کر سکے عقل حیران ہے کہ اس قسم کا کلام ایسے شخص کی زبان سے کیوں کر ادا ہوا جو بالکل امی تھے تمام مشرق نے اقرار کیا ہے کہ یہ وہ کلام ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معناً ہر لحاظ سے اس کی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے یہ وہی کلام ہے جس کی بلند انشا پردازی نے حضرت عمر بن خطابؓ کو مطمئن کر دیا ان کو خدا کا معترف ہونا پڑا یہ وہی کلام ہے کہ جب یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر بن ابی طالب نے نجاشی بادشاہ کے سامنے پڑھے ہیں تو اس کی آنکھوں سے بیساختہ آنسو جاری ہو گئے اور پشت جلا اٹھا کر یہ کلام اسی سرچشمہ سے نکلا ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام کلام نکلا تھا۔ حضرت سیدنا محمد ﷺ قرآن کو اپنی رسالت کی دلیل کے طور پر لائے اور وہ اس وقت سے تا ایں دم ایک ایسا مہتم بالشان راز چلا آتا ہے جس کے طلسم کو توڑنا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

اسی طرح انگلستان کے نامور مورخ ڈاکٹر گبن اپنی مشہور تصنیف ''سلطنت روما کا انحطاط وزوال۔ جلد ۵، باب ۵۰'' میں لکھتے ہیں کہ قرآن کی نسبت بحر اطلانٹک سے لے کر گنگا تک نے مان لیا ہے کہ یہ پارلیمنٹ کیروح ہے قانون اساسی ہے اور صرف اصول مذہب ہی کے لیے نہیں بلکہ احکام تعزیرات کے لیے اور ان قوانین کے لیے بھی ہے جن پر نظام کا مدار ہے جن سے نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے جن کو حیاتِ انسانی کی ترتیب وتنسیق سے گہرا تعلق ہے حقیقت یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ کی شریعت سب پر حاوی ہے وہ اپنے تمام احکام میں بڑے بڑے شہنشاہ سے لیکر چھوٹے سے چھوٹے فقیر وگداگر تک کے لیے مسائل ومبانی رکھتی ہے یہ وہ شریعت ہے اور ایسے دانشمندانہ اصول اور اس قسم کے عظیم الشان قانونی انداز پر مرتب ہوئی ہے کہ سارے جہاں میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی ایک اور جگہ فرماتے ہیں تثلیث اور خدا کے مجسم ہونے کے رموز واسرار سے صاف ظاہر ہے کہ دو تین ہم رتبہ خداؤں کی تعلیم دیتے ہیں اور حضرت مسیح علیہ السلام کو جو ایک انسان ہیں خدا کا بیٹا ظاہر کرتے ہیں (نعوذ باللہ) قدیم زمانے کی تفسیر صرف ان پختہ عقیدہ کے عیسائی کو مطمئن کرسکتی ہے لیکن حضرت محمد ﷺ کا ایمان وعقیدہ ہر قسم کی پیچیدگی اور ابہام وحدانیت کی ایک زبردست شہادت ہے آگے چل کر رقم فرماتے ہیں کہ قرآن وحدانیت خدا کا ایک شاہد عظیم ہے ایک فلسفی موجد بے تکلف مذہب اسلام میں شریک ہوسکتا ہے وہ ایک ایسا مذہب ہے جو ہم لوگوں کی موجودہ سمجھ کے لیے بہت عالی ہے۔ جان جاک ریملک مشہور جرمن فلاسفر جس نے مقامات حریری اور تاریخ ابوالفدا اور معلقہ طرفہ وغیرہ وغیرہ تصنیفات کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا تھا لکھتا ہے۔ بعض لوگ ایسے دیکھے گئے ہیں کہ جہاں اڑانے لگے اگر خوش نصیبی سے کہیں انہیں وہ موقع ہاتھ لگتا ہے کہ آنحضرت ﷺ اپنی فصیح زبان اور موثر لہجہ میں قرآن کی سورت پڑھ رہے ہیں دلوں پر بجلیاں گر رہی ہے اور جب کسی آیت کے متعلق یہ احتمال ہوتا ہے کہ سامعین اس کے حقیقی مفہوم تک نہ پہنچ سکیں گے تو آپ نے

اس کو بیان سے اسطرح واضح فرماتے کہ وہ آیت سنتے ہی جلد سے سجدہ میں گر پڑتا ہے اور سب کے منھ سے وہی آواز نکلتی کہ ہمارے نبی پیارے رسول اللہ ﷺ ہاتھ بڑھا دیجئے اور مجھے اپنے پیروں میں شامل کرنے میں دیر نہ فرمایئے۔

اسی طرح قرآن شریف کے سلسلے میں ڈاکٹر ''موریس'' نے جو فرانس کے نامور اہل قلم مستشرق اور ماہر علوم عربیہ، جنہوں نے گورنمنٹ فرانس کے حکم سے قرآن کریم کا ترجمہ فرانسیسی زبان میں کیا تھا اپنے ایک مضمون میں جو لابار اوّل فرانس..... میں شائع ہوا تھا ایک اور فرانسیسی مترجم قرآن ''موسو سالمان ارینا ش'' کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے لکھتا ہے۔ قرآن کیا ہے قرآن کی اگر کوئی ایسی منقبت ہو سکتی ہے جس میں کسی طرح کا نقص نہ نکل سکتا ہو تو وہ اس کی فصاحت و بلاغت ہے وہ عظیم الشان فضیلت جس پر تین کروڑ (چالیس کروڑ مولت) انسان فخر کر رہے ہیں وہ یہی ہے کہ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر فائق ہے بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرت کی ازلی عنایت نے انسان کے لیے جو کتابیں تیار کی ہیں ان سب میں یہ بہترین کتاب ہے اسی کے نغمے انسان کی خیر و فلاح کے متعلق فلاسفہ یونان کے نغموں سے کہیں اچھے ہیں اس میں آسمان و زمین کے بنانے والے کی حمد و ثنا بھری ہے خدا کی عظمت سے اس کا حرف حرف لبریز ہے جس نے یہ چیزیں پیدا کی ہیں اور ہر ایک چیز کی اس کی استعداد کے مطابق رہنمائی کی ہے۔

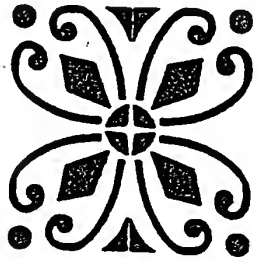

سوال جواب

فی سلسلۃ الاسلام

سوال: کیا اسلام سچا مذہب ہے اگر ہے تو کس طرح ہے۔

جواب: ہاں اسلام سچا مذہب ہے جس عمل کی وہ ہدایت کرتا ہے اس کے کرنے سے وہی نتیجہ ہوتا ہے جو وہ بتاتا ہے۔

سوال: اسلام میں کتنی خوبیاں ہیں جو اس کو عظمت دیتی ہے۔

جواب: اسلام عملی وقولی مذہب ہے وہ عملی طور سے عمل زندگی میں عملی مدد دیتا ہے ایک خدا کی پرستش اور جملہ انسان کی بردریت مساوات اس کو خاص فوقیت بخشتی ہیں۔

سوال: کیا مذہب اسلام میں روحانی ودماغی بلوغیت حاصل ہوسکتی ہے اور انسان اس سے اعلیٰ قوتیں حاصل کر کے اعلیٰ مرتبت اور انجام کو پہنچ سکتا ہے۔

جواب: اسلام کے طرز مراقبہ وعمل سے ضرور روحانی ودماغی بلوغیت حاصل اور انسان اعلیٰ مرتبہ اور نجات کو حاصل کرسکتا ہے بہت کافی اشخاص اس کو کر چکے ہیں جیسا کہ ہندوؤں کے پوپ پادری راجہ بھوج نے اسلام کی فقط ایک کرامت یعنی شق القمر کے واقعہ کو سن کر اسلام قبول کیا۔

سوال: کیا مذہب اسلام کی ہدایت عملی آسائش بخش اور منافع خلائق ہیں۔

جواب: اسلام کی تقریباً جملہ ہدایات عملی ہیں اور وہ بغرض رفاہِ عام ہیں جو ہدایات کسی کو ظالمانہ معلوم ہوتی ہیں ان کی فہم وعقل میں غلطی ہے اور ممکن ہے کہ اسی وجہ سے کسی کے عمل میں بھی غلطی ہوتی ہو ورنہ وہ ایسے ہیں جیسے جراحی کا کام جس کی نسبت

الزام نہیں لگایا جاسکتا ہے اسی طرح اسلام میں منافع خلائق اور بھی ہیں کیوں کہ جب دنیا میں اسلام کا وجود ہوا اور نبی اکرم ﷺ کی بعثت ہوئی تو غریبوں کے حقوق دلائے اسی طرح عورتیں اور جوان لڑکیوں کے حقوق دلائے جیسا کہ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ اسلام سے پہلے جوان لڑکیوں کو زندہ دفن کر دیا جاتا تھا لیکن جب آپ ﷺ کی بعثت ہوئی تو فوراً یہ اعلان کیا کہ یہ تمام عمل ناجائز وحرام ہے۔

سوال: کیا مذہب اسلام ظلم وتشدد کی اجازت دیتا ہے اگر اسلام ظلم وتشدد کی اجازت نہیں دیتا تو پھر گائے بیل بھینس کو کیوں ذبح کیا جاتا ہے کیوں کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس پر بھی ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھائے جارہے ہیں۔

جواب: مذہب اسلام نے کبھی بھی کسی پر ظلم کی اجازت نہیں دیا ہے اور نہ دیتا ہے اور دے گا۔(الی یوم القیامة)

اب رہا سوال کہ آپ گائے بیل کو کیوں ذبح کرتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ منجانب اللہ حکم ہے نہ کہ ظلماً ہے اور جس میں اللہ کا حکم نہ ہو لیکن اس عمل کو کیا جاتا ہو تو اسے ظلم کہتے۔ اور گائے بیل کے سلسلے میں اللہ کا حکم ہے۔

سوال: کیا اسلام معتدل مذہب ہے۔

جواب: ہاں اسلام معتدل مذہب ہے یعنی افراط وتفریط سے مبرہ ومنزہ ہے۔

سوال: کیا جانوروں کی قربانی اسلام کو عظمت سے باز رکھتی اور گائے کی قربانی کبھی جائز ہوسکتی ہے۔

جواب: سچی قربانی ہر مذہب میں جائز ہے اور صرف گائے کی نہیں بلکہ ہر انسان کی اور اپنے عزیز ترین اولاد کی بھی۔ لیکن اولاد کی قربانی کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔

سوال: کیا مذہب اسلام میں آزاد خیالی کی گنجائش ہے۔

جواب: مذہب اسلام میں اگر آزاد خیالی کی گنجائش نہ ہوتی تو وہ ہرگز عمل مذہب نہیں ہوسکتا تھا۔

سوال: کیا مذہب اسلام میں کوئی ایسی بات ہے جو کسی اور مذہب میں نہیں۔
جواب: اسلام میں کئی ایسی باتیں ہیں جو دیگر مذاہب میں نہیں ہیں مثلاً رسم اخلاق مستورات کا حق وراثت مساوات قبولیت تبلیغ وغیرہ ہندو میں نہیں ہیں اگر ہے بھ تو حال میں شامل کیے گئے ہیں۔
سوال: کیا مذہب اسلام میں انسان کو دیگر انسان وحیوانات کی خدمت میں اپنے آپ کو قربانی کرنیوالے اشخاص کی مثال ہیں اور اسلام نے کبھی ایسے اشخاص پیدا کیے ہیں۔
جواب: مذہب اسلام کی تاریخ میں نہ محض انسان کی خدمت کے لیے جان دے والے اشخاص کے کارنامے ہیں بلکہ چھوٹے کیڑوں کے لیے بھی تکلیف اٹھا۔ والے اشخاص کی مثالیں ہیں۔ ہارون رشید حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے کارنامے کیا اعلیٰ درجے کے ہیں یہ صرف چند سوالات جو بعض اوقات مجھ سے اہل ہنود اور نیز مسلم نے کیا ہے جوابات ہو بہو تحریر ہیں ایسے بہت سے سوالات کیے جاتے ہیں اور کیے جاسکتے ہیں کیا اچھا ہوتا اگر مذہبی مباحثات مہذبانہ اور غیر متعصبانہ طریقے سے کیے جاتے اہل ملک کو ان سے بے حد نفع پہنچتا اور دنیا میں تکالیف کی بہت کمی ہو جاتی۔

سوال و جواب
فی سلسلۃ القرآن

(بحوالہ: حضرت نانوتویؒ)

سوال: قرآن کیا ہے اور کس چیز کا نام ہے۔

جواب: بک رہا ہے یوں ہی کچھ سے کچھ کہیں
مطالب قرآن وہ سمجھا ہی نہیں

ہم اہل ایمان جواب دیتے ہیں خود انہی کے فرقے میں سے ایک شخص ہے جو فرانس کے مشہور مستشرق ''موسیو سیدیو نے'' اپنے قلم سے لکھتا ہے قرآن ایک واجب التعظیم کتاب ہے جس نے بتایا ہے کہ خدا کے حقوق بندوں پر کیا ہیں اور بندوں کے حقوق اور تعلقات خدا سے کس قسم کے ہونے چاہیے اس میں فلسفہ اور اخلاق کی ہر قسم کی باتیں مذکور ہیں فضل و کمال عیب و نقصان حقیقت اشیاء عبادات و اطاعت گناہ و معصیت کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا قرآن جامع نہ ہو واقعات کے اعتبار سے اس کی آیتیں رسول اللہ ﷺ پر اترتی رہی ہیں اور یہی ایک چیز تھی جس نے تمام عرب میں فوقیت کی روح پھونک دی جنگجو قبائل میں اتفاق و اتحاد کی بنیاد ڈال دی اور دنیا میں ایک عالم گیر رابطہ اخوت پیدا کر دیا وہ آداب و اصول جو فلسفہ و حکمت پر قائم ہیں جن کی اساس عدل و انصاف پر مبنی ہے جو دنیا کو بھلائی اور احسان کی تعظیم دیتے ہیں ان میں سے ایک خبر بھی ایسی نہیں جو قرآن میں نہ ہو اور وہ اعتدال و میانہ روی کا سیدھا راستہ دکھلاتا ہے ضلالت و گمراہی کے گڑھے سے نکالتا ہے اخلاقی کمزوریوں سے بچا کر فضائل و عزت کی روشنی میں لاتا ہے اور انسانی زندگی کے نقائص کو کمالات سے بدل دیتا ہے جو جہلا اسلام کو وحشیانہ مذہب کہتے ہیں ان کے سیاہ قلب ہونے کی یہی ایک بڑی دلیل ہے کہ وہ قرآن کی ان صریح آیات کو بالکل نہیں دیکھتے جن کے اثر سے عرب کی تمام بری اور معیوب عادتیں جو مدت ہائے دراز سے تمام ملک میں رائج تھیں ایک دم مٹ گئیں۔

اللہ تعالیٰ کو عاشق رسول ﷺ کہنا سخت گناہ ہے

یہاں پر ایک اور غلطی کا ازالہ کرنا بھی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ جناب رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا معشوق کہتے ہیں چنانچہ شعراء اشعار یا نعت میں اس مضمون کو باندھتے ہیں عشق کا خاصہ ہے عاشق کو مضطرب کر دینا اور حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے مگر غضب یہ ہے کہ بعض بیباکوں نے اس اضطراب کو بھی نعوذ باللہ خدا تعالیٰ کے لیے مان لیا چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے ؎

پیئے تسکین خاطر صورت پیرہن یوسفؑ
محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو دنیا میں بھیج دیا اور چوں کہ وہ معشوق تھے اور عاشق کو بدوں معشوق کے قرار نہیں ہوتا اسلیے تسلی کے واسطے سایہ ان کا وہاں رکھ لیا کہ اسی سے مجھ کو تسلی رہے گی جیسے یعقوب علیہ السلام کو یوسف علیہ السلام کے کرتے سے تسلی ہوتی تھی یہ نعت نہیں یہ بلکہ حد درجہ گستاخی ہے لہٰذا باری تعالیٰ کے جناب میں نیز حضرت رسالت پناہ کی شان میں بھی ایسے اشعار سننا اور پڑھنا گناہ ہے۔

لہٰذا احتراز ضروری ہے بعض دینداروں کو بھی خبط ہوتا ہے کہ اشعار نعتیہ خواہ ان کا مضمون شریعت پر منطبق ہوتا ہو یا نہ ہو ذوق وشوق میں پڑھتے ہیں بعض اشعار نعت کے ایسے ہیں کہ ان میں دیگر حضرات انبیاء علیہم السلام کی بے ادبی ہوتی ہیں الحاصل معشوق کہنا یہ سخت بے ادبی ہے اس لیے کہ عشق خاصہ آدمی کا ہے اس لیے کہ عشق نام ہے نفس کے ایک خاص انفعال کا اور اللہ تعالیٰ انفعال اور تاثر سے سے پاک ہے ہاں یہ کہنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے مقبول ہیں اگر کوئی عشق کو معنی مجازی میں لینے لگے تو حق

تعالیٰ کی جناب میں ایسا اطلاق اذن شرعی کا محتاج ہے البتہ اگر مغلوب الحال کیکلام میں ہو اس کو معذور سمجھیں گے بدون غلبہ حال کے کسی کو اجازت نہ ہوگی خلاصہ یہ ہے کہ مقربان الٰہی کے محبوبان مجازی پر قیاس کرنا صحیح نہیں پس جب کہ یہ مبنی ہی منہدم ہوگیا تو آدمی کے ایسے مرتبہ پر پہنچنا کہ گناہ گناہ نہ رہے غلط ہوا اور بعضوں کو بزرگوں کے اس قول سے شبہ ہوگیا ہے کہ بندہ ایسے موقع پر پہنچ جاتا ہے کہ تکالیف شرعیہ اس سے اٹھ جاتی ہیں یہ قول صحیح ہے لیکن اس کے یہ معنی سمجھنا کہ طاعات کا وجوب نہیں رہتا یہ غلط ہے معنی اس قول کے یہ ہیں کہ طاعات اس کے لیے طبعی بن جاتے ہیں جیسے افعال طبیعہ میں طبیعت ان کے ارتکاب کی طرف مضطرب ہوتی ہے اسی طرح طاعات کی اس کو رغبت ہوجاتی ہے تکالیف اسکے لیے تکالیف نہیں رہتیں۔

خلاصہ تمام بیان ان غلطیوں کا ارتفاع ہوا کہ جی بھر کر گناہ اس لیے کرنا کہ گناہ کی ہوس نہ رہے اور گناہ کو کسی مصلحت کی وجہ سے کرنا اور خدا کا مقرب ہوجانے سے اور کسی گناہ کے مکشوف ہونے سے کسی گناہ کا حلال ہونا بعض اغلاط قصداً رفع کئے گئے بعض طبعاً مذکور ہوئے اب اس سے قرآن شریف کی جامعیت کا بھی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مختصر الفاظ کتنے معانی کو مستعمل ہیں اس کے بعد سمجھئے کہ اسی غلطیوں کی اصلاح علم اور صحت محققین سے ہوتی ہے اس لیے ان دونوں کو اختیار کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ تمام غلطیوں سے محفوظ رکھیں۔ آمین۔

برحمتك یاارحم الراحمین

قرآن میں ایجادات جدیدہ کا ذکر

(بحوالہ: کتب تھانویؒ)

اور بعض حضرات نے ریل گاڑی کو سورۂ نحل کی اس آیت **ویخلق مالا تعلمون** میں داخل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسی ایسی چیزیں پیدا کرے گا جن کو تم نہیں جانتے گو یہ تحریف تو نہیں ہے مگر بعید ضرور ہے کیوں کہ **یخلق** بظاہر صیغۂ حال ہے اور ظاہر ہے کہ ان سواریوں میں جو آج کل ایجاد ہوئی ہیں صحابہؓ کے زمانہ میں کوئی بھی پیدا نہیں ہوئی اور اگر اس کو مستقبل لیا جائے تو صحابہؓ کچھ سمجھے ہی نہ ہوں گے پھر یہ ایجادات خلق کے بعد تو معلوم ہو گئیں اور اس آیت کے تحت میں وہی اشیاء داخل ہو سکتی ہیں جو بعد خلق کے بھی معلوم نہ ہوں اس لیے اس کی تفسیر میں سہل بات وہی ہے جو اوپر بیان کی گئی ہیں کہ مراد وہ چیزیں ہیں جو انسان کے لیے مثل نعم مذکورہ کے نافع ہیں اور تم کو ان کی خبر بھی نہیں جیسے مواد ارضیہ جو موذیات کو فنا کرتے رہتے ہیں اور نافع ہونے کی قید باقتضاء مقام ہے اشیاء ناقصہ کا ذکر ہو رہا ہے پس حاصل مقام یہ ہوا کہ ہم ایسے نفع خیر بھی نہیں ہیں کہ بعض چیزوں کی تم کو اور ہم ان سے تم کو نفع پہنچا رہے ہیں یہ نہ سمجھو کہ بس وہی چیزیں تمہارے نفع کی پیدا ہیں جو تم کو معلوم ہوا جیسے نعم مذکورہ اور اس تقریر پر **یخلق مالا تعلمون** کا ربط بھی نعم مذکورہ سے ظاہر ہو گیا یعنی ربط یقابل اور بعض حضرات نے **مایفتح اللہ للناس من رحمۃ فلا ممسک لھا** میں ریل کو داخل کیا ہے کیوں کہ بعض سلف نے فرمایا ہے کہ رحمت میں ہر وہ نعمت داخل ہے جو بندوں کی راحت و آسانی کے لیے ایجاد ہوئی ہے چنانچہ شغدف وغیرہ کو بھی انہوں نے اس میں داخل کیا ہے اس میں البتہ زیادہ بعید نہیں اگر

واسطے میں نے بھی اپنی تفسیر کے حاشیہ میں اس مقام پر لکھ دیا ہے کہ من وحشہ کے عموم میں ریل بھی داخل ہے اور اتفاق عجیب یہ ہوا کہ جس دن میں اس آیت کی تفسیر لکھ رہا تھا اسی دن پہلے پہل ہمارے قصبے کے سامنے سے ریل گذری اس لیے میں نے تفسیر کے حاشیہ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بحمداللہ آج ہماری بستی کے سامنے سے عیدگاہ کے قریب ریل گذری ہے اور اس کے ساتھ ریل کے جاری ہونے کا سن اور تاریخ بھی لکھ دی تا کہ محفوظ رہے غرض اس آیت میں ریل کا داخل کرنا بعید نہیں اور خود میں نے بھی اسی میں اس کو داخل کیا تھا لیکن اس وقت میرے ذہن میں ایک بات اس سے بھی زیادہ قریب آئی ہے وہ یہ کہ اگر ذکر کو حقیقی اور حکمی کے لیے عام لیا جائے تو میرے نزدیک ریل کا ذکر وَتَحمِلُ اثقالکم الی بلدٍ لم تکونوا بالغیه الا بشق الانفس ۔ میں سب سے اقرب طرق کے ساتھ ہو جاوے گا کیوں کہ حق تعالیٰ نے یہاں مرکب میں وجہ نعمت اس غایت کو بیان فرمایا ہے کہ وہ تمہارا بوجھ ایسے بلاد تک پہنچاتے ہیں جہاں تم بدون مشقت کے نہیں پہنچ سکتے تھے تو جس سواری میں بھی یہ غالب موجود ہوگی وہ حکما اس نعمت میں داخل ہو کر مثل انعام کے نعمت کی ایک فرد ہوگی اور ریل میں یہ غایت سب سے زیادہ موجود ہیں۔

تو وہ بھی حکما اس نعمت میں داخل ہے اور جب نعمت میں داخل ہے تو جس طرح نعمت انعام پر ہم کو شکر کی تعلیم دی گئی ہے اس طرح نعمت ریل پر بھی شکر ادا کرنا چاہیے مگر اکثر لوگ اس سے غافل ہیں۔ (حضرت تھانویؒ)

قرآن مطب روحانی ہے

کیوں کہ میں بتلا چکا ہوں کہ قرآن مطب روحانی ہے اور مطب میں ترتیب نسخہ جان کی ضرورت نہیں قرآن کا طرز مصنفین کا نہیں ہے بلکہ معالجین کا سا طرز ہے اور یہیں سے ان لوگوں کی غلطی ظاہر ہوگئی جو حضور ﷺ کے خطبوں کے اجزا میں ارتباط ڈھونڈتے ہیں کیوں کہ حضور ﷺ میں صرف ایک ہی حیثیت، نہیں تھی بلکہ آپ خطیب ہونے کے ساتھ معالج بھی تھے اور ارتباط مضامین کا لحاظ وہ کرتا ہے جو محض خطیب ہونے کے ساتھ طبیب بھی ہو اور ارتباط ظاہر سے زیادہ مخاطبین کی حالت کا لحاظ کرے گا۔ کہ اس وقت ان کو کن کن باتوں کی ضرورت ہے خوب سمجھ لو مگر یہ قاعدہ عام نہیں ہے کہ آپ ہر جگہ اس کو جاری کرنے لگیں کہ ترتیب کی کیا ضرورت ہے بعض امور میں ترتیب کی ضرورت بھی ہوتی ہے مثلاً علاج ہی میں دیکھ لیجئے کہ نسخہ نویسی اور دوا کی تیاری میں تو دواؤں کی ترتیب ضروری نہیں مگر استعمال میں ترتیب ضروری ہے کہ پہلے خاکی پھانک لو اس پر جوشاندہ پیو یا دوا پہلے کھاؤ غذا اس کے دو گھنٹہ بعد کھاؤ اگر کوئی غذا پہلے کھائے گا تو دوا سے نفع نہ ہوگا اسی طرح اعمال شرعیہ میں ترتیب ہے کہ پہلے ایمان لاؤ پھر نماز پڑھو پھر نماز میں ترتیب ہے کہ اوّل صبح کی نماز پڑھو پھر ظہر کی اگر کوئی اعمال میں بے ترتیبی کرنے لگے تو اس کی ایسی مثال ہوگی جیسے ایک ظریف نے رس کی کھیر کھانا چاہی تھی پوچھا کھیر کس طرح بنتی ہے لوگوں نے کہاں چاول اور

رس ملا کر آگ پر رکھتے ہیں چاول پک جاتے ہیں کھیر تیار ہو جاتی ہے کہنے لگا یہ تو بڑا چکڑ ہے بس تو آپ نے کیا کیا کہ چاول کچے کھا کر اوپر سے رس پی لیا اور آگ کی طرف سرین کر کے جا کھڑا ہوئے اور کیا رس چاول تو پیٹ میں جا کر مل گئے اور آگ کے سامنے ہونے سے وہ پک بھی جائیں گے تو کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے کھائی اور اس کو کھیر کا مزا آ گیا ہرگز نہیں بلکہ اس کو تو ہیضہ کا مزا آیا ہوگا بہر حال یہ قاعدہ عام ہے جس کو اعمال میں بھی آپ جاری کرنے لگیں بلکہ عدم ضرورت ارتباط صرف نصائح ہی کے ساتھ خاص ہے جس سے مقصود علاج ہے اس لیے اگر اختصار کے ساتھ انتشار بھی ہو تو مجھے معاف کیا جائے۔

حضرات ائمہ مجتہدین پر اعتماد کا سبب

من جملہ ان غلطیوں میں سے ایک غلطی بحث و مباحثہ بھی ہے یعنی اپنی بات غالب کرنے کے لیے گو وہ حق بھی نہ ہو لیکن ادھر ادھر کی باتیں کرتے ہیں سو یہ مرض آج کل اہل علم میں بہت ہے کہ ایک دفعہ زبان سے کوئی بات نکل جائے تو پھر اس کی ضد ہو جاتی ہے اور مناظرہ و مباحثہ کی نوبت آتی ہے پھر ہم نے کبھی نہیں سنا کہ فریقین میں سے کسی نے اپنی بات سے رجوع کیا ہو حالاں کہ دونوں میں سے ایک ضرور ناحق پر ہوتا ہے بعض لوگ تو یہاں تک غضب کرتے ہیں کہ ایک دفعہ غلط فتوی قلم سے نکل گیا تو عمر بھر اسی پر جمے رہے اور اس کی تاویلیں کرتے رہے چنانچہ ایک شخص نے رضاعت کے مسئلہ میں غلطی کی اور غلط مسئلہ چھاپ دیا علماء نے اس پر گرفت کی کہ جو اب غلط ہے تو مفتی صاحب نے اپنے فتویٰ کی تائید میں ایک رسالہ لکھا اور اپنے استاذ کے پاس دستخط کے لیے گئے تو مفتی صاحب کے استاذ نے بھی کہا کہ یہ جواب غلط ہے لہٰذا میں اس پر کیوں دستخط کر دوں تو آپ کہتے ہیں کہ حضرت واقعی غلطی تو ہو گئی مگر آپ دستخط کر دیں تا کہ میری بات رہ جائے استاذ نے انکار کر دیا اور اس مفتی کو ملامت کی کہ بعد حق واضح ہونے کے باوجود بھی غلطی پر جما ہوا ہے مگر اس نے ایک نہ سنی اور وہ رسالہ غلط مسئلہ کی تاویل میں شائع کر ہی دیا ان کے استاذ حالاں کہ معقول اور پوربی اور ملک میں ہمارے مخالف ہیں مگر ان کی طبیعت میں انصاف ہے ایک بار ایک شخص انکے پاس ایک سوال لایا کہ اس پر جواب لکھ دیجئے کہنے لگے میں تو فتوی لکھتا نہیں کسی دوسری جگہ لکھوالو۔ لیکن اگر ایمان کا مسئلہ پوچھنا چاہو تو گنگوہ تھانہ بھون سے منگاؤ اور بے ایمانی کا فتوی چاہو تو یہاں کے مولویوں سے پوچھ لو اور بے ایمان فتوی

میں یہی ہے کہ مفتی کو اپنی بات کی ضد ہو ایسے شخص کے فتوی پر کچھ اعتماد نہیں قابل اعتماد وہ شخص ہے جو ایک بچہ کے کہنے سے بھی اپنی رائے کو چھوڑ دے اگر وہ بچہ حق پر ہو بہرحال حضرات ائمہ مجتہدین پر جو امت کا اعتماد ہے وہ اسی لیے ہے کہ ان کی بات اگرچہ سچ تھی لیکن وہ پھر بھی وہ ہر وقت اپنی رائے سے رجوع کرنے کو تیار تھے جب بھی ان کو اپنی رائے کا غلط ہونا واضح ہو جائے چنانچہ امام ابوحنیفہؒ نے بہت سے مسائل میں رجوع کیا ہے (ایسے ہی امام مالکؒ نے اور امام شافعیؒ کا مذہب ہی مصر جا کر بدل گیا محض اس لیے کہ اس زمانے کے اعتبار سے مسئلہ صحیح نہیں ہے۔

تواضع حاصل کرنے کا طریقہ

اور تواضع محض کتابیں پڑھنے سے نہیں حاصل ہوتی بلکہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جس کو مولانا فرماتے ہیں۔ (حضرت تھانویؒ) کہ تواضع حال سے پیدا ہوتی ہے اور حال کسی کامل کی جوتیاں سیدھی کرنے سے حاصل ہوتا ہے پس تواضع حاصل کرو اور اپنی بات غالب کرنے کے لیے مباحثہ کبھی نہ کرو ایک گناہ زبان کے متعلق یہ ہے کہ کسی کو طعنہ دیا جائے یا اس کے عیب کو جتلایا جائے۔

جلالت شان رسول اللہ ﷺ

عشاق نے یہ سمجھا ہے کہ اس میں آنحضرت ﷺ کی جلالت شان کی طرف اشارہ ہے کیوں کہ مطلقاً مکہ کی قسم نہیں کھائی بلکہ جب آپ اس میں رونق افروز ہوئے تو عشاق کے محاورہ میں گویا آپ کے خاک کی پاک قسم کھائی ہے اور اس میں عربیت متروک نہیں ہوئی بلکہ نعمت سے متباید ہے اس لیے یہ محض نکتہ نہیں ہے بس عشاق کا ذہن اس طرف گیا کہ آپ کی ذات تو بہت بڑی ہے کہ آپ کے نزول سے مکہ قابل قسم ہو گیا مگر اس عنوان محبت سے کوئی نہ سمجھے کہ خدا عاشق ہے (نعوذ باللہ) ہم اس لیے اللہ کی پناہ مانگتے ہیں۔ اس کا دعویٰ لفظاً و معناً خلاف واقع ہے۔

معجزۂ قرآن

قرآن جیسا زندہ اور علمی معجزہ کس پیغمبر کو دیا گیا؟ جس کا مقابلہ بہ اعتبار فصاحت و بلاغت کے اور بہ اعتبار علم و مضامین اور بہ اعتبار تحریف و تبدیل کے رہنے کے باوجود دنیا کی کوئی کتاب نہیں کر سکتی اور نہ انشاء اللہ کر سکے گی قرآن کے حق میں ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں جو خود قرآن بار بار اعلان کر رہا ہے یعنی یہ کہ جس میں ہمت ہو وہ میرا جواب لکھ دے مگر آج تک کسی کی جرأت نہ ہوئی اور نہ ہوگی کہ اس کی ایک چھوٹی سی سورۃ کی بھی نظیر پیش کر سکے۔ ان میں اس کے سوا کیا کہوں کہ آنحضرت ﷺ جیسا کہ اپنی عبادات و اخلاق میں تمام انبیاء علیہم السلام سے فائق تھے ایسے علوم کے بھی ستارے و مراتب آپ کو دیئے گئے جو کسی اور کو نہیں دیا گیا کیوں کہ انبیائے سابقین میں نہ ایسا اعجاز علمی کسی کو دیا گیا اور ان کے اتباع میں کسی نے ان علوم کے دریا بہائے جو اہل اسلام نے بہائے ہیں۔

خاتم الانبیاء

اور جبکہ صفتِ علم تمام ان صفات کی خاتم ہے جو مربی عالم ہیں تو جو اعجاز علمی ہوگا گویا اس پر تمام کمالات علمی کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور اسی کو ہمارے نزدیک خاتم الانبیاء کہنا زیادہ مناسب ہوگا اور چونکہ اس کا دین قیامت تک رہے گا اس لیے اس کی کتاب کا بھی تا قیامت باقی رہنا ضروری ٹھہرے گا۔ باقی قرآن کے سوا آپ کے جو اور علمی اور علمی معجزات ہیں ان کے بیان کی اس وقت بالکل گنجائش نہیں رہی اور نہ میں قلت وقت کی وجہ سے توریت و انجیل وغیرہ کی بشارت آپ کی نبوت کے متعلق نقل کر سکا جس کسی کو شوق ہو، اوّل مضمون کے واسطے حضرت مولانا محمد قاسم صاحبؒ نانوتی کی حجۃ الاسلام اور دوسرے کے لیے علامہ ابن قیم کی ہدایۃ الحیازی کا مطالعہ کرے۔

مسلمانوں کے تمدن کی کہانی غیروں کی زبانی

قارئین کرام! علوم وفنون دنیا میں مسلمانوں کے ذریعے سے پھیلا اور تمدن کے شعبوں کو ترقی ہوئی اس کا بھی اندازہ غیروں کی زبانی سے ہم سامعین کو کرادیں تاکہ جو لوگ مسلمانوں کو علم اور تمدن کا دشمن بتاتے ہیں اور پھر اس دشمنی کو ان کی مذہبی تعلیمات کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ وہ بھی اپنی کم فہمی اور کوتاہ نظری سے کچھ شرمائیں۔ ترقی علوم فنون کے متعلق ''انسائیلو پیڈیا'' میں لکھا ہے۔ جس کا خلاصہ نقل کرتا ہوں۔ ۶۴۹ء خلفائے عباسیہ کے عہد میں علم ادب وفنون حکمت کا ظہور ہوا اور المنصور ۷۵۴ء کے ایام حکمرانی سے ہارون رشید ۷۸۶ء تک بڑی فیاضی سے اس کی تربیت ہوئی اور بہت سے ملکوں سے اہل علم طلب کئے گئے اور بادشاہانہ سخاوت کی طرف ان کی بہت کچھ داد دہش کی گئی اہل یونان وشام وایران قدیم کی عمدہ عمدہ کتابیں عربی میں ترجمہ ہوکر شائع اور مشتہر ہوئیں خلیفہ مامون نے سلطان روم کو ساڑھے بارہ من سونا دیا اور ہمیشہ کے لیے صلح اس شرط پر منظور کی کہ لیوفلسوف کو اجازت دی جائے کہ چند عرصے کے لیے وہ یہاں آکر مامون کو فلسفہ وحکمت سکھلائے فلسفہ حاصل کرنے کے لیے ایسی خطیر زر صرف کرنے کی بہت کم مثال ملے گی اسمامون کے زمانے میں بغداد، بصرہ، بخارا، اور کوفہ میں بڑے بڑے مدرسوں کی بنیاد پڑی اور اسکندریہ بغداد اور قاہرہ میں عظیم الشان کتب خانے بنائے گئے اسپین میں مدرسہ اعظم مقام قرطبہ کا بغداد کی علمی شہرت کی ہم سری کرتا تھا اور عموماً دسویں صدی میں جہاں دیکھو وہاں مسلمان ہی علوم کے حافظ اور سکھلانے والے نظر آتے تھے ''فرانس'' اور ممالک فرنگستان کے جوق در جوق طالب علم اندلس کو آنے لگے اور ریاضی، اور طب عربوں

سے سیکھنے لگے اندلس میں چودہ مدرسے اور بڑے بڑے کتب خانے تھے جن میں سے حاکم کے کتب خانے میں چھ لاکھ کتابیں جمع ہوئیں۔ یہ کیفیت ترقی علم کی جب کہ اس زمانے میں ملائی جائے جو قبل از زمانہ محمد ﷺ کے گزرا، تو ثابت ہے جیسا کہ عرب فتوحات میں سبقت کرتے تھے ایسے ہی ترقی علم میں بھی یہ لوگ تیز رفتار تھے جغرافیہ تاریخ، فلسفہ، طبعیات، اور ریاضی، میں مسلمانوں نے بڑا ہی کام کیا ہے اور عربی الفاظ جواب تک علوم حکمیہ میں بولے جاتے ہیں اور بہت سے ستاروں کے نام وغیرہ ذلک اس بات کی دلیل ہے کہ یورپ کے اکتساب علوم پر قدیم سے مسلمانوں کو بہت دخل وتصرف ہوا ہے مگر بعد کے زمانے میں اس سے زیادہ جغرافیہ کا علم بہت کچھ یورپ کو حاصل ہوا ہے ایشیاء اور افریقہ، میں جغرافیہ کی بہت اشاعت ہوئی اور علی ہذا، جغرافیہ میں پرانی عربی کتابیں اور سفر وسیاحت کے رسالے تصنیفات ابوالعذا، ادریسی ٹیوافریفالوس ابن بطوطہ ابن فضلان، ابن جبیر البیرونی، المنجم اور ان کی تحریریں اب تک مفید اور گرامی قدر ہیں۔ علم تاریخ بھی محنت سے حاصل کیا گیا اور قدیم عربی مورخ جس کا حال ہم کو ملتا ہے محمد الکلبی ہے جو ۸۱۹ میں گزرا مگر اسی زمانے میں اور کئی مورخ گزرے اور دسویں صدی کے شروع سے تو عرب نے علم تاریخ پر بہت توجہ کی اور لوگوں نے تمام جہاں کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا ان میں اوّل مسعودی، طبری، حمزہ، اصفہانی اور برطبکیونس، بطریق اسکندریہ ہیں مسعودی کی تاریخ کا نام مروّج الذہب، اور معدم الجواہرہ اسکے بعد ابوالفرح اور جارج اقاقین ہر دو عیسائی اور ''ابوالعذا وغیرہ ہیں بہر کیف جزیرۂ سفلیہ کی تاریخ ایام سلطنت عرب کی لکھی بہت سے ابواب عربی تاریخوں کے جن میں عیسائیوں کی جنگ مقدس کا بیان ہے ''فرانسیسی'' زبان میں ترجمہ ہوئے ہیں اور اندلس میں مسلمانوں کی سلطنت کے حالات ابوالقاسم قرطبی تمنی وغیرہ نے متعدد کتابوں میں لکھے ہیں جس کسی کو ان کی حالات دریافت کرنے کا زیادہ شوق ہو تو ''قطر بمیرہ'' کی تصنیفات خصوصاً وان ہمبر

کی کتابوں سے رجوع کرے عرب کے فلسفہ کو جو یونانی الاصل تھا قرآن سے وہی نسبت ہے جو اوسط زمانے کے معقولات کو عیسائیوں کی کتب سے تھی یعنی فلسفہ کو دینیات کا خادم سمجھا جاتا تھا عربوں نے ارسطاطالیس کی تصنیفات کو بہت پڑھا اور اس پر ان کی بہت شہرت ہوئی اور بالآخر تمام فرنگستان میں عربی زبان سے ''لاطینی'' زبان میں ترجمے کے ذریعے سے اس کی اشاعت ہوئی گو عرب تو خود ہی عہد عباسیہ میں ترجمے کے وسیلے سے حاصل ہوا تھا منطق اور علم مابعد الطبعیۃ پر زیادہ توجہ ہوئی اور مسلمانوں میں اہل فلسفہ یہ لوگ ہوئے ہیں الکندی البصری، جو نویں صدی عیسوی میں تھا الفارابی جس نے ۹۵۴ء میں اصول میں کتابیں لکھی ابن سینا جس نے منطق اور علم مابعد الطبعیۃ اور طبی کو جمع کیا اور علم کیمیا اور تشخیص امراض وشناخت ادویات بنانے میں بڑی ترقی کی ابن یحییٰ جس کی تحقیق کی بڑی شہرت ہوئی الغزالی جس نے لیاقت الفلاسفہ تصیف کی ابوبکر بن طفیل جس نے اپنی حیٔ بن یقظان میں انسانوں کا حیوان سے ظہور میں آنے کا مسئلہ بیان کیا اور ان کے شاگرد ابن رشید جو ارسطاطالیسی کے مفسر ہونے میں بڑا مشہور اور گراں قدر تھا ان لوگوں کا اور ان کے مسلک کا بیان شمول اور ترکی کتابوں میں مفصل ملے گا۔

بہرحال بہت ان عرب فلسفوں میں بھی تھے ان کے علم خواص وادویہ میں مہارت کامل حاصل کرنے کو میں نے معلومات جغرافیہ سے منسوب کیا ہے علم طب اس حیثیت کا وہ ایک علم ہے جو عرب ہی کی ایجاد ہے جن کو نہایت قدیم اور وسیع ماخذ، یعنی ہندی طبیب شروع ہی سے مل گئے تھے معمون بنانے کی کیمیائی ترکیب عربوں ہی نے ایجاد کیا، اور دواؤں کے مرکب کرنے اور نسخہ لکھنے کی ایجاد بھی انہی سے ہوئی اور مدرسہ کے ذریعہ سے یہ علم فرنگستان جنوبی میں پھیل گیا۔ دواسازی کی وجہ سے علم حیات اور کیمیا کی حاجت پڑی اور تین سو برس تک ان علوم کی تحصیل ہوتی رہی اور میں بغیر علم تشریح کے بڑی نرمی ہوئی اس کے استغناء کی وجہ یہ ہے کہ قرآن

میں اجسام کی تشریح منع کی گئی ہے علم طب میں یہ لوگ بڑے نامی مشہور ہوئے ہارون کندی، ابن سینا، جس نے قانون لکھا اور عرصے تک اس فن میں یہی ایک کتاب درس میں رہی علی بن سینا، جس نے قانون لکھا اور عرصے تک اس فن میں یہی ایک کتاب درس میں رہی علی بن عباس، اسحاق بن سلمان، ابوالقاسم اور اوس جس نے طب کی تکمیل کی اور علی بن عیسیٰ وغیرہم۔ ریاضی میں اہل عرب نے بڑی ترقی کی اور بحر المقابلہ کو بڑی ترقی دی بغداد اور قرطبہ کے مدرسوں اور عیدگاہوں میں علم ہیئت کمال شوق سے بڑھا جاتا تھا الحسن نے علم مناظر و مزایا میں تصنیف کی اور نصیر الدین طوسی نے اقلیدس کا ترجمہ کیا جبیر بن عقلا نے طلموس کے علم مثلث پر تشریح لکھی اور نظام طلموسی کی کتاب موتی کو الہادی اور سیومیوس نے عربی میں ترجمہ کیا اور دسویں صدی عیسوی میں البائن نے زمین کے دائرہ عظیمہ کے ارتفاع پر نظر کی اور محمد بن الجز الثانی نے رفتارِ شمس کی دریافت کی الیز جیوش نے توابت کے بیان میں کتاب لکھی اور ابوالحسن علی نے آلات علم ہیئت میں تصنیف کی۔

ڈاکٹر لی بان کا حقیقت افروز بیان

یہ حالت جو انسائیکلو پیڈیا کے حوالے سے درج کی گئی مسلمانوں کے علم وفضل کے متعلق اب ان کی چند تمدنی خصوصیات کو بھی سن لینا چاہیے فرانس کا مشہور ومعروف ڈاکٹر کی جان عربوں کی ملک گیری کی خصوصیات میں لکھتا ہے یہ خلفائے راشدین جس خوش تدبیری کو کام میں لائے وہ مافوق ان کی سپاہ گری اور فن حرب کا ثمرہ تھا جسے انہوں نے اس آسانی سے سیکھ لیا تھا شروع ہی سے انہیں ایسے اقوام سے کام پڑا، جس پر سالہا سال سے مختلف صوبہ میں مختلف حکومتوں نے ظلم کر رکھا تھا اور اس مظلوم وعلا نے نہایت خوشی کے ساتھ ان نئے ملک گیروں کو قبول کر لیا، جن کی حکومت میں انہیں بہت زیادہ آسائش تی مفتوح اقوام کے ساتھ طریقہ کیا ہونا چاہیے نہایت صاف اور صریح طور پر مقرر کر دیا گیا تھا اور خلفائے اسلام نے ملک کے غیر امن کے مقابل میں ہرگز یہ زور شمشیر دین کو پھیلانے کی کوشش نہیں کی بلکہ بہ عوض اس کے کہ وہ جبراً اپنے دین کی اشاعت کرتے، جیسا کہ بار بار کہا جاتا ہے وہ صاف طور پر کہہ دیتے تھے کہ اقوام مفتوحہ کے مذاہب ورسوم اور اوضاع کی پوری طرح سے احترام کیا جائے گا اور اس آزادی کے معاوضے میں بہت خفیف سا خراج لیتے تھے جو ان مطلوبات کے مقابلے میں جو ان اقوام کے پرانے حکام ان سے وصول کیا کرتے تھے نہایت کم تھا۔ کسی ملک پر فوج کشی کرنے سے پہلے عرب ہمیشہ ان کے پاس سفیروں کے ذریعہ سے صلح کے شرائط بھیجا کرتے تھے اور یہ شرائط جن کا ذکر ''المکین'' نے کیا ہے علی العموم اسی قسم کے ہوا کرتے تھے جو عمرو نے ۱۷ھ میں باشندگان غزہ کے سامنے جو اس وقت محصور تھا پیش کئے تھے اور یہ شرائط مصریوں اور ایرانیوں دونوں سے کی گئی تھیں۔ وہ شرائط ذیل میں لکھی جاتی ہیں ہمارے حاکم نے ہمیں حکم دیا ہے کہ اگر تم ہم سے بھی مل جاؤ قانون اسلام قبول تمہارے ساتھ جنگ کریں

گے اور ہمارے بھائی بن جاؤ اور ہمارے منافع ہمارے منصوبوں میں شریک ہو جاؤ اس کے بعد ہم تم سے کوئی برائی نہ کریں گے لیکن اگر تم یہ کرنا نہیں چاہتے تو تم ہمیں اپنی زندگی تک ایسا سالانہ خراج بالالتزام دیا کرو اس کے بعد تمہارے بدلے ہم تمام ان لوگوں سے لڑیں گے جو تمہیں ستانا چاہیں یا کسی طرح تمہارے دشمن ہوں اور ہم اپنے معاہدے پر مضبوط رہیں گے اگر تمہیں یہ بھی منظور نہیں ہے تو پھر ہم میں اور تم میں بجز تلوار کے کوئی چیز نہیں رہتی، اور ہم تم سے اس وقت تک جنگ کرتے رہیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کے حکم کو پورا نہ کر لیں بیت المقدس کی فتح کے وقت حضرت عمرؓ کا اخلاق ہم پر ثابت کرتا ہے کہ ملک گیران اسلام مفتوح اقوام کے ساتھ کیا نرم سلوک کرتے تھے اور یہ سلوک اس مدارات کے مقابل میں جو صلیبیوں نے اس شہر کے باشندوں سے کئی صدی بعد کی نہایت حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے حضرت عمر اس شہر مقدس میں بہت تھوڑے اشخاص کے ساتھ داخل ہوئے اور آپ نے سفر و نیسبطریق سے درخواست کی کہ مقامات مقدسہ کی زیارت میں آپ کے ہم راہ چلے اسی وقت حضرت عمرؓ نے منادی کرادی کہ میں ذمہ دار ہوں کہ باشندگان شہر کے مال اور ان کی عبادت گاہوں کی حرمت کی جائے گی اور مسلمانوں عیسائی گرجوں میں نماز پڑھنے کے مجاز نہ ہوں گے۔

جو سلوک عمر نے مصریوں کیساتھ کیا اور وہ اس سے کم نہ تھا اس نے باشندگان مصر سے وعدہ کیا کہ انہیں پوری مذہب کی آزادی پورا انصاف بلا رورعایت اور جائداد کی ملکیت کے پورے حقوق دیے جائیں گے اور ان ظالمانہ اور غیر محدود مطالبوں کے عوض میں جو شہنشاہان یونان انسے وصول کیا کرتے تھے صرف ایک سالانہ جزیہ لیا جائے گا جس کی مقدار فی کس تقریباً دس روپے تھی دیا جائے رعایائے صوبہ جات نے ان شرائط کو اس قدر غنیمت سمجھا کہ وہ فوراً عہد و پیمان میں شریک ہو گئے اور جزیئے کی رقم انہوں نے پیشگی ادا کر دی۔ عمال اسلام اپنے عہد پر اس درجہ مستحکم رہے اور انہوں نے ان رعایا کے ساتھ جو ہر روز شہنشاہ قسطنطنیہ کے عاملوں کے ہاتھ سے انواع و اقسام کے

مظالم مہیا کرتے تھے اس طرح کا عمدہ برتاؤ کیا کہ سارے ملک نے یہ کشادہ پیشانی دین اسلام اور زبان عربی کو قبول کرلیا میں بار بار کہونگا کہ یہ نتیجہ ہے کہ ہرگز بزور شمشیر حاصل نہیں ہوسکتا اور عربوں سے پہلے جن اقوام نے مصر پر حکومت کی وہ ہرگز یہ کامیابی نہ حاصل کرسکی عربوں کی ملک گیری میں ایک خاص بات ہے جو انکے بعد کے ملک گیری میں ہرگز نہیں پائی جاتی اور اقوام نے بھی مثل بربریوں جنہوں نے روم کے ملک کو فتح کیا ہے یا ترکیوں وغیرہ کو۔ ملک گیری کی ہے لیکن انہوں نے کبھی نے کوئی تمدنی نہیں قائم کیا اور انکی ساری ہمت اسی طرف مصروف رہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ اقوام مفتوحہ کے مال سے فائدہ اٹھالیں برخلاف انہیں کے عربوں نے قلیل زمانے میں ایک جدید تمدن کی عمارت کھڑی کردی اور انہوں نے ایک گروہ اقوام کو اس جدید تمدن کے ساتھ اپنے مذہب اور اپنی زبان اختیار کرنے پر آمادہ کیا۔ عربوں کی صحبت کے ساتھ ہی مصر اور ہندوستان کی سی قدیم اقوام نے ان کا دین، ان کا لباس ان کا طرز معیشت بلکہ ان کا طریقہ تعمیر تک اختیار کرلیا عربوں کے بعد بہت سی اقوام نے ابھی خطوں پر حکومت کی ہے لیکن پیغمبر اسلام کی تعلیم کا اثر اس وقت تک ان ملکوں میں باقی ہے کل ممالک ایشیا و افریقہ میں مراکش سے لے کر ہندوستان تک جہاں کہیں عرب پہلے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر ان ملکوں میں ہمیشہ کے لیے قائم ہوگیا بہت سے ملک گیروں نے ان ممالک کو عربوں کے بعد فتح کیا ہے لیکن وہ ان سے عربوں کا مذہب اور عربوں کی زبان کو ہرگز نہ مٹا سکے یہ شایستہ تمدن جس کا ذکر محقق موصوف نے کیا چند ہی روز میں دریائے سندھ سے اندلس تک پہنچ گیا اور رفتہ رفتہ ہندوستان میں جو ہزارہا معبودوں کا گھر تھا مسلمانوں کے بابرکت قدم آئے اور انہوں نے اس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ روشن اور گویا بت خانے کے اندر مسجد بنادی۔

تمت

بسم اللہ الرحمن الرحیم

منکرین اسلام کو
دندان شکن جوابات
حصہ دوم

افادات

حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہٗ

بانی دارالعلوم دیوبند

تالیف

مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فاضل دارالعلوم دیوبند

فیصل پبلیکیشنز دیوبند

© کتاب کے جملہ حقوق بحق ناشر مکمل محفوظ ہیں

کوئی بھی صاحب اس کتاب کے کسی بھی حصہ کو بغیر ناشر کی اجازت کے چھاپنے کی کوشش نہ کریں ورنہ اس کے خلاف قانونی کاروائی کی جائیگی۔ (ناشر)

I.S.B.N. : 81-86971-98-X

نام کتاب	منکرین اسلام کو دندان شکن جوابات
افادات	حجۃ الاسلام حضرت مولانا قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ
تالیف	مولانا محمد نسیم رحمانی سہرساوی
حصہ	دوم
صفحات	۲۲۴
سن اشاعت	۲۰۰۴
باہتمام	محمد نوید صدیقی
قیمت	.....
کمپیوٹر کتابت و	
ٹائٹل ڈیزائن	فیصل کمپیوٹرس دیوبند
مطبع	فیصل پریس دیوبند
ناشر	فیصل پبلیکیشنز جامع مسجد دیوبند

PHONES : 01336-224110,222694 FAX.224110

Distributed by

FAISAL BROTHERS

468, Gali Bahar Wali Chhatta Lal Mian
Daryaganj New Delhi.110002 Ph. 3245665
e-mail : faisal_india@rediffmail.com

انتساب

والد بزرگوار، محترم عزت مآب جناب صوفی غلام مصطفیٰ صاحب کے نام
جن کے ذریعہ باری تعالیٰ نے دنیا کے
اندر وجود بخشا
اور
دینِ اسلام کی خدمت کرنے کی توفیق بخشی

محمد نسیم رحمانی سہرساوی

فہرست مضامین

منکرین اسلام کو دنداں شکن جوابات

عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ
● قرآن غیر مسلموں کی نظر میں	۷	● نبوت و رسالت	۴۳
● اشکالات و جوابات فی قرآن الکریم	۱۰	● ملائکہ، جنات، اور شیاطین کی حقیقت	۴۶
● قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟	۱۳	● کرامات اولیاء	۴۶
● اشکال و جواب فی باب الرزق؟	۱۸	● امام غائب کا عقیدہ درست نہیں	۴۷
● لا یجب علی اللہ شئ	۱۹	● باری تعالیٰ مکان سے پاک ہے	۴۹
● بعث بعد الموت	۲۰	● باری تعالیٰ زمان سے پاک ہے	۵۰
● میزان و نامہ اعمال	۲۱	● اشکالات و جوابات فی علوم القرآن	۵۱
● الکتاب	۲۳	● اشکال و جوابات لوح محفوظ پر	۵۳
● پل صراط	۲۴	● مصیبت	۵۳
● شفاعت	۲۴	● نبی اکرم ﷺ اُمی تھے	۵۴
● مقتول	۲۵	● خوف و خشیت	۵۵
● رویت باری تعالیٰ	۲۶	● قرآن کریم معجزۂ الٰہی	۵۶
● تقلید	۲۹	● اشکال و جواب علی الوحدانیہ	۵۶
● اثبات وحدانیت	۳۱	● کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے	۵۶
● تقریر برہان تمانع	۳۴	● اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے	۵۷
● صفات باری	۳۶	● اللہ تعالیٰ جملہ اعضاء سے پاک ہے	۵۷
● اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا مطلب	۳۷	● عذاب دائمی	۵۸
● صفات باری پر شبہ اور اس کا جواب	۳۸	● جنت و جہنم	۵۹
● تعدد صفات حقیقیہ	۳۹	● اتباع اللہ و الرسل	۶۰
● صفتِ علم	۳۹	● مرتد	۶۱
● ایمان اور اسلام	۴۱	● مردہ	۶۱

● مہذب وحسن اخلاق	۶۲	● صدور اور خلق کا فرق	۱۵۹
● زکوٰۃ زیادتی کا باعث	۶۳	● خدا برائیوں کا خالق ہے مصدر نہیں	۱۵۹
● اللہ تعالیٰ معشوق ہیں	۶۴	● برائیوں کا مصدر ہونا برا ہے،	
● دنیا کافروں کے لئے جنت ہے	۶۴	خالق ہونا نہیں	۱۶۰
● زمانۂ میثاق	۶۵	● اعتراض: نسخ احکام واَدیان کا نظریہ	
● مذہب اسلام	۷۶	غلط ہے	۱۶۱
● اسم اللہ	۶۷	● جوابِ اوّل	۱۹۵
● اللہ کون سی زبان ہے	۶۹	● جواب ترمیم وتنسیخ کے دو محرکات	۱۶۲
● رحمٰن ورحیم کی تحقیق	۶۹	● مصلحت کی رعایت نادانی نہیں	۱۶۴
● چند علمی حقائق ودقائق	۷۲	● اعتراض: خلق ارواح کا نظریہ صحیح نہیں	
● نتیجہ اوّل	۷۲	بلکہ نظریۂ تناسخ صحیح ہے	۱۶۵
● نتیجہ دوم	۷۴	● پہلے دعوے کا الزامی جواب	
● نتیجہ سوم	۷۸	ضرورت سے زائد اور قبل از وقت	
● نتیجہ چہارم	۷۹	موجود رہنا خلاف عقل نہیں	۱۶۷
● نتیجہ پنجم	۸۱	● دوسرے اور تیسرے دعوے کا	
● نتیجہ ششم	۸۲	الزامی جواب مہمل بات	۱۶۸
● نتیجہ ہفتم	۸۵	● پہلے دعوے کا علمی جواب روح، جسم اور	
● ایک شبہ اور اس کا ازالہ	۸۹	اعضاو جوارح کی حیثیت	۱۷۰
● انصار مدینہ کا قبول اسلام	۹۰	● دوسرے دعوے کا علمی جواب	
● عبدیت حصہ دوم	۹۳	دلیل کم نظری	۱۷۲
● اعتراض: شیطان کا کوئی وجود نہیں...	۱۵۳	● تیسرے دعوے کا علمی جواب	
● جوابِ اوّل: وجودِ شے کے لیے		تناسخ کی بحث	۱۷۴
مصدرِ شے کا علم ضروری نہیں	۱۵۴	● تناسخ اور دلیل نقلی	۱۷۴
● جوابِ دوم اوصاف اور ان		● کیا ویدوں کی تعلیمات الہامی ہیں؟	۱۷۵
کے صدور کی بحث	۱۵۵	● تناسخ عقل کی روشنی میں	۱۷۷
● ایک سخت الجھن اور اس کا حل	۱۵۷	● تناسخ کی ممکنہ عقلی دلیل	۱۷۸

● تناسخ کے خلاف عقل ہونے کی پہلی وجہ	۱۷۹
● دوسری وجہ	۱۸۱
● عہدِ الست پر ایک شبہ اور اسکا جواب	۱۸۳
● عہد الست کا عقلی ثبوت	۱۸۵
● تیسری وجہ کائنات میں انسان کی حیثیت	۱۸۶
● چوتھی وجہ انسان کا جسمانی اور روحانی ارتقاء اور اس کے مراحل	۱۸۹
● عوارض و اوصاف کی دو قسمیں	۱۹۲
● بے ہوشی اور علم	۱۹۳
● اعتراض: دفنِ میت کا اسلامی طریقہ مناسب نہیں ہے	۱۹۴
● جواب روح اور جسم کی حیثیت	۱۹۴
● دفن ہی قابل اعتراض کیوں؟	۱۹۶
● زمین کی آلودگی کا کوئی مکان نہیں	۱۹۷
● دفن کے فوائد	۱۹۸
● زمین کی قوتِ نمو کا تقاضا	۲۰۰
● طبعی تقاضا	۲۰۲
● تناسبِ عناصر کا تقاضا	۲۰۳
● محبت و اکرام کا تقاضا	۲۰۴
● اعتراض: قیامت، برزخ، حساب کتاب وغیرہ اسلامی عقائد خلافِ عقل ہیں	۲۰۵
● جواب اول	۲۰۵
● جواب دوم	۲۰۶
● جزا و سزا میں تاخیر خلاف عدل نہیں	۲۰۷
● جزا و سزا کی حقیقت	۲۰۸
● ایک شبہ کا ازالہ	۲۰۹
● قیامت کی دلیلِ اوّل	۲۱۱
● دلیل دوم	۲۱۲
● دلیل سوم	۲۱۴
● عبادت کاملہ اور اُسکی ادائیگی کی شکل	۲۱۵
● علم، خاتم الصفات کیوں ہے؟	۲۱۶
● خاتم المراتب کون؟	۲۱۸
● دین خاتم النبیین کا مصرف	۲۱۸
● حضور ﷺ کی دو خصوصیتیں	۲۱۹
● دلیل چہارم	۲۲۱
● دلیل پنجم	۲۲۲

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن غیر مسلموں کی نظر میں

قارئین کرام! قرآن کی عظمت و رفعت اس قدر ہے کہ دنیا میں اس کی نہ کوئی مثال ہے اور نہ کوئی نظیر جیسا کہ رب حقیقی نے مختلف جگہوں پر تمام دنیا والوں کو اس بات پر برانگیختہ کیا اور دلوں کو ابھارا کہ اس کی مثال کم از کم ایک آیت بھی پیش کر دو لیکن عرب کے بڑے بڑے فصحاء و بلغا نے نفی میں جواب دیا بہر حال:

یہی قرآن ہے جس نے تہذیب و تمدن کا سبق سکھلایا
یہی قرآن ہے جس نے عدل و انصاف قائم کرنے کا حکم دیا
یہی قرآن ہے جس نے غرباء و مساکین کے حقوق دلوائے۔
یہی قرآن ہے جس نے عورت اور بیکسوں پر آنے والے ظلم و زیادتی کو ہبا منثورا کیا۔
یہی وہ قران جس نے تمام امت محمدیہ کو افضلیت و اشرفیت کی ڈگری بخشی یہی وہ قرآن ہے جس نے تمام لوگوں کے ساتھ حسن اخلاق کی تعلیم دی۔ بہر کیف اس مذکورہ خوبیوں کے علاوہ بہت ساری خوبیاں ہیں جو قرآن کریم کی اہمیت و رفعیت پر دال ہے۔ اور اس قرآن کریم کی اولیت و صداقت کو اہل ایمان تو در کنار خود غیر مسلموں نے بھی تسلیم کیا چنانچہ کتب آریہ کے مختلف عبارات پیش کئے جاتے ہیں تا کہ یہ بات اظہر من الشمس ہو جائے کہ واقعتاً غیر مسلموں نے بھی قرآن کی فصاحت و بلاغت اور ان کے اصول و قوانین کو سر خم تسلیم کیا ہے۔

فیصلہ

۱- بہر حال سندر لال نے اپنی کتاب ''گیتا اور قرآن، ص: ۳۸''، اور قرآن کے اندر لکھا ہے کہ ''قرآن شبد قراء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اعلان کرنا اور جو بھی شخص ان شبدوں کو اعلان کرے گا یا کروائے گا وہ ایشور کی طرف سے پن پائے گا'' (یعنی ثواب پائے گا) قارئین! غور کریں کہ خود ہندوؤں کے مکھ منتری نے یہ کہہ دیا ہے کہ قرآن کا پھیلانا ثواب سے خالی نہیں تو پھر ان لوگوں کی تاخیر کیوں ہو رہی ہے جلد از جلد ایمان قبول کر لیں اور قرآن کو پڑھیں اور پڑھائیں۔ تاکہ پن (ثواب) کا مستحق قرار دیئے جائیں اور اگر نہیں پھیلاتے ہیں تو گویا کہ ان کی اپنی کتاب خود تسلیم نہیں۔

نوٹ: قرآن کو سنسکرت زبان میں ''کرند'' انگریزی زبان میں ''کراتی'' اور عربی زبان میں ''قرآن'' یعنی کلام الٰہی کہتے ہیں۔ نیز یہ تمام الفاظ ایک معنی میں ہیں صرف اپنی اپنی زبان کا فرق ہے۔

۲- اسی طریقے سے غیر مسلموں نے قرآن کے ساتھ ساتھ ان کی توضیح و تشریح یعنی حدیث کا بھی انکار کیا ہے مگر سندر لال نے اپنی مذکورہ کتاب کے اندر لکھا ہے کہ ''حضور اکرم ﷺ کی جملہ نصیحتیں جو قرآن کے علاوہ ہیں وہ روایت شبد رسول (ﷺ) کہلاتا ہے مگر یہ ''ایشور'' کا کلام نہیں'' اس عبارت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ آریہ سماج حدیث کے بھی مقر ہیں۔

۳- تیسری عبارت یہ ہے کہ ''ایشور جس آیت کو چاہتا ہے رد کر دیتا ہے اور اس سے بہتر حکم نافذ فرما دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ ایشور ہر ایک شئی پر قادر ہے (یعنی سمرتھ ہے) اسی طرح محمد ﷺ کی زندگی میں ۴۰ آیتیں منسوخ ہوئی، اور بعد کے زمانہ میں منسوخ تصور کی جانے لگی''۔ (گیتا اور قرآن: ص: ۲۳)

ہمارے نزدیک یہ عقیدہ اپنی جگہ پر مسلم اور برحق ہے کہ باری تعالیٰ نے اپنی سابقہ کتب اور آیات مبارکہ کو اتنے اچھے احکامات کے ذریعہ منسوخ فرمایا لیکن اس کے ساتھ ''سندر لال'' نے بھی اقرار کر لیا کہ ہاں ایشور نے احکامات کو نافذ کیا ہے اور وہ اس بات پر قادر ہے کہ چاہے ناسخ کر دے اور جس کو چاہے منسوخ کر دے۔ لہٰذا ان عبارتوں سے معلوم ہوا کہ ناسخ منسوخ کی باتیں ان کے نزدیک بھی مسلم ہیں۔ پس اسلام پر اشکال کرنا بیجا اور ناجائز باتیں ہیں۔

۴- چوتھی عبارت یہ ہے کہ ''قرآن نے تمام برائیوں کو ختم کر دیا''۔ (گیتا اور قرآن: ص:۱۸۰)

ان عبارتوں سے بھی عند المخالفین یہ بات اظہر من الشمس ہو رہی ہے کہ:

قرآن ایک اچھی کتاب۔

قرآن برائیوں کا زہر ہے۔

قرآن ظلم و تشدد کا دشمن ہے۔

قرآن حسن اخلاق کا حکم دیتا ہے۔

قرآن اچھے عملوں کا حکم کرتا ہے۔

قرآن بھائی چارگی کا سبق سکھلاتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس دور کے غیر مسلم اشکال کرتے ہیں پس یہی کہا جائے گا کہ انہوں نے اپنی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا۔

۵- پانچویں عبارت یہ ہے کہ اسلام سوائے ایک اللہ کی بندگی کے تمام پوجا و بندگی سے روکتا ہے اور ڈانٹ و توبیخ کرتا ہے کہ بالکل یہ مذہب صحیح ہے اور اہل ایمان کا مبدا الا الہ الا اللہ بالکل صحیح ہے کیوں کہ (خدا کے علاوہ) دوسرا کوئی معبود حقیقی نہیں اور تمام دنیا کے ایک معبود ہیں۔ (گیتا اور قرآن: ص:۱۷۹)

قارئین کرام! ان عبارات کے ذریعہ ''سندر لال'' نے اپنے تمام بھیدوں کو کالشمس کر دیا کہ اسلام اچھا مذہب، خدا ایک ہے اس کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں اور ستم بالائے ستم بات تو یہ ہے کہ انہوں نے کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ کی تصدیق کر دی جب انہوں نے تصدیق کر دی تو پھر زبان پر جاری کرنے میں کون سی دشواری ہے۔

خیر ان باتوں سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام معتدل مذہب ہے اور عند المخالفین بھی قبول ہے لیکن ان کی جاہ و جلالت اور مال و ثروت ایمان سے مانع ہے خیر دعاء فرمائیں کہ اللہ ان لوگوں کو ایمان کی توفیق بخشے۔ (آمین)

❁ ❁ ❁

اشکالات و جوابات

فی باب القرآن الکریم

سوال: ایک اشکال قرآن کریم پر وارد ہوتا ہے جو عام طور سے لوگ علمائے کرام سے سفر، حضر ہر ایک وقت سوال کرتے ہیں لیکن یہ سوال مبنی ہے کم علمی پر، سوال یہ ہے کہ دنیا کے اندر علمائے کرام گلی، کوچہ، قریہ، دیہات، ضلع، صوبہ حتیٰ کہ ملک در ملک یہ اعلان کر رہے ہیں کہ تم میں سے سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھلائے، (الحدیث) حالاں کہ قرآن سے کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا ہے بلکہ جتنے بھی فائدے انسان کو محسوس ہو رہے ہیں وہ سائنس ٹکنالوجی، طبی علوم، وغیرہ سے اور قرآن نے آج تک کسی نئی چیز کو ایجاد نہیں کیا جس سے سامان بنایا جا سکے حتیٰ کہ کھانے کا چمچہ بھی ایجاد نہیں کر سکا تو پھر اس قرآن کو سیکھنے اور سکھانے سے کیا فائدہ کیوں کہ انسان اسی چیز کو سیکھ سکتا ہے اور سکھا سکتا جو انسان کے فائدے کی چیز ہو۔ بخلاف سائنس اور ٹکنالوجی وغیرہ کے کہ اس کے ذریعہ سے انسان طرح طرح کے سامان مہیا کرتے ہیں جو لوگوں کے لیے کارآمد ہیں:

ہوئی جہاز بنانے کا طریقہ سائنس نے سکھلایا۔

بم بنانے کا طریقہ سائنس نے سکھلایا۔

میزائل بنانے کا طریقہ سائنس نے سکھلایا۔

انسان کی حرارت و برودت کی جانچ کا طریقہ علوم طب نے سکھلایا۔

زمین کے اندر کیا ہے کون سی چیز ہے ان کو معلوم کرنے کا طریقہ سائنس نے سکھلایا۔

لیکن آج تک کوئی عالم، محدث، مفکر، مفسر، مقرر، حفاظ، وغیرہ کسی نے بھی کوئی سامان بنانے کا طریقہ نہیں سکھلایا بلکہ اگر آج کسی مولوی سے کہا جائے کہ بھائی آپ گاڑی کا فلاں نٹ ذرا فٹ کر دیں؟ تو فوراً کہیں گے کہ ارے یار؟ ہمیں تو پتہ نہیں۔ تو پھر قرآن سیکھنے

اور سکھانے سے کیا فائدہ جو انسان کے کام نہ آئے۔ کیوں کہ لوگوں کو وہی کام کرنا چاہیے جو لوگوں کے مفاد کی چیز ہو اور اگر لوگوں کے مفاد کی چیز نہ ہو تو اس کو سیکھنا اور سکھلانا لغو ہے۔

جواب ۱: آپ نے ماقبل کی تقریر سے یہ اندازہ کرلیا ہوگا کہ قرآن نے کسی بھی سامان تیار کرنے کا طریقہ نہیں سکھلایا؟ او نادانو! میں تم سے پوچھتا ہوں کہ انسان اچھا ہے یا سامان۔ یقیناً تمام حضرات یہی کہیں کہ انسان اچھا ہے سامان سے، کیوں کہ اگر انسان اچھا نہ ہوتا تو سامان بیکار۔

جہاز بیکار

بم بیکار

میزائل بیکار

چمچہ بیکار

گویا کہ سامان موقوف ہے انسان کی اچھائی پر کیوں کہ اگر آپ اناڑی آدمی کو دیں کہ تم بم چلاؤ تو خود کو ہلاک کرلے گا، اگر تم کہہ دو کہ جہاز چلاؤ تو جہاز کے اندر آگ لگوادے گا، اگر کسی کو کہہ دو کہ میزائل چلاؤ تو اپنا بیڑا غرق کرلے گا، اگر کہہ دو کہ چمچہ سے کھاؤ تو منہ کے بجائے ناک میں داخل کرلیگا۔ تو سائنس ٹکنالوجی، علوم طبی، تو سامان بنانا اور پرکھنا سکھلایا لیکن قرآن نے انسان بنانا سکھلایا، تو معلوم ہوا کہ قرآن نے افضل چیز کو تیار کیا اور جس چیز کو قرآن نے تیار کیا اس چیز نے سامان تیار کئے یعنی قرآن نے انسان کو تیار کیا اور انسان نے سائنس کے ذریعہ سے آلات جدیدہ اور قدیمہ تیار کیا جیسا کہ انسان کے سلسلے میں خود قرآن ناطق ہے۔ **لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔**

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ از ابتداء تا انتہا جتنے بھی سائنس داں دنیا کے اندر تشریف لائے ہیں تمام کے تمام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ سائنس کے اندر جو ترقیاں مل رہی ہیں وہ قرآن وحدیث کی بدولت۔ سائنس کا وجود موقوف ہے قرآن وحدیث کے وجود پر تو اب یہی کہا جائے کہ سائنس نے جتنی چیزیں بنائی ہیں تمام کے تمام گویا کہ قرآن نے بنائیں۔ پس اب کوئی شک وشبہ واشکال کی بات نہیں) کیوں کہ یہی وہ:

قرآن ہے جس نے تاریکی و جہالت و گمراہی کو دور کیا۔

قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ہزاروں عورتوں کی جانیں بخشوایا۔
قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے انسانوں کے حقوق دلوائے۔
قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے رعایا اور بادشاہ کے حقوق کے درمیان فیصلہ کروایا
قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے عدل وانصاف کی دعوت دی۔
قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ہر ایک کو سہارا دلوایا۔
قرآن یہی وہ چیز ہے کہ جس نے ان تمام اشیاؤں کو ایجاد کیا جو انسان کے مفاد کے لئے ہیں۔

بہر حال پتہ یہ چلا کہ تمام چیزوں کا مرجع ومرکز قرآن ہے اور قرآن کے بغیر انسان، انسان نہیں رہتا۔ (قرآن پر کافی تقریریں ہیں لیکن وقت مہلت نہیں دیتا)

سوال: جس کلام کو سیدنا حضرت جبرئیل علیہ السلام محمد ﷺ کے پاس لائے تو کیا یہ کلام من جانب اللہ ہے یا من جانب جبرئیل وغیرہ ہے، تو یقیناً آپ یہی کہیں گے کہ من جانب اللہ ہے اگر من جانب اللہ ہے تو پھر اللہ کے پاس زبان ہونا لازم آتا ہے جو کہ حادث پر دال ہے۔

جواب: حضرت حق جل مجدہٗ تمام اعضاء سے مبرہ ومنزہ ہے نہ ان کو کلام کے لئے زبان کی ضرورت ہے اور نہ ان کو جزاء وسزا دینے کے لئے ہاتھ کی ضرورت ہے اور نہ ان کو دیکھنے کے لئے آنکھ کی ضرورت جب یہ تمام چیزیں نہیں ہیں تو پھر اشکال باقی نہ رہا اب رہی بات کہ بغیر زباں کے کلام کیسے کرسکتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا کلام کرنے کے لئے زبان کو زبان کی ضرورت ہے یا نہیں یقیناً آپ حضرات یہی کہیں گے کہ کلام کرنے کے لئے زبان کو زبان کی ضرورت نہیں تو کیا جس نے زبان اور تمام اعضاء وجوارح کو پیدا کیا تو ان کو زبان اور دیگر اعضاؤں کی ضرورت پڑے گی ہرگز نہیں کیوں کہ وہ خود ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے۔

یہی جواب ان تمام اعضاء وجوارح کا ہے جو انسان کے پاس موجود ہیں۔

سوال: کلام الٰہی حادث ہے یا نہیں اگر ہے تو پھر ایسی شریعت اور قرآن پر عمل کرنے سے کیا فائدہ جو حادث ہو۔

جواب: کلام کی دو قسمیں ہیں: ۱- کلام لفظی ۲- کلام نفسی۔

پس اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ جس کا نام کلام اللہ ہے جو حروف سے مرکب نہیں ہے یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو کلام اللہ کی صفت ہے وہ قدیم ہے اور باری تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص ہے لہٰذا جس طرح باری تعالیٰ قدیم ہیں اسی طرح ان کا کلام بھی قدیم ہے۔

لیکن وہ حروف جو مرکب ہے مختلف زبانوں میں مثلاً عربی، فارسی، انگریزی، ہندی، سنسکرت، اردو، وغیرہ سے تو یہ تمام کے تمام حادث ہیں اور یہ صفت قدیم نہیں جو ذات باری تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو سکے۔ خلاصہ کلام یہ نکلا کہ اگر کلام کو کلام نفسی مانیں گے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ خاص کریں گے تو اسے قدیم ماننا پڑے گا اور باری تعالیٰ کی صفت قدیم ہے۔ لیکن اگر قرآن کو کلام لفظی مانیں گے جو آپ کے سامنے موجود ہے تو یہ قرآن کلام لفظی ہے جو حادث ہے۔

لیکن قارئین کرام! یہ بات یاد رکھئے کہ قرآن کریم کو مختلف زبانوں میں منتقل کیا گیا ہے تو یہ تمام کے تمام کلام لفظی ہیں جو حادث ہیں اور اصل کلام کلام نفسی ہے جو غیر حادث ہیں لیکن معتزلہ کلام نفسی کے منکر ہیں اسی وجہ سے وہ کلام کو حادث مانتے ہیں اور ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اگر قرآن کریم کلام نفسی مانیں گے تو ان کو حادث نہیں کہا جائے گا کیوں کہ اس صورت میں صفات قدیم ہوں گی بہر حال مذکورہ پہلی صورت حادث اور دوسری صورت قدیم ہے۔

قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق؟

یہ بات عام طور پر دنیا کے اندر پھیلی ہوئی ہے کہ قرآن مخلوق ہے یا غیر مخلوق اور اس معاملے میں بڑے سے بڑے عالم وعلماء پھسل جاتے ہیں اس وجہ سے ان باتوں کو صحیح طریقے سے یاد رکھیں کہ ہم اہل سنت والجماعت کا یہ عقید ہے کہ ''القرآن کلام اللہ تعالیٰ غیر مخلوق'' یعنی مخلوق نہیں ہے لیکن کچھ زمانہ قبل فرقہ باطلہ پیدا ہوئے تھے جو اس بات کے قائل تھے کہ قرآن اللہ کا کلام مخلوق ہے۔ نیز جو حضرات یہ کہتے ہیں کہ قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے تو ان فرقۂ باطلہ نے اہل حق کو ناجائز موت کے گھاٹ اتار دیا جیسا کہ اس واقعہ کو تفصیل کے ساتھ علامہ تفتازانیؒ نے بیان فرمایا چنانچہ ارشاد ہے:

فیصلہ

ان بعض المتغلبة قتل كثيراً من اهل الحق لعدم قولهم بخلق القرآن۔ (شرح عقائد)

یعنی بعض فرقے جن کا اس زمانہ میں غلبہ تھا انہوں نے اہل حق کی کثیر جماعت کو تہ تیغ کر دیا ان کا قصور یہ تھا کہ اہل حق کی جماعت قرآن مجید کو مخلوق نہیں مانتی تھی اور یہ دور عباسیہ کا تھا ان سے مامون باللہ اور واثق باللہ اور احمد بن داؤد جو معتزلہ کے قاضی وغیرہ مراد ہیں۔

بہر حال ان لوگوں کا باطل عقیدہ یہ تھا کہ قرآن کریم کو مخلوق شمار کرتے تھے اور جو لوگ اس عقیدہ کو تسلیم نہیں کرتے پس ان کا سر قلم کر دیتے تھے، چنانچہ ان باطل فرقوں کا سابقہ اہل حق سے ہوا تو ان لوگوں نے اہل حق کے ساتھ بہت برا معاملہ کیا جو قابل ملال ہے۔

سوال: کلام کا باری تعالیٰ کی صفت ہونا شریعت سے ثابت ہے۔ اور شریعت کا ثبوت کلام پر موقوف ہے۔ لہٰذا کلام کا باری تعالیٰ کی صفت ہونا نقل۔ عقل سے ثابت ہونا شریعت سے ثابت ہونا ہے۔ کیوں کہ یہ حجت شرعی ہے تو پس ایسی صورت میں دور لازم آئے گا۔

جواب: اللہ تعالیٰ کا متکلم ہونا انبیاء سے بذریعہ تواتر نقل ہوتا چلا آیا ہے۔ اور انبیاء کرام کا صادق ہونا معجزہ سے ثابت ہے نہ کہ شریعت سے ہاں آپ کا اشکال اس وقت درست ہوتا جب انبیاء کرام کا صادق ہونا شریعت سے ہوتا۔ جو ان کا صادق و مصدوق ہونا شریعت کے بجائے معجزہ سے ثابت ہے، اس کی ضرورت نہیں پڑی کہ حق تعالیٰ انبیاء کے سچے ہونے کی خبر بذریعہ تکلم فرماتے اس لئے دور لازم نہیں آتا۔

سوال: قرآن کریم (کلام نفسی) اللہ تعالیٰ کی صفت ازلی ہے۔ اسی طریقہ سے دیگر چیزیں بھی مثلاً قدیم وغیرہ ہونا صفت ازلی ہے۔ تو گویا کہ باری تعالیٰ کی صفت متعدد ہے۔ مثلاً بکر ہے اس کا لقب عبدالصمد، قطب وغیرہ ہے۔ اور صفت متعدد دال ہے تعدد الٰہ پر جو کہ عند الشرع ناجائز ہے۔

جواب: یہ بات تو ہم اہل ایمان کے نزدیک بھی مستحکم اور متحقق ہے کہ باری تعالیٰ کی مختلف صفات ہیں۔ لیکن یہ بات اور قاعدہ قانون کہاں ہے کہ صفات کے متعدد ہونے سے ذات کا بھی متعدد ہونا لازم آتا ہو، ہرگز نہیں۔

لہٰذا باری تعالیٰ ایک اور ان کی صفات متعدد ہیں۔ اس سے تعدد الٰہ لازم نہیں

آتا۔ کیوں کہ تعدد الٰہ اس وقت لازم آتا جب کہ ذات بھی متعدد ہوتے۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ۔ مثلاً زید ہے اور اس کی صفت، متو د، سخی، وغیرہ ہے۔ تو جب زید کی آپ نے دعوت کی تو کیا کھانا تین آدمیوں کے لئے بنائیں گے۔ ہرگز نہیں بلکہ صرف آپ نے زید کی دعوت کی ہے۔ پس زید ہی کا کھانا بنائیں گے۔ کیوں کہ متو، اور سخی زید نہیں ہے بلکہ ان کی صفت ہے۔

پس یہی مثال باری تعالیٰ کے لئے ہے۔

سوال: کیا کلام ایک صفت ہے یا کلام کے اندر مختلف اوصاف موجود ہیں۔ اور اگر کلام کے اندر مختلف اوصاف نہیں ہے تو پھر قرآن کریم کے اندر، امر، نہی، استفہام، نداء، وغیرہ کا تذکرہ آیا ہے۔ تو اس کا باری تعالیٰ کی صفت قرار دینا درست نہ ہوگا۔

جواب: اللہ تعالیٰ صفت کلام کے ساتھ متکلم ہے اور امر و نواہی وغیرہ مخبر ہے۔ جیسا کہ علامہ تفتازانیؒ نے اپنی کتاب شرح عقائد کے اندر فرمایا ہے۔ انہ صفة واحدہ۔ جس کا مطلب یہ کہ کلام ایک ہی صفت ہے۔ اور منقسم ہوتا ہے۔ امر نہی اور خبر کی جانب۔

بہر حال علامہ تفتازانیؒ کے قول سے معلوم ہو گیا کہ کلام ایک ہی صفت کا نام ہے الگ الگ چیز نہیں۔

جواب۲: دوسرا جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر کلام کے اندر مختلف صفت مانیں گے تو اس صورت میں نفس کلام کو ذات ماننا پڑیگا۔ کیوں کہ بغیر ذات کے صفات نہیں پائی جاتی ہیں، حالانکہ صفات کبھی نہ ذات بنی ہے اور نہ بنے گی۔

پس اب یہی کہا جائے گا کہ کلام صفت ہے اور اس کی کوئی صفت نہیں۔

سوال: ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ قرآن کریم سید المعجزات ہے اگر کوئی یہ تسلیم کرتا ہے کہ قرآن کریم سیدۃ المعجزات ہے تو ان کی دلیل کیا ہے؟

جواب: صاحبو! الفاظ قرآن کریم کو اس کی حفاظت میں بڑا دخل ہے۔ کیوں کہ الفاظ قرآن کا یہ معجزہ ہے کہ وہ نہایت سہولت سے یاد ہو جاتے ہیں۔ کہ اگر خدانخواستہ یہ لکھے ہوئے مصاحف گم ہو جائیں تو ایک بچہ حافظ قرآن اپنی یاد سے اس کو دوبارہ لکھ سکتا ہے۔ بڑوں کا ذکر ہی کیا۔ چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ ایک واعظ نے قرآن کے اس معجزہ کو ظاہر

فیصلہ

کرنا چاہا تو درمیان میں واعظ ایک آیت پڑھ کر اٹک گئے۔ اور مجمع کو خطاب کر کے کہا کہ اس مجمع میں جس قدر حافظ موجود ہیں چھوٹے بڑے سب کھڑے ہو جائیں۔ ایک آیت میں شبہ ہو گیا ہے اس کو حل کرنا چاہتا ہوں۔ تو چاروں طرف سے بہت سے آدمی کھڑے ہو گئے۔ جس میں بچے بھی تھے۔ جوان بھی تھے، اور بوڑھے بھی تھے۔ اور ادھیڑ بھی یہ دیکھ کر واعظ نے کہا کہ الحمدللہ صاحبو! مجھے آیت میں شبہ نہیں ہوا تھا۔ مجھے صرف یہ دیکھنا تھا کہ اس مجمع میں جس کے اندر حفاظ کو بالقصد نہیں بلایا گیا۔ بلکہ یوں ہی کیف ما اتفق یہ مجمع آ گیا ہے۔ اس قدر حفاظ قرآن موجود ہیں۔ اب قیاس کرو کہ سارے شہر میں کتنے حافظ ہوں گے۔ پھر اندازہ کرو کہ پورے ضلع میں کتنے ہوں گے۔ پھر سوچو کہ پورے ہندوستان میں کتنے ہوں گے۔ اور دنیا بھر میں کتنے ہوں گے۔ صاحبو۔ یہ قرآن کا معجزہ نہیں ہے تو اور کیا؟ اس زمانے میں جب کہ قرآن کی طرف رغبت کا کوئی سامان نہیں ہے اور اس کے یاد کرنے حفظ کرنے والوں کو کوئی بڑا عہدہ نہیں ملتا ہے۔ بلکہ زیادہ تر امراء کی توجہ انگریزی پڑھنے کی طرف ہے۔

کفار قرآن مٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قدر حافظ موجود ہوتے ہیں۔ کہ بچے بھی حافظ ہیں اور مرد بھی۔ اور بعض قصبات میں عورتیں بھی حافظ ہیں۔ چنانچہ قصبہ پانی پت میں بہت سی عورتیں حافظہ ہیں۔ اور بعض تو سبعہ قرآت کی حافظہ ہیں۔

سوال: آپ کا کہنا یہ ہے کہ قرآن کریم مٹ نہیں سکتا حالانکہ حال ہی کا واقعہ ہے کہ دہلی کے اندر اور جگہوں پر قرآن کریم کو جلایا گیا تو کیا اس کو مٹنا نہیں کہیں گے۔ اس سے تو یہ معلوم ہوا کہ قرآن کریم مٹ سکتا ہے۔

جواب: اللہ کا نور مٹ نہیں سکتا ہے۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ جو اہل اللہ کے انوار کسی کے مٹائے نہیں مٹ سکتے تو خود اللہ تعالیٰ کا نور کیوں کر مٹ سکتا ہے۔ بس یہ خدا کی حفاظت ہے کہ قرآن کے اس قدر حفاظ ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں کہ ان کا شمار و احصاء دشوار ہے۔

اس پر بعض لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ خدا قرآن کا حافظ نگہبان ہے تو ہمیں اس کے اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔

اے صاحبو! یہ بات ایسے دل سے نکلی ہے جس میں خدا سے ذرا بھی علاقہ اور لگا

نہیں کیا۔ اگر آپ کو کوئی تحفہ دے تو اس کی بے قدری کر سکتے ہیں؟ اور خصوصاً اس کی نگاہ کے سامنے، ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کو سر اور آنکھوں پر رکھا جائیگا۔ اور اس کی جان سے بھی زیادہ حفاظت کی جائے گی۔ اور اگر وہ تحفہ کھانے کے واسطے آپ کو دیں اور اس کی کوئی برائی کرے تو کیا آپ برداشت کرلیں گے ہرگز نہیں۔ بلکہ اس طرح شوق سے کھائیں گے کہ گویا کہ کبھی یہ نعمت آپ کو ملی ہی نہیں تھی۔ اور اگر اس میں سے ذرا سا بھی زمین پر گر گیا تو فوراً اٹھا کر سر پر رکھیں گے۔

سوال: جس طریقے سے رب کریم نے قرآن کریم کو نازل کیا، تو کیا بعینہٖ اسی رسم الخط کے ساتھ قرآن محفوظ ہے؟

جواب: صاحبو! آج کل تو یادگار قدیم کی اس قدر حفاظت کی جاتی ہے کہ اس کے لئے تغیر یادگار قدیم ہونے کی وجہ سے اس کی حفاظت ضروری تھی۔ چہ جائیکہ وہ بالکل محفوظ صحیح ہے۔ بلکہ اس میں تفاوت ہے۔ چنانچہ ایک جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا گیا ہے۔ کیوں کہ وہاں دوسری قرأت بقدر موجود ہے۔

تو صحابہؓ نے اس جگہ بقادر میں الف نہیں لکھا اسی طرح دوسری قرأت پر بھی رسم خط ال ہے۔ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں مـالـک یـو م الدین ۔ میں الف نہیں لکھا۔ کیوں کہ یک قرأت میں ملک۔ ہے پس رسم الخط کا قرآن میں اس کا بیحد لحاظ کیا گیا ہے۔ کہ سب راتوں کو جامع رہے۔ اس لئے اس کا بدلنا حرام ہے۔

صاحبو! جب قرآن کی ہر چیز کی حفاظت کی گئی ہے اور یہ امت مسلمہ کے لئے بڑا فخر ہے کہ ان کے برابر کسی اور امت نے آسمانی کتاب کی حفاظت نہیں کی۔ تو آپ کو بھی اس کی ر چیز کی ویسی ہی حفاظت کرنی چاہیئے جیسا کہ اب تک کہ امت نے کی ہے۔ اور یہ مت کہو کہ خدا تو اس کا نگہبان ہے۔ پھر ہم کو کیا ضرورت ہے۔ کیوں کہ ان کی محافظت کی یہ بھی ورت ہے کہ اس نے محافظت کا حکم اپنے بندوں کو دے دیا۔ اور یہ ان کا احسان وانعام ہے کہ یہ خدمت ہم سے لے لی۔ اگر تم یہ کام نہ کروگے تو اللہ تعالیٰ کسی دوسری قوم سے یہ کام لے گا جی چاہے تو چھوڑ کر دیکھ لو۔ (نعوذ باللہ)

تمہاری تان گاڑی نہیں چل رہی ہے، اللہ کو ہمارے پیدا کرنے کی کوئی ضرورت نہ

تھی۔ یہ انکا محض انعام ہے کہ ہم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا اور پیدا کرنے سے پہلے ملائکہ سے فرمایا: انی جاعل فی الارض خلیفۃ۔ کہ زمین کے اندر اپنا خلیفہ پیدا کرنے والا ہوں۔

بہرحال اس رحمت وشفقت کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا ہے۔ جیسا کہ خود احادیث مبارکہ کے اندر حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دنیا کے تمام درختوں کو قلم اور تمام ندیوں اور نہروں کو روشنائی بنادیا جائے اور انعامات الٰہی کی فہرست بنائی جائے۔ تو بھی انعامات خداوندی کا احصاء نہ ہوسکے گا، چنانچہ ارشاد باری ہے۔ ان تعدو نعمت اللہ لا تحصوھا

اشکال وجواب فی باب الرزق

سوال: کیا رزق حرام بھی من جانب اللہ ہے؟

جواب: خواہ رزق حرام ہو یا حلال ہر ایک شئ من جانب اللہ ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ۔ لا ن الرزق اسم کما یسوق. اللہ تعالیٰ الیٰ الحیوان فیأکل ۔یعنی رزق اس چیز کا نام ہے جس کو اللہ تعالیٰ حیوان کی طرف بھیجتا ہے پس اس کو وہ کھاتا ہے۔ اور یہ کبھی حلال ہوتا ہے اور کبھی حرام۔ کیوں کہ ہر ایک شئ من جانب اللہ ہوا کرتی ہے۔ البتہ بندہ کے اختیارات کے اندر فرق ہے۔ مثلاً کوئی حرام طریقے سے شئ من اللہ کو اختیار کرتا ہے اور کوئی حلال طریقے سے شئ من اللہ کو اختیار کرتا ہے تو درحقیقت تمام رزق من جانب اللہ عطا ہوا ہے لیکن جس نے حلال طریقے سے اختیار کیا ہے تو ان کا ثمرہ احسن ہوگا۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر حرام رزق کی اضافت اللہ کی طرف نہ کریں تو یقیناً یہی کہا جائے گا کہ حرام رزق من جانب العباد ہے تو اس صورت میں بندہ کا مختار کل ہونا لازمی آئے گا حالاں کہ بندہ مختار کل نہیں ہے۔

پس یہی کہا جائے گا کہ ہر ایک شئ من جانب اللہ ہے۔

سوال: سوال کیا اللہ تعالیٰ غیر مسلموں کو بھی رزق عنایت کرتا ہے حالاں کہ وہ اس کے باغی تھے۔

جواب: خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم ہر ایک کو اللہ تعالیٰ رزق عطا کرتا ہے لیکن ایک بات یاد

رہے کہ غیر مسلم جو رزق پا رہے ہیں وہ اہل ایمان کے صدقے وطفیل میں پا رہے ہیں۔اس کی مثال یوں لیجئے کہ اگر معشوق عاشق کو کوئی چیز عطا کرتا ہے تو معشوق اپنے عاشق کے طفیل میں دوسرے لوگوں پر بھی رحم وکرم کا معاملہ کرتا ہے پس یہی مثال دنیا کی ہے کہ حضرت حق مجل مجدہٗ معشوق اور حضور اکرم ﷺ عاشق ہیں تو رب کریم نے اپنے عاشق کے طفیل میں غیر مسلموں کو بھی رزق عطا کیا ہے۔اب رہی بات کہ غیر مسلم اللہ کے باغی ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس بغاوت کی سزا و جزا بروز قیامت بشکل جب الحزن کے ملے گی۔دوسری بات یہ ہے کہ رب کریم دنیاوی اعتبار سے غیر مسلم کے لئے رحمٰن ہیں اور اخروی اعتبار سے غیر مسلموں کے لئے عادل ہوں گے۔

لا یجب علی اللہ شیٔ

سوال: جو چیز بندوں کے لئے نفع بخش ہے تو شیٔ منفعت اللہ پر واجب ہونی چاہیے؟

جواب ۱: حضرت حق جل مجدہٗ پر کوئی چیز نہ واجب تھی نہ واجب ہوگی اور نہ واجب ہے کیوں کہ اگر کوئی چیز حضرت حق جل مجدہٗ پر واجب ہوتی تو کافر کو پیدا نہ کرتے جو دین وشریعت کی بغاوت کرتا ہے، اسی طریقے سے فقیر کو پیدا نہ کرتے جو گلیوں اور دیہاتوں کے اندر پریشان حال رہتے ہیں حتی کہ اگر شیٔ منفعت اللہ پر واجب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کے لئے بندوں پر احسان جتلانے کا حق نہ ہوتا، حالاں کہ پوری دنیا خداوند قدوس کا شکریہ ادا کر رہی ہے اور یہ کہنے پر مجبور ہے کہ جو بھی چیز اللہ نے ہمیں عطا کی ہے وہ تمام شیٔ ہمارے لئے ہے اور ہم ان کے ذریعہ سے ان کا شکر ادا کرتے ہیں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر اللہ کے لئے اشیاء منفعت کو واجب کریں گے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونا لازم آئے گا حالاں کہ رب کریم محتاج نہیں ہے بلکہ محتاج الیہ ہے۔

سوال: اگر کوئی چیز اللہ پر واجب نہیں ہے تو پھر جب بندہ دعا مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان دعاء کے ذریعہ کیوں عنایت کرتا ہے؟

جواب ۱: یہ سوال دراصل کم فہمی پر مبنی ہے، بہر حال اس سوال ہی کے اندر جواب بھی عیاں

وبیاں ہورہا ہے کیوں کہ سائل نے کہا کہ ''دعا کے ذریعہ کیوں عنایت کرتا ہے'' تو دعا کے ذریعہ شئ وجوب کی عنایت نہیں ہوتی ہے بلکہ شئ احسان عنایت ہوتی ہے یعنی اس شئ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر اپنا احسان جتلاتے ہیں پس ان شئ احسان کو وجوب سے تعبیر کرنا غیر دانش مندی کی علامت ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ بندہ رب کریم سے نہایت ہی عجز وانکساری کرتا ہے اور رب کریم کی صفت رحمانیت جوش میں آتی ہے اور ان کی درخواست کو قبولیت حاصل ہوتی ہے بہر صورت غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر کوئی چیز اللہ پر واجب ہوتی تو بندہ فوراً سینہ تان کر طلب کرتا لیکن بندہ اس طرح طلب نہیں کرتا ہے بلکہ گریہ وزاری کے ساتھ طلب کرتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ خداوند قدوس پر کوئی چیز واجب نہیں ہے اگر کوئی شئ من جانب اللہ عنایت ہوتی ہے تو وہ بطور بادشاہ ورعایا کے عنایت ہوتی ہے جیسا کہ دنیا کا مشاہدہ ہے۔

بعث بعد الموت

سوال: یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ انسان کے مرنے کے بعد تمام ہڈیوں کو جمع کر کے اس کو بروز قیامت زندہ کرے بالخصوص اس میت کو جسے شیر، چیتا نے اپنی غذا بنالیا ہو؟۔

جواب ۱: پہلا جواب تو یہ دیا گیا کہ وہ رب کریم جس نے ہمیں اور آپ حضرات کو ایک ناپاک قطرے سے پیدا کیا نیز یہ ناپاک قطرہ سب سے پہلے باپ کی ریڑھ میں تھا پھر منتقل ہوکر ماں کے رحم میں گیا اس کے بعد اب ماں کا مادۂ منویہ اور باپ کا مادۂ منویہ جمع ہوا تو گویا کہ رب کریم نے ان تمام ناپاک قطرے کو ایک جگہ جمع کر کے انسان کا وجود بخشا۔ بہر حال جب اللہ تعالیٰ ان مذکورہ تمام قطرات کو جمع کر کے انسان پیدا کرسکتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ بنی بنائی ہوئی چیزوں کو ایک جگہ جمع کر کے اس کے اندر روح پھونکنے پر قادر نہیں ہے یقیناً وہ جمیع ما کان ویکون پر قدرت رکھتا ہے۔

جواب ۲: ان اللہ کل علی شیئ قدیر کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے جب ہر چیز پر قادر تو کیا وہ گوشت پوست اور ہڈیاں جو ہوا منتشر ہوچکی ہیں اس کو جمع کرنے اور اس میں روح پھونکنے پر قادر نہیں یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

جواب ۳: تیسرا جواب بعث بعد الموت حق ہے کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ''پھر تم دوبارہ بروزِ قیامت اٹھائے جاؤ گے'' یہ آیت ابی ابن خلف کافر کے جواب میں نازل ہوئی تھی یہ کافر ایک بوسیدہ ہڈی لے کر حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور سوال کیا من یحیی العظام وھی رمیم جب ابی ابن خلف نے یہ سوال کیا تو حضور ﷺ نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا بقولہ تعالیٰ ''انشأھا اوّل مرۃ''۔ یعنی ان بوسیدہ ہڈیوں کو وہی ذات زندہ کرے گا جس نے پہلے مرتبہ پیدا فرمایا لہٰذا جو ذات انکو عدم سے وجود میں لاسکتا ہے تو وہ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ ہلاک ہونے کے بعد دوبارہ زندہ کردے۔

الی غیر ذٰلک من النصوص القاطعۃ الخ۔

ان کے علاوہ دوسری ایسی ایسی نصوص ہیں جو قطعی الدلالت ہیں اور کسی تاویل کا احتمال نہیں رکھتی جس سے اجسام کا دوبارہ زندہ اور جمع کیا جانا معلوم ہوتا ہے۔

میزان و نامۂ اعمال

سوال: میزان ترازو کا نام ہے، یا اعمال کے جزاء کا نام ہے اور معلوم ہونا چاہیے کہ اعمال اعراض کے قبیل سے ہیں اور عرض دو زمانوں میں باقی نہیں رہتا ہے۔ نیز معدوم کا اعادہ محال ہے؟

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ نامۂ اعمال ایسی کتابیں ہیں جو وزن کی جائیں گے جیسا کہ احادیث مبارکہ کے اندر یہ باتیں کثرت سے موجود ہیں، دوسری بات یہ ہے کہ آپ نے کہا کہ اعمال اعراض کے قبیل سے ہیں اور وہ دونوں زمانوں میں باقی نہیں رہتا تو اس کا جواب یہ ہے کہ باری تعالیٰ کے نزدیک یہ کوئی محال شی نہیں کہ میزان کا اعادہ کریں کیوں کہ خود آپ دنیا ہی کے اندر غور کرلیں کہ باری تعالیٰ محال سے محال اشیاء کو وجود بخشتا ہے جو کہ انسان کی تفہیمات سے بالاتر ہے مثال کے طور پر کفار و مشرکین پر خداوند قدوس نے ابابیل کو مبعوث کیا اور تمام منکرین اسلام کو ہبا منثوراً کیا گیا۔ اسی طریقے سے حضور اکرم ﷺ کو راتوں رات ساتوں آسمان حتی کہ عرش و کرسی جنت و جہنم کی بھی سیر کرائی گئی بہر حال محال سے محال چیزوں کو اللہ تعالیٰ وجود بخشتا ہے جو کہ انسان کی سمجھ میں نہیں آتی اسی طریقے سے میزان بھی ہے کہ باری تعالیٰ اس کا اعادہ فرمائیں گے۔

سوال ثانی: وزن کرنا یہ اجسام ثقیلہ کا خاصہ ہے اور نامہ اعمال یہ ایسی شئی ہے کہ اس کا وزن ثقالت نہیں ہے تو پھر اس کا وزن کیسے ہوگا؟

جواب ۱: ہر ایک چیز کے وزن کرنے کے آلات الگ الگ ہوتے ہیں مثلاً گندم، چنا، چاول، وغیرہ کو وزن کرنے کے لئے ترازو ہے جو کہ آپ حضرات کے سامنے موجود ہے اور بجلی، ہوا، آگ، کے لئے الگ آلات ہیں یعنی میٹر وغیرہ تو جب دنیا کا یہ حال ہے کہ ہر ایک چیز کے پرکھنے اور تولنے کے آلات الگ الگ ہیں تو کیا نامۂ اعمال کے تولنے کا آلہ ان تمام آلات سے جدا نہیں ہوسکتا ہے یقیناً نامہ اعمال کے پرکھنے کا ایسا آلہ ہے جو ہمارے اور آپ کے نزدیک ماورائے عقل ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ خود، شاک نے سوال کے اندر یہ فرمایا کہ نامہ اعمال غیر ثقالت کا حامل ہے جو کہ ہمارے آپ کے مشاہدے سے بالاتر ہے تو ان کا ترازو بھی ایسا ہی ہوگا جو ہمارے اور آپ کے معائنے سے الگ تھلگ ہوگا اور یہ تمام چیزیں بروز قیامت ہی عیاں ہوگی۔

سوال: بندہ جو بھی عمل کرتا ہے خواہ نیک ہو یا بد تو اس کی ہر ہر جز تمام کے تمام اعمال کی خبر خدا تعالیٰ کو معلوم ہے پس جب تمام اعمال خواہ اعمال سیئہ ہو یا اعمال حسنہ کی خبر اللہ کو معلوم ہے تو پھر اسے وزن کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

جواب: باری تعالیٰ یقیناً عالم الغیب ہیں اس میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں لیکن بروز قیامت اعمال کا وزن محض اس لئے کیا جائے گا تا کہ انسان یہ جان لے کہ واقعتاً اللہ تعالیٰ انصاف سے کام لے رہے ہیں، اور کسی پر ظلم وتشدد کا معاملہ نہیں کرتے ہیں اور اگر نامہ اعمال کا وزن نہ کیا جائے اور بندوں کو اس کے اعمال پر مطلع کئے بغیر جہنم یا جنت بھیج دیا جائے تو جہنمی کہے گا کہ پتہ نہیں میرے اعمال حسنہ زیادہ تھے یا اعمال سیئہ پس باری تعالیٰ تو نامہ اعمال کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن بندوں کے شک وشبہ کے ازالے کے لئے مذکورہ معاملہ کریں گے۔ لیکن بروز قیامت باری تعالیٰ کفار ومشرکین کے حق میں عدل کا معاملہ کریں گے جس کے لئے جہنم تیار ہے اور مومنین کے لئے فضل کا معاملہ کریں گے جس کے لئے جنت تیار ہے۔ (انشاءاللہ)

الکتاب

اشکال و جواب سے قبل بطور تمہید کے چند باتیں ذہن نشیں کرلیں پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں کتاب سے کتاب کا پڑھنا مراد ہے یعنی نامہ اعمال میں بندوں کی نیکیاں اور برائیاں ثابت ہوں گی نیز کتاب سے جنس کتاب مراد ہے جس میں طاعات اور معاصیات دونوں لکھی ہوئی ہوں گی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہل ایمان کو نامۂ اعمال داہنے ہاتھ اور کفار و مشرکین کو بائیں ہاتھوں میں دیئے جائیں گے تاکہ ہر ایک شخص اپنا اپنا نامۂ اعمال پڑھ لے اور ماضی کے خرافات و فسادات، و سیئات، کو خوب خوب یاد کرلے بہر حال جن کے داہنے ہاتھوں میں نامۂ اعمال دیا جائے گا وہ خوشی و مسرت کی فضاؤں میں سیر کرتے ہوئے جنت میں داخل ہوجائیں گے اور ان کے تمام حسابات آسان ہوجائیں گے جیسا کہ باری تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **فاما من اوتی کتابه بیمینه فسوف یحاسب حسابا یسیرا وینقلب الیٰ اهله مسرورا**O

سوال: جب انسان کوئی عمل کرتا ہے تو وہ اعمال انسان کی ذات کے ساتھ راسخ اور نقش ہوجاتے ہیں اور باری تعالیٰ بندوں کے اعمال کو بخوبی جانتے ہیں تو پھر نامۂ اعمال کو لکھ کر بشکل کتابچہ تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟

جواب ۱: یہ بات تو ہمیں بھی تسلیم ہے کہ بندوں کے نامہ اعمال راسخ اور منقش ہے نیز باری تعالیٰ کو بھی معلوم ہے لیکن بشکل کتابچہ اس وجہ سے تیار کیا جاتا ہے تاکہ بروز قیامت بندہ اپنے تمام اعمال کا اچھی طرح مشاہدہ کرلے اور یہ تسلیم کرلے کہ واقعتاً ہم نے فلاں فلاں عمل کیا جس کے نتیجے میں جنت ملی اور فلاں فلاں برا عمل کیا جس کے نتیجے میں جہنم ملی۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ انسان خطاء اور نسیان سے مرکب ہے (**الانسان مرکب من الخطاء و النسیان**) پس لوگ اپنے بعض بعض برے عمل کو بھول جاتے ہیں لہٰذا جب اپنے برے عمل کو بھول گئے اور باری تعالیٰ اس بھولے ہوئے عمل کے مطابق فیصلہ کردیں گے تو بندہ کہے گا کہ ہم نے برے عمل کو نہیں کیا۔ پس اب اس کی خاموشی کے لیے کتاب پیش کی جائے گی۔

پل صراط

سوال: پل صراط نہایت ہی پتلی اور تلوار سے زیادہ تیز تو پھر اس پر سے انسان کیسے گذرے گا؟

جواب ۱: اس بات کا اعتراف آپ نے کر ہی لیا کہ پل صراط کا وجود ہے اور اس کا موجد رب کریم ہے تو جو ذات پل صراط کے بنانے پر قادر ہے وہی ذات اپنے محبوبین کو بجلی کی طرح گذارنے پر بھی قادر ہے اس کی مثال یوں لیجئے کہ اگر آپ کوئی آلہ بناتے ہیں مثلاً بندوق وغیرہ تو بظاہر دوسروں کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بم، بندوق کیسے چلایا جائے گا لیکن بنانے والا فوراً اس کے ذریعہ وار کر دیتا ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ پل صراط سے گذرنا صرف عاصی و نافرمان کیلئے مشکل ہے لیکن اہل ایمان کے لئے کوئی مشکل نہیں بلکہ اسہل ہے اور محبوبین الٰہی بجلی کی طرح پل صراط سے گذر جائیں گے اور ذرہ برابر بھی احساس نہ ہوگا۔ برخلاف کفار و مشرکین کے کہ ان لوگوں کیلئے اس پر سے گذرنا نہایت ہی مشکل ہوگا اور بالآخر جہنم کے اندر گر جائیں گے۔

شفاعت

سوال: بقولہ تعالیٰ **واتقوا یوماً لا تجزی نفس عن نفس شیئاً** ۔اس آیت کے اندر **یوما** مفعول بہ ہے یعنی اس دن کوئی نفس کسی نفس کو کوئی بدلہ نہ دے گا اور نہ کسی نفس کی شفاعت قبول کی جائے گی، اور اللہ تعالیٰ کے اس قول سے بھی کہ **ماللظلمین من حمیم** ظالموں کے لئے کوئی دوست اور محبّ نہ ہوگا اور نہ کسی شفاعت کرنے والے کی شفاعت قبول کی جائے گی؟

جواب ۱: آیت مذکورہ عموم فی الاشخاص پر دلالت کرتی ہیں مگر اس آیت سے ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ شفاعت کی نفی ہر ہر شخص سے کی گئی ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہاں اشخاص سے کفار مراد ہیں پس اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ کوئی نفس کافر کی جانب سے بدلہ نہ دے گا اور نہ اس کی شفاعت کسی کافر کے لئے قبول کی جائے گی اور کافرین کے لئے کوئی دوست اور محبّ نہ ہوگا۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ مذکورہ آیت شفاعت عام خاص منہ البعض کے قبیل سے ہے اور مخصوص وہ ہیں جن کے لئے شفاعت قبول کی جائے گی۔

مقتول

سوال: کیا مقتول کی موت اس کے متعینہ وقت میں ہوتی ہے یا قاتل نے اس کے مقدر وقت کو کاٹ دیا؟

جواب: موت کسی بھی طرح آئے خواہ قتل وغارت کے ذریعہ آئے خواہ پانی میں ڈوبنے کی وجہ سے آئے خواہ چھت پر سے گرنے کی وجہ سے آئے خواہ گاڑیوں کے ٹکرانے کی وجہ سے آئے۔ ہر ایک شکل کے اندر مقتول اپنے متعینہ وقت پر مرتا ہے یعنی جب اس کو موت آئی تو یہی کہا جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اتنے وقت تک اس کی زندگی بخشی تھی۔

لیکن بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذکورہ شکل کے اندر مقتول اپنے وقت پر نہیں مرتا بلکہ اللہ نے اس کے لئے اور زندگی بخشی تھی لیکن قاتل نے اسے قتل کے ذریعہ یا وہ میت کے چھت پر سے گرنے کی وجہ سے اس کے متعینہ وقت کو ختم کر دیا گیا یعنی ایسی صورت میں وہ اپنے وقت پر نہیں مرا۔ پس اس خلجان کا جواب یہ ہے کہ جیسا کہ باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: **لکل امة اجل فاذا جاء اجلهم لايستاخرون ساعة ولايستقدمون** ۔ کہ حق تعالیٰ نے امتوں کی مدتیں مقرر کر دی ہیں پس وہ اپنی موت سے نہ ایک ساعت مؤخر ہو سکتے ہیں اور نہ مقدم۔

سوال: اگر مقتول اپنی مدت میں مرتا ہے تو قاتل کو دنیا کے اندر مذمت کیوں کی جاتی ہے اسی طریقے سے قتل خطا کی صورت میں دیت اور قتل عمد کی شکل میں قصاص کا مستحق کیوں قرار دیا جاتا ہے؟

جواب: جہاں تک قاتل کی مذمت اور اس کے مستحق عذاب ہونے کا تعلق ہے نیز عذاب وضمان کے واجب ہونے کا تعلق، تو اس نے چوں کہ ایک ممنوع اور منہی چیز کا ارتکاب کیا ہے اور اسباب قتل مثلاً تلوار سے مارنا اور بندوق سے فائر کرنا وغیرہ تو یہ تعبدی ہے جس میں صرف حکم باری کی تکمیل کی گئی ہے۔ اور امر تعبدی یہ ہے کہ جیسا کہ ارشاد باری ہے **لا يسئل عما يفعل وهم يسئلون** اللہ تعالیٰ جو کرتا ہے اس سے سوال نہیں کیا جاتا وہ فاعل

مختار ہے اور مالک کائنات ہے اور بندے اپنی کارگزاری پر سوال کئے جائیں گے وہ محض خدا کے بندے ہیں۔

سوال :اہل سنت والجماعت کا کہنا ہے کہ اجل (موت) قطعی چیز ہے۔حالاں کہ احادیث کثیرہ کے ذریعہ یہ پتہ چل رہا ہے کہ اجل کوئی قطعی چیز نہیں ہے چنانچہ مثال کے طور پر ایک حدیث پیش کی جارہی ہے جیسا کہ حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا جو شخص چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے اور اس کی موت میں تاخیر کی جائے تو چاہیے کہ وہ صلہ رحمی کرے بہر حال معلوم ہوا کہ اجل (موت) کوئی قطعی چیز نہیں اگر قطعی چیز ہے تو زیادتی عمر کے کیا معنی ہیں؟

جواب :اللہ تعالیٰ ازل میں یہ جانتے تھے کہ اگر یہ بندہ اطاعت کرے گا تو اس کی عمر ۷۰ربرس کی ہوگی اور اگر نافرمانی کرے گا تو اس کی عمر ۴۰ربرس ہوگی پس جب یہ بندہ اطاعت کرتا ہے تو اس کی عمر ۷۰ربرس ہوجاتی ہے اور اگر نافرمانی کرتا ہے تو ۴۰ربرس ہوجاتی ہے۔پس معلوم ہوا کہ اجل (موت) قطعی چیز ہے۔

رویت باری تعالیٰ

تمام اہل ایمان کا متفقہ فیصلہ ہے کہ حشر ونشر اور حساب وکتاب کے بعد نیکوکار کو جنت اور بدکار کو جہنم رسید کیا جائے گا پس جنتی کو اس قدر نعمتیں دی جائے گی جس کی کوئی انتہا نہیں ہے فلہٰذا آخر کار رب کریم تمام جنتیوں کو مخاطب کرتے ہوئے تفتیش کریں گے کہ کیا تمہیں اور کوئی نعمت چاہیے تو جنتی اپنی آخری تمنا کو رب حقیقی کے سامنے ظاہر کریں گے کہ یا اللہ، یارب العالمین، یاارحم الراحمین، یاخیر الرازقین ہم تمام لوگ اب تیرا دیدار کرنا چاہتے ہیں۔اس کے بعد رب کریم اپنے ان محبوبین کی آرزو وتمنا کو پورا فرمائیں گے بہر حال رویتِ باری پر پہلی دلیل یہ ہے:

دلیل ۱: لقولہٖ تعالیٰ قال رب ارنی انظر الیک قال لن ترانی الخ ۔بہر کیف رب کریم کا ارشاد ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ہمارے مقرر کردہ وقت اور مقام پر تشریف لائے اور ان کے رب نے ان سے کلام فرمایا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض

کیا میرے رب مجھ کو دکھلا دے کہ میں تجھ کو دیکھ لوں، حق تعالیٰ نے فرمایا تم مجھ کو ہرگز نہیں دیکھ سکتے لیکن اس پہاڑ کو دیکھ لو اگر وہ اپنی جگہ اور اپنی حالت پر برقرار رہا تو تم مجھ کو دیکھ لو گے فلما اجب ان کے رب نے پہاڑ پر تجلی فرمائی تو اس کو چور چور کر دیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو کر زمین بوس ہو گئے جب ہوش آیا تو فرمایا یا اللہ پاک تو جملہ عیوبات سے مبرہ ومنزہ ہے میں تیری جانب رجوع کرتا ہوں اور توبہ کے ساتھ ساتھ تمام گستاخیوں سے مغفرت طلب کرتا ہوں اور میں اوّل مومنین میں سے ہوں۔ (القرآن الکریم)

ان موسی علیہ السلام قد سأل الخ بیشک حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے اس قول سے رویتِ باری تعالیٰ کی درخواست فرمائی کہ رب ارنی انظر الیک، اے میرے رب مجھ کو دکھلا دے کہ میں تجھ کو دیکھ لوں تو اگر باری تعالیٰ کی جانب نظر کرنا اور آنکھ سے دیکھنا ممکن نہ ہوتا تو رویتِ کی فرمائش ایک قسم کی ناواقفیت ہوتی کہ ذات باری تعالیٰ میں کون سی بات جائز اور کون سی بات ناجائز ہے، یا پھر سفاہت اور بے وقوفی ہوئی اور یہ ایک جہال شی کی فرمائش ہوتی اس وجہ سے کہ اگر رویتِ باری کے محال ہونے کو جانتے تھے اس کے بعد رویت کی فرمائش کی تو ایک بیکار اور عبث کام ہوتا اور ایک قاعدہ کا لشمس علیٰ نصف النهار ہے کہ والانبیاء منزهون عن ذلک کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام خدائی معاملات میں ہر قسم کی جہالت عبث سے منزہ و پاک ہیں۔ لہٰذا معلوم ہوا کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی رویت باری کے سلسلے میں باری تعالیٰ سے درخواست کرنا یہ ایک ممکن الوقوع شی ہے اور رویت باری متحقق اور متقین چیز ہے۔

دلیل ۲: دوسری دلیل یہ ہے کہ رب حقیقی نے رویت کو استقرار جبل پر معلق فرمایا، اور استقرار جبل کی فی نفسہٖ امر ممکن ہے، کیوں کہ ممکن وہ ہے جس کے فرض وقوع سے کوئی محال لازم نہ آئے، لہٰذا اگر پہاڑ اپنی حالت پر برقرار رہے تو کوئی استحالہ لازم نہ آئے گا، اس لئے علامہ تفتازانیؒ نے فرمایا، استقرار جبل فی نفسہٖ امر ممکن ہے اس کے فرض وقوع سے کوئی محال لازم نہیں آتا کیوں کہ ہر جسم کے لئے ممکن ہے وہ ساکن ہو۔

بہر حال جو شی کسی امر ممکن پر معلق ہو وہ ممکنات میں سے ہوتی ہیں، کیوں کہ باری تعالیٰ کے قول فان استقر مکانه فسوف ترانی ۔ میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ معلق ثابت ہوگا، یعنی رویت ثابت ہوگی، اگر معلق ثابت ہو جائے جیسے اس جگہ معلق بہ استقرار

جبل ہے۔ نیز محال ممکن الفاظ دیر میں اقتدیر ممکن پر ثابت نہیں ہوتا، لہٰذا ثابت ہوا کہ رویت باری تعالیٰ محال نہیں ہے۔

اشکال :مذکور دلائل کے اوپر اشکال کیا جاتا ہے کہ ہم تسلیم نہیں کرتے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے رب ارنی انظر الیک میں رویتِ باری کا سوال فرمایا تھا بلکہ ان کا سوال ذات باری تعالیٰ کے علم سے متعلق تھا۔ وہ حق تعالیٰ کی ذات بابرکات کو حاصل کرنا چاہتا تھا اور رویت بول کر کلام عرب میں علم مراد لینا مشہور و معروف ہے اسی طرح نظر بول کر مجازاً علم کے معنی مراد لئے جاتے ہیں۔

الجواب:اس اعتراض کا جواب یہ دیا گیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ذات باری تعالیٰ کے عالم تھے کیوں کہ باری تعالیٰ کا ان سے خطاب ہو رہا تھا، نیز نظر کا صلہ جب الی حرف جار ہوتا ہے تو رویتِ بالبصر ہی مراد ہوتی ہے اس لئے سوال بہر حال رویت باری ہی کا تھا۔

دوسرا اشکال :دلائل سابق پر دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے آیات میں جن آیتوں کا سوال کیا تھا سو وہ قیامت پر دلالت کرنے والی تھیں۔ تو اصل سوال یہ تھا انظر الی آیاتک ۔

الجواب:اس اشکال کا یہ جواب یہ دیا گیا کہ اس سوال کی یہ تاویل ظاہر کے خلاف ہے۔ نیز فان استقر مکانہ خود اس کی نفی کرتا ہے کیونکہ وہ آیت جو وقوع قیامت پر دلالت کرتی ہے، دَکِ جبل ہے، یعنی بروزِ قیامت پہاڑ کو ریزہ ریزہ کر دیا جائے گا، نہ کہ استقرار جبل۔

اشکال :جب دنیا کے اندر حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے دیدار باری کے سلسلے میں رب کریم سے سوال فرمایا تو اس سوال کے جواب پر باری تعالیٰ نے صرف اپنی جھلکیاں دکھائیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام زمین بوس ہو گئے لہٰذا اب اس مشاہدے کے بعد کیسے ہو سکتا ہے کہ جنت کے اندر دیدار باری نصیب ہو کیوں کہ اگر جنت کے اندر ایسا عمل ہو گا تو وہاں بھی جنتی مر جائیں گے۔

جواب ا:اس اشکال کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وقت آنے سے پہلے کم عمری میں شادی کر لے تو وہ شخص اپنی بیوی کا کما حقہٗ حق ادا نہیں کر پاتا ہے بالآخر طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اسی طرح وقت آنے سے پہلے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام

نے دیدار باری کی تمنا ظاہر کی اس وجہ سے تجلی باری کو برداشت نہ کر پائے اور زمین بوس ہو گئے۔

جواب ۲: خود اشکال مذکورہ کے اندر جواب بھی موجود ہے کیوں کہ حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے دنیا کے اندر بطور مقدمہ کے دیدارِ باری کی تمنا کی اور دیدار باری نصیب ہوا تا کہ لوگوں کو بالخصوص ''منکرین اسلام'' کو یہ یقین ہو جائے کہ واقعتاً عالم کو چلانے والا کوئی فرد واحد ہے، جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام کو دیدار نصیب ہوا ہے۔ بہر حال جب دنیا کے اندر رویت باری ہو سکتی ہے تو کیا بعید ہے کہ جنت میں رویت باری نہ ہو۔ یقیناً آخرت میں رویت باری ہوگی۔ (انشاء اللہ)

جواب ۳: تیسرا جواب یہ ہے کہ دنیوی اعضاء و جوارح اور جنتیوں کے اعضاء و جوارح کے اندر زمین و آسمان کا فرق ہے کیوں کہ جتنی طاقت دنیا کے اندر ایک شخص کو ہے سو جنت کے اندر دنیوی اعتبار سے ستر مردوں کی طاقت ایک جنتی کو ہوگی۔ (روایات کے اندر اس سے بھی زیادہ کی خوش خبری موجود ہے) اب خود فیصلہ کیجئے کہ آخرت کے اندر کیا رویت باری محال ہوگا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنت کے اندر باری تعالیٰ جنتیوں کی بینائی کو اور ترقی دیں گے جن کا دنیا کے اندر کوئی تصور نہیں کر سکتا ہے۔

بہر کیف ان تمام دلائل واشکالات وجوابات سے یہ معلوم ہو گیا کہ واقعتاً رویت باری متحقق ہے۔

۱- وجوه یومئذ الناظرة الی ربها ناظرة۔

۲- وجوه یومئذ مسفره ضاحکة مستبشره۔

۳- واذ الجنة ازلفت علمت نفس ما احضرت۔

تقلید

بعض اہل تعصب کو اللہ کی تقلید میں ایسا جمود ہوتا ہے کہ وہ امام کے قول کے سامنے احادیث صحیحہ کو غیر معارضہ کے بے دھڑک رد کر دیتے ہیں۔ میرا تو اس سے رونگٹا کھڑا ہوتا ہے چنانچہ ایک ایسے ہی شخص کا قول ہے۔

قال قال بسیار است مرا قال ابوحنیفہؒ درکار است

اس جملہ میں احادیث نبویہ کے ساتھ کیسے بے اعتنائی اور گستاخی ہے خدائے تعالیٰ

ایسے جمود سے بچائے ان لوگوں کے طرز عمل سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ امام ابوحنیفہ کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں اب اس تقلید کو شرک فی النبوت کہہ دے تو اس کی کیا خطا ہے مگر یہ بھی غلطی ہے کہ ایسے دو چار جاہلوں کی حالت دیکھ کر سارے مقلدین کو شرک فی النبوت سے مطعون و متہم کیا جائے۔

بہر حال میرے دل میں تقلید کی تفسیر یہ ہے کہ ہم رسول اللہ ﷺ کی احادیث وارشادات پر عمل کرتے ہیں اس تفسیر پر جو امام ابوحنیفہؒ نے بیان کی ہے اس کو اپناتے ہیں کیوں کہ وہ ہمارے نزدیک درایت وفقہ میں اعلیٰ پایہ پر ہیں اس کا کوئی انکار نہیں کرسکتا کیوں کہ امام صاحب کا فقیہ الامت ہونا تمام امت کو تسلیم ہے اور ان کے علوم پر شاہد عادل ہے۔ اب بتلایئے کہ اس تفسیر کی بناء پر تقلید میں شرک فی النبوت کیوں کر ہو گیا۔ اس لئے کہ جس کے نزدیک تقلید کا یہ درجہ ہوگا اس کے نزدیک اتباع حدیث مقصود بالذات ہوگا اور امام ابوحنیفہ محض واسطہ فی التفہیم ہوں گے جو شخص بلا واسطہ عمل بالحدیث کا دعویٰ کرتا ہے وہ حدیث کا اتباع دینی فہم کے ذریعہ سے کرتا ہے اور یقیناً سلف صالحین، کی فہم وعمل ورع وتقویٰ ودیانت وامانت وخشیت واحتیاط اس قدر کثیر تعداد میں تھے کہ جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تو بتلایئے کہ عمل بالحدیث کس کا کامل ہوا۔ پس مقلدین جو سلف صالحین کے عمل کردہ حدیث پر عمل کرتے ہیں اس کا فیصلہ اہل انصاف خود کرلیں۔ (بحوالہ: پچاس اشکالات کے جوابات مصنفہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ)

اعتراض: رہا مدعیان عمل بالحدیث کا یہ اعتراض کہ تمہارے سامنے ایک حدیث پیش کی جائے اور تم اس کو نہیں مانتے محض اس وجہ سے کہ تمہارے امام کا قول اسکے خلاف ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو تقلید حدیث مقصود بالذات نہیں بلکہ تقلید قول امام مقصود ہے۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ جس مسئلہ میں اختلاف ہوتا ہے اس میں احادیث مختلف ہوتی ہیں پس ائمہ کرام کے نظریات اور تحقیقات کے مطابق افضل احادیث پر عمل کرتے ہیں۔ رہا تمہارا یہ کہنا کہ ہماری حدیث راجح ہے تمہاری مرجوح ہے اس کا جواب یہ ہے کہ طریق ترجیح کا مدار ذوق پر ہے تمہارے ذوق میں ایک حدیث ارجح ہے اور سیدنا ابوحنیفہ کے ذوق میں دوسری راجح ہے اور ہمارے نزدیک امام کا ذوق تمہارے ذوق سے اقوی

وارد حج ہے فلہٰذا تمہارا اپنے آپ کو عامل بالحدیث کہنا اور مقلدین کو عامل بالحدیث نہ کہنا محض ہٹ دھرمی ہے۔

اثبات وحدانیت

قارئین عظام؟ اسلام کا دارومدار وحدانیت پر ہے یعنی اگر کسی اہل اسلام کے دل میں رب کریم کی وحدانیت نہیں ہے تو یقیناً وہ دائرۂ اسلام سے خارج ہے اسی طریقے سے تمام مومنین کو یہ عقیدہ رکھنا ہے اور یقیناً عقیدۂ راسخہ ہر ایک مسلمانوں کے دلوں میں منقش ہے کہ:

رب حقیقی ایک

خانۂ کعبہ ایک

مذہب اسلام ایک

قرآن کریم ایک

خاتم النبیین ﷺ ایک

سید الملائکہ ایک

سید الانبیاء ایک

یعنی رب حقیقی کی وحدانیت پر ایمان رکھنا تمام اہل ایمان کا ایک اہم عقیدہ ہے۔ جس کے اندر ذرہ برابر بھی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔

بہر حال وحدانیت کے اوپر حجۃ الاسلام حضرت العلماء والصلحاء حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نور اللہ مرقدہٗ نے بہت ہی زور وشور اور ذکاوت وفطانت کے ساتھ کام کیا ہے چنانچہ احقر نے پہلی جلد کے اندر حضرت نانوتویؒ کے حوالے سے کچھ تحریر کیا ہے پھر صلی اللہ علیہ وسلم مزید اقوال کو درج کر رہا ہے۔

بہر کیف وحدانیت کے سلسلے میں حضرت سیدنا امام نانوتویؒ نے فرمایا کہ باری تعالیٰ کے واحد ہونے کے دو معنی ہیں ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان کی ذات امور کثیرہ کے اجتماع سے مرکب نہیں ہے اس اعتبار سے واحد کا لفظ بسیط کے مرادف ہوگا۔ دوسرے معنی یہ ہے کہ عالم وجود میں کوئی بھی ایسی چیز نہیں جو واجب الوجود ہونے اور مبدء وجود اور تمام ممکنات کا مانع ہونے میں اس کا شریک اور ساجھی ہو اور ملا علی قاریؒ نے مرقات شرح مشکوٰۃ میں فرمایا ہے

کہ اللہ کے واحد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہٗ کی ذات قابل تجزی نہیں، نہ صفات میں کوئی اس کا نظیر ہے اور نہ افعال میں کوئی اس کا شریک ہے۔ شیخ ابوالحسن اشعریؒ سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ باعتبار عدد کے واحد ہیں۔ شیخ کے اس قول پر بعض لوگوں نے بڑے شدومد سے نکیر کی ہے کہ اس سے تو باری تعالیٰ کا معدودات میں داخل کرنا لازم آئے گا اور چوں کہ ہر عدد متناہی ہے اور عدد کا متناہی ہونا معدود کے متناہی ہونے کو مستلزم ہے۔ اس بناء پر اللہ تعالیٰ کو واحد بالعدد کہنے سے اس کا متناہی ہونا لازم آئے گا۔ لیکن قارئین کرام؟ اس اعتراض میں کوئی جان نہیں ہے کیوں کہ باری تعالیٰ کے متناہی ہونے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اس کے لئے بے شمار کثرت ثابت ہے کیوں کہ یہ تو صریح شرک ہے ہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ باری تعالیٰ کو معدودات میں داخل کرنا بے ادبی سے خالی نہیں۔ حتیٰ کہ ایک صحابیؓ پر آپ نے محض اس بناء پر نکیر فرمائی تھی کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو ضمیر تثنیہ میں جمع کیا تھا۔ جیسا کہ مسلم اور ابوداؤد و نسائی میں حضرت عدی بن حاتم سے مروی ہے کہ ایک شخص نے رسول اکرم ﷺ کے پاس تقریر کی اور کہا: **من یطع اللہ ورسولہ فقد رشد ومن یعصھما فقد غوٰی** تو اس کے جواب میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ **لیس الخطیب انت قل ومن یعصی اللہ ورسولہ** یعنی **من یعصھما** کے بجائے **من یعصی اللہ ورسولہ** کہو۔ نیز اشعریؒ کے کلام کی توجیہ یہ ہوگی کہ اشعریؒ کا اللہ تعالیٰ کو واحد بالعدد کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ جزئی حقیقی ہیں واحد بالنوع یا واحد بالجنس نہیں ہیں جس کے تحت افراد کثیرہ ہوں گے۔

نیز اس تقریر کی سماعت بندہ ناچیز نے درس بخاری میں حضرت شیخ الحدیث انظر شاہ صاحب سے بھی کی ہے۔

والمحدث للعالم ھو اللہ مانع عالم اللہ ہیں اس کی توضیح کے تحت حضرت علامہ تفتازانیؒ نے دیگر کتب کے اندر اللہ کی تعبیر ذات واجب الوجود سے کی تھی تو اللہ کو واحد ہونے کے ساتھ متصف کرنا ذات واجب الوجود کو واحد کے ساتھ متصف کرنا ہوا چنانچہ علامہؒ نے آگے فرمایا **فلا یمکن ان یصدق مفھوم واجب الوجود الاعلی ذات واحدۃ** ۔ اور جب صانع عالم اللہ ہے اور اللہ ذات واجب الوجود ہے اور ذات واجب الوجود ہے تو معلوم ہوا کہ مانع عالم واحد ہے۔

بہر صورت باری تعالیٰ کی وحدانیت پر قائم ہونے والے دلائل میں سے بعض تو وہ ہیں جو صانع عالم کے واحد ہونے پر دال ہیں جیسے کہ برہان تمانع - اور بعض وہ ہیں جو واجب الوجود کے واحد ہونے پر دال ہیں مثلاً متکلمین کی یہ دلیل کہ اگر دو واجب الوجود موجود ہوں تو دونوں صفتِ وجود میں شریک ہوں گے۔ لہٰذا کسی دوسرے جزء کے ذریعہ ایک دوسرے سے ممتاز ہوں گے تو واجب کا مابہ الاشتراک اور مابہ الامتیاز سے مرکب ہونا لازم آئے گا۔ نیز مرکب ہونا محتاج الا جزاء ہونے کو مستلزم ہونے کے سبب محال ہے لہٰذا دو واجب الوجود ہونا بھی محال ہے، اور برہان تمانع کی طرف اشارہ باری تعالیٰ کا قول لو کان فیھما آلھة الا اللہ لفسدتا میں جو قیاس استثنائی ہے۔ ثانی کی نقیض کا استثناء کرنے سے نتیجہ مقدم کی نقیض ہوگا۔ شکل یوں بنے گی۔

برھان تمانع

لو کان فیھما آلھة الا اللہ (مقدم ثانی)

لفسدتا لکنھما لو تفسدا (نقیض ثانی کا استثناء)

فلم یکن فیھما آلة الا اللہ (نتیجہ)

تقریر برہان تمانع

اگر دو صانع ممکن ہوں تو ان دونوں کے درمیان تصانع اور ٹکراؤ ممکن ہوگا مثلاً جس وقت ایک زید کی حرکت کا ارادہ کرے۔ دوسرے مانع کا زید کے سکون کا ارادہ کرنا ممکن ہوگا اس لئے زید ایک جسم ہے اور ہر جسم میں حرکت وسکون دونوں ممکن ہیں۔ لہٰذا زید کی حرکت اور سکون میں ہر ایک اپنی ذات کے اعتبار سے یعنی مدمقابل سے صرف نظر کرتے ہوئے ممکن ہے تو جس صانع نے زید کی حرکت کا ارادہ کیا۔ اسی نے بھی ممکن کا ارادہ کیا اور جس نے سکون کا ارادہ کیا اس نے بھی ممکن کا ارادہ کیا اسی طرح ہر صانع کے ارادہ کی حرکت وسکون میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلق بھی ممکن ہے۔ یعنی حرکت وسکون میں سے ہر ایک کا ازالہ کرسکتا ہے۔ کیوں کہ دونوں ارادوں میں کوئی تضاد نہیں کیوں کہ ارادہ حرکت ایک صانع کا ہے اور ارادۂ سکون دوسرے صانع کا ہے۔ تضاد تو اس وقت ہوتا ہے جب دونوں ارادہ کا محل ایک ہوتا بایں معنی کہ ارادہ حرکت جس صانع نے کیا تھا ارادۂ سکون بھی وہی صانع کرتا۔ ہاں تضاد دونوں مرادوں یعنی حرکت وسکون میں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ زید کی حرکت اور اس کا سکون دونوں ممکن ہیں اور صانعین میں سے ہر ایک کا زید کی حرکت اور سکون میں سے ہر ایک کا ارادہ کرنا بھی ممکن ہے تو ایک صانع کا زید کے سکون کا ارادہ کرنا بھی ممکن ہے یہی تصانع اور ٹکراؤ ہے۔ پہلا احتمال یہ ہے کہ دونوں صانع کی مراد پوری ہوں یعنی زید حرکت بھی کرلے اور ساکن بھی رہے یہ اجتماع ضدین ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دونوں صانع میں سے کسی کی مراد پوری نہ ہو۔ زید نہ حرکت کرے اور نہ ساکنین ہو۔ یہ ارتفاع ضدین ہونے کی وجہ سے محال ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ ایک کی مراد پوری ہو اور دوسری کی مراد پوری نہ ہو۔ پس جس کی مراد پوری نہ

ہو وہ عاجز ہوا اور عاجز ہونا چوں کہ حادث اور ممکن ہونے کی علامت ہے اور حادث وممکن صانع عالم نہیں ہوسکتا۔ تو ایک ہی صانع عالم ہوا۔ لہٰذا دو صانع عالم ہونا باطل ہو گیا۔

اشکال: اہل ایمان حضرت حق جل مجدہٗ کی وحدانیت پر بہت سارے دلائل پیش کرتے ہیں ان میں سے ایک دلیل یہ بھیہے **لو کان فیھما آلھة الا اللہ لفسدتا** اس دلیل پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے کہ **لو کان فیھما آلھة** میں تو حرف شرط ہے جونحو کے بیان کے مطابق اوّل یعنی شرط کے نہ پائے جانے کے سبب زمانہ ماضی میں ثانی یعنی جزاء کے نہ پائے جانے پر دلالت کرتا ہے۔ جیسے کوئی کہے **لو جئتنی لاکرمتک** کہ اگر تو میرے پاس آتا تو میں تیرا اکرام کرتا اس کا صاف مطلب یہی ہوتا ہے کہ تمہاری آمد نہ ہونے کے سبب میری طرف سے ماضی میں تمہارا اکرام نہیں ہوا۔ اس لحاظ سے آیت **لو کان فیھما آلھة** کے معنی یہ ہوئے کہ اگر متعدد الٰہ ہوتے تو فساد ہوتا مگر متعدد الٰہ نہیں تھے جس کے سبب فساد کے منتفی ہونے پر دلالت ہوئی۔ لہٰذا انتفائے فساد پر انتفاء تعدد الٰہ دلیل ہو خود انتفاء تعدد پر کوئی دلیل نہیں جب کہ مقصود تعدد الٰہ کی نفی پر دلیل قائم کرنا ہے۔ گویا اعتراض کے دو جزء ہیں ایک یہ کہ لو انتفاء اوّل کے سبب انتفاء ثانی پر دلالت کرتا ہے دوسرے یہ کہ ماضی میں ثانی کے منتفی ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ہمیں یہ بات تسلیم ہے کہ حرف لو کان اصنعی اور وضعی معنی وہی ہے جو آپ نے ذکر کیا۔ لیکن بعض دفعہ اس کے برعکس انتفاء ثانی کے سبب انتفاء اوّل پر دلالت کرتا ہے دراں حالیکہ اوّل کا انتفاء کسی خاص زمانہ کے ساتھ مقید نہیں ہوتا مثلاً ہمارا قول **لو کان العالم قدیماً لکان غیر متغیر** ہے کہ اگر عالم قدیم ہوتا تو غیر متغیر ہوتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ غیر متغیر نہیں ہے بلکہ متغیر ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ قدیم نہیں ہے تو دیکھئے اس مثال میں ثانی یعنی غیر متغیر ہونے کی نفی کو دلیل بنایا گیا ہے اوّل یعنی قدیم ہونے کی نفی پر، اسی طرح آیت میں حرف لو انتفاء ثانی سے انتفاء اوّل پر استدلال کرنے کیلئے ہے۔ اور آیت کا معنی ہے کہ اگر متعدد الٰہ ہوتے تو فساد ہوتا لیکن فساد نہیں ہوا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ متعدد الٰہ نہیں ہیں حاصل جواب یہ ہے کہ اصلی معنی اور ہے اور معنی مستعمل فیہ اور ہے اس فرق کے معلوم نہ ہونے کی وجہ سے بعض لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔

صفات باری

ہم تمام اہل ایمان کا متفقہ عقیدہ ہے کہ جس طرح ذات باری قدیم اور غیر حادث ہے اسی طرح صفات باری بھی قدیم اور غیر حادث ہے چنانچہ اگر کسی کو اس عقیدہ کے اندر اگر ذرہ برابر بھی شک وشبہ ہے تو وہ خارج عن الاسلام ہے۔

لیکن بعض لوگ تو صفات باری کے قدیم ہونے کے قائل ہو گئے لیکن بعض بعض صفات باری کو حادث بھی تسلیم کرتے ہیں۔

دلیل : پیش کرتے ہیں کہ سمع تحقق بغیر مسموع کے اور بصر کا تحقق بغیر مبصر کے اور کلام تحقق بغیر مخاطب کے نہیں ہوسکتا اور مسموع، مبصر، مخاطب سبھی حادث ہیں لہٰذا ان سے متعلق صفات یعنی سمع، بصر، کلام بھی حادث ہوں گے نیز صفات میں تغیر اور تجدد ہوتا ہے مثلاً زید کی پیدائش سے پہلے علم باری تعالیٰ کا تعلق اس بات سے تھا کہ زید پیدا ہوگا اور اس کی پیدائش کے بعد علم باری اس بات سے متعلق ہو گیا کہ زید پیدا ہو چکا تو علم الٰہی میں تغیر لازم آیا اور ہر متغیر حادث ہے لہٰذا علم الٰہی حادث ہے۔

جواب : دونوں دلیلوں کا جواب یہ ہے کہ صفات کے متعلقات حادث ہیں اسی طرح دوسری دلیل میں جو مثال پیش کی ہیں اس کے اندر علم کے تعلقات میں تغیر لازم آتا ہے پہلے ایک بات سے علم کا تعلق تھا بعد دوسری بات سے اس کے تعلقات متغیر ہوئے اور کل متغیر حادث کے تحت تعلقات ہی حادث ہوئے اور تعلقات کا حادث ہونا متعلقہ صفات کے حادث ہونے کو مستلزم نہیں ہے دوسری بات اور ذہن نشیں کرلیں کہ صفات کی چار قسمیں ہیں۔

۱- پہلی قسم حقیقیہ محضہ مثلاً حیات۔ ۲- دوسری قسم حقیقیہ ذات الاضافۃ مثلاً علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام اور ماتریدیہ کے نزدیک تکوین بھی ہے۔ ۳- اضافیہ محضہ، مثلاً قبلیت وبعدمیت اور معیت۔ ۴- صفات سلبیہ مثلاً جسم نہ ہونا جوہر نہ ہونا، عرض نہ ہونا، وغیرہ ہے، ان میں سے پہلی اور چوتھی قسم میں کسی قسم کا تغیر اور تجدد نہیں ہوتا اور دوسری قسم کی صفات فی نفسہٖ تجدد اور تغیر کو قبول نہیں کرتی البتہ ان کے تعلقات میں تجدد وتغیر ہوتا ہے لہٰذا تعلقات حادث ہیں اور تیسری قسم کی صفات میں تغیر ہوتا ہے کیوں کہ وہ اضافی اور اعتباری ہیں حقیقت میں وہ ذات باری کے ساتھ قائم نہیں ہیں۔

بہر حال حضرت علامہ تفتازانیؒ نے صفاتِ باری کے ساتھ قائم ہونے پر عرف اور لغت سے استدلال کیا ہے کہ عرف ولغت میں کسی شئ کی صفت اسی چیز کو کہتے ہیں جو اس شئ کے ساتھ قائم ہو مثلاً بیاض کپڑے کی صفت اس وقت قرار پائے گی جب وہ کپڑے کے ساتھ قائم ہو لہٰذا علم، حیات، قدرت، وغیرہ کے صفات باری ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ ذات باری کے ساتھ قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ کے متکلم ہونے کا مطلب

معتزلہ کا کہنا ہے کہ حضرت حق جل مجدہٗ متکلم تو ہیں مگر اس کے متکلم ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ کلام نام کی کوئی حقیقی صفت کے ساتھ قائم ہے بلکہ وہ ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہیں جو اس کے غیر مثلاً لوح محفوظ یا جبرئیل یا نبی اکرم ﷺ کے ساتھ قائم ہے۔

معتزلہ کی اس تعبیر سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ معتزلہ کلام کو اللہ کی صفت مانتے ہیں مگر اس کو اللہ کے ساتھ قائم نہیں مانتے بلکہ غیر کے ساتھ قائم مانتے ہیں چنانچہ حضرت علامہ تفتازانیؒ اس عقیدے کی تردید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ معتزلہ کا مقصد کلام کو اللہ کی ایسی صفت ثابت کرنا نہیں جو غیر کے ساتھ قائم ہے کیوں کہ یہ تو بدیہی طور پر باطل ہے کہ صفت کسی کی ہو اور قائم کسی اور کے ساتھ ہو۔ بلکہ ان کا مقصد کلام کے اللہ تعالیٰ کی صفت ہونے کا انکار کرنا ہے کیوں کہ معتزلہ کا قول **ان اللہ متکلم بکلام ھو قائم بغیرہ** کا مطلب یہ ہے کہ وہ کلام کو اپنے غیر مثلاً لوح محفوظ یا ذاتِ جبرئیل یا ذاتِ رسول اللہ ﷺ میں موجود کرنے والا ہے اور وہ کلام اسی غیر کے ساتھ قائم ہے گویا وہ متکلم بمعنی موجد کلام ہے۔

جواب: معتزلہ کے اس خلجان کا جواب یہ ہے کہ مشتق کا اطلاق ماخذ اشتقاق کے موصوف پر ہوتا ہے نہ کہ ان کے موجد پر مثلاً اسود کا اطلاق مآخذ اشتقاق یعنی سواد کے ساتھ موصوف کپڑے پر ہوگا۔ اس صباغ پر نہیں ہوگا جو کپڑے کے اندر سواد کو موجود کرنے والا ہے بہر حال اس جواب سے فرقۂ باطلہ کا تصور، گمان، زعم، فہم، فکر، نظر، اعتقادات وتجربات زمین بوس ہو گئے۔

صفات باری پر شبہ اور اس کا جواب

اس بات پر تمام اہل سنت والجماعت کا اتفاق ہے کہ واجب تعالیٰ کے لئے ایسی صفات ثابت ہیں جو واجب الوجود کے مفہوم سے زائد ہیں عین ذاتِ واجب نہیں ہیں اس کے برخلاف معتزلہ کہ صفات باری کی نفی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صفاتِ عین ذاتِ واجب ہیں اور صفات کے عین ذات واجب ہونے کا یہ مطلب ہے کہ جن افعال کے لئے صفات ثابت کی جاتی ہیں۔ سوان کے لئے اللہ کی ذات کافی ہے اس کی ذات سے زائد کوئی چیز اس کے لئے ثابت نہیں ہے صفات کی نفی پر معتزلہ یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ اگر باری تعالیٰ کے لئے ایسی صفات ہوں جو اس کی ذات کا عین نہ ہوں بلکہ اس کی ذات سے زائد چیز ہوں تو وہ اس کا غیر ہوں گی اب وہ حادث تو ہو نہیں سکتی ورنہ ان کے موصوف یعنی واجب تعالیٰ حادث ہونا لازم آئے گا لامحالہ وہ قدیم ہوں گی۔ لہٰذا غیر اللہ کا قدیم ہونا لازم آئیگا۔ نیز یہ صفات بہت سی ہیں تو تعدد وقدماء بھی لازم آئے گا اسی طریقے سے قدیم اور واجب مترادف ہیں، لہٰذا تعدد واجب لذاتہ کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کا قدیم ہونا بھی لازم آئے گا اور تعدد وقدماء اور تعدد وحیاء یہ سب توحید کے منافی ہے۔ پھر یہ کہ قائلین بالصفات میں بعض سات صفات بعض آٹھ صفات اور بعض ان سے زائد مانتے ہیں حالاں کہ نصاریٰ صرف تین قدماء یعنی اب، ابن، روح القدس کے قائل ہونے کی وجہ سے کافر قرار دیئے گئے تو پھر سات یا آٹھ یا اس سے زائد قدماء ثابت کرنے والوں کے کفر کا کیا ٹھکانا ہوگا۔

جواب: حضرت علامہ تفتازانیؒ نے اپنے قول وہی الھو ولا غیرہ سے اشارہ کیا ہے اور محل اشارہ غیریت کی نفی ہے کیوں کہ جب صفات باری کا غیر نہیں ہے تو ان کے قدیم ہونے سے غیر اللہ کا قدیم ہونا لازم نہیں آئے گا۔ نیز بقدر اور تکثر اشیاء متعددہ اور متکثرہ درمیان تغا، بمعنی ایک کا دوسرے سے انفکاک اور انتقال ممکن ہونے پر موقوف ہے اور جب صفات باری کا اسی طرح آپس میں بھی ایک دوسرے کا غیر بایں معنی نہیں ہے کہ ایک کا دوسرے سے انفکاک اور انتقال ہو سکے تو تعدد اور تکثر متحقق نہیں ہوگا لہٰذا ان کے قدیم ہونے سے تعدد وقدماء یا تکثر وحیاء لازم نہیں آئے گا، حاصل یہ ہے کہ مطلق تعدد قدماء محال نہیں ہے بلکہ

قدماء متغائر کا تعدد محال ہے اور ہم جن صفات کو قدیم کہتے ہیں وہ متغائر نہیں ہے نہ ذات واجب کا غیر ہے اور نہ آپس میں ایک دوسرے کا غیر ہیں۔

اشکال: نصاری جن تین قدماء کے قائل ہیں انہیں باہم متغائر نہیں کہتے ہیں اس کے باوجود کافر قرار دیئے گئے اس سے معلوم ہوتا ہے کے مطلقاً تعدد قدماء توحید کے منافی ہے خواہ ان میں باہم تغائر ہو یا نہ ہو۔ لہٰذا تمہارا یہ کہنا کہ مطلق تعدد قدماء محال نہیں بلکہ قدماء متغائرہ کا تعدد محال ہے درست نہیں۔

جواب: کا حاصل یہ ہے کہ نصاری جن تین قدماء کے قائل ہیں ان کے درمیان تغائر کی اگر چہ انہوں نے صراحت نہیں کی ہے مگر ایسی بات کہی ہے جس سے ان تینوں قدماء کے درمیان مغائرت لازم آتی ہے اور وہ بات یہ ہے کہ انہوں نے تین اقانیم ثابت کئے ایک وجود جس کو لفظ اب سے تعبیر کرتے ہیں دوسرے علم جس کو لفظ ابن سے تعبیر کرتے ہیں تیسرے حیات جس کو لفظ روح القدس سے تعبیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اقنوم علم جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات سے عیسیٰ کے بدن کی طرف منتقل کیا گیا اسی طرح انہوں نے انفکاک اور انتقال کو جائز قرار دیا اور انفکاک اور انتقال جس کا نام غیر میت اور تغائر ہے سو وہ ذوات میں ہوتا ہے لہٰذا یہ اقانیم ثلاثہ متغایر ذوات ہوئے تو جواب کا خلاصہ یہ نکلا کہ تکثر اور تعدد اس وقت متحقق ہوگا جب غیر میت بمعنی انفکاک اور ایک دوسرے سے انتقال ممکن ہو لہٰذا صفات کو قدیم کہنے سے ان پر تعدد قدماء کے قول کا الزام نہیں ہوگا۔

تعدد صفات حقیقیہ

باری تعالیٰ کی صفات حقیقیہ سات ہیں۔ ۱- علم۔ ۲- حیات۔ ۳- قدرت۔ ۴- سمع۔ ۵- بصر۔ ۶- ارادہ۔ ۷- کلام لیکن ماتریدیہ کے نزدیک صفات حقیقیہ آٹھ ہیں جن میں سات تو وہی مذکورہ صفات ہیں اور آٹھویں صفت تکوین ہے۔ یعنی ہم اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدہ کہ باری تعالیٰ کے صفات حقیقیہ ۷ ہیں۔ اور یہ مذکورہ تمام صفات ازلی ہیں۔

صفتِ علم

باری تعالیٰ کی صفات ازلیہ میں سے ایک صفت علم بھی ہے۔ چنانچہ صفت علم ازلی

سے مراد علم الٰہی ہے۔ اور وہ علم ایک ایسی ازلی صفت ہے جس کے معلوم ہونے والی اشیاء کے ساتھ تعلق قائم ہونے کے وقت وہ اشیاء منکشف اور معلوم ہو جاتی ہے۔ نیز معلومات سے مراد وہ اشیاء ہیں جن کے اندر معلوم بننے کی استعداد ہے۔ جو کہ معلوم ہو سکتی ہیں۔ گویا کہ انہیں بالقوۃ کے درجہ میں معلوم کہا۔ لہٰذا یہ اشکال وارد نہیں ہوگا کہ انکشاف کس چیز کے معلوم ہونے کا نام ہے۔ اس بناء پر معلومات کی طرف انکشاف کی نسبت تحصیل حاصل ہے۔

اشکال: علم کے صفت ازلی ہونے پر یہ اشکال وارد کیا جاتا ہے کہ ازل میں علم الٰہی اگر اس بات سے متعلق تھا کہ زید گھر میں ہے تو یہ خلاف واقع ہونے کی وجہ سے جہل ہوگا۔ کیوں کہ ازل میں نہ زید کا وجود نہ تھا نہ گھر کا۔ اور اگر علم الٰہی کا تعلق اس بات سے تھا کہ زید داخل ہو گا۔ تو زید کے داخل ہونے کے بعد علم الٰہی اس بات سے متعلق ہوگا کہ زید گھر میں داخل ہے۔ لہٰذا علم الٰہی میں تغیر لازم آیا۔ اور تغیر حدوث کو ملتزم ہے۔ جو ازلیت کے منافی ہے۔

جواب: کا حاصل یہ ہے کہ یہ تغیر تعلق میں ہوا کہ کبھی دخول استقبالی کے ساتھ اور کبھی دخول حالی کے ساتھ اور کبھی دونوں ماضی کے ساتھ ہوا۔ اور تعلقات کا تغیر صفت متعلقہ کے تغیر کو مستلزم نہیں۔ مثلاً آئینہ کا تعلق کبھی سامنے گذرنے والے انسان سے ہوتا ہے۔ اور اس وقت انسان کی صورت کا عکس آئینے میں نظر آتا ہے۔ اور کبھی اس کا تعلق سامنے گذرنے والے گھوڑے سے ہوتا ہے۔ اس وقت گھوڑے کی صورت آئینہ میں منعکس ہوتی ہے۔ تو آئینہ کے تعلق میں تغیر ہوا مگر خود آئینہ میں کوئی تغیر نہیں۔

بہر حال خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مذکورہ صفات سابقہ ازلی ہیں۔

لیکن ان صفات پر بھی بہت حضرات شاک نے شک کیا ہے۔ تو ان کے جوابات کے لئے حضرت علامہ تفتازانیؒ کی کتاب "شرح عقائد" کی طرف رجوع کیجئے۔

ایمان اور اسلام

جمہور اہل سنت والجماعت کا مذہب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں ایک ہیں۔ بایں معنی کہ دونوں کے درمیان تساوی ہے چنانچہ ہر مومن مسلم ہے اور ہر مسلم مومن ہے اس دعوے پر حضرت تفتازانیؒ نے:

فوٹ :اسلام اور ایمان کے درمیان کیسی نسبت ہے تو اس سلسلے میں ائمہ کرام کا شدید اختلاف ہے لیکن یہاں اس کے لکھنے کی ضرورت نہیں۔

دلیل ۱: پیش کی کہ اسلام کے معنی خضوع یعنی سر تسلیم خم کرنا اور انقیاد بمعنی احکام کو قبول کرنا اور مان لینا ہے اور یہ خضوع وانقیاد ہی تصدیق ہے اور تصدیق عین ایمان ہے لہٰذا اسلام عین ایمان ہے اور ایمان واسلام کے ایک ہونے کی تائید اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے **فاخرجنا من کان فیھا من المومنین فما وجدنا فیھا غیر بیت من المسلمین** یعنی قوم لوط کی بستیوں میں جتنے مومنین تھے سب کو ہم نے نکل جانے کو کہا تو ہم نے ان بستیوں میں کوئی بھی مومن نہیں پایا سوائے ایک مسلم گھرانے کے، وجہ استدلال یہ ہے کہ آیت کا معنی ہے۔ **فما وجدنا احدا من المومنین غیر اھل بیت من المسلمین** اور اصل استثناء میں استثناء متصل ہوتا ہے یعنی مستثنیٰ کا مستثنیٰ منہ کی جنس سے ہونا ہے معلوم ہوا کہ مستثنیٰ یعنی مسلم گھرانے مستثنیٰ منہ یعنی مومنین میں سے ہیں۔

دلیل ۲: ایمان اور اسلام کے ایک ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ شریعت مطہرہ میں یہ بات صحیح اور درست نہیں ہے کہ کسی کے متعلق کہا جائے کہ وہ مومن ہے مسلم نہیں، یا مسلم ہے مومن نہیں، پس جب ایسا کہنا درست نہیں تو پھر ضروری ہوا کہ ہر مومن مسلم ہو اور ہر مسلم مومن ہو، یعنی اسلام اور ایمان کا دونوں کا مصداق ایک ہو اور ہم دونوں کے اتحاد سے اتحاد بحسب المصداق جس کو تساوی کہتے ہیں، اس کے علاوہ اور کوئی معنی مراد نہیں لئے ہماری مراد اتحاد بحسب المفہوم نہیں جس کو مترادف کہتے ہیں، اور جس نے مترادف کا اطلاق کیا

ہے اس نے بھی اتحاد بحسب المفہوم مراد نہیں لیا ہے بلکہ اتحاد بحسب المصداق یعنی تساوی مراد کہنے کے بعد ہر ایک کا الگ الگ مفہوم بیان کیا اور جب ہر ایک کا مفہوم جداگانہ ہوگیا تو ترادف کہاں رہا، کیوں کہ ترادف تو اتحاد بحسب المفہوم کا نام ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ شیخ ابوالمعین کی مراد دونوں کے درمیان تغایر نہ ہونا ہے بایں معنی کہ ایک دوسرے سے جدا نہ ہو بلکہ جہاں ایک صادق آئے دوسرا بھی صادق آئے جس کو تساوی کہتے ہیں۔ اتحاد بحسب المفہوم مراد نہیں لیا ہے جس کو ترادف کہتے ہیں۔

اعتراض: ماقبل کے دونوں دلائل پر ایک اشکال کیا جارہا ہے یعنی اہل سنت والجماعت کا قول کہ ایمان اور اسلام دونوں ایک ہی چیز ہیں اور دونوں کے درمیان تساوی کی نسبت ہے سو اسی قول پر ایک اشکال وارد ہوتا ہے جیسا کہ عند الناس والعلماء والصلحاء ایک حدیث کا لشمس علی نصف النہار ہے جسے ہم اور آپ حضرات حدیث جبرئیل کے نام سے پکارتے ہیں۔ چنانچہ جب جبرئیلؑ نے حضور اکرم ﷺ سے اسلام کے بارے میں پوچھا تو آپ نے اسلام کی تفسیر اقرار بالشہادتین اور اعمال سے جو اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام اقرار بالشہادتین اور اعمال کا مجموعہ ہے جبکہ ایمان کی حقیقت تصدیق قلبی ہے تو دونوں کے درمیان مغایرت ثابت ہوگئی۔

جواب: اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ ایمان اور اسلام دونوں کی حقیقت تصدیق قلبی ہے اور حدیث جبرئیلؑ میں آپ ﷺ کی مراد یہ ہے کہ اسلام کے ثمرات اور اس کی علامات یہ چیزیں ہیں چنانچہ اقرار بالشہادتین علامت ہے اسلام کے اعمال اربعہ اسلام کے ثمرات ہیں جس طرح جب قبیلہ عبدالقیس کا نمائندہ وفد آپ ﷺ کی خدمت میں آیا تھا اور آپ ﷺ نے اس سے ایمان کے بارے میں پوچھا، جب انہوں نے کہا کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ زیادہ جانتے ہیں تو آپ ﷺ نے ایمان کی تفسیر بھی اقرار بالشہادتین اور اعمال سے فرمائی۔

حالاں کہ اعمال اہل سنت والجماعت میں سے کسی کے نزدیک بھی ایمان کی حقیقت میں داخل نہیں ہیں اسی طرح ایک مشہور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: **الایمان بضع وسبعون شعبة اعلاها قول لااله الا الله وادناها اماطة الاذی عن الطریق** اس میں بھی آپ ﷺ نے ایمان کو قول وعمل ٹھہرایا تو مراد یہی ہے کہ قول یعنی اقرار بالشہادتین ایمان کی علامت ہے اور اعمال اس کے ثمرات ہیں۔

نبوت ورسالت

قارئین عظام! پہلی جلد کے اندر احقر نے نبوت ورسالت پر کچھ قلم چلایا لیکن یہ عنوان اتنا وسیع وعریض ہے کہ اگر علماء اسلام پوری زندگی اسی عنوان پر بحث کرنے میں صرف کردیں لیکن پھر بھی اس کا کما حقہ حق ادا نہیں ہو پائے گا۔ بہر حال جلد اوّل کی تقریر واشکالات وجوابات کے باوجود بھی تشنگی باقی ہے پس ملاحظہ کیجئے۔

رسالت کے معنی سفارت ہے اور سفارت کے معنی ایک جانب سے دوسری جانب بھلائی پہنچانے میں واسطہ ہونا ہے، مگر یہاں رسالت کا مفہوم مطلق سفارت نہیں بلکہ اللہ اور اس کے ذوالعقول مخلوق کے درمیان بندہ کا سفیر ہونا مراد ہے رسالت کے یہ معنی بیان کرنے میں شارحؒ کا اشارہ ان لوگوں کی تردید کی جانب ہے جو یہ کہتے ہیں کہ حیوانات کی ہر نوع کے لئے خواہ وہ ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول ان ہی کی جنس میں سے رسول ہیں اور ان کی دلیل میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وان من امة الا خلا فیها نذیر، پیش کرتے ہیں قاضی عیاضؒ نے اپنی کتاب ''شفا'' میں ان لوگوں کے قول کی بڑے شدومد سے تردید کی ہے اس لئے کہ اس قول کی بناء پر غیر ماکول اللحم اور ماکول اللحم اور متنفر جانوروں کا بھی نبی ورسول ہونا لازم آتا ہے اور آیت میں امت بمعنی گروہ ہیں اور گروہ سے انسانی گروہ مراد ہیں۔

بہر حال رسالت سے مراد اللہ تعالیٰ اور اس کی ذوی العقول مخلوق کے درمیان بندہ کا سفیر اور واسطہ سے دنیا اور آخرت سے متعلق ان احوال ومسائل میں پیش آنے والے بندوں کو شکوک وشبہات کا ازالہ کرنا جن کے ادراک سے ان کی عقلیں قاصر ہیں۔ اسی بناء پر علامہ تفتازانیؒ سے فرمایا کہ ارسال رسول میں بڑی حکمت ہے۔ اور بندوں کے بہت فائدے ہیں۔ مثلاً جن امور کی معرفت میں عقل انسانی کافی ہے۔ جیسے وجود باری، علم باری، وغیرہ ان امور میں رسول کی سفارت سے طاقت پہنچنا اور جن امور میں عقل انسانی کافی نہیں ہے۔ ان میں رسول کے ذریعہ ان کی مدد کرنا۔ اور ان دواؤں اور غذاؤں کے نفع نقصان کو رسول کے ذریعہ بیان کرنا جنہیں تجربہ کے ذریعہ جاننے کے لئے صدیاں چاہئیں۔

نیز زہریلی غذاؤں اور دواؤں کا تجربہ خطرہ سے خالی نہیں۔ اسی طرح علم وعمل میں افراد انسانی کو ان کی استعداد کے مطابق کامل بنانا۔ اسی طرح سے اعمال حسنہ کی طرف لو

گوں کو راغب کرنے کے لئے اطاعت گذار بندوں کے ثواب کی تفصیلات اور اعمال سیئہ سے لوگوں کو دور رکھنے کی غرض سے نافرمان بندوں کے عقاب کی تفصیلات بیان کرنا وغیرہ بے شمار فوائد ہیں۔ سوا رسال رسول کو اللہ تعالیٰ پر واجب قرار دیتے ہیں۔ بایں معنی کہ اس کا ترک محال ہے۔ اور باری تعالیٰ پر اصلح للعبد کے وجود کی نفی کے براہین بہت سارے ہیں۔

اس سے پہلے احقر نے اجمالاً کچھ تحریر کیا ہے۔ اب تفصیلاً ملاحظہ ہو۔

دلیل ۱: پہلی دلیل یہ ہے کہ اگر اصلح للعبد اللہ تعالیٰ پر واجب ہوتا تو فقیر کو جو دنیا کے اندر فقر کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اور کافر جو آخرت کے عذاب میں مبتلا ہوگا۔ پیدا نہ فرماتا۔ کیوں کہ ان دونوں کے حق میں عدم ہی اصلح ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کو پیدا فرمایا معلوم ہوا کہ اصلح للعبد باری تعالیٰ پر واجب نہیں ہے۔

دلیل ۲: دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ پر اصلح للعبد واجب ہوتا تو اسے بندوں کو ہدایت دینے اور طرح طرح کی بھلائیاں اور اس کے نفع کی چیزیں دینے کی وجہ سے شکر کا اور بندوں پر احسان جتلانے کا حق نہ ہوتا۔ کیوں کہ واجب کی ادائیگی سے نہ شکر کا استحقاق ہوتا ہے اور نہ کسی پر احسان جتلانے کا حق ہوتا ہے۔ جس طرح کسی کی امانت اس کے مالک کو واپس کر دینے یا کسی کا اپنے اوپر واجب قرضہ ادا کر دینے سے شکریہ اور احسان جتلانے کا حق نہیں ہوتا۔ حالانکہ باری تعالیٰ نے بندوں پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا۔ **بل اللہ یمن علیکم ان ھداکم للایمان** ۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا شکریہ اس کے انعام کی بناء پر بالاجماع واجب ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اصلح للعبد بندوں پر واجب نہیں ہے۔

دلیل ۳: تیسری دلیل یہ ہے کہ اگر باری تعالیٰ پر اصلح للعبد واجب ہوتا تو گناہوں سے حفاظت، نیکی کی توفیق، مصائب کے ازالہ اور زیادتی رزق وغیرہ کا اللہ تعالیٰ سے سوال کرنا بے معنی ہو گا۔ کیوں کہ جب ایک چیز اللہ تعالیٰ نے کسی کو نہیں دی تو اس سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ وہ چیز اس کے حق میں اصلح نہیں تھی۔ ورنہ اللہ تعالیٰ واجب کی ادائیگی فرماتے اور وہ چیز ضرور عطا فرماتے۔ لیکن جب نہیں عطا فرمائی تو معلوم ہوا کہ وہ چیز اس کے حق میں اصلح نہیں بلکہ مفسد اور مغفرت تھی۔ جس کا ترک کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب تھا۔ ایسی صورت میں اس چیز کی دعاء کرنا بے معنی ہو گا۔ حالانکہ تمام انبیاء اولیاء کی مذکورہ چیزوں میں دعائیں موجود ہیں۔

دلیل ۴: چوتھی دلیل یہ ہے کہ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ معتزلہ وآریہ سماج وغیرہ سے کہ اگر آپ کہتے ہیں کہ اصلح للعبد اللہ تعالیٰ پر واجب ہے تو پھر آپ رات ودن اللہ تعالیٰ سے خضوع وخشوع کے ساتھ دعائیں کیوں مانگتے ہیں۔ کیوں کہ جب آپ کے قول کے مطابق واجب ہی ہیں تو وجود کی ادائیگی خود بخود ہونی چاہئے۔ بہر حال آپ کا اور ہمارا دعاء کے ذریعہ اشیاء مطلوبہ کا طلب کرنا اس بات کی علامت ہے کہ اصلح للعبد باری تعالیٰ پر نہ واجب ہے اور نہ واجب تھی اور نہ واجب ہوگی۔

اور اگر کوئی شخص ایسا اعتقاد رکھتا ہے تو وہ خارج عن الاسلام ہے۔

دلیل ۵: پانچویں دلیل یہ ہے کہ اگر باری تعالیٰ پر اصلح للعبد واجب ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کا متناہی ہونا لازم آئے گا اس لئے کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے اندر کوئی ایسی چیز ہو جو بندہ کے حق میں اصلح ہو مگر بندہ کو نہ دی گئی ہو۔ ورنہ اللہ کا تارکِ واجب ہونا لازم آئے گا اور یہ جملہ جن بشر کے نزدیک باطل ہے۔ سو جب اللہ کی قدرت میں کوئی بھی اصلح للعبد باقی نہ رہے گا تو اللہ کی قدرت کا متناہی ہونا لازم آیا۔ اور اللہ کی قدرت کا متناہی ہونا باطل ہے لہٰذا اللہ تعالیٰ پر اصلح للعبد کا واجب ہونا بھی باطل ہے۔

قارئین دلائل بہت ہو رہے ہیں اب ہم اپنے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بہر حال جملہ اہل سنت والجماعت کا یہ عقیدۂ مسلمہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ جن وبشر کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تو پھر شرح العقائد کے ماتن کا قول **وقد ارسل اللہ تعالیٰ رسولاً من البشر الی البشر مبشرین** کیا معنی رکھتا ہے۔

جواب: اس شبہ کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ جنات کے مقابلے میں انسان کی اہمیت وفضیت زیادہ ہے پس ماتنؒ نے انسان کو اصل اور جنات کو فرع تسلیم کیا ہے لہٰذا جب اصل انسان کا ذکر ہوا تو ان کے ضمن میں فرع جنات کا بھی ذکر ہو گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ **الی البشر** میں بشر سے عام بشر مراد ہے اس لئے ارشاد الٰہی "**اللہ یصطفی من الملائکۃ رسلا**" سے اعتراض وارد نہیں ہوگا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کو بھی رسول بنایا ہے تو پھر علامہ تفتازانیؒ نے رسلاً من البشر کیوں فرمایا اس لئے کہ ملائکہ عام انسانوں کے اعتبار سے رسول نہیں ہیں بلکہ انبیاء بشر کو اللہ کا پیغام پہنچانے کے اعتبار سے رسول ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ وہ رسول الی عامۃ البشر نہیں ہیں بلکہ رسول الی الانبیاء البشر ہیں۔

ملائکہ، جنات اور شیاطین کی حقیقت

اہل سنت والجماعت کے نزدیک ملائکہ نورانی اجسام ہیں نیز ملائکہ، جن، شیاطین، یہ سب لطیف اجسام ہونے کے باوجود باعتبار عوارض کے ایک دوسرے سے امتیاز رکھتے ہیں۔ چنانچہ ملائکہ خیر اور اطاعت پر پیدا کیے گئے ہیں شر اور معصیت کی ان کے اندر صلاحیت ہی نہیں۔ اور جن کے اندر خیر اور شر دونوں کی استعداد ہے۔ البتہ بشر کی استعداد غالب ہے اور شیطان ہر خبیث اور سرکش جن کو کہتے ہیں نیز جنات میں مرد و عورت بھی ہوتے ہیں ان میں توالد و تناسل ہوتا ہے اور بنی آدم کی طرح وہ بھی وعد و عید کے مکلف ہیں برخلاف ملائکہ کے کہ ان میں یہ سب باتیں نہیں ہیں۔ اور مادہ کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ ملائکہ کا مادۂ تخلیق نور سے ہے اور جنات کا مادۂ تخلیق نار سے ہے جیسا کہ مسلم شریف میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے قال رسول اللہ ﷺ خلق الملائکة من نور و خلق الجن من مارج من نار و خلق آدم مما وصف لکم۔

کرامات اولیاء

قارئین کرام! پہلی بات تو یہ ملاحظہ کریں کہ وسوسہ اور الہام میں کیا فرق ہے چنانچہ ان دونوں کے درمیان مشکوٰۃ شریف کے محشیؒ نے ان الفاظ کے ساتھ توضیح کی ہے۔ فرمایا:

''ان کانت تدعوا الی الرذائل فهی الوسوسة و ان کانت تدعوا الی الفضائل فهو الهام'' (مشکوٰۃ جلد:۱، حاشیہ)

کہ اگر اقوال رذیلہ یا افعال رذیلہ کی طرف مدعو کیا جائے تو وہ شیطانی وسوسہ ہے اور اگر دین، حدیث ہو قرآن کے موافق اقوال و افعال و عادات کی طرف مدعو کی جائے تو وہ الہام ہے۔

اب معجزہ اور کرامات کے درمیان فرق ملاحظہ کریں چنانچہ معجزہ انبیاء کرام علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لئے خاص ہے ان کے علاوہ کسی بھی جن و بشر کو نہیں دیا گیا اور معجزہ دراصل نبوت و رسالت کی تائید میں دیا جاتا ہے لہٰذا جب نبوت و رسالت کا دروازہ بند ہو گیا تو اب کسی بھی شخص کو معجزہ نہیں دیا جائے گا اگر کوئی شخص اپنی کرامات و الہامات کو معجزہ پر محمول کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہمیں معجزہ دیا گیا ہے تو ایسا شخص گستاخ رسول

ہے جیسا کہ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے الہامات تو درکنار بلکہ وسوسہ کو کہہ دیا کہ یہ من جانب اللہ معجزہ ہے تو یہ شخص قرآن وحدیث کے آئینے میں کافر قرار پایا۔

اب رہی بات الہامات وکرامات کی تو یہ تمام فضیلتیں اولیاء اللہ عارف باللہ بزرگان دین کو دیا جاتا ہے اور من جانب اللہ ان کے قلوب میں یہ باتیں ڈالی جاتی ہیں کہ آپ ایسا ایسا عمل کریں اور لوگوں کو اس پر آمادہ کروائیں چنانچہ کرامات اولیاء پر ایک واقعہ یاد آگیا کہ عارف باللہ فخر بہار حضرت العلماء، حضرت الاستاذ حضرت مولانا منت اللہ رحمانی نور اللہ مرقدہٗ ایک مرتبہ ضلع سمستی پور بہار کا سفر کر رہے تھے تو حسن پور روڈ اسٹیشن پر سوار تھے اور ٹرین پلیٹ فارم پر کھڑی تھی اور آپ نے باضابطہ وضو فرمایا اور اسٹیشن ہی پر صلوٰۃ عصر کی نیت باندھ لی آپ نماز میں مصروف ہیں اور گاڑی کے جانے کا وقت ہو چکا، سگنل ہو چکا، گاڑی کافی سیٹیاں دے رہی ہے اور گاڑی کے ڈرائیور گاڑی کو چلانے کے لیے کافی جدوجہد کر رہے ہیں۔ لیکن گاڑی اپنی جگہ سے ایک بال کے برابر بھی نہیں کھسکی جب آپ نماز سے فارغ ہوئے اور گاڑی پر تمام مریدین کے ساتھ قدم رکھا تو فوراً ٹرین تیزی کے ساتھ چل پڑی۔ آخر کار اسٹیشن ماسٹر نے اس کی تفتیش کی کہ کیا بات ہے گاڑی ابھی خراب تھی اور یکا یک چل پڑی آخر کیا وجہ ہے تو لوگوں نے حضرتؒ کے کرامات کو بیان کیا اور اسٹیشن ماسٹر کو یقین ہو گیا کہ واقعی اسلام بھی کوئی چیز ہے اسی طریقے سے الہام کا بھی ایک عجیب وغریب واقعہ ہے کہ حضرت مولانا محمد طیب صاحب القاسمی بانی مدرسہ نظامیہ اشرف المدارس للجہ سہرسا بہار کو اللہ نے ابتداء کے اندر صرف لڑکی ہی سے نوازا اور غالباً پانچ یا چھ لڑکیاں ہو گئیں پھر لڑکا نہیں ہوا آخر کار جب سادسًا یا سابعًا والدۂ مجاز مکرمہ رحمتی خاتونؒ حاملہ ہوئیں تو حضرت الاستاذ حضرت مولانا طیب صاحب مدظلہ جامعہ رحمانی خانقاہ مونگیر کا رخ کیا اور شیخ طریقت حضرت مولانا محمد ولی رحمانی مدظلہ کی خدمت میں پہنچے اور حضرت استاذ محترم نے اپنے تمام حالات پیر ومرشد سے بیان فرمائے اس کے بعد حضرت مولانا محمد ولی رحمانی کو الہام ہوا کہ اے ولی آپ ان کو یہ جواب دیجئے کہ آپ للجہ واپس جائیں انشاء اللہ اب لڑکا پیدا ہوگا چنانچہ حضرت مولانا طیب صاحب القاسمی گھر واپس آئے تو چوتھی دنوں کے بعد دو لڑکے پیدا ہوئے چنانچہ احقر اپنے جملہ ساتھیوں کے ساتھ مالا بدمنہ، فارسی، پانچواں گھنٹہ تین بجے دن میں حضرت سے پڑھ رہا تھا کہ اچانک محلہ سے مدرسہ نظامیہ

سے خبر آئی کہ حضرت کو اللہ نے آج دو لڑکوں سے نوازا ہے پس آپ خوشی و مسرت کی فضاؤں میں جھوم اٹھے اور احقر ہی کو مٹھائی کا ڈبا عنایت کیا اور فرمایا اے نسیم تمام ساتھیوں میں تقسیم کرلو، خیر یہ تمام واقعات کرامات والہامات کے ثبوت پر شاہد ہے نیز یہ واقعہ احقر کے مشاہدہ کی ہیں ان کے علاوہ اور بہت سے واقعات ان مذکور باتوں پر شاہد و عادل ہے۔

امام غائب کا عقیدہ درست نہیں

شیعہ امامیہ کا عقیدہ ہے کہ آقائے رحمت ﷺ کے بعد سلسلہ امامت حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے شروع ہو کر بارہویں امام حضرت مہدی پر ختم ہو گیا جو دشمنوں کے خوف سے ۲۰۵ھ یا ۲۰۶ھ میں ایک غار کے اندر پوشیدہ ہو گئے اور اس غار کا نام ''سر من رأی'' ہے یہ لوگ ہر سال ایک مقررہ تاریخ میں اس غار کے دروازے پر جمع ہو کر ان کے خروج کا انتظار کرتے ہیں اور یہ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ جب دنیا سے شر و فساد کا خاتمہ ہو جائے گا اور اہل باطل کا نظام زائل ہو جائے گا۔ اس وقت حضرت مہدی ظاہر ہوں گے اور دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دیں گے اسی وجہ سے حضرت علامہ تفتازانیؒ نے ان کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ لوگوں پر ظاہر ہونا چاہیے ان کی نگاہوں سے روپوش نہ ہونا چاہیے تاکہ ضرورت کے وقت لوگ اس کی طرف رجوع کر سکیں اور لوگوں کے درمیان رہ کر انھیں ان کی ضروریات کا پتہ چلے۔

بہر حال حضرت علامہ تفتازانیؒ نے مذکورہ عقائد باطلہ کے بطلان پر دلیل پیش کی ہے۔

دلیل ۱: پہلی دلیل یہ ہے کہ جو اغراض تقرر امام سے مطلوب ہیں مثلاً اقامت حدود وغیرہ ان کے حاصل نہ ہونے کے سلسلے میں امام کا غائب اور روپوش ہونا اور نئے سرے سے اس کا معدوم ہونا دونوں برابر ہے۔

دلیل ۲: دوسری دلیل یہ ہے کہ دشمنوں کا خوف اس طرح غائب ہونے کا مقتضی نہیں کہ ان کے نام کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہ ہو۔ زیادہ سے زیادہ اس بات کا مقتضی ہو سکتا ہے کہ عام لوگوں سے اپنے دعویٰ امانت کو مخفی رکھے۔ جیسا کہ ان کے آبا میں سے بعض مثلاً حسن بصری لوگوں کے سامنے اور انکے درمیان رہتے تھے مگر امامت کا دعویٰ نہیں کرتے تھے۔

دلیل ۳: تیسری دلیل یہ ہے کہ اس زمانہ میں فساد اور بگاڑ اور ظالموں کے غلبہ کی وجہ سے اس وقت لوگوں کو امام کی حاجت زیادہ ہے اور ایسے وقت میں ان کے لئے امام کی اطاعت اور

فرمانبرداری بہ نسبت اس وقت کے زیادہ آسان ہے کہ جب دنیا سے شر وفساد کا مادّہ زیادہ ہو جائے گا اور اہل باطل کا نظام زائل ہو جائے گا بہر حال ان تمام دلائل سے معلوم ہوا کہ شیعہ امامیہ کا مذکورہ عقیدہ باطل اور قابل عقاب ہے۔

باری تعالیٰ مکان سے پاک ہے

باری تعالیٰ مکان وغیرہ سے پاک ہے یعنی باری تعالیٰ ہر جگہ حاضر وناظر ہیں اور وہ ذات کسی بھی جگہ مستقر نہیں بلکہ وہ ہر ایک جگہ کی خبر رکھتا ہے اور ان کی نگاہیں ہر جگہ پھیلی ہوئی ہیں اور پھیلی ہوئی تھیں اور ہمیشہ پھیلی رہیں گی۔ خیر باری تعالیٰ مکان سے پاک ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جو لوگ ثبوت خلاء کے قائل ہیں یعنی متکلمین اور اشراقین کے نزدیک بعد کی دو قسمیں ہیں ایک وہ بعد جو جسم کے ساتھ قائم ہے دوسرے وہ بعد جو مجرد عن المادہ اور قائم بالذات ہے اس حیثیت سے کہ اگر کوئی جسم اس کو اوپر لئے ہوئے اور اس کے اندر سمایا نہ ہو تو وہ خلاء محض ہوگا۔ متکلمین اور اشراقین اسی دوسرے بعد کو جسے خلاء سے بھی تعبیر کرتے ہیں مکان کہتے ہیں فرق اتنا ہے کہ متکلمین اس بعد مجرد عن المادہ کو موہوم قرار دیتے ہیں اور اشراقین اسے موجود قرار دیتے ہیں۔ گویا جسم اپنے بعد یعنی قول وعرض وعمق کے بقدر جس خلاء کو پُر کئے ہوئے ہوتا ہے وہی خلاء اس جسم کا مکان ہے اور اس خلاء یعنی بعد عن المجرد کے اندر جو کہ قائم بالذات ہے جسم کے بعد کا نفوذ کرنا اور سما جانا تمکن کہلاتا ہے۔ تمکن کے اس معنی کے لحاظ سے متمکن فی المکان وہی چیز ہوگی جس کے لئے بعد اور امتداد ہو اور بعد اور امتداد کے تجزی اور قابل تقسیم ہونے کی وجہ سے باری تعالیٰ بعد اور امتداد سے پاک ہے اس لئے وہ مکان سے بھی پاک ہے فلا یتمکن فی مکان۔

ان مذکورہ مباحث سے معلوم ہوا کہ باری تعالیٰ مکان سے مبرہ ومنزہ ہے پس جس طرح مکان سے پاک ہے اسی طرح اشیاء سے بھی پاک ہے ان کے بھی دلائل بہت سارے ہیں اب بمرور دلائل ملاحظہ کیجئے۔

دلیل ۱: پہلی دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ اگر متحیز ہوں یعنی کسی چیز میں ہوں تو دو احتمال ہیں اوّل یہ ہے کہ وہ ازل ہی سے متحیز ہوں اور یہ اس وقت ہوگا جب چیز بھی ازل میں ہو ایسی صورت میں چیز (یہ بات واضح رہے کہ چیز کو چیز کے معنی میں لیا گیا ہے تاکہ پڑھنے والوں

کے لیے آسانی ہو) کا ازلی اور قدیم ہونا لازم آئے اور یہ باطل ہے کیوں کہ چیز من جملہ عالم کے ہونے کی وجہ سے حادث ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ازل کے بعد متحیز ہو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ازل میں چیز معدوم تھی بعد میں موجود ہوئی اور معدوم رہنے کے بعد موجود ہونے والی چیز حادث ہوتی ہے۔ لہٰذا باری تعالیٰ کا محل حوادث ہونا لازم آئے گا اور یہ بھی باطل ہے اور جب متحیز ہونے کی دونوں صورتیں باطل ہوگئیں تو اس کا متحیز ہونا بھی باطل ہوگیا۔

دلیل ۲: دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر باری تعالیٰ کے لئے حیز ہو تو یا تو حیز اس کے مساوی ہوں گے یا اس سے کم ہوں گے یا اس سے زائد ہوں گے۔ پہلی اور دوسری صورت اس لئے باطل ہے کہ چیز متناہی ہے اور جو چیز متناہی کے مساوی ہو یا اس سے کم ہو وہ بھی متناہی ہوگی۔ اور باری تعالیٰ کا متناہی ہونا باطل ہے، اور تیسری صورت اس لئے باطل ہے کہ اس صورت میں باری تعالیٰ کی تجزی اور تقسیم لازم آئے گی بایں طور کہ باری تعالیٰ کا ایک حصہ وہ ہوگا جو حیز کے اندر ہوگا۔ دوسرا حصہ وہ ہوگا جو حیز سے بڑھا ہوا ہوگا اور حیز سے خارج ہوگا اور جب متحیز ہونے کی تینوں شقیں باطل ہوگئیں تو متحیز ہونا بھی باطل ہوگیا۔

باری تعالیٰ زمان سے پاک ہے

باری تعالیٰ جس طرح مکان اور حیز سے مبرہ ومنزہ ہے اسی طرح زمان سے بھی پاک ہے اس لئے کہ ہم اہل حق کے نزدیک زمانہ سے ایک ایسا لمحہ ہے کہ شیأ فشیأ حادث ہونے والا امر ہے جس کے ذریعہ دوسرے امر حادث کا اندازہ کیا جائے مثلاً گھنٹوں سے ایام کا ایام سے مہینوں کا اور مہینوں سے سال کا اور سال سے عمر کا اندازہ کیا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ تجدد اور حدوث سے پاک ہے۔ فلاسفہ کے نزدیک بھی باری تعالیٰ زمانی نہیں ہے کیوں کہ ان کے نزدیک زمانہ مقدار اور حرکت ہے اور اللہ تعالیٰ مقدار اور کم ہونے سے پاک ہے۔

بہر حال باری تعالیٰ مکان، حیز، زمان، عرض، جوہر، جسم، صورت، شکل، محدود اور متناہی ہونے سے مبرہ ومنزہ ہے کیوں کہ یہ تمام اشیاء حوادث پر دال ہے اور باری تعالیٰ قدیم ہیں جیسا کہ ماقبل کے اندر بالتفصیل بحث گذر چکی ہے۔

اشکالات وجوابات فی علوم القرآن

سوال: کیا تمام علوم قرآن شریف میں ہیں یا نہیں اگر نہیں ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ اس پر قادر نہیں اور اگر ہے تو حدیث فقہ وغیرہ کی کیا ضرورت؟

جواب: تمام کے تمام علوم قرآن شریف میں ہیں حتی کہ طبعیات سائنس وغیرہ بھی ہیں (لیکن ان علوم کو وہی جان سکتا ہے جن کے اندر کچھ مہارت ہو) چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں نے تحقیق کرلیا کہ مادہ منویہ میں کیڑے ہوتے ہیں سو قرآن شریف میں بھی یہ مسئلہ مذکور ہے کہ اس لئے فرمایا گیا خلق الانسان من علق اور علق کے معنی جونک کے ہیں اور دوسرا معنیٰ خون بستہ کے ہیں لیکن صحیح قول یہی ہے البتہ معنی کو تفسیر کہہ سکتے ہیں۔

اب رہا شاک کا شک کہ جب تمام علوم قرآن میں موجود ہے تو پھر فقہ حدیث کی ضرورت کیوں پڑی تو اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن بدرجہ متن اور احادیث فقہ بدرجہ شرح ہے یعنی فقہ وحدیث کوئی الگ سے آسمانی کتب نہیں ہیں بہر حال اس جواب کی مثال یوں لیجئے کہ اگر کوئی اہل عرب آپ سے کرے درانحالیکہ آپ عربی پر حاوی نہیں ہیں خواہ اس اہل عرب کے خطاب کے بعد ہندوستانی کسی شخص کو پکڑتے ہیں تو یہ شخص اس عربی خطاب کی تشریح وتوضیح کرتا ہے۔ یہی حال قرآن اور فقہ وحدیث کا ہے۔

سوال: قرآن کریم میں جگہ جگہ تکرار آیا ہے مثلاً یعلمون تعلمون وغیرہ اور تکرار کلام عند البلغاء والفصحاء ناجائز ہے۔

جواب ۱: اس کا جواب یہ ہے کہ پنڈت اور دیگر جہلاء کو نصیحت حاصل کرنے کیلئے باری تعالیٰ نے تاکیداً تکرار کلمات کا استعمال کیا تاکہ عام وخاص تمام لوگ اس پر ایمان رکھیں یہی وجہ ہے کہ اگر سامع کے ذہن میں کوئی بات جلد منقش نہیں ہوتی ہے تو بلغاء وفصحاء ادباء وعلماء صلحاء تمام کے نزدیک کلمات کا تاکیداً بار بار استعمال کرنا جائز ہے۔ چنانچہ اسی اشکال کو دفع کرنے کیلئے باری تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وصرفنا القرآن للناس لیشکروا یعنی ہم نے لوگوں کے لئے طرح طرح سے اس لئے بیان کیا تاکہ نصیحت قبول کریں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح باپ بیٹے کو نصیحت کرتا ہے اور اگر بیٹا نا سمجھ ہوتا ہے تو بار بار نصیحت کرتے ہیں تاکہ بیٹا نصیحت قبول کرلے اور اگر بیٹا پھر بھی نصیحت کو نہیں

مانتا ہے تو باپ پھر زجر و توبیخ کے ساتھ طرح طرح سے نصیحت کرتا رہے۔ تاکہ بیٹا راہ راست پر آجائے لہٰذا خداوند تعالیٰ باپ سے بھی زیادہ شفیق ہیں تو انہوں نے بھی بار بار کلمات ناصحانہ کا استعمال کیا ہے۔ تاکہ میرا بندہ جہنم کی آگ سے بچ جائے اور راہ راست پر آجائے۔

سوال: اگر کوئی شخص قرآن کریم کو نہ سمجھے اور اس کی تلاوت کرے تو گویا کہ وہ اپنے زمانے کا جاہل ہے اسی کے مصداق حروف مقطعات ہے کہ ان کو لوگ سمجھتے نہیں پھر بھی تلاوت کرتے ہیں۔

جواب ۱: محترم آپ نے تجارت کی ہوگی اور تجارت کے اندر ہمیشہ نفع کو نہیں پایا ہوگا کبھی نقصان ہے تو کبھی نفع۔ لہٰذا جب آپ کو نقصان ہوا تو عقل کا تقاضہ یہ ہے کہ فوراً تجارت چھوڑ دینا چاہیے لیکن پھر بھی تجارت نہیں چھوڑتے اور فائدے کی امید لئے ہوتے ہیں۔ تو اب خود فیصلہ کریں کہ جب آپ کو تجارت میں نقصان ہوا پھر بھی تجارت کرتے ہیں تو حیرت کی بات ہے کہ دین کے کام میں نفع کی تاخیر کو نفع نہ سمجھا جائے۔ یقیناً حروف مقطعات کی تلاوت میں نفع ہے اور انسان کو نفع ہی مقصود ہوتا ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ جس طرح کوئی بادشاہ اپنے اور وزیر کے درمیان کوئی راز و نیاز کی باتیں مخفی رکھتا ہے اور رعایا کو پتہ نہیں چلنے دیتا لہٰذا اسی طرح رب کریم اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان حروف مقطعات بھید کی بات ہے جو کہ دوسروں پر مخفی ہے۔ اور ان کی تفتیش میں پڑنا گمراہی کی علامت ہے۔

سوال: اللہ تعالیٰ نے بارہا قرآن میں یہ اعلان کر دیا کہ میں عالم الغیب ہوں پھر بھی فرشتوں سے دریافت کر رہے ہیں کہ میرا بندہ کیا کر رہا ہے۔؟

جواب ۱: جب رب کریم نے فرشتوں کو اظہار خیال فرمایا تھا تو فرشتے نے جواب دیا تھا **اتجعل فیھا من یفسدفیھا**۔ کہ اے اللہ آپ ایسی مخلوقات کو پیدا کرنے والے ہیں کہ جو خوں ریزی کرے گی۔ یعنی فرشتوں کا مقصد اور خیال یہ تھا کہ آدمی کو نہ پیدا کریں لیکن پھر بھی رب حقیقی نے پیدا فرمایا۔ تو جب بندہ نیک کام کرتا ہے تو خدا تعالیٰ فرشتوں سے بطور خیال سابق کو فاسد کرنے کیلئے فرماتے ہیں اے فرشتے میرے بندے کیا کر رہے ہیں تو جواب دیتے ہیں کہ نیک عمل کر رہے ہیں تو باری تعالیٰ فرشتوں سے کہتے ہیں کہ جناب تم

نے مجھ سے کہا تھا کہ خوں ریزی کریں گے اور ابھی تم خود کہہ رہے ہو کہ نیکی کر رہے ہیں۔ فبهت الملائكة۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ خداوند قدوس یقیناً عالم الغیب ہیں لیکن پھر بھی مذکورہ جملہ اس وجہ سے استعمال کرتے ہیں تا کہ اے فرشتو تم گواہ رہو کہ میں نے فلاں بندہ کی بخشش کر دی۔ یعنی بطور شاہد کے فرماتے ہیں کہ میرا بندہ کیا کر رہا ہے۔ (بحوالہ الصلوٰۃ، ص:۴۵)

اشکال وجوابات لوح محفوظ پر

سوال: لوح محفوظ کی وسعت کتنی ہے اور لوح محفوظ کتنی بڑی ہی مان لی جائے مگر پھر بھی کبھی نہ کبھی ختم ہو جائے گی۔ نیز ہزاروں لاکھوں ہو چکے ہیں بے شمار چیزیں پیدا ہوئی اور فنا ہو گئیں لہٰذا لوح محفوظ پر کہاں تک لکھا گیا ہوگا؟

جواب ۱: اس سوال کے جواب پر حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے فرمایا کہ تمہارا ذہن ہے، یہ کبھی ختم نہیں ہوتا اس میں تم نے کتنی چیزیں بھری ہوں گی مگر وہ ابھی تک خالی ہے تو لوح محفوظ ذہن سے بھی بہت بڑی ہے ہاں واقعی اتنے سے ذہن میں کس قدر گنجائش ہے کہ دہلی، کلکتہ، زمین و آسمان سب سمایا ہوا ہے اگر حصول الاشیاء بانفسھاء نہ مانتے تو باشیاء ھا کے قائل ہو جایئے۔ (بحوالہ روح الجوار، ص:۹)

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ لوح محفوظ کی لمبائی پر آسمان اور نیچے زمین اور چوڑائی مشرقی تا مغرب ہے بہر حال روایات مختلف ہیں کتب احادیث کی طرف رجوع کریں۔

مصیبت

سوال: اگر مصیبت گناہوں کی وجہ سے آتی ہے تو کفار و مشرکین پر اے اور نیک لوگوں پر مصیبت نہ آنی چاہیے؟

جواب: مصیبت دو قسم کی ہے ایک مصیبت انسان کی رسوائی و ذلیل اور تہ و بالا کرنے کے لئے آتی ہے جیسے غضب سے تعبیر کیا جاتا ہے جیسا کہ قرآن نے اعلان کر دیا۔ غیر المغضوب علیھم و لا الضالین. (آمین)

اور دوسری مصیبت ہوتی ہے انسان کو پاک وصاف کرنے کے لئے جیسے اگر کوئی کپڑا

گندہ ہو جاتا ہے تو اسے پاک کر کے استعمال میں لاتے ہیں اسی طرح اگر نیکو کار عند اللہ گنہگار ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ مصیبت بطور نظافت کے دیتے ہیں نہ کہ غضب کے۔

خلاصہ کلام یہ نکلا کہ مصیبت کی مذکورہ پہلی قسم کفار و مشرکین کے لیے خاص ہے اور دوسری قسم اہل ایمان کے لیے ہے۔ کیوں کہ جس طرح انسان یہ پسند نہیں کرتا ہے کہ ہمارا جسم ہمارا کرتا ہمارا لباس وغیرہ گندہ رہے اسی طرح رب کریم ہرگز یہ نہیں چاہتا کہ میرا محبوب بندہ گنہگار رہے۔

نبی اکرم ﷺ اُمی تھے

سوال: لاتتبع اھواء الذین لا یعلمون کہ آپ ﷺ اس شخص کی اتباع نہ کیجئے جو نہیں جانتے ہیں تو حضور ﷺ بھی جاہل تھے تو پھر ان کی اتباع بھی نہ کی جائے۔ (نعوذ باللہ)

جواب ۱: جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا کہ حضور اکرم ﷺ امی تھے لیکن آپ کو معلوم نہیں کہ:

حضور اکرم ﷺ کے استاذ خود رب کریم۔

حضور اکرم ﷺ کے معشوق خود رب کریم۔

حضور اکرم ﷺ کے علوم کا مرکز خود رب کریم۔

حضور اکرم ﷺ کے رہبر و ہادی اور علم و عمل کا منبع خود رب کریم۔

اب آپ دل پر ہاتھ رکھ کر تبادلۂ خیال کریں کہ جن کے استاذ خود حضرت حق جل مجدہٗ ہوں تو وہ کتنا بڑا عالم ہوگا۔ جیسا کہ خود قرآن نے اعلان کر دیا اَوْحیٰ اِلَی کہ بذریعہ جبرئیل علیہ السلام علوم ربانی ہمارے قلب میں القاء ہیں لہٰذا اب آپ کو یہ ماننا پڑے گا کہ اور پوری دنیا نے یہ تسلیم کر لیا اور تا قیامت تسلیم کرتی رہے گی حضور اکرم ﷺ جیسا عالم دنیا کے اندر کہیں پیدا نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ پیدائشی اعتبار سے امی تھے اور جب آپ بالغ ہوئے تو اللہ نے آپ ﷺ کو عقل و دانش سے اس قدر نوازا جس کی کوئی انتہا نہیں اور جب آپ ﷺ کی عمر ۴۰ ربرس ہوئی تو خود رب حقیقی آپ ﷺ کے استاذ محترم ہو گئے۔

جیسا کہ پورا پورا قرآن اس بات پر دال ہے کہ اللہ نے آپ ﷺ کو اپنا شاگرد بنایا جو عند الناس محتاج تعارف نہیں۔

خوف وخشیت

اشکال: انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء کہ علماء کرام اللہ ہی سے ڈرنے والے ہیں تو پھر شیر، چیتا، حکومت، وغیرہ سے کیوں ڈرتے ہیں۔

جواب ۱: خوف کی دو قسمیں ہیں۔ ۱-خوف ابدی۔ ۲-خوف عارضی۔ پس انسان (علماء کرام) کے اندر جو خوف من اللہ ہے یہ ابدی خوف ہے یعنی ہمیشہ سے اہل ایمان خداوند قدس سے ڈرتے ہیں اور ڈرتے رہیں گے اور شیر چیتا وغیرہ کا خوف یہ خوف عارضی ہے یعنی تھوڑی دیر کے لئے ڈرتا ہے پھر جب انسان کے اندر طاقت وقوت اور ہتھیار مہیا ہوجاتا ہے تو شیر پر غالب آجاتا ہے اور اس سے مقابلہ کرنے لگتا ہے بخلاف رب کریم کے کہ انسان کو دیکھتا ہی نہیں لیکن ان سے خوف کھاتا ہے اور کھاتا رہے گا۔

خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ خوف کی مذکورہ پہلی قسم رب کریم کے لئے خاص ہے اور دوسری قسم عام اور عارضی ہے جو وقتاً فوقتاً انسان کو پیش آتا رہتا ہے لہٰذا آیت مذکورہ میں پہلی قسم مراد ہے نہ کہ دوسری قسم پس آپ کا اعتراض ختم ہوگیا۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ دیا جائے گا کہ آیت مذکورہ میں خشیت کا مفہوم ہے نہ کہ خوف کا اور خوف عام ہے جو کہ ہر ایک کے لئے بولا جاتا ہے مثلاً بیٹا باپ سے ڈرتا ہے اسی طریقے سے طرح طرح کے خوف ہوتے ہیں اور خشیت یہ خاص ہے کہ جو کہ صرف رب کریم ہی کے لئے بولا جاتا ہے پس جب ڈرنے کی نسبت باری تعالیٰ کی طرف کریں گے تو اس وقت خشیت مراد ہوگی اور جب بندہ کی طرف کریں گے تو خوف مراد ہوگا۔

قرآن کریم معجزۂ الٰہی

سوال: قرآن کا معجزہ ثابت کرنا یہ سراسر غلط ہے کیوں کہ ایسا کلام ہر ایک شخص لاسکتا ہے جیسے ''مقامات حریری'' وغیرہ۔

جواب: قرآن نے کئی جگہوں پر باطل فرقوں کو بیا نگ دہل اور ڈنکے کی چوٹ سے چیلنج کیا فاتوبسورۃ من مثلہ تم ایک سورۃ بھی پیش کردو اگر تمہارے اندر طاقت وقوت ہے، جب انہوں نے ایک سورۃ پیش کرنے سے قاصر وعاجز ہوگئے تو پھر قرآن نے چیلنج کیا کہ چلو ایک

آیت ہی نہیں اسی کو پیش کر دو بالآخر تمام اہل عرب اس سے قاصر و مجبور رہ گئے حالاں کہ یہ لوگ اپنے زمانے کے ادیب تھے ان کی بچیاں اور بچے بھی عربی شاعر تھے پھر بھی مجبور ہو گئے۔ اور تا قیامت مجبور ہوتے ہی رہیں گے اب رہی بات مقامات حریری کی تو کتاب بھی قرآن کریم ہی کے اصول وقواعد سے اخذ کی گئی ہے اور باری تعالیٰ نے جو چیلنج فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کے اصول وفروع سے ہرگز اخذ نہ کرنا۔

اشکال وجواب علی الوحدانیہ

سوال: بسم اللہ الرحمن الرحیم یہاں پر اللہ کا نام استعانت حاصل کرنے کے لیے ذکر کیا تو پھر براہ راست باکو اللہ پر کیوں نہ داخل کیا؟

جواب ۱: اس سوال کے جواب کی مثال یوں لیجئے کہ دنیا کا بادشاہ ہے کہ اگر اس کے پاس جانے کی نوبت آتی ہے تو وزیر کی ضرورت پڑتی ہے اور وزیر کے واسطہ سے رعایا بادشاہ تک پہنچتا ہے ڈائریکٹ کسی کی ہمت نہیں کہ بادشاہ تک پہنچ جائے۔ تو کیا جو تمام بادشاہوں کے بادشاہ ہیں ان کے پاس انسان ڈائریکٹ پہنچ جائے ہرگز نہیں۔ بلکہ ایک واسطہ کی ضرورت پڑے گی اور واسطہ خداوند قدس کی ذات گرامی ہے فلہٰذا اصول مذکورہ کے مطابق انسان ''ب'' کو اللہ پر داخل نہ کیا بلکہ اسم پر داخل کیا ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ جس طرح رب کریم کی ذات گرامی تمام عیوب سے پاک ہے اسی طرح رب کریم کا اسم گرامی بھی تمام عیوب سے مبرہ ومنزہ ہیں پس اگر اسم پر ''ب'' داخل کر دیا گیا تو کوئی اشکال کی بات نہیں ہے۔

نوٹ: احقر وحدانیت کے سلسلے میں پہلی جلد کے اندر مکمل بحث کر چکا ہے۔

کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے

سوال: بقولہ تعالیٰ وقاتلوا فی سبیل اللہ اسی طرح دوسری جگہ ارشاد ربانی ہے وجاھدوا فی سبیل اللہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے۔

جواب ۱: اگر تلوار کے زور سے اسلام پھیلتا تو ان کے قلب پر تلوار کا اثر کیسے ہو جاتا، پس دل پر اثر ہو جانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کی عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے

بالکل مطابق ہوگئی تھیں لہٰذا اس سے یہ معلوم ہوا کہ اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا بلکہ بزور رحمت الٰہی اور بزور شفقت نبوی پھیلا ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ دیا جاسکتا ہے کہ اگر اسلام بزور شمشیر پھیلتا تو لوگ چند ساعت کے لئے اسلام قبول کر لیتے اور پھر ارتداد اختیار کرتے لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ جنہوں نے اسلام قبول کیا اور ان کو جب اسلام کی چاشنی اور لذت محسوس ہوتی تو ارتداد تو درکنار بلکہ لات وعزی کے دشمن ہوگئے۔ چنانچہ تاریخ شاہد وعادل ہے کہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو انہوں نے کھلم کھلا یہ اعلان کر دیا کہ اسلام ایک معتدل مذہب ہے اس کو مان لو اور اس مذہب کو کوئی ہرگز برا نہ کہے ورنہ میری تلوار اور ان کی گردنیں ہوگی۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے

سوال: اسی طرح آپ کے قرآن نے یہ بھی کہہ دیا کہ اللہ تعالیٰ کفار ومشرکین کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کفار ومشرکین کو معاف کرنے پر قادر نہیں ہے۔

جواب ۱: اس سوال مذکورہ کا جواب صرف ایک مثال سے سمجھ میں آجائے گا وہ یہ ہے کہ کوئی رعایا بادشاہ کی اقتداء کو ابتدا تا انتہا تسلیم نہیں کرتی ہے لہٰذا اب بادشاہ اس رعایا کے سلسلے میں پھانسی کا حکم دیتا ہے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ بادشاہ اسکو پھانسی سے رہائی کر دینے پر قادر نہیں ہے یقیناً بادشاہ پھانسی اور رہائی دونوں پر قادر ہے لیکن وہ بادشاہ کے خلاف پوری زندگی رہے اس لئے اس کو پھانسی کا حکم دیا جارہا ہے۔ پس یہی مثال حضرت حق جل مجدہٗ کی ہے کہ کفار ومشرکین پیدائش تا موت ان کے باغی رہے ہیں اس لئے ان کے لئے ہمیشہ ہمیش کے لئے جہنم ہے (اور باری تعالیٰ ان کفار ومشرکین کی رہائی اور عدم رہائی ہر چیز پر قادر ہے)

اللہ تعالیٰ جملہ اعضاء سے پاک ہے

سوال: خداوند قدس کے پاس زبان ہے یا نہیں اگر باری تعالیٰ زبان اور دوسرے اعضاء وجوارح سے مبرہ ومنزہ ہے تو پھر قرآن کو کیسے نازل کیا گیا ہے۔

جواب ۱: دراصل حضرت حق جل مجدہٗ ان تمام چیزوں (یعنی زبان وغیرہ) سے مبرہ ومنزہ ہیں اب رہا آپ کا سوال تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں آپ سے دریافت کرتا ہوں کہ آپ کے منہ کے اندر زبان ہے تو جب آپ گفتگو کرتے ہیں تو کیا زبان کو زبان کی ضرورت پڑتی ہے یا نہیں یقیناً آپ اور تمام حضرات یہی کہیں گے کہ زبان کو زبان کی ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ تو جب تکلم کرنے کے لئے زبان کو زبان کی ضرورت نہیں پڑتی تو اللہ تعالیٰ کو زبان کی ضرورت پڑ سکتی ہے ہرگز نہیں۔ کیوں کہ وہ ان تمام اعضاء وجوارح سے پاک وصاف ہیں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ دیا جائے گا کہ انسان محتاج اور زبان محتاج الیہ ہے یعنی انسان زبان کا محتاج ہے اور اگر نعوذ باللہ خداوند قدس کے لئے زبان کا ہونا ثابت کریں گے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا محتاج ہونا لازم آئے گا حالاں کہ اللہ تعالیٰ ان تمام چیزوں سے بے نیاز ہے۔

عذاب دائمی

سوال: مذہب اسلام میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں؟

جواب ۱: جیسی کرنی ویسی بھرنی نہ مانے تو کر کے دیکھ
جنت بھی ہے دوزخ بھی ہے نہ مانے تو مر کے دیکھ

کیوں کا جواب یوں دیا جائے گا کہ انسان جب حضرت حق جل مجدہٗ کو ایک تسلیم نہیں کرتا اور خداوند قدس کے انعامات کی تکذیب کرتا ہے اور بہت سارے انعامات میں سے ایک عظیم انعام جنت بھی ہے۔ اور کفار ومشرکین جنت کے منکر ہیں تو خود آپ فیصلہ کیجئے کہ جو جس چیز کا منکر ہو تو کیا اس کو وہ چیز دی جا سکتی ہے ہرگز نہیں۔ اس کی مثال یوں لیجئے کہ ایک شخص نے آگ کو پکڑا دوسرا شخص جواہر پکڑے تو کیا آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آگ پکڑنے والے کا ہاتھ کیوں جلا پس اسی طرح کفار ومشرکین نے آگ کو اختیار کیا تو اس کو ہمیشہ کے لئے آگ ہی ملے گی اور مومنین نے جواہر اختیار کیا اسکو ہمیشہ کے لئے جواہر ہی ملیں گے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ دیا جائے کہ دائمی عذاب ہر ایک کے لئے نہیں ہے بلکہ دائمی عذاب اس کے لئے ہے جو شروع سے اخیر تک اپنے عقائد باطلہ پر قائم رہا ہے اسی طرح

جس نے اسلام سے ارتداد اختیار کیا اس کیلئے یہ سزا ہے۔ اور جس شخص نے شروع زمانے میں بت پرستی کی لیکن آخر زمانے میں اسلام قبول کر لیا تو اس کے لئے دائمی عذاب نہیں ہے۔

جنت و جہنم

سوال: جنت و جہنم کوئی چیز نہیں بلکہ ایک فرضی چیز ہے اور اہل ایمان کو ڈرانے کے لیے لوگوں نے جنت و جہنم کا تذکرہ کیا۔

جواب ۱: اگر جنت و جہنم فرضی چیز ہوتی تو اس موجودہ دنیا میں بارہا یہ واقعے سنائے جاتے ہیں کہ مردہ کو دفن کرنے کے بعد ایسا معاملہ ہوا ایسا ہوا! چنانچہ جہنم کے وجود پر ایک واقعہ سناتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک شخص اپنی بہن کو دفن کر کے گھر آیا اور دیکھا کہ میرے جیب میں جو روپے تھے وہ تمام روپے بہن کی قبر میں گر چکے ہیں چنانچہ وہ شخص دوڑا ہوا واپس آیا اور قبر کھودی تو دیکھا کہ میری بہن کو عذاب ہو رہا ہے۔ اسی طرح جنت کے وجود پر بھی ایک واقعہ یاد آیا وہ یہ ہے کہ ایک شخص کے والد محترم کا انتقال ہو گیا تو ان کو دفن کر دیا اور دفن کے بعد قبر کے پاس جانا ہوا تو آواز آئی کے عزیزم میں بہت ہی خوش و خرم ہوں اور طرح طرح کے میوے مل رہے ہیں، بہر حال خود دنیاوی واقعات جنت و جہنم پر کافی ہیں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ خود آریہ سماج کی معتبر کتاب یجروید کے اندر جنت و جہنم کا تذکرہ آیا ہے جس کو بیکونٹھ اور نرک سے تعبیر کرتے ہیں بیکونٹھ جنت کو اور نرک جہنم کو کہتے ہیں لہٰذا اگر آپ جنت و جہنم کو تسلیم نہیں کرتے تو آپ گویا کہ قرآن و حدیث تو در کنار، خود اپنی کتاب کو نہیں مانتے ہیں۔

جواب ۳: تیسرا جواب یہ ہے کہ جنت و جہنم کے سلسلے میں قرآن و احادیث کثرت سے وارد ہیں چنانچہ ارشاد باری ہے۔ **وسارعوا الی مغفرة من ربکم وجنة.**

اتباع اللہ۔ والرسل

سوال: اسی طرح قرآن نے اللہ اور اس کے رسول کو ایک پلڑا میں رکھ دیا چنانچہ ارشاد ربانی ہے: **اطیعو اللہ و اطیعو الرسول۔**

جواب: اللہ تعالیٰ کی اتباع اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے اندر زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیوں کہ انسان اللہ تعالیٰ کو رب تسلیم کرتا ہے معبود ہونے کی حیثیت سے یعنی ان کی اتباع خداوند قدس ہونے کی حیثیت سے ہے اور:

رسول اکرم ﷺ کی اتباع سید الشریعت ہونے کی حیثیت سے

رسول اکرم ﷺ کی اتباع دنیا و آخرت کے دلہا اور ہادی امت ہونیکی حیثیت سے

رسول اللہ ﷺ کی اتباع شفیع الامت ہونے کی حیثیت سے

رسول اللہ ﷺ کی اتباع محسن اعظم ہونے کی حیثیت سے

اور حضرت حق جل مجدہٗ کی اتباع خالق کائنات ہونے کی حیثیت سے اس کی مثال یوں لیجئے کہ اگر رعایا بادشاہ کو مالک تسلیم کرتی ہے تو کیا آپ یہ کہیں گے کہ بادشاہ رام، کرشن، بھگوان، ہوگیا ہرگز نہیں بس یہی مثال رسول اکرم ﷺ اور اللہ کے درمیان ہے کہ اللہ کی اتباع بطور معبود، اور رسول اللہ ﷺ کی اتباع بطور بشر کرتے ہیں۔

سوال: رسول اکرم ﷺ نے اشاعت دین اس وجہ سے کی تا کہ عند الناس ہماری تعظیم ہو اور ہم مکرم و محترم ہو جائیں۔

جواب: اس کا جواب یہ ہے کہ اگر رسول اللہ ﷺ کے ذہن میں ایسی بات ہوتی تو مکہ کی گلیوں میں مار کھا کھا کر دین نہ پھیلاتے اور ہر بڑی بڑی رسوائیوں کا سامنا نہ کرتے جیسا کہ تاریخ شاہد و عادل ہے کہ:

آپ ﷺ نے طائف کے میدانوں میں پتھروں کی بارش کھائی اور اشاعت دین

کے لئے پیہم جدو جہد کرتے ہیں۔
آپ ﷺ کے گلے میں اونٹ کی اوجھڑی ڈالی گئی۔
پھر آپ بھی ﷺ نے دین کی اشاعت کی۔
آپ ﷺ کو مکہ والوں نے طرح طرح کی اذیتیں دیں پھر بھی آپ نے دین کی اشاعت کی۔
بہر حال اگر حضور ﷺ کے دل میں ایسی بات ہوتی کہ اشاعت دین سے محض ہماری تعظیم ہو تو یقیناً ایسی ایسی رسوائیوں کا سامنا نہ کرتے بلکہ آپ ﷺ نے اشاعت دین محض اس لئے کیا تا کہ حضرت حق جل مجدہٗ مجھ سے اور میری امت سے راضی ہو جائیں۔
چنانچہ آپ ﷺ خداوند قدوس کے نزدیک راضی ہی نہیں بلکہ آپ ﷺ عاشق اور اللہ تعالیٰ معشوق کہلاتے ہیں۔

مرتد

سوال: مرتد پہلے مومن تھا لہٰذا جب تک وہ نے ایمان پر قائم و دائم رہا اس کا بدلہ جنت ہونا چاہیے اور بعد میں جہنم میں داخل کر دیا جائے تا کہ انصاف قائم ہو سکے۔

جواب ۱: مرتد جنت کا مستحق اس وجہ سے نہیں کہ اس نے شریعت مطہرہ سے منہ موڑا ہے اور اللہ اور رسول ﷺ کی اہانت کی ہے اور جس نے اللہ اور اس کے رسول کی اہانت کی تو گویا کہ اس نے جنت اور خدا تعالیٰ کے انعامات کی بھی اہانت کی اب آپ خود انصاف کریں کہ کیا کوئی شخص کسی چیز کی اہانت کرے اور اس کو اس کا مستحق قرار دیا جائے ہرگز نہیں بلکہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس کو جہنم کا مستحق قرار دیا جائے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر مرتد کو جنت کا مستحق قرار دیا جائے تو منافقین کفار و مشرکین پر بھی جنت واجب ہونی چاہیے۔ حالاں کہ ان لوگوں کے لئے قرآن ناطق ہے الھم عذاب الیم۔ کیوں کہ جس طرح مرتدین سے شریعت کو نقصان پہنچتا ہے اسی طرح کفار و مشرکین سے بھی نقصان پہنچتا ہے۔

مردہ

سوال: مردہ کو جلا ڈالنا بہتر ہے دفن کرنے سے کیوں کہ دفن کی صورت میں مردہ کے جسم پر

کیڑے مکوڑے پیدا ہو جاتے ہیں جس سے مردہ کی بے حرمتی عیاں ہوتی ہیں۔

جواب ۱: ہر ایک مردہ کے جسم سے کیڑے مکوڑے نہیں پھیلتے ہیں بلکہ وہ بندہ جو گنہگار ہوتا ہے اسی کے جسم سے کیڑے مکوڑے پیدا ہوتے ہیں۔ اور علماء و صلحاء و حفاظ و انبیاء کرام و شہدائے کرام کے جسم میں کیڑے ہرگز ہرگز پیدا نہیں ہو سکتے، کیڑے مکوڑے تو درکنار بدبو تک نہیں آتی ہے کیوں کہ آپ کو امام بخاریؒ کا واقعہ معلوم ہوگا کہ جب ان کو دفن کیا گیا تو کئی ماہ تک ان کی قبر سے خوشبو آتی رہی اسی طرح حضرت مولانا محمد علی مونگیریؒ کی قبر سے بھی خوشبو آتی رہی۔ پھر اگر کوئی اشکال کرے کہ گنہگار بندہ ہی کو جلا دینا چاہیے تا کہ کیڑے مکوڑے پیدا نہ ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ کیڑے خود بخود پیدا نہیں ہوتے ہیں بلکہ رب کریم کی جانب سے عذاب ہے اور اگر گنہگار بندہ کو یا کسی بھی شخص کو جلا دیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے لہٰذا اس کو جسم دے کر کیڑے مکوڑے پیدا کر دیں گے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر مردے کو جلا دیا جائے تو گویا کہ اس کو دنیا میں عذاب دے دیا گیا حالاں کہ عذاب دینے اور ہٹانے کے مستحق صرف اللہ تعالیٰ ہیں۔

مہذب و حسن اخلاق

سوال: بہت سے غیر مہذب مگر حسن اخلاق ہوتے ہیں۔ لہٰذا باری تعالیٰ کو چاہئے کہ اپنی صفات رحمانیت کے مدنظر انکی بخشش کر دے

جواب: ایک شخص ہے کہ وہ گورنمنٹ کے شاہانہ اقتدار کو مانتا ہے۔ لیکن بدتہذیب بن کر رہتا ہے۔ اور مزید زنا اور طرح طرح کی برائیوں میں مصروف رہتا ہے۔ اور دوسرا شخص ہے کہ وہ شاہانہ اقتدار کو تسلیم نہیں کرتا اور تمام برائیوں سے اجتناب کرتا ہے۔ تو حاکم یہی فیصلہ کریگا کہ جو شخص میرے اقتدا کو تسلیم کرے اور غلط کاریوں میں بھی مصروف رہے تو اس کو بقدر غلط گناہ سزا دے دو۔ اور اس کے بعد میری محبوب رعایا کی صف میں شامل کر دو۔ اور جو شخص میرے اقتدار کو تسلیم نہ کرے اس کو پھانسی یا آگ میں ڈالدیا جائے۔ سامعین کرام! اسی طرح اسلامی قانون بھی ہے کہ جس کے عقائد اچھے نہیں وہ باغی ہیں اگرچہ نماز روزہ کرے۔ بہر حال یہ شخص ہمیشہ کے لئے مردود ہوگا برخلاف وہ شخص کے جن کے عقائد اچھے ہیں لیکن طرح

طرح کی غلط کاریوں میں مصروف رہتا ہے۔ تو اب ان کو جنت میں ضرور بالضرور داخل کیا جائے گا۔ مگر اپنے گناہوں کی سزا پانے کے بعد۔

بہر حال حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے فرمایا کہ جتنے اشکالات مذہب اسلام پر کئے جاتے ہیں وہ سب اشکالات کے جوابات دینوی معاملات میں موجود ہیں۔ (اشرف الجواب: ص: ۳۸۰)

زکوٰۃ زیادتی کا باعث

سوال: زکوٰۃ دینے سے مال کے اندر کمی آتی ہے، حالاں کہ اہل اسلام کا عقیدہ ہے کہ زیادتی ہوتی ہے؟

جواب ۱: یہ ہے کہ مال بڑھنے کی حقیقت اور غرض پر اگر نظر ہوتی تو یہ شبہ نہ ہوتا۔ بہر کیف مال کے بڑھنے سے غرض یہ ہے کہ بڑھتا ہوا مال کام میں آئے۔ چنانچہ اگر کسی کے پاس کروڑوں روپے ہوں اور اس کے کام نہ آئیں بلکہ فضولیات میں ضائع ہو جائیں اور ایک شخص کے پاس دس روپے ہوں لیکن دس کے دس کام آجائیں تو یہ شخص اس سے بدرجہا بڑھ کر ہے۔ سو ہم کھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتے ہیں کہ دو شخص ہیں اور ان دونوں کی برابر آمدنی ہے مگر فرق اتنا ہے کہ ایک زکوٰۃ دیتا ہے اور تمام حقوق واجبہ ادا کرتا ہے سو اس کی زندگی چین و آرام سے گذرتی ہے۔ اور دوسرا شخص جو حقوق ادا نہیں کرتا وہ ہمیشہ پریشان رہتا ہے۔ آج چوری ہو گئی کل کوئی مقدمہ قائم ہو گیا، خود بیمار ہو گیا، بچے بیمار ہو گئے، عطار کے یہاں روپے جا رہے ہیں۔ طبیب کی فیس میں روپے خرچ ہو رہے ہیں۔ بخلاف پہلے اس شخص کے کہ جس قدر آمدنی ہے وہ سب کی سب کام آرہی ہے۔ غرض اللہ تعالیٰ جس قدر لیتے ہیں اس سے زیادہ دیتے ہیں۔ پھر جو لیتے ہیں وہ ہمارے ہی لئے ہیں۔

جواب ۲: دوسرا الزامی جواب ہے کہ ہندو لوگ نہ تو زکوٰۃ کے قائم مقام کوئی عمل کرتے ہیں اور نہ ہی غرباء و مساکین پر خرچ کرتے ہیں بلکہ یہ لوگ ایسے ایسے عمل کرتے ہیں جو عند الناس قبیح ہوں مثلاً ہولی کے تہوار میں ہندو لوگ کافی روپیہ خرچ کر کے رنگ خریدتے ہیں اور بھابھی دیو۔

کو دیور بھابھی کو اور بہن بھائی کو بھائی بہن کے رخساروں پر رنگ ملتے ہیں جس سے قطعی طور پر بے پردگی عیاں ہوتی ہیں۔ لاحول پڑھیں ایسے ایسے عقائد پر۔

اللہ تعالیٰ معشوق ہیں

سوال: تمام انبیاء کرام عاشق اور اللہ معشوق ہیں تو پھر طائف والوں نے جب نبی اکرم ﷺ پر اینٹوں کی بارش برسا رہے تھے تو رب کریم نے ان بارشوں کو کیوں نہ روکا۔

جواب ۱: پہلا جواب تو یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے ان مصائب میں اس لئے مبتلا کیا کہ کیا میرا محبوب میری محبت میں ان مصائب کو داشت کر سکتا ہے یا نہیں۔ یعنی رب کریم کو حضور اکرم ﷺ کی محبت کا اظہار کروانا مقصود تھا۔ چنانچہ رسول اکرم ﷺ نے محبت و عشق کا اظہار کیا۔ اور اول نمبر سے کامیابی حاصل کی۔ چونکہ دنیا کا بھی یہ رسم ورواج ہے کہ معشوق اپنے عاشق کو آزماتا ہے اور طرح طرح کی تکلیف دیتا ہے، اور معشوق عاشق کی گہرائی کو دیکھتا ہے کہ میرا عاشق مجھ سے کتنی محبت کرتا ہے، چنانچہ جب عاشق اپنے معشوق کے تمام مصائب کو برداشت کر لیتا ہے تو اب معشوق سمجھ لیتا ہے واقعی یہ میرا سچا عاشق ہے۔ یہی حال تمام انبیاء کرام کا ہے کہ جملہ انبیا کرامؑ عاشق اور رب کریم معشوق ہیں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ جو دشمنان اسلام ہیں اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ بداعمال کروانا چاہتے ہیں۔ تاکہ اس کو جہنم رسید کیا جا سکے۔

جواب ۳: تیسرا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر اتنی طاقت وقوت بخشی ہے کہ دنیا کے اندر حکم الٰہی کے خلاف اعمال کر لے۔ لہٰذا اسی طاقت وقوت کے تحت دشمنان اسلام انبیاء کرام کے ساتھ برا معاملہ کرتے ہیں۔ لیکن آخرت میں حضرات محبوبین کا مرتبہ بڑھتا ہے اور اشقیاء کا مرتبہ جہنمی ہونے کے اعتبار سے ان کے جہنم کے طبقات بڑھتے ہیں۔

دنیا کافروں کے لئے جنت ہے

سوال: جب اللہ ہر چیز پر قادر ہے تو مسلمانوں کو غیر مسلموں کی سلطنت کیوں نہ دے دی؟۔

جواب ۱: یہ ہے کہ جو چیز نہایت صاف وشفاف ہو اس پر دھبہ ہونا نہایت ناگوار ہوتا ہے اور

جو چیز خود میلی ہو اس پر ناگوار نہیں ہوتا ہے۔ جیسے کہ سفید کپڑوں پر چھینٹ لگ جانے سے اتار کر پھینک دیتے ہیں۔ اور جوتے میں گندگی لگ جانے سے کوئی ناگواری نہیں ہوتی ہے۔ ایسے ہی مسلمان جو دعویٰ محبت کرتے ہیں ان سے ذرا سی بھی بے احتیاطی ناگواری کا سبب بنتی ہے۔ بخلاف اعداء کے کہ وہ جو کچھ بھی کسی اصول پر کریں ان کو دیتے ہیں۔ اگرچہ وہ اللہ کے دشمن ہیں۔ (اشرف الجواب)

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ **الدنیا ھو الجنة للکافرین** ۔ کہ دنیا جنت ہے کافروں کے لئے۔ اور اہل ایمان کے لئے قید خانہ ہے۔ یعنی جو کچھ کافروں کو مزہ لینا ہے وہ صرف دنیا ہی میں لے لے۔ آخرت میں اس کا کچھ بھی حصہ نہیں ،اور آخرت میں اس کے لئے صرف جہنم کی دہکتی ہوئی آگ ہے۔ بخلاف اہل ایمان کے کہ ان کے لئے دنیا قید خانہ ہے اب خود فیصلہ کر لیجئے کہ جس کے لئے کوئی گھر قید خانہ ہو تو کیا وہ اس گھر پر چاہے گا کہ ہماری حکومت ہو ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ ہمیشہ تمنا کریگا کہ ہم یہاں سے کب رخصت ہوں تا کہ آخرت میں طرح طرح کی نعمتیں مہیا ہوگی۔

سوال: جب اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی تقدیر میں لکھ دیا ہے کہ یہ فلاں گناہ کریگا اور وہ فلاں گناہ کریگا تو پھر مجرم کیوں۔

جواب: باری تعالیٰ کو معلوم تھا کہ یہ شخص فلاں فلاں عمل کرے گا جو کے معیوب اور قابل عقاب ہے یعنی رب کریم جانتے ہیں کہ یہ شخص آئندہ ایسا ایسا فعل کریگا جس کا کرنا یقینی اور متحکم ہے۔ تو گویا کہ خود ہی اس نے ایسا ایسا کیا۔ لہٰذا وہ مجرم ہے۔

جواب: دوسرا جواب یہ ہے کہ شاک کے تفہیم سے یہ اشکال اور جواب بالاتر ہے۔ ہاں اگر اشکال کرنے والے مسلم ہوتے تو ان کو اس تقدیر کے معاملے میں نہ پڑنا چاہئے تھا کیوں کہ اس سے حضور اکرم ﷺ نے منع فرمایا ہے۔

زمانۂ میثاق

سوال: **الست بربکم الاعلی قالوا بلیٰ** ۔ اہل اسلام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

تمام ارواح کو درجات میں جمع کر کے اپنی وحدانیت کا وعدہ لیا تھا حالاں کہ آج تک اس بات کا کسی کو پتہ نہیں چلا۔

جواب ۱: پہلا جواب تو یہ ہے کہ پنڈت جی آپ ہمیں یہ بتلایئے کہ آپ نے سیتا اور رام وکھمن کے واقعات کو کیسے جانا؟ تو یقیناً آپ جواب دیں گے کہ کتابوں کے ذریعہ سے اور اب تک کوئی بھی اس کا پتہ نہیں لگا سکا۔ پس اسی طرح میثاق کا حال ہے کہ اس مذکور چیز کی خبر ہمیں متواتر کے ساتھ انبیاء اور کتب عظیم کے ذریعہ معلوم ہوئی ہے اور اس پر ہمارا پختہ عقیدہ بھی ہے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ جب آپ کی والدہ آپ کو جنا تھا تو کیا آپ ان کو پہچان رہے تھے کہ میری والدہ یہی ہے؟ یقیناً آپ کہیں گے کہ ہم نہیں پہچان رہے تھے؛ تو آپ نے والدہ کو پہچانا ہی نہیں پھر بھی بعد العقل آپ کا عقیدہ ہے کہ یہی میری والدہ ہے اور یہی مرے والد ہیں۔ پس اسی طریقے سے خداوند قدوس نے تمام مخلوقات سے وعدہ لیا تھا اور اس وقت کسی کو عقل وشعور نہ تھا البتہ اب انبیاء اور قرآن وحدیث کے ذریعہ معلوم ہو گیا کہ خدا تعالیٰ نے وعدہ لیا تھا۔

مذہب اسلام

سوال: آپ کا مذہب اسلام محض غلامی اور مقید رہنے کو فروغ دیتا ہے یعنی اسلام قبول کرنے کے بعد لوگوں کو طرح طرح کی پریشانیاں ہوتی ہیں۔

جواب ۱: آپ کا تصور، گمان، زعم، فکر، نظر، بالکل غلط ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد انسان پریشان رہتا ہے بلکہ ایمان قبول کرنے کے بعد انسان سکون واطمینان سے زندگی گذارتا ہے چوں کہ جس نے ایمان قبول کر لیا تو اب اس سے نہ کوئی جہاد کرے گا نہ کوئی اس پر سب وشتم کا معاملہ کرے گا اور نہ ہی کوئی الگ تھلگ کرے گا۔ بخلاف جس نے ایمان قبول نہیں کیا ہے اس سے مجاہدین جہاد کرتے ہیں اور حتی کہ غیر مسلموں کو ان کے برے عمل کی وجہ سے قتل وقتال کیا جاتا ہے اس سے یہ معلوم ہوا کہ ایمان قبول کرنے کے بعد سکون ہے نہ کہ پریشانیاں اور نہ غلامیاں۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ ایمان ماخوذ ہے امن اور سلامتی سے جس کے معنی آتے

ہیں بعد الایمان چین کی زندگی گذارنا اور قبل الایمان غلامی اور بے چینی کی زندگی گذارنا۔ بہر حال لغوی اعتبار سے بھی معلوم ہوا کہ اسلام آزادی کو فروغ دیتا ہے اور پریشانیوں کو دور کرتا ہے جیسا کہ رب کریم نے ارشاد فرمایا لا اکراہ فی الدین۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہی وہ مذہب اسلام ہے کہ جس نے تمام خرافات وفسادات کو ہباً منثورا کر دیا اور آنے والی تمام نسلوں کے لئے نصیحت کر دکھایا کہ واقعی یہ مذہب یہ مسلک قابل قبول ہے۔ چنانچہ مذہب کے اندر ایک شعبۂ جہاد بھی ہے جس نے تمام دنیا کو فائدہ تو پہنچایا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ بالخصوص ہندوستانیوں کو بھی غلامیوں کی زنجیروں سے نجات دلوائی جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ چند سال قبل ہندوستان کے اندر انگریزوں کی حکومتیں تھیں اور یہ بد بخت قوم جملہ باشندگان ہند پر ظلم وتشدد کے پہاڑ ڈھا رہے تھے تو اس وقت کسی نے بھی سر نہ اٹھایا صرف اسلام کا ایک شعبہ، شعبۂ جہاد ہی کے ذریعہ سے علماء اسلام نے انگریزوں کو ملک سے بھگایا اور تمام باشندگان ہند کو عافیت ملی۔

خواہ مسلم ہو

خواہ سکھ ہو

خواہ تیلی ہوں

خواہ آریہ سماج ہوں

خواہ ہندو دھرم ہوں

تمام قوموں کو اسی جہاد کے ذریعہ نجات ملی اور بڑی عزت وذلت سے چھٹکارا ملا۔ پس معلوم ہوا کہ تمام مذاہب سے امن واجمل مذہب مذہب اسلام ہے۔

اسم اللہ

سوال: ذات باری تعالیٰ کے لئے اسم لفظ اللہ کو کس نے وضع کیا اگر آپ کہیں گے کہ بندوں نے وضع کیا ہے تو وضع کے لئے ضروری ہے کہ موضوع لا ملتفت الیہ بالذات ہو اور ذات باری بندوں کے لئے ملتفت الیہ بالذات نہیں ہیں لہٰذا بندے بھی وضع نہیں ہو سکتے ہیں پس معلوم ہو گیا کہ ذات باری تعالیٰ کے لئے کوئی اسم وضع نہیں کیا گیا ہے۔

جواب: یہ ہے کہ مسمّی کے لئے معلوم بالکنہ یا بکنہ ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ علم بالوجہ اور بوجہ بھی کافی ہے اور یہاں یہ بات ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کا علم بوجہ اس کی صفات کے ذریعہ ہوگیا ہو اور اس کے بعد اس کے لئے لفظ وضع کر دیا گیا ہو۔

سوال: اللہ مشتق ہے لاہ یلیہ لیہ ولاھا اور اس کے معنی آتے ہیں چھپنے کے جیسا کہ بیضاوی کی عبارت ہے لانہ تعالیٰ محجوب اس صورت میں اللہ تعالیٰ کا مقہور ہونا لازم آتا ہے یعنی وہ غیر کے فعل سے متاثر ہوکر چھپا ہوا ہے۔

جواب ۱: وہ غیر کے فعل سے چھپا ہوا نہیں ہے بلکہ انسان کی بصارت کے اندر اتنی طاقت وقوت نہیں کہ حضرت حق جل مجدہ کو دیکھ سکے لیکن خداوند قدوس ہر ایک شخص کو دیکھ رہے ہیں خواہ بادشاہ ہو یا رعایا، امیر ہو یا غریب، جیسا کہ اس بات پر قرآن ناطق ہے واللہ سمیع البصیر بہرحال ایک واقعہ آپ لوگوں کو معلوم ہوگا کہ خود انسان ابھی مقہور ہے کہ باری تعالیٰ کو دیکھ نہیں سکتے جنت کے اندر رب کریم کا دیدار ہوگا۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ بیضاویؒ کی عبارت محجوب سے مراد محتجب ہے اب کوئی اشکال باقی نہ رہا۔

سوال: والاظھر انہ وصف فی اصلہ (بیضاوی) عبارت کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ صفت ہے تو اب لفظ اللہ کسی بھی انسان کی صفت بن سکتی ہے جس کی وجہ سے نعوذ باللہ باری تعالیٰ کے اندر شرکت لازم آتی ہے؟

جواب: یہ ہے کہ غالباً یہ ذات باری ہی کیلئے اس طور پر مخصوص ہوگیا اور علم کی حیثیت اختیار کرلی تو پھر علم کے قائم مقام ہوگیا امتناع وصف اور عدم احتمال شرکت کے اندر یعنی جس طرح علم کے اوصاف ذکر کئے جاتے ہیں لیکن وہ خود کسی کا وصف نہیں بنتا، اور جس طرح علم شرکت کا احتمال نہیں رکھتا ایسے ہی لفظ اللہ شرکت کا احتمال نہیں رکھتا ہے جیسے کہ الریا اور لفظ الصعق کہ حقیقت میں یہ وصف تھے لیکن غالباً علم ہوگئے اور علم کی حیثیت اختیار کرلی، پس ایسے ہی لفظ اللہ بھی علم ہوگیا اور جب یہ علم کی حیثیت کا یحامل ہوگی تو اب کوئی اشکال باقی نہ رہے گا۔

اللہ کون سی زبان ہے

سوال: لفظ اللہ سریانی لفظ ہے یا عبرانی نیز ان کی اصل کیا ہے؟

جواب: لفظ اللہ کی اصل لاہ ہے الف کے ساتھ اور یہ سریانی لفظ ہے۔ اور بعض لوگوں نے کہا کہ عبرانی لفظ ہے اور ان کی زبان میں الف کے ساتھ بولا جاتا ہے۔ جیسے کہ فارسی زبان میں کہتے ہیں الٰہا۔ بہر حال لاہ کے معنی معبود کے ہیں پھر ان کو عربی بنالیا گیا صورت یہ ہوگی کہ آخر کے الف کو حذف کر دیا اور محض ابتداء کرنے کی وجہ سے شروع کرنے کی وجہ سے الف لام زیادہ کر دیا، ادغام کرنے کے بعد اللہ ہو گیا۔ اور بعض لوگوں نے لفظ اللہ کے سریانی ہونے کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ یہ لفظ قرآن میں موجود ہے۔ اور قرآن میں اکثر کلمات عربی ہیں نہ کہ عجمی۔ لہٰذا بغیر کسی دلیل ظاہر کے لفظ اللہ کو معرب ماننا درست نہیں ہے اور اگر کوئی شاک یہ شک کرے کہ لفظ اللہ اور لاہ میں مشابہت اور مماثلت موجود ہے تو ہم کہیں گے کہ صرف مشابہت کا پایا جانا لاہ کو اصل اور لفظ اللہ کو فرع قرار دینے کے لئے کافی نہیں ہے۔

رحمٰن ورحیم کی تحقیق

سوال: رحمٰن مشتق من الرحمۃ کہ رحمٰن مشتق ہے رحمۃ سے جس کے معنی آتے ہیں رقت قلب اور انعطاف کے اور انعطاف کہتے ہیں نفس کے مائل ہونے کو اور یہ ان کیفیات نفسانیہ میں سے ہے جو مزاج جسمانی کے تابع ہوتی ہے یعنی پہلے مزاج جسمانی کسی اثر کو قبول کرتا ہے اور پھر نفس پر کیفیت طاری ہوتی ہے اب اگر اللہ پر رحمٰن اور رحیم کا اطلاق کرتے ہیں تو باری تعالیٰ کے لئے نفس اور جسم کا ثابت کرنا لازم آئے گا اور یہ بالکل محال ہے لہٰذا رحمٰن اور رحیم کا اطلاق ذات باری پر درست نہیں ہے؟

جواب: یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اوپر ایسے الفاظ کا اطلاق کرنا جو اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے درست نہ ہو تو وہاں ان الفاظ کا اطلاق ذات باری پر ان کی غایات اور آثار کے اعتبار سے ہوتا ہے جو از قبیل تاثیر ہے ان اسباب ومبادی کے اعتبار سے نہیں ہوتا جو از قبیل انفعال وتاثر ہیں مثلاً لفظ رحمت اس کے معنی رقت قلب کے ہیں اور یہ مبتداء اور سبب ہے مگر

ان کا اثر انعام واحسان ہے۔ مبدأ تو از قبیل انفعال ہے اور اثر از قبیل تاثیر ہے پس جب رحمت کا اطلاق ذات باری پر ہوگا تو انعام کے معنی کے اعتبار سے ہوگا۔ اور رحمٰن کے معنی منعم کے ہوں گے اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ رحمٰن اور رحیم کا اطلاق ذات باری پر بطور مجاز مرسل یا استعارہ تمثیلیہ کے ہیں پہلا یعنی مجاز مرسل راجح ہے مجاز مرسل کہتے ہیں سبب بول کر مسبب مراد لیا جائے یہاں پر بھی یہ بات موجود ہے کیوں کہ رحمت جو سبب ہے وہ بول کر مسبب مراد لیا انعام واحسان کو جو مسبب ہے اور استعارہ تمثیلیہ کہتے ہیں ایک ہیئت منتزعہ کو دوسری ہیئت منتزعہ کے ساتھ تشبیہ دینا اور جو لفظ ہیئت مشبہ بہ کے لئے استعمال کیا اس کو ہیئت مشبہ کے لئے استعمال کرنا اور یہاں پر استعارۂ تمثیلیہ کی صورت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے معاملہ کو جو ان کے بندوں کے ساتھ ہے یعنی انعام واحسان کرنا اور ان سے تکالیف کو دور کرنا اس معاملہ کو تشبیہ دی گئی ہے اس بادشاہ کے معاملہ کے ساتھ جو وہ اپنی رعایا کے ساتھ کرتا ہے جب کہ اپنی رعایا پر نرم ہوتا ہے اور ان پر انعام واحسان کرتا ہے اور ان کی تکالیف کو دور کرتا ہے تشبیہ دینے کے بعد مشبہ بہ کے لئے جو الفاظ رحمت استعمال ہوتے تھے وہ مشبہ ذات باری کے معاملہ کے لئے استعمال ہونے لگے اور اس کے نتیجے میں اللہ کو رحمٰن اور رحیم کہنا درست ہے۔

سوال: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یعنی بسم اللہ الخ کے اندر رحمن کو مقدم اور رحیم کو مؤخر کیا جو بالکل قاعدۂ کلیہ کے خلاف ہے کیوں کہ قاعدہ ہے ترقی من الادنی الی الاعلیٰ کہ ادنی سے اعلیٰ کی طرف ترقی کی جائے حالاں کہ مذکورہ بسم اللہ الخ کے اندر ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ کے بجائے ترقی من الاعلیٰ الی الادنیٰ کیا گیا ہے جو کہ خلاف قانون وقواعد ہے؟

جواب ۱: اس اشکال کا جواب بہت سارے دیئے گئے ہیں پہلا جواب تو یہ ہے کہ رحمٰن زیادتی بحسب الکمیت کے اعتبار سے رحمت دنیا پر دلالت کرتا ہے اور رحمت دنیا وجود کے اعتبار سے مقدم ہے رحمت آخرت پر لہٰذا اس کے لفظ دال یعنی رحمٰن کو بھی ذکراً مقدم کر دیا تا کہ دال کا وجود ذکری مطابقی ہو جائے مدلول کے وجود طبعی کے۔

جواب ۲: دوسرا جواب یہ ہے کہ رحمٰن کو اللہ کے ساتھ زیادہ مشابہت ہے کیوں کہ غیر اللہ اس کے ساتھ قطعاً متصف نہیں ہوتا، جس طرح کہ اللہ کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہوتا اس مناسبت کی وجہ سے رحمٰن علم کی حیثیت میں ہو جاتا ہے اور چوں کہ علم مقدم ہوتا ہے وصف پر اس لئے رحمٰن کو مقدم کر دیا رحیم پر۔ بخلاف رحیم کے کہ اس کا اطلاق غیر اللہ پر بھی ہوتا ہے چنانچہ حضور اکرم ﷺ کے لئے رحیم کا لفظ ''بالمؤمنین رؤف رحیم'' کے اندر استعمال ہوا ہے۔ رہی یہ بات کہ رحمٰن کا اطلاق غیر اللہ پر کیوں نہ ہوتا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ رحمٰن کے معنی ہیں اس منعم حقیقی کے جو انعام کے انتہائی کمال کے درجہ کو پہنچا ہوا ہو اور ہم دیکھتے ہیں کہ یہ معنی غیر اللہ پر صادق نہیں آئے لہٰذا رحمٰن کا اطلاق غیر اللہ پر نہیں ہو سکتا ہے اب رہی یہ بات کہ یہ معنی غیر اللہ کے اندر کیوں نہیں پائے جاتے تو اس کا جواب سننے سے پہلے منعم حقیقی اور انعام کے درجہ کمال کے معنی سمجھ لیجئے، منعم حقیقی اس منعم کو کہتے ہیں جو خالص اپنی ذاتی نعمتیں دیتا ہو انعام کرنے میں واسطہ نہ ہو اور انعام کا درجہ کمال یہ ہے کہ انعام کر کے اس کے بدل کا خواہاں نہ ہو۔

اب سنئے درجہ کمال اس لئے پایا جاتا ہے کہ بندے لطف و انعام کر کے اس کے عوض کے متمنی رہتے ہیں اب بدل کی دو قسمیں ہیں۔ ۱- جلب منفعت (۲) دفع مضرت۔ پھر جلب منفعت کی دو صورتیں ہیں یا تو آخرت سے متعلق ہوگا یا دنیا سے، بندے ان چاروں قسموں کے بدل کے خواہاں ہیں لیکن رب کریم انعام کرنے کے بعد بدل کے خواہاں ہرگز نہیں۔ پس رحمن اور رحیم کے درمیان امتیازی فرق **کالشمس علی نصف النهار** ہو گیا۔

چند علمی حقائق و دقائق

نتیجۂ اوّل

اسلام نے جس سلطنت اور خلافت کی بنا قائم کی اس میں مشورہ کی یہ قدر و قیمت تھی کہ خلیفہ المسلمین کوئی رائے قائم کرنے کے واسطے مسلمانوں کے عام و خاص افراد سے مشورہ طلب کرتے ہیں مشورہ دینے میں بھی ہر شخص آزاد ہے۔ ہر شخص اطمینان سے کھڑا ہو کر بے دھڑک رائے ظاہر کرنے کا مختار ہے خلیفہ کثرت رائے پر ایک جانب کو ترجیح دیتے ہیں جیسا کہ اوّل مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خود میدان جنگ میں تشریف لے جانے کا فیصلہ کثرت رائے پر کر دیا اور کبھی قوت دلیل پر جیسا کہ اس معاملہ میں حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے کو تسلیم کر کے عمل پیرا ہوئے اور کثرت رائے کو جس میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی رائے بھی شامل تھی جو گویا بمنزلہ ولی عہد خلافت سمجھے جاتے تھے ترک کر دیا علاوہ خاص اس واقعہ کے حضرت عمرؓ کا عام قاعدہ یہی تھا کہ جب کوئی امر پیش آتا تھا اس میں اسی طرح آزادی کے ساتھ مشورہ فرماتے تھے خلافت راشدہ کے طرز عمل سے ہم کو چند فائدے حاصل ہوئے۔

الف۔ سلطنت کے اس طرز کی بنیاد اسلام نے ڈالی آج کل کی متمدن لڑائی نہیں ہوئی۔ پایۂ تخت مدائن پر تو کچھ مقابلہ ہی نہیں ہوا کیوں کہ ساٹھ ہزار جمعیت کو بے خوف و خطر دجلہ عبور کرتے دیکھ کر عجمیوں کے حواس باختہ ہو گئے تھے اور ان کو سوائے فرار کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا البتہ نہاوند کا معرکہ جس کو ایک فارس کی آخری کوشش کہنی چاہیے بہت سخت تھا مگر ساز و سامان اور بعض خاص وجوہ سے وہ بھی قادسیہ سے دوسرے ہی درجہ پر تھا بہر حال دارالسلطنت میں تخت شاہی پر جلوہ افروز تھے افواج تازہ دم میدان جنگ میں پہنچ کر داد شجاعت دینے کے لئے مضطرب و بے قرار تھیں ہر قسم کے سامان حرب سے مکمل آراستہ و پیراستہ تھے۔ پایہ تخت سے میدان جنگ تک کا ایسا مکمل انتظام کیا گیا تھا کہ تار برقی کے بعد

اگر کوئی ذریعہ جلد خبر رسانی کا ہوسکتا ہے تو وہی ہے سپاہیوں کو اتنا قریب قریب کھڑا تھا کہ ایک دوسرے کی گفتگو اور آواز کو بے تکلف سن لے اس طرح میدان جنگ، پایہ تخت تک آن کی آن میں جزوی وکلی امور کی اطلاع پہنچتی تھی اور اسی طرح پایہ تخت سے ہدایات واحکام کا سلسلہ جاری تھا رستم نے مسلمانوں کو پیس ڈالنے کے واسطے ممکن سے ممکن ذرائع سے کام لیا اپنی فوج کو مکمل تربیت دے کر قلب میں تخت پر متمکن ہوا اور گرد وپیش اٹھارہ زرہ پوش ہاتھیوں کو ترتیب سے کھڑا کیا جن کی محفوظ مضبوط عمارتوں میں اوّل درجہ کے بہادر سوار تھے اس کے بالمقابل عرب کے پاس یہ سامان کہاں تھا ایک لاکھ تیس ہزار نبرد آزما کے مقابلہ کے لئے تیس ہزار فوج تھی عربی گھوڑے اور پارلیمانی سلطنتیں تھیں اس سے زیادہ بہتر اور آزاد طریقہ نہیں کرسکیں۔

ب۔ کسی جانب کثرت رائے کا ہونا صواب اور مطابقت واقعہ کی ضمانت نہیں ہوسکتا اور یہ ضرور ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے اہل مدار قوت دلیل پر ہے ممکن ہے کہ قلیل التعداد راویوں کی دلیل قوی ہو اور اسی جانب حق بھی ہو اور اسی میں بہتری اور کامیابی بھی مضمر ہو۔

شوریٰ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ موافق ومخالف رایوں کے پہلو واضح اور ظاہر ہوجائیں ان میں سے کسی ایک جانب کو ترجیح دینا ممبر کا کام ہے اور یہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرح عقل ودانائی فراست وتجربہ کامل اور کسی قسم کی آرائش دنیا اور غرض ساتھ لگی ہوئی نہ ہو خاص وعام کو ان کے انتخاب وترجیح پر اطمینان ہو چنانچہ صحابہؓ کے طرز عمل سے یہ بات واضح ہوگئی کہ باوجود کثرت رائے جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس رائے کو ترک فرمایا کسی نے اس سے انکار نہیں کیا کیوں کہ آپ کی عقل وتدبیر تجربہ اور خیر خواہی اسلام اور سب سے بڑھ کر آپ کی فراست وشان محدثین پر سب کو کامل اطمینان تھا۔ البتہ اگر خلیفہ وقت یا صدر مجلس اس درجہ کا نہ ہو اور مسلمان کسی ایک رائے پر متفق نہ ہوسکیں تو اختلاف ونزاع کو رفع کرنے کا بہترین طریقہ کثرت رائے ہے اس زمانہ میں بھی اگر صدر مجلس حضرات صحابہ کا سچا جانشیں ہو۔ اپنے اندر عقل وتدبیر تجربہ ودانش مندی ہمدردی واخلاص لئے ہوئے نور یقین وفراست ایمانی سے مزین ہو۔ اور باوجود اختلاف رائے کے مسلمان اس کی بات پر اعتماد واطمینان کرسکتے ہوں یا کسی معاملہ میں قلت رائے کی تائید قرآن وحدیث کی کسی صحیح مرجح فیصلہ سے ہوئی تو کثرت رائے قابل اعتماد نہیں ہے ورنہ درصورت اختلاف ونزاع

کثرت رائے سے ایک جانب کو ترجیح دی جاسکتی ہے مشورہ دینے اور رائے ظاہر کرنے کا بہترین طریقہ یہی ہے جو صحابہ رضی اللہ عنہم کا تھا ہر شخص آزادی سے اپنی رائے دیتا تھا لیکن کسی کو اپنی رائے پر اصرار نہ تھا اس کی رائے کے خلاف جو فیصلہ ہوتا تھا اس پر ایسی ہی خوشی سے عمل کرتا تھا جیسا اس وقت عمل کرتا جب کہ اس رائے پر فیصلہ ہوتا۔

نتیجہ دوم

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو ہدایتیں حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو فرمائیں ان کو دیکھنے سے ہم کو بہت اہم اور ضروری فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

الف- صحابہؓ باوجود ان تمام کمالات واوصاف حسنہ اور مقبولیت اپنے کسی عمل صالح پر فخر وکبر نہیں کرتے تھے۔ وہ ہر وقت رضائے الٰہی کے طالب اور اس کے خلاف سے خائف رہتے تھے۔

ب- صحابہ میں ایک سے ایک اعلیٰ برتر وفائق موجود تھے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے فرائض کو کسی پر بھروسہ کر کے ترک نہ فرماتے تھے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو باوجود کہ عشرہ مبشرہ میں سے تھے مناسب مقام اور موقعہ پر پوری پوری نصیحتیں فرمائیں۔ جس سے ہم کو دو باتیں حاصل ہوئیں۔

اوّل یہ کہ خلیفہ اور سلطان وقت کو اپنے فرائض کے ادا کرنے میں پوری بیدار مغزی سے کام لینا چاہیئے۔ اگر اس خیال پر کہ دوسرا شخص واقف کار ہے سکوت کیا جائے۔ کبھی اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوسکتے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ **أریتم ان استعملت علیکم خیر من اعلم ثم امرته با لعدول اقضیتُ ما عَلیّ قالو نعم قال لا. حتیٰ انظر فی عمله اعمل بما امر ته ام لا۔**

اگر میرے علم کے موافق سب سے بہتر شخص تم پر امیر بنا کر عدل وانصاف کی ہدایت کردوں تو میں اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔ سب نے عرض کیا بے شک ہو جائیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اتنی سی بات سے سبکدوش نہیں ہوسکتا۔ یہ دیکھنا بھی میرا فرض ہے کہ اب وہ ہدایت پر عمل کرتے ہیں کہ نہیں۔ دوم یہ کہ باوجود عالم وواقف ہونے کے جلیل القدر حضرات سے بھی کسی ابتلا ذہول یا نسیان یا فروگذاشت ممکن ہے۔ اس لئے ان کو تنبہ کرتے رہنا لوازمات میں سے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بھی یہی طریقہ تھا کہ جن صحابہ

پر آپ کو ہر طرح کا اطمینان تھا ان کا امتحان بھی لیا کرتے تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب شام کا سفر کیا تو امیر شام حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہم کو اپنے گھر لے چلو۔ انہوں نے فرمایا کہ آپ وہاں جا کر کیا کریں گے۔ رونے کے سوا اور کچھ نہ ہوگا۔ مگر آپ ان کے اصرار پر لے گئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ تمہارا اسباب کہاں ہے۔ تم امیر شام ہو تمہارے پاس تو سواء ایک نمدہ اور لکڑی کی رکابی اور مشکیزہ کے کچھ بھی نہیں۔ کچھ کھانے کی چیز ہو تو لاؤ۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے روٹی کے سوکھے ٹکڑے لا کر سامنے رکھ دیئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو پڑے۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ آپ وہاں جا کر روئیں گے ہم کو زیادہ سامان کی کیا ضرورت ہے۔ اتنا ہی کافی ہے۔ جو اصلی قیام گاہ یعنی آخرت تک پہنچا دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔۔

غیر تنا الدنیا کلنا غیرک یا ابا عبیدہ۔

ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دنیا نے ہم سب کو متغیر کر دیا مگر تم پر اثر نہیں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی جانچنا تھا اس زہد میں۔ جو بہ برکت صحبت حضو اقدس ﷺ حاصل ہوا ہے۔ کچھ کمی تو نہیں آ گئی مگر اس ظاہری طور پر دیکھ لینے کے بعد بھی آپ غافل نہ رہے۔ پھر بھی مخفی طور پر اس کی جانچ ضرور کی کہ دنیا کی طرف کسی درجہ میں بھی التفات ہے یا نہیں؟ ایک مرتبہ آپ نے ان کی خدمت میں چار سو دینار اشرفیاں بھیجیں اور قاصد سے کہہ دیا کہ یہ دیکھ کر آنا کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے قاصد کے سامنے ہی سب اشرفیاں اہل حاجت کو تقسیم کر دیں۔ ایک بھی نہ رکھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کچھ تھوڑا سا رکھ لیتے تو کسی درجہ میں طمع دنیا کی بات نہ تھی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس پر گرفت کر سکتے تھے۔ خود ہی بھیجا تھا۔

اس لئے سب کا سب رکھ لیتے تو کیا بن جاتا؟ مگر وہاں تو فی الحقیقت دل میں دنیا کے لئے کچھ بھی جگہ نہ تھی۔ عمال اور والیوں کی نگرانی سیاست کے اصول میں سے ہے کہ۔ الحزم سوء الظن ۔ کا مطلب بھی معلوم ہو گیا یہ ضروری نہیں کہ دانش مند خواہ مخواہ بدگمان ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو متہم سمجھتا ہے۔ بلکہ اپنی بیدار مغزی سے معاملہ ایسا کرتا ہے جیسا بدگمانی کی حالت میں کیا جائے۔

ج- صحابہ کے علوم نہایت عالی اور غامض تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ہدایات میں سلطنت اور سیاست کا شریعت وحقیقت کے نہایت دقیق علوم کا بھی چند لفظوں میں دروازہ کھول دیا اور یہیں سے ہم کو یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ صحابہؓ ہر ایک بات میں اعلیٰ وبرتر وفائق ہیں۔ کوئی کسی درجہ تک پہنچ جائے۔ مگر شریعت وطریقت حقیقت ومعرفت میں ان کی مساوات نہیں کرسکتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ۔ حامد و ذام۔ حق کے معاملہ میں سب یکساں ہوں۔

کہنے اور سننے میں دو لفظ ہیں مگر فی الواقع شریعت وطریقت کا خلاصہ یہی ہے کہ کوئی شخص اس مقام تک نہیں پہنچ سکتا جب تک کہ سوائے رضائے الٰہی اور طلب حق اس کے قلب میں کسی امر کی گنجائش نہ رہی ہو۔ جب تک غیر خدا کا کچھ بھی لگاؤ ہوگا کبھی اس مرتبہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ اہل تصوف کا کام ریاضیات وغیرہ ہے۔ ایک مرتبہ شیخ العرب والعجم قطب عالم حاجی امداد اللہ صاحب قدس سرہٗ نے مکہ معظمہ سے اپنے خلیفہ خاص حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا رشید احمد صاحب قدس سرہ کو تحریر فرمایا کہ:

''عرصہ سے آپ نے اپنے خیالات تحریر نہیں فرمائے اس کے جواب میں حضرت مولانا نے بہت ہی اظہار ندامت واعتراف تحقیر کے بعد نہایت مختصر لفظوں میں تحریر فرمایا کہ اپنے اندر چند باتیں پاتا ہوں۔ ان میں ایک یہ بھی تھی کہ مادح وذام یکساں ہیں جس روز یہ جواب حضرت حاجی صاحبؒ کی خدمت میں پہنچا تو حاضرین مجلس کا بیان ہے فرط مسرت سے حضرت پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی اور بار بار فرماتے تھے کہ یہ باتیں کس کو نصیب ہوتی ہیں؟ جن لوگوں کو حضرت مولانا کی کفش برداری کا موقعہ ملا وہ خوب جانتے ہیں کہ مولانا کا اصلی اور بے تکلف حال یہی تھا جو تحریر فرمایا کسی کی مدح وذم سے ذرا بھی متغیر نہ ہوتے تھے اور امر حق کے اظہار میں کسی کی پرواہ نہ کرتے تھے اور یہی اظہار حق اور تصلب فی الدین ہے جو علمائے ربانیین کو صحابہؓ سے ورثہ میں ملا ہے جس کا نام تعصب وتنگ خیالی رکھا گیا''۔

نام ونمود کی طلب نیک نامی ونام آوری خواہش وجاہت کی تحصیل محبوب خلائق بن

جانا مذموم اور غیر پسندیدہ یا خلاف شرع معلوم ہوتے ہیں اور ظاہر ہے بھی ایسا ہی ہے کیوں کہ کوئی شخص جب تک مدارات خلق نہ کرے اور امور شریعت میں مداہنی نہ بنے کبھی لوگوں میں مقبول اور عام خلائق کے نزدیک محبوب نہیں بن سکتا لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے روشن اقوال کے اس قاعدہ کلیہ کو بھی بتلا دیا۔

آپ نے اوّل تو ارشاد فرمایا کہ حق گوئی میں حامد وذام برابر ہوں اور ظاہر ہے کہ اس حالت میں کوئی شخص محبوب عام نہیں ہوسکتا اور پھر آگے ارشاد فرماتے ہیں کہ تم محبوب بننے سے اعتراض مت کرو اور اس کو خلاف دیانت نہ سمجھو بظاہر تو یہ جملہ اوّل ارشاد کے تعارض ومخالف ہے مگر حقیقت میں کچھ اختلاف نہیں ہے آپ نے اس کو بالکل صاف کر دیا حاصل ارشاد یہ ہے کہ وجاہت مقبولیت کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ حق کو چھپا کر اور لوگوں کی رضا کو حق پر مقدم سمجھ کر حاصل کیا جائے یہ بالکل مذموم اور حرام ہے اسی کی مذمت آتی ہے یہ درجہ مقبولیت کا عوام الناس میں حاصل ہوتا ہے خواص کے قلب میں ایسے شخص سے بجائے محبت کے نفرت ہوتی ہے ایسی وجاہت کو انبیاء علیہم السلام اور خواص نے ہرگز طلب نہیں کیا اور نہ اپنے لئے کسی درجہ گوارہ کیا دوسرا یہ کہ اعمال صالحہ اور اتباع شریعت کے ذریعہ سے خداوند عالم کا محبوب ومقبول بن جائے اور اس ذریعہ سے محبوب خلائق بنے کیوں کہ حق تعالیٰ جس کو مقرب بناتا ہے اس کو مخلوق میں محبوب ومقبول بنا دیتا ہے چنانچہ ایک حدیث شریف میں وارد ہے۔

عن ابی هريرةؓ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم فقال ان الله اذا احب عبداً دعا جبرئيل فقال انى احب فلانا فاحبه قال فيحبه جبرئيل ثم ينادى فى السماء فيقول ان الله ..... فلانا فاحبوهُ فيحبه اهل السماء ثم يوضع له القبول فهى الرض. (رواہ مسلم)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ فرمایا رسول اللہ..... نے اللہ تعالیٰ جب کسی بندہ کو دوست رکھتا ہے تو جبرئیل امین سے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم فلاں بندہ کو محبوب سمجھتے ہیں تم بھی اس سے محبت کرو جبرئیل خود محبت کرنے لگتے ہیں اور آسمان میں منادی کر دیتے ہیں کہ فلاں شخص خدا کا محبوب ہے تو اس سے آسمان والے محبت کرنے لگتے ہیں اور پھر وہ زمین میں مقبول بن جاتا ہے اس سے معلوم ہوگیا کہ مقبولیت کا اصلی طریقہ مقبولیت خواص کی ہے اور یہی پسندیدہ اور محمود ہے۔ كان عند الله وجيهاً۔

اللہ کے یہاں صاحب وجاہت ہیں میں اسی درجہ کی مدح فرمائی اور واجعلہ رب رضیا اے اللہ اس کو پسندیدہ اور مرضی بنادے میں اسی درجہ کی طلب کی ہے۔ ان دونوں درجوں کو پہچاننے کی علامت وہی ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمائی کہ اگر اہل اللہ اور خواص میں محبت ومقبولیت ہے اور یہی محبت عوام تک سرایت کر جائے تو بے شک قابل مدح وشکر ہے ورع قابل مذمت اکثر دنیا طلب علما اور مشائخ کی مقبولیت قسم اوّل کی ہوتی ہے اور علماء ربانیین کی قبولیت قسم ثانی کی۔

نتیجہ سوم

ان تمام اوصاف کمالات کے ساتھ جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ میں بدرجہ اتم موجود تھے آپ کے اندر شان فراست خاص امتیاز لیے ہوئے تھی جس کے بارے میں جو فراست ظاہر کی کبھی اس کے خلاف نہ نکلی، قبیلۂ سکون بھی منجملہ دیگر قبائل کے جوش اور اخلاص کے معرکہ کارزار کی طرف قدم بڑھاتا ہوا چلا جاتا ہے لیکن آپ کے سامنے گذرے تو بجائے خوش ہونے کے آپ منقبض ہو گئے اور اس انقباض کا اثر ہمیشہ قبیلہ سکون کے ذکر پر ظاہر ہوتا رہا اور یہ صرف اس وجہ سے کہ آپ نے اپنی شان فراست سے اس قبیلہ میں فتنہ پردازی کا مادہ محسوس فرمایا اور یہ آپ کی فراست بالکل صحیح اور سچی تھی بڑے بڑے مفسدوں اور اسلام میں سخت رخنہ ڈالنے والوں کا معدن یہی قبیلہ تھا جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس خاص امتیازی شان کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے۔

عن ابی هریرة رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ لقد کان فیما قبلکم من الامم محدثون فان یک فی امتی احداً فانه عمرؓ. متفق علیه.

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ فرمایا رسول اللہ ﷺ نے پہلی امتوں میں صاحب الہام وفراست ہوتے تھے میری امت میں ایسا کوئی ہے تو عمر ہے اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس فضیلت خاصہ میں امتیاز واختصاص ضرور تھا۔

ف۔ کوئی شخص الفاظ حدیث سے یہ نہ سمجھے کہ حضور انور ﷺ کو اس امت میں کسی صاحب فراست الہام ہونے میں تردد تھا یہ بات وہ شخص کہہ سکتا ہے جو اردو اور عربی محاورے سے بالکل ناواقف ہو اس طرز ادا میں اظہار تردد نہیں ہوتا بلکہ جس شخص کی نسبت اس بات حکم ہے

اس کی نسبت متفق اور تاکید کا اظہار ظہور ہوتا ہے مثلاً یوں کہا جائے کہ دنیا میں اگر کوئی سخی ہے تو حاتم ہے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا بھر میں سوائے حاتم کے اور کوئی سخی نہیں ہے یا دنیا میں کسی سخی کے موجود ہونے میں تردد ہے بلکہ حاتم کے بالیقین اوصاف سخاوت سے متصف ہونے کو ثابت کرنا ہے۔ واقعات وحالات تاریخی کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قدر وسیع اور طویل وعریض ملک میں جس کا انتظام آپ کے مبارک ہاتھوں میں تھا اور انتظام بھی صرف ایک قسم کا نہیں بلکہ ایک طرف معرکہ کارزار میں فوجیں بھیجنے اور افسروں کو نامزد کرنے اور مواقع جنگ متعین کرنے کا ہے تو دوسری جانب ملکی اور عدالتی یا رفاہ عام شہروں کے آباد کرنے سڑکوں کو نکالنے پلوں کے بنانے اور نہروں کے جاری کرنے کا وغیرہ وغیرہ جس بارے میں آپ نے جو فراست ظاہر فرمائی وہ بالکل ہو بہو صحیح نکلی ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ اہل حمص نے بارگاہ خلافت میں اپنے والی سعید ابن عامر کے خلاف شکایات پہنچائی آپ نے سن کر فرمایا الٰہی میری فراست سعید ابن عامر کے بارے میں غلط نہ نکلے سعید ابن عامر کو مدینہ میں طلب کر کے ان لوگوں سے فرمایا تم اپنی شکایات بیان کرو عرض کیا پہلی شکایت یہ ہے کہ ہر روز بہت دن چڑھے برآمد ہوتے ہیں سعید ابن عامر نے جواب دیا کہ بے شک صحیح ہے میرے پاس کوئی خادم تو ہے نہیں خود ہی آٹا گوندھ کر روٹی پکاتا ہوں اور وضو کر کے باہر نکلتا ہوں فرمایا اور کیا شکایت ہے۔ عرض کیا دوسری یہ کہ رات کو کسی کی بات نہیں سنتے سعید بن عامر نے جواب دیا میں اس بات کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا مگر اب مجبوراً عرض کرنا پڑا میں نے دن تو ان لوگوں کے لئے خاص کر دیا ہے اور رات اللہ کے واسطے خاص رکھی ہے فرمایا اور کیا شکایت ہے عرض کیا تیسری یہ کہ مہینہ میں ایک دن بالکل برآمد نہیں ہوتے سعید ابن عامر نے عرض کیا صحیح ہے خادم نہ ہونے کی وجہ سے مجھے خود ہی اپنے کپڑے دھونے پڑتے ہیں مہینہ میں ایک روز اس کام کے واسطے مقرر کر لیا ہے آپ نے فرمایا خدا کا شکر ہے میری فراست غلط نہ نکلی اہل حمص سے فرمایا جاؤ اپنے والی کی قدر کرو۔

نتیجۂ چہارم

عراق کے پاس عظیم الشان معرکہ میں تیس ہزار سے کچھ زیادہ اسلامی لشکر تھا جن میں کا ہر ایک فرد تہذیب وشائستگی اخلاص ہمدردی دانش مندی وحسن تدبیر شجاعت ومردانگی کا مجسم

نمونہ تھا کسی ایک فرد سے بھی اس طویل معرکہ میں ابتداء سے انتہاء تک کوئی ایک حرکت سرزد نہیں ہوئی جس سے مسلمانوں پر بدنما دھبا لگتا بلکہ ان کی ہر ہر ادا سے اسلامی خلافت کا سکہ مخالفوں کے دلوں پر بیٹھتا جاتا تھا ہر ایک بات سے معلوم ہوتا ہے کہ جو بات منہ سے نکالتے ہیں پہلے سے سوچے ہوئے اور مشورہ کر کے طے ہوئی ہے جو انداز اختیار کرتے ہیں اس سے مخالف پر رعب پڑتا اور اسلام کی برتری کا ثبوت ہوتا ہے وہ ملک فتح کرتے تھے تو مفتوح قوموں کی حالت ابتر سے بہتر ہو جاتی تھی۔ کسریٰ اور رستم کے دربار میں ہر ایک سفیر نے اپنے اپنے نمبر پر جو بات کی مناسب وقت اور تدبیر و فراست سے لبریز کی جس سے درباری اور عام رعایا تو کیا خود رستم مرعوب ہو گئے کہ اگر اپنے گھوڑے کو قیمتی فرشوں سے گذارتے ہوئے یا بیش قیمت قالینوں سے اپنے نیزہ سے پھاڑتے ہوئے مسندوں سے باگ ڈور باندھنے اور مکلف فرش کو اٹھا کر خود زمین پر سمیٹنے سے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ ساز و سامان ہماری نظروں میں نہایت حقیر اور غیر قابل التفات ہیں اور ان نمائش سامانوں سے ہم پر کچھ اثر نہیں پڑ سکتا تو دوسرے سفیر مغیرہؓ نہایت استغناء سے گذرتے ہوئے رستم کے برابر تخت پر جا بیٹھے ہیں۔ اور اہل فارس ان کو کھینچ کر نیچے اتارتے ہیں۔ تخت پر بیٹھنے سے اپنے لئے مساوات یا برتری کا ثبوت دینا مقصود نہ تھا۔ اور نہ اپنے لئے وہ باعث عزت سمجھتے تھے۔ بلکہ وہ جانتے تھے کہ مجھ کو تخت و تاج دیا جائے گا مگر وہ اپنی فراست و روشن ضمیری تدبیر و دانائی سے اول ہی مرحلہ میں سمجھ لیتے تھے کہ اس طرح بے ڈھرک جا بیٹھنے سے اس فوق العادت مرات کو دیکھ کر وہ مرعوب ہو جائیں گے۔ اور جو وہ مجھ کو تخت سے اتار دینگے تو یہ ظاہر کرنے کا موقع مل جائے گا کہ اسلام اس تفاوت و امتیاز کو جائز نہیں رکھتا جو فارس میں مروج ہے کہ حکام امراء و رعیت کو بمنزلہ غلام کے سمجھتے اور خود خدا بن کر بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ب۔ درباریوں پر رعب چھا گیا اور اہل فارس کے دلوں میں اسلام کی محبت کا بیج جم گیا اور رعایا جزئیت و مساوات کے تحصیل کے لئے اسلام کے حلقہ اثر میں داخل ہونے کے واسطے بے تاب ہو گئی اور رستم بول اٹھا کہ اس گفتگو کے سننے کے بعد رعایا کبھی ہماری مطیع نہ رہے گی امراء فارس گھبرا کر کہنے لگے کہ خدا برا کرے، ہمارے اسلاف کا جنہوں نے فارس میں اس تغوف و امتیاز کی بنیاد ڈالی جس کا خمیازہ آج بھی ہم کو بھگتنا پڑتا ہے دونوں سفیروں کی ادائیگی گہری پالیسی اور اعلیٰ تدبیر و ہوشمندی کا نتیجہ تھیں۔

پہلے دن کے طرز عمل نے یہ اثر ڈالا کہ انسان کی برتری ان سامانوں سے نہیں ہے بلکہ ان کا مدار اعلیٰ اخلاق اور شریفانہ معاملات اور سب سے بڑھ کر اپنے خالق و مالک کے ساتھ ربط و کامل انقیاد سے ہے ولی اگر ان کمالات سے معمور ہے جو ایک انسان میں ہونی چاہئیں تو ان نمائشی سامانوں کی ضرورت نہیں اور اگر بجائے انسانی کمالات کے وحشیانہ اخلاق بھرے ہوئے ہیں تو یہ سامان کچھ کارآمد نہیں ہیں تو دوسرے دن کے معاملے نے اسلامی قوانین حریت و مساوات وغیرہ کا سکہ دلوں پر بیٹھا دیا۔ اہل فارس خود سمجھ گئے کہ ہم ابتر اور ذلت کی حالت میں زندگی کے مراحل طے کر رہے تھے۔ اگر انسانیت اور آزادی کا لطف ہے تو صرف مسلمانوں کی اطاعت اور ان کے زیر اثر آجانے میں۔ رستم نے سفراء اسلام کو بار بار اس لئے بلایا تھا کہ ان کی گفتگو سے امراء دربار متاثر ہو کر میرے ہم خیال بن جائیں۔ مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا مگر سفیر اپنا کام کر گئے ان میں سے ہر ایک جو بات کہتا تھا یا جو معاملہ کرتا تھا اس سے نہ صرف رستم اور درباری مرعوب و متاثر ہوتے تھے بلکہ عوام میں اسلام اور مسلمانوں کی محبت بیٹھتی چلی جاتی تھی۔

ایک ایسی قوم سے جس کو وحشیانہ اور بدویانہ زندگی بسر کرتے ہوئے صدیاں گذر گئی ہوں جنکی تنگ دستی اور فاقہ مستی ضرب المثل ہو۔ جو ہمیشہ فارس اور روم کے غلام بنے رہے ہوں۔ کسریٰ و رستم کی بھی بروقت گفتگو نے ان کی اسی حالت کو یاد دلا کر شرمندہ کرایا اور طمع زور دے کر ٹال دینا چاہتے ہوں یہ امر نہایت تعجب انگیز ہے کہ دشمن کے ملک میں فاتحانہ حیثیت میں داخل ہو کر بھی کسی پر چیرہ دستی نہ کریں فقر و فاقہ کی تکلیف اٹھاتے ہوئے ایسے سرسبز ملک میں پہنچیں اور کوئی چیز خلاف قانون لینا گوارہ نہ کریں بلکہ اپنی ہر ادا سے ثابت کریں کہ ان کو بھانے والی چیزوں کی طرف اصلاً رغبت نہیں ہے اسلام کی اشاعت کا اصلی مدار انہیں اخلاق و معاملات میں مضمر تھا اور اب بھی مسلمان کسی قسم کی ترقی کر سکتے ہیں تو انہیں اخلاق و اوصاف سے متصف ہونے کے ساتھ وحشیانہ افعال یا حرکات یا جابرانہ تصور مردانگی یا مجلدانہ تمیلات کبھی ایک قدم بھی آگے بڑھنے نہ دیں گے۔

نتیجہ پنجم

شام و روم و عراق و جزیرہ وغیرہ ممالک پر پیش قدمی سے مسلمانوں کو خون ریزی کا

بازار گرم کرنا یا باشندوں کو ملک بدر کر کے ان کے املاک ومتاع پر قابض ہونا مقصود نہ تھا نہ ان کو ذلیل بنا کر خود آقاء مالک بننا ان کے اغراض میں داخل تھا۔ بلکہ اصلی غرض وغایت یہ تھی کہ مخلوق کو قوانین کی تیرہ وتار مہلک اور پیچیدہ عقاب سے نجات دلا کر امن وآسائش تہذیب وتمدن کے راہ پر لائیں اور ان کو حریت وآزادی انسانیت کی دولت ونعمت سے متمتع کریں اس اعلیٰ ارفع مقصد کے لئے جو طریقے اختیار کیے گئے نہایت سہل تھے یا اسلامی اوصاف وکمالات کی طرف راغب ہو کر برضاء رغبت مسلمان بن جائیں۔ یا تھوڑا سا اخلاقی فریضہ پیش کر کے مسلمانوں سے مساوات کا درجہ حاصل کریں میزان میں مسلمانوں کے برابر تولیں، حقوق میں برابر کا حصہ لیں، واطمینان کے ساتھ املاک پر ملک پر قابض وحاکم رہیں مسلمان خود ان کی حمایت وحفاظت کریں گے۔

اسلامی سفراء اور نائبین کی گفتگو بغور ملاحظہ کی جائے اسکا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے اور یہی مطلب کلمۃ اللہ کے بلند وبالا کرنے سے تھا۔ جس کے لئے مسلمان مامور تھے۔ نظیر دیکھنی ہو تو ہر مزان سے مصالحت کا معاملہ دیکھ لینا کافی ہے۔ جس کا مفصل تذکرہ آئندہ ایک عنوان میں لکھا جائے گا۔ وہ بشرط ادائے محصول اپنے ملک پر قابض ومتصرف رہا۔ اور مسلمانوں نے اس کی اور اس کے ملک کی حفاظت اپنے ذمہ لی۔

نتیجہ ششم

مسلمانوں کا سرزمین عرب سے نکل کر قدیم اور زبردست سلطنتوں سے معرکہ آرا ہونا لٹیروں اور غارت گروں کا سامان، یا چنگیز خانی فتوحات کا نمونہ نہ تھا بلکہ ابتداً سے ہی انتہا تک ان کی تمام حرکات وسکنات، ارادے، منصوبے، عمل اور کام ایسے مرتب اور باقاعدہ تھے کہ اس زمانہ کا متمدن اور شائستہ قومیں اس سے زیادہ تو کیا پوری تقلید بھی نہیں کر سکتی ہیں۔

تاریخ عالم کی ورق گردانی اور واقعاتِ سابقہ وحال کے تجربہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فاتح وقتال مند قوموں کی کامیابی کا راز امور ذیل میں مضمر ہے۔

فنون جنگ میں مہارت اتحاد واتفاق ہمدردی ملکی وقومی، امتیاز وجان نثاری، جوش واستقلال، ہمت ومردانگی، حفظ راز، اطاعت شعاری، حریت، تعدی وظلم سے اجتناب، جوش انتقام میں اعتدال پر قائم رہنا، دشمن کے ملک سے کما حقہ واقفیت، حفظ ماتقدم، انتظام

ذرائع خبر رسانی وفراہمی رسد وغیرہ وغیرہ۔ یہ وہ باتیں ہیں کہ جس قوم میں پائی گئیں، فتح و نصرت ان کے ہم رکاب ہوئی۔

مذکورہ بالا واقعات کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک بات بدرجہ کمال مسلمانوں میں موجود تھی۔ مادی ترقیات کی وجہ سے یہ ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے۔ کہ بعض اہم انتظامی امور میں متمدن قومیں اس وقت ترقی کر جائیں، مگر اصولی باتوں پر نظر ڈالتے ہوئے صاف صاف تسلیم کر لینا پڑیگا کہ عین اوصاف میں مسلمانوں سے بڑھ کر کوئی قوم نہ اس وقت تھی۔ اور نہ اس کے بعد اب تک ہوئی۔ مدعی تو پہلے ہی سے بہت ہوئے ہیں۔ اور اب بھی ہیں مگر کوئی یہ بتلا دے کہ ان اصولوں پر مجموعی طور سے کہاں تک عمل کیا گیا ہے؟ مسلمانوں سا اتفاق واتحاد، جو اس وقت تھا کسی قوم نہیں ہوا۔ حفظ راز کا حال تو ظاہر ہے غیر تو کیا اپنوں کو تدابیر جنگ کے راز قبل از وقت معلوم نہ ہوتے تھے۔ ایثار کی یہ حالت تھی کہ سخت سے سخت خطرہ کے موقع پر ہر شخص یہی چاہتا ہے کہ میں آگے ہو جاؤں، جو گزند پہنچے میرے بھائی اس سے محفوظ رہیں، اور رستم کے یہاں جا کر دلیرانہ گفتگو کرنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ مگر اس پر بھی یہ ہوا کہ ایک شخص کو دوسری بار جانے کی نوبت آئی ہمت واستقلال کا یہ حال تھا کہ تن تنہا بادشاہ وقت سے ایسے بے دھڑک گفتگو کرتے تھے، جس سے خود بادشاہ اور درباری مرعوب ہو جاتے تھے۔ جوش مردانگی اس سے ظاہر ہے کہ طلحہ اسدیؓ نے واپس آنے کو پسند نہ کیا۔ دشمن کے ملک میں اس وقت تک قدم نہ رکھتے تھے۔ جب تک کہ ان کی اندرونی حالت سے پوری واقفیت نہ ہو جاتی۔

اس زمانے میں میدان جنگ اور دشمن کے ملک کے نقشے تیار ہوتے ہیں۔ مگر اس وقت بھی پس اصولی پر مضبوطی سے عمل تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے امیر لشکر حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو تحریر فرمایا۔ صف الارض انظر الیھا۔ (سرزمین عراق کا حال ایسا لکھو کہ گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں)

حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کیا۔ یہ نقشہ کھینچنا نہ تھا اس نقشہ کو ملاحظہ فرما کر، قا میہ کو جنگ کے لئے منتخب کیا گیا۔ اسی طرح ایک قدم بھی اندروں ملک میں داخل ہونے کی ممانعت تھی۔ جب تک کہ سامان رسد اور ذرائع خبر رسانی کا کامل بندوبست نہ ہو۔ سلسلہ امداد برابر متصل نہ ہو۔ انتظام ڈاک ایسا تھا کہ امیر عراق چھوٹی چھوٹی باتوں میں دارالخلافت سے

مشورہ طلب کرتے تھے۔اور وہاں سے فوراً جواب آتا تھا اگر ڈاک کا کامل انتظام نہ ہوتا تو ہزاروں میلوں کے فاصلے پر اس قدر جلد خبریں کیوں کر پہنچ سکتیں اور جواب کیسے آسکتا؟ رہا عدل وانصاف حریت ومساوات وغیرہ تو یہ وہ باتیں ہیں جن کا سکہ مفتوح قوموں پر فتح سے قبل ہی بیٹھ چکا تھا۔اس قانون میں حاکم محکوم، امیر ورئیس، عالم وجاہل، سب مساوی تھے۔ اور بایں ہمہ مساوات امیر کی اطاعت اس درجہ تھی کہ سرمو کوئی شخص تاب نہ کرسکتا تھا۔امیر لشکر ان ہدایات پر جو دارالخلافت سے آتی تھیں۔نہایت پابندی کے ساتھ کاربند ہوتے تھے۔اور یہی حال ہر ماتحت کا اپنے افسر کی اطاعت میں تھا۔کیا ایسے شائستہ اور باقاعدہ لشکر کو کوئی شخص غارت گروں سے تشبیہ دے سکتا ہے کہ ان فتوحات کو غارت گری کا نتیجہ بتلا سکتا ہے؟ اگر شائستہ اور متمدن قوم نے اس سے آدھا بھی کر دکھایا تو بتلا دے۔لیکن مسلمانوں نے ان قوانین کی تعلیم کسی لاء کالج، یا ملٹری کالج میں نہیں پائی تھی۔قانون بین الاقوام بھی اس وقت مدون نہ ہوئے تھے۔امن عالم قائم رکھنے کے واسطے۔''ہیگ'' کی کانفرس بھی وضع نہ ہوئی تھی۔اور پھر بھی سادہ لوگ سب امور سے ماہر تھے۔

عرب کا جہل اور بدویت، سادگی وفاقہ مستی تو ایسی مشہور تھی کہ روم وشام وفارس وغیرہ میں جب کسی سفیر سے گفتگو ہوتی تو اس کے سابق حالات یاد دلائے گئے اور مسلمانوں نے بھی بے تکلف ان سب باتوں کو تسلیم کیا۔بایں ہمہ یہ باتیں ان میں کہاں سے آئیں اور کیوں کر سیکھیں؟

صرف لا الٰہ الا اللہ ،محمد رسول اللہ ۔کا اقرار واعتقاد کرنے اور خدا کے حبیب ومحبوب نبی اکرم ﷺ کی چند ساعت ہم نشینی سے اس سے صرف یہی بات معلوم نہ ہوتی کہ اسلام تمام باتوں کے لئے کافی ہے بلکہ یہ بھی سمجھ میں آگیا کہ نفس اسلام کو۔جو صدق ودل سے اور کمال رسوخ وپختگی کے ساتھ ہو وہ تمام خوبیاں اور عمدہ اطوار وعادات جو ہدایات قرآنی وتعلیم پاک نبوی ﷺ کا نتیجہ ہے اور جن کے ساتھ متصف ہونے سے خود بخود دین دنیا کی خوبیاں عقل ودانش کے مراتب حاصل ہو جاتے ہیں۔لازم اور ملزوم ہیں۔مسلمان اور پختہ مسلمان ہونا تمام اخلاقی اور دماغی کمالات وروشن ضمیری کی ضمانت ہیں۔

نتیجۂ ہفتم

رستم کو خود یہ علم تھا کہ مسلمان ضرور ملک فارس پر قابض ہوں گے۔ اور ہم پر غالب آئیں گے۔ اسی وجہ سے وہ ہر پہلو سے لڑائی کو ٹالنا چاہتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے باصرار عرض کیا کہ مجھے میدان جنگ میں جانے سے معاف کیا جائے اس نے بار بار سفرائے اسلام کی گفتگو امراء فارس کو سنا کر ان کو سمجھانا چاہا کہ ان لوگوں کی گفتگو اور یہ پاکیزہ حالات اور اعلیٰ و برتر خیالات و کمالات ہیں۔ ان کے معاملات اپنے دشمنوں کے ساتھ یہ ہیں وہ کس قدر سچے اور صاف ان کا دین کیسا برگزیدہ اور ان کے قوانین کیسے عمدہ ہیں؟ اس نے کوشش کی کہ میں خود اور میرے ساتھ تمام امراء لشکر برغبت مسلمان ہو جائیں اور اپنے ملک و حکومت کو بدستور اپنے قبضہ میں رکھیں۔ جس کا اقرار وہ مسلمانوں سے لے چکا تھا۔ اگر مسلمان ہو گئے تو ملک ان کا ان کے قبضہ میں رہے گا مسلمانوں کے غلبہ اور حقانیت کا علم فقط رستم ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ جملہ خواص و سرداراس میں شریک تھے، جس کو وہ عوام پر ظاہر کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ رستم اور باجان کی گفتگو ان کے لئے شاہد ہے، یہ ممکن ہے کہ تمام خواص سرداروں کو رستم و باجان کے برابر یقین نہ ہو، مگر اس علم سے خالی نہ تھے اور گو عوام کو اس راز سے کتنا ہی غافل رکھنا چاہا مگر۔

نہاں کے ماند آں رازے کز و زند محفلہائے

بلکہ خواص میں باہم چرچا تھا تذکرے تھے اور رستم نے بر سر دربار سفیرانِ اسلام سے گفتگو کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا، تو ناممکن تھا کہ ان تک یہ خیال نہ پہنچتا اور وہ اس اثر سے متاثر نہ ہوتے۔ رستم کی کچھ پیش نہ چلی ادھر بادشاہ نے مجبور کیا، ادھر اس کے ماتحت افسروں نے اس بارے میں اطاعت نہ کی تو مجبوراً جنگ کا پہلو اختیار کیا۔ اس نے اور اس کے تمام ماتحت افسروں نے ملک کی حفاظت میں جان توڑ کر کوشش کی دشمن کو ہلاک و تباہ کرنے کی سب تدبیریں عمل میں لائے کوئی دقیقہ سرفروشی و جانبازی کا اٹھا نہ رکھا رگِ حمیت نے تھوڑی دیر کے لئے اس کے سب قلبی خیالات راسخ اور متیقن علم کو مٹا دیا اور وہ نہایت قوت و شوکت کے ساز و سامان کے ساتھ دلیرانہ الفاظ کہتا ہوا میدان کارزار کو روانہ ہوا اس علم نے اس کے ارادے میں کسی قسم کی سستی اور ہمت میں ضعف پیدا نہ کیا بلکہ اس

سے زیادہ تند ہی دکھلائی، جو لاعلمی کی حالت میں دکھلاتا اس نے اس عداوت کا اظہار کیا، جو معاند اور جامد حق کرتا ہے یہ عداوت جہل کی عداوت سے کہیں زیادہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ جہل کا علاج تنبیہ سے ہوسکتا ہے مگر عناد کا علاج نہیں۔ مسلمانوں کے غلبہ اور تسلط کو اہل فارس کے ضعف یا پستیٔ ہمت و دل شکستگی پر محمول کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے اور جس طرح کفار عرب و اہل مکہ سے باوجودیکہ ان کے دلوں میں مذہب اسلام کی سچائی رسول اکرم ﷺ کی صداقت و راست بازی مرکوز تھی، انہوں نے وہ تمام حالات و معجزات دیکھے تھے جن کو دیکھنے و سننے سے سنگ دل بھی نرم ہو جاتا، آپ کی کوئی بات بھی غلط نہ نکلی۔ کیوں کہ آپ ﷺ نے جو بھی فرمایا وہ صحیح اور حق اتری، جو حجت طلب کی دکھلا دی گئی وہ آپس میں بیٹھ کر آپ کی حقانیت کے تذکرے کرتے تھے، مگر بایں ہمہ رسول اکرم ﷺ کی ایذا رسانی، آبرو ریزی، دشنام دہی اور انجام کار بغاوت اور قتل میں مسلمانوں کو تنگ کرنے اور حتی کہ مکہ چھوڑ کر حبشہ چلے جانے اور وہاں بھی ان کا پیچھا کر کے اور ضعیف مسلمانوں کو طرح طرح کے عذاب دیکر اسلام سے پھیر دینے میں ممکن سے ممکن کوشش کی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انجام کار رسول اللہ ﷺ کو مع اپنی جماعت کے ہمیشہ کے لئے مکہ معظمہ چھوڑ دینا پڑا، مگر ہجرت کر جانے کے بعد بھی ان کے صفحۂ ہستی سے معدوم کر دینے کی کوششوں سے باز نہ آئے۔ کبھی یہود مدینہ سے سازش اور منافقوں کو آمادہ کر کے مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنے کی تدابیر میں مشغول ہونا اور انجام کار عرب کے تمام قبائل کو متفق بنا کر غزوۂ خندق کی صورت میں مدینہ کا محاصرہ کرنا کبھی ملوکِ غسان وغیرہ کو مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے آمادہ کرنا۔

قارئین عظام! خفیہ و علانیہ جس طرح بھی ممکن تھا، اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے اور مسلمانوں کو جو ان کے ہم قوم و ہم وطن رشتہ دار اور عزیز تھے جن کی عزت ان کی عزت تھی جن کی فلاح میں ان کی فلاح و بہبودی تھی، جو اگر غالب آ کر سلطنت و حکومت کی مسند پر بیٹھتے، تو انہیں کی سلطنت و حکومت ہوتی چنانچہ ایسا ہی ہوا جب اسلام کا غلبہ اور مسلمانوں کا تسلط ممالکِ شام و روم وغیرہ پر ہوا پس یہی لوگ مسند آراء حکومت ہوئے۔ ابوسفیان جو بعد ابوجہل کے تمام کفار کے افسر اعلیٰ اور تمام معرکوں کا بانی و مبانی تھے اور اس کی بیوی ہندہ بنت

جنہ نے جوشِ انتقام سے جنگ اُحد میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبایا تھا۔ معرکہ یرموک میں اعلیٰ اور ذمہ داری کی خدمت خاص (خطیب) پر مامور تھے، جن کا کام یہ تھا کہ اپنی مؤثر تقریر اور جادو بیانی سے مسلمانوں میں جوش کی روح پھونکتے رہیں، ان کے دونوں بیٹے یزید و معاویہ گورنری شام پر ممتاز ہوئے۔ اسی طرح عکرمہ بن ابی جہل اور سب بڑے بڑے سرداران مکہ یا ان کی اولاد ذمہ داری کے اعلیٰ عہدوں پر ممتاز تھے۔ مگر یہ علم حقانیت اور یہ تعلقات قومیت و قرابت وطنیت ان کو کسی بات سے مانع نہ آئی۔ فتح مکہ اور ہر طرح سے مغلوب ہو جانے کے بعد بھی جب تک ان کے اندر کما حقہٗ اسلام راسخ نہ ہو گیا، دلوں میں یہ خیال لیتے رہے۔ حنین کی لڑائی میں جب نو مسلموں اور ان کے ذیل میں چند قدیم اور پختہ مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تو یہی سفیان وغیرہ جو ابھی چند روز ہوئے فتح مکہ کے دن مسلمان ہو چکے تھے ایسے خوش ہوئے کہ اپنے دلی جذبات کو چھپا نہ سکے۔ ایک بولے کہ محمد (ﷺ) کا جادو اب باطل ہو گیا۔ دوسرے بولے کہ جی اب مسلمانوں کے قدم کہیں نہ جمیں گے۔ (بحوالہ البدایہ والنہایہ)

مدینہ کے یہود خوب جانتے تھے کہ نبی آخر الزماں مبعوث ہونے والے ہیں آپ ﷺ کے اندر وہ سب علامتیں دیکھتے تھے جو ان کے یہاں لکھی ہوئی تھیں مگر عناد و بغض، حب جاہ و ریاست نے اجازت نہ دی، دولتِ اتباع سے مالا مال ہوتے۔ دغا بازیاں کیں، کتاب اللہ کے احکام چھپائے، مشرکین مکہ کا ساتھ دیا، قتل و غارت ہوئے جلاوطن ہوئے، مگر ہٹ دھرمی سے باز نہ آئے علیٰ ہذا منافقین مدینہ سب کچھ جان کر اپنے بھائیوں کے حسد و بغض کی وجہ سے اس حقیقی نعمت سے محروم رہے۔

یہی حال رستم اور اس کے ہم خیال امراء اور ارکان سلطنت و رعایا کا تھا اور ان کو علم اور یقین ضرور تھا، مگر نہ اس درجہ کا جو مشرکین عرب و یہودِ مدینہ و منافقین کو تھا اور نہ ان کے سامنے علم و یقین کے وہ اسباب تھے، جو ان لوگوں کے سامنے تھے اس لئے وہ مسلمانوں کے ساتھ اپنی پوری قوت اور سامان سے نبرد آزما ہوئے اور نہ فقط معرکۂ قادسیہ کے اختتام تک ہی ان کی ہمت قائم رہی بلکہ پایہ تخت نکل جانے کے بعد بھی اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔

نہاوند کا سب سے آخری معرکہ ایسا سخت تھا کہ باوجود فتوحات اسلامیہ کے اس قدر وسیع

ہو جانے اور تقریباً کل مملکتِ فارس و شام زیر نگیں ہو جانے اور ہر قسم کے سامان جنگ میں سہولت و وسعت ہونے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اس قدر اہتمام کرنا پڑا کہ اس سے پہلے کسی معرکہ میں نہ کیا تھا اہل فارس نے بھی اتنا زور دکھلایا کہ اس سے قبل نہیں دکھلایا تھا۔

رستم کے ہم مرتبہ فیروزان کی کمان میں ڈیڑھ لاکھ نبرد آزما فوج جمع تھی اور امداد کا سلسلہ برابر جاری تھا ہزیمت سے محفوظ رہنے کے واسطے وہ سخت صورتیں تجویز کیں جو قادسیہ میں بھی نہ تھیں۔ اپنے پیچھے گہری خندق کھودی اور اپنے اور خندق کے درمیان لوہے کے گوکھرو (نوک دار شے) اور کانٹے بچھا دیتے اور سات سپاہیوں کو ایک زنجیر میں باندھ دیا کہ بھاگ ہی نہ سکیں اور اگر بھاگیں تو کانٹوں میں پھنس کر رہ جاویں اور اس پر بھی اگر کوئی بھاگ نکلے تو خندق میں گر کر ہلاک ہو جائیں۔

غرض کہ اپنی انتہائی کوشش اور بہادری کو خرچ کیا اور جب یزدجرد کو ملک فارس میں کہیں قدم رکھنے کو جگہ نہ رہی تب بھی اپنی ضد سے باز نہ آیا خراسان و ترکستان اور چین تک پہنچ کر مسلمانوں سے مقابلہ کرتا اور کراتا رہا اس لئے یہ تو کوئی شخص ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ اہل فارس میں فی الحقیقت ضعف تھا یا اپنے اس علم کی وجہ سے کما حقہٗ مقابلہ نہ کیا اور مسلمانوں نے ایک ضعیف و مردہ قوم پر غلبہ حاصل کر لیا ہاں اس علم و یقین کا یہ اثر ضرور ہوا کہ جس جس ملک پر فتح حاصل کر کے مسلمان مسلط ہو جاتے اور وہاں اس کی برکات پھیلاتے جاتے وہاں کے باشندے جو پہلے سے علم کے درجہ میں اسلام کی صداقت دل میں لئے ہوئے تھے اور مسلمانوں کے معاملات سے اور ان کے اس قانون حریت و آزادی اور معدلت و نصفت سے واقف تھے جس کا برتاؤ وہ اپنے دشمنوں اور مفتوح قوموں سے کرتے تھے جب ان کو بالذات مسلمانوں سے واسطہ پڑتا تھا، ان کی ہر ہر بات کو آنکھ سے دیکھتے تھے اور پھر اس ہمدردی اور شفقت و مساوات کا مشاہدہ کرتے تھے، جو ان کے ساتھ برتے جاتے تھے اور ان سب سے بڑھ کر ان کے حالات کو بھی دیکھتے تھے، جس سے مسلمانوں کا دنیا سے بے تعلق آخرت کی طرف رغبت اور ہر ایک بات میں رضائے الٰہی کا طالب ہونا معلوم ہوتا تھا اسلام کی محبت ایسے غیر محسوس طریقہ سے سرایت کر جاتی تھی کہ وہ بے اختیار زبان کے اقرار سے پہلے دل سے مسلمان اور نہ صرف مسلمان بلکہ اسلام کے شیدائی بن جاتے تھے اور یہ ایسا مؤثر اور قوی سبب تھا کہ کوئی دوسرا سبب اس کے مقابلہ میں مؤثر نہیں

ہو سکتا تھا، اس کے برخلاف جو شخص کوئی دوسرا سبب بیان کرے محض دعویٰ بے دلیل ہے جس کو کبھی ثابت نہیں کر سکتا۔

رستم کے اور امرائے فارس کے خیالات اور اس کے ذیل میں دوسرے حالات لکھنے میں ہم نے کسی قدر طول سے کام لیا، لیکن جن مطلب کے ہم درپے ہیں اس کے اظہار کے واسطے واقعاتِ مذکورہ کا تذکرہ نہایت ضروری تھا ان واقعات سے چند نتائج اخذ کرتے ہیں، جن میں ہر ایک بجائے خود مہتم بالشان اور نہایت مفید ہے لیکن اصلی مقصود ان مسلسل حالات کے ذکر کرنے سے یہی آخری نتیجہ ہے جن کا تعلق ہمارے اصلی دعویٰ سے ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

لیکن قبل اس کے کہ ہم اس عنوان کو ختم کریں، اس قدر لکھ دینے کی ضرورت باقی ہے کہ رستم یا اراکین سلطنت، امرائے فارس، یا عام رعایا کو اس کی صداقت اور مسلمانوں کے غلبے کا یقین کس ذریعہ سے ہوا تھا؟ قیصر روم وشام تو اہل کتاب میں سے تھے، علی ہٰذا یہود مدینہ بھی ان کو اگر آسمانی کتابوں کے ذریعہ سے علم ہوا تو قرین قیاس ہے مگر قوم مجوس جو کسی آسمانی مذہب کی پابند نہ تھی نہ کتاب الٰہی ان کے پاس پھر ان کو علم ہوا تو کیوں کر؟

جواب: اس خلجان کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو یہ ممکن ہے کہ فارس اور روم کی سلطنتیں باہم ملی جلی تھیں کبھی ان میں باہمی جنگ ہوتی تھی اور کبھی صلح۔ غرض آپس میں ایسے تعلقات تھے جن کی وجہ سے یہ امر کچھ مستعبد نہیں ہے کہ جو خیال قیصر وشام وروم اور علماء نصاریٰ میں راسخ تھا، ان کے ذریعہ سے فارس تک بھی پہنچ گیا ہو۔ یا یہ کہ عرب کے اکثر حصوں پر فارس کی حکومت تھی اور عرب کے کاہنوں اور نجومیوں میں ولادت باسعادت رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہی کھلبلی پڑ گئی تھی اور بعد ولادتِ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تو عرب بھر چرچا ہو گیا تھا یہ کچھ بھی مستعبد نہیں ہے کہ یہ خیالات عرب سے فارس تک پھیل گئے ہوں۔ لیکن اصل وجہ اس کی یہ ہے کہ فارس میں خود ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے ان کو بالذات یہ علم ہو گیا۔

انصار مدینہ کا قبول اسلام

موسم حج میں آپ کی عادت شریفہ تھی کہ جو قبائل حج کو آتے تھے ان سے مل کر اسلام کی حقیقت اور اس کی خوبیاں بیان فرماتے تھے ایک سال مدینہ کے چند لوگوں کو دعوتِ اسلام دی، یہ لوگ یہود سے سنا کرتے تھے کہ عنقریب ایک نبی عرب میں مبعوث ہونے والے ہیں انہوں نے سن کر آپس میں کہا کہ یہی نبی مبعوث ہیں، مدینہ سے لوگ گھر گئے اور وہاں جا کر ذکر کیا، تو گھر گھر آپ ﷺ کا ذکر پھیل گیا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے انصار مدینہ کو مشرف باسلام کرایا۔

سوال: خداوند کے جملہ انعامات میں سے ایک اہم انعام آسمان کا پیدا کرنا اور اس بات پر قرآن واحادیث میں کثرت سے وارد ہے لیکن بعض منکرین اسلام آسمان کے وجود کے منکر ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ آسمان کا کوئی وجود نہیں؟۔

جواب: اہل سائنس کا دعویٰ ہے کہ آسمان کا وجود نہیں ستارے سب فضا میں گھوم رہے ہیں تو دیکھو یہ مسئلہ ظنی ہے یا یقینی۔ تو سائنس کی رو سے آسمان کا عدم قطعی طور سے نہیں ہوسکتا۔ آج تک جتنی دلیلیں نفی آسمان پر قائم کی گئیں ان سب کا خلاصہ عدم العلم ہے جو کہ عدم آسمان کے وجود کو مستلزم نہیں اور وجود آسمان دلیل قطعی سے ثابت ہے کیوں کہ وجود آسمان فی نفسہٖ ممکن ہے۔ یعنی آسمان کا وجود عدم دونوں عقلاً برابر ہیں اور یہ عقلی مقدمہ ہے کہ جس ممکن کے وجود کی خبر کوئی مخبر جو قطعاً صادق ہو دیتا ہو تو اس ممکن کا وجود ثابت قطعی ہوتا ہے اور اس کے وجود کی خبر ایک مخبر صادق یعنی قرآن شریف نے دی ہے پس ان تینوں مقدموں سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوگئی کہ آسمان موجود ہے اور آسمان کے ممکن الوجود ہونے کی بناء پر میں کہتا ہوں کہ جب یہ عقلاً ممکن ہے یعنی نہ واجب ہے اور نہ ممتنع۔ پس نہ ضروری الوجود ہوا۔ نہ ضروری العدم تو عقل اس کے وجود یا عدم کی بابت کوئی فیصلہ کر ہی نہیں سکتی۔ زیادہ

سے زیادہ اگر کہا جا سکتا ہے تو صرف اس قدر کہ ہم کو از روئے عقل وجود کا پتہ نہیں چلا۔ اور معلوم ہے کہ عدم ثبوت اور ثبوت العدم میں زمین اور آسمان کا فرق ہے اس کی مثال یوں لیجئے کہ جس وقت ہمیں امریکہ کا علم نہ تھا تو ہم یہ نہیں کہہ سکتے تھے کہ امریکہ موجود نہیں ہے۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ ہم کو وجود امریکہ کا علم نہیں ہے۔ پس اہل سائنس یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم کو آسمان کے وجود کا پتہ نہیں چلتا اور یہ ہم کو مضر نہیں کہ ہم تقریر سابق سے ان کو وجود آسمان تسلیم کرا دیں گے۔ البتہ اس کے ضروری الوجود نہ ہونے پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اہل یونان نے وجود آسمان پر عقلی دلائل قائم کئے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ یونان کے دلائل قریب قریب سب مخدوش ہیں جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ واقعیت یہی ہے کہ عقل سے نہ آسمان کا وجود ثابت ہوتا ہے نہ عدم رہی یہ بات کہ علی العموم اس نیلگوں رنگ کو جو کہ جانب فوق میں نظر آتا ہے آسمان سمجھا جاتا تھا۔ اور آج یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ یہ نیلگوں رنگ آسمان نہیں اس کے جواب میں میں کہتا ہوں کہ اوّل تو جن دلائل سے یہ ثابت ہوا ہے کہ وہ خود ابھی مخدوش ہیں اور بنا الفاسد علی الفاسد ہے۔ دوسرے اگر ثابت ہو بھی جائے کہ یہ رنگ آسمان نہیں ہے تب بھی اس سے عدم وجود آسمان نہیں ثابت ہوتا ممکن ہے کہ اس سے آگے ہو پس یہ کہنا کہ آسمان کا وجود جو کہ شریعت سے ثابت ہے اور قرآن شریف ناطق اور تصادم و تعارض ناطقین میں ہوتا ہے۔ ساکت و ناطق میں نہیں ہو سکتا اور جب تعارض نہیں ہے تو سماء کی تعریف کواکب یا ما فوقنا وغیرہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ اور یہ تفسیر یقیناً تحریف ہوگی اور ایسے محرفین کی بابت یہ کہنا صحیح ہے کہ انہوں نے وحی کو معیار نہیں بنایا کیوں کہ باوجود وحی ماننے کے اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کی۔ (تقویم الزیغ: ص:۱۱)

سوال: منکرین اسلام حضرات اسباب عالم کو مؤثر بالحقیقت تصور کرتے ہیں اور رب حقیقی مسبب الاسباب کے منکر ہی ہو بیٹھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسباب عالم کے بناء پر پس اس کا جواب ملاحظہ کیجئے؟۔

جواب: فرمایا نئے خیال کے لوگ اسباب عالم پر ایسے جمع ہیں کہ مسبب الاسباب کو چھوڑ ہی دیا۔ اسباب طبعیہ کے آثار کو لازم سمجھ کر تصرفات حق تعالیٰ کے منکر ہو گئے اور غلطی ان کی یہ ہوئی کہ کسی اثر کے دوام سے اس کا ضروری ہونا اعتقاد کر لیا مثلاً آگ کا اثر ہے جلانا۔

اس کے دوام سے یہ سمجھنا کہ یہ اس کا ذاتی اثر ہے۔ انفکاک متصور نہیں اور یہ سخت غلطی ہے اور اسی وجہ سے انہوں نے قصہ ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے متعلق آیت قلنا یانار کونی برداً وسلاماً میں تاویلات بعیدہ کیں۔ یہ سمجھ کر کہ آگ کیوں کر ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ اس غلطی کی ایسی مثال ہے کہ ریل والوں کی اصطلاح میں گاڑی روکنے کے لئے سرخ جھنڈی ہوتی ہے ایک نادان بار بار اسکو دیکھ کر یہ سمجھنے لگے کہ خود اس جھنڈی میں یہ اثر ہے کہ اس سے گاڑی رک جاتی ہے۔ کیوں کہ جب دیکھا تو ایسا ہی نظر آیا اور جو لوگ حقیقت جانتے ہیں وہ کہیں گے کہ روکنے والا اصل میں ڈرائیور ہے باقی یہ جھنڈی محض علامت ہے۔ اس میں کوئی اثر ذاتی نہیں۔ ایسے ہی بغیر حکم حق ایک ذرہ بھی حرکت نہیں کر سکتا۔ حتی کہ زبان سے جو جو الفاظ نکلتے ہیں ہر ہر حرف پر حکم جدید ہوتا ہے تو زبان حرکت کرتی ہے تمام عالم میں ایسا ہی تصرف جاری ہے۔ افسوس کہ منکرین اسلام نے دوام سے ضروری ہونا اعتقاد کر لیا اور تصرف حق کے منکر ہو گئے۔ (ملفوظ نمبر ۲۵، دعوات عبدیت حصہ دوم)

عبدیت حصہ دوم

بعض لوگ ایسے گھڑنے والے ہیں جو مشیت حق ہی کے معتقد نہیں بلکہ اسباب ہی ہر چیز کا مدار رکھتے ہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے تعطیل اسباب فی بعض الاوقات کو جابجا اہر فرمایا ہے اور اگر اسباب کی حقیقت پر غور کیا جائے تو عقلاً بھی خدا تعالیٰ کی مشیت کو موثر ناضروری ہے کیوں کہ میں کہتا ہوں کہ جس حادث کے لئے آپ نے ایک دوسری شے کو بب مانا ہے وہ سبب بھی ایک حادث ہے اس کے لئے کون سبب ہوا اگر اس کے لئے آپ تیسری چیز کو سبب مانیں تو ہم اس میں بھی کلام کریں گے تو اس سلسلہ ممکنات کو لامحالہ واجب پر منتہی کیا جاوے گا ورنہ تسلسل لازم آئے گا اور لامتناہی کے ابطال پر متکلمین دلائل قائم کر چکے ہیں اور یہ حکماء کی حماقت ہے کہ وہ اجزاء عالم کو حادث بالشخص اور قدیم بالنوع کہتے ہیں کہ ہر ہر فرد تو حادث ہے مگر نوع قدیم ہے۔ حالاں کہ وہ خود اس کے بھی قائل ہیں کہ نوع کا وجود بدون شخص کے نہیں ہوسکتا پھر جب ہر ہر شخص حادث ہے تو نوع قدیم کا تحقق کیسے ہوگا غرض دلائل عقلیہ سے بھی اور نقلیہ سے بھی مشیت حق کا مؤثر اصلی ہونا ہر طرح ثابت ہے اور جو شخص ہر بات میں لاتسلیم ہی کا سبق پڑھ لے تو اس کا علاج متکلمین نے احراق بالنار بتلایا ہے نیز فطرتاً بھی حق تعالیٰ کی ہستی اور قدرت ماننے کی چیز ہے اور ماننے کی چیز کو نہ ماننا تحکم ہے اور تحکم کا تو کوئی بھی جواب نہیں۔ جیسے ایک مجنوں پاخانہ کھا رہا تھا کسی نے ملامت کی تو کہا اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ وہی تو ہے جو تھوڑی دیر پہلے ہم نے داخل کیا تھا اب وہ ہمارے اندر سے نکل کر برا کیوں ہوگیا ذرا عقلاً کسی عقلی دلیل سے اس کا جواب دے دیں، مگر عرف اور طبیعت سے نہ لیں محض عقلی دلیل سے اس کے دعوے کو باطل کریں میں سچ کہتا ہوں کہ اس کے ابطال پر وہ کوئی دلیل نہ قائم کرسکیں گے مگر کیا اس سے کوئی یہ کہے گا کہ اس مجنون کی بات صحیح ہے۔ ہرگز نہیں سب یوں ہی کہیں گے کہ وہ نالائق پاگل ہے جو ماننے

کی چیز کو نہیں مانتے جو اجماعاً ماننے کی چیز ہے۔ اسی طرح ہم منکر صانع کو ہم پاگل سمجھتے ہیں کیوں کہ وہ بھی ایسی ماننے کی چیز کو نہیں مانتا جس کے ماننے پر اجماع عقلاً واتفاق مذاہب ہے اور ضرورت فطرت اس پر مزید، یہ تو کامل درجہ کی دہریت ہے کہ خدا ہی کو نہ مانے اور ایک قسم کی دہریت یہ بھی ہے کہ خدا تعالیٰ کو تو مانے اور اس کی قدرت مشیت کو کامل نہ مانے بلکہ یہ پہلی قسم سے بھی بدتر ہے کیوں کہ یہ شخص خدا کا قائل ہے اور محض برائے نام قائل ہے جیسے کوئی یوں کہے کہ فلاں بادشاہ تو ہے مگر پنشن یافتہ ہے کہ اسے اختیارات کچھ نہیں چنانچہ بعض لوگ خدا تعالیٰ کو ایسا قادر مانتے ہیں جیسے گھڑی کا کوکنے والا کہ کوک بھر دینے کے بعد گھڑی کے چلنے میں اس کے اختیار کو کچھ دخل نہیں۔ بلکہ اب وہ خود بخود چلتی رہے گی کوک دینے والا زندہ ہو یا نہ ہو جب تک کوک بھری ہوئی ہے اس وقت تک گھڑی کو اس کی کچھ ضرورت نہیں ایسے ہی یہ لوگ کہتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا کام اتنا ہے کہ اسباب کو پیدا کر دیا۔ اب اسباب سے مسببات اور علل سے معلولات کا وجود خود بخود ہوتا رہے گا نعوذ باللہ اس تاثر تاثیر میں حق تعالیٰ کا کچھ بھی اختیار نہیں وہ اسباب سے مسبب کو مختلف نہیں کر سکتے بس ان لوگوں کا خدا کو ماننا ایسا ہے جیسے بعض لوگ من تشبہ بقوم فھو منھم سے بچنے کے لئے کوٹ پتلون اور بوٹ سوٹ کے ساتھ ترکی ٹوپی پہنتے ہیں۔ کہ ساری ہیئت تو کفار کی سی ہے صرف ٹوپی سے آپ مسلمان معلوم ہوتے ہیں ایسے ہی یہ لوگ حق تعالیٰ کے لئے قدرت واختیار تو ایسا ضعیف مانتے ہیں جیسا کہ دہری منکر صانع مانتا ہے کیوں کہ جیسا اختیار یہ مان رہے ہیں وہ بھی نہ ماننے کے مثل ہے مگر الزام دہریت سے بچنے کے لئے برائے نام یوں کہتے ہیں کہ خدا موجود ہے اور بعض لوگ خدا تعالیٰ کو بھی مانتے ہیں اور ان کی قدرت واختیار کو کامل بھی مانتے ہیں۔ جیسے عامۃ المسلمین مگر سچ یہ ہے کہ یہ بھی محض زبان ہی سے خدا تعالیٰ کی قدرت کو کامل کہتے ہیں دل سے یہ بھی کامل نہیں مانتے چنانچہ مصائب وحوادث میں ہم اپنے قلب میں وہی ضعف پاتے ہیں جو قائل دہریت کے قلب میں ہوتا ہے ہم نے مانا کہ طبیعت کا بھی اقتضا ہوتا ہے۔ مگر پھر بھی طبیعت کے اقتضا میں اعتقاد کی وجہ سے کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ جیسے گرم پانی جو بہت گرم ہو جس کی حرارت ناگوار ہو۔ اس میں ٹھنڈا پانی مل جانے سے کچھ تو فرق ضرور ہوتا ہے اب حرارت ناگوار نہیں ہوتی اسی طرح اعتقاد قدرت الٰہیہ کی برودت سے

بھی خلجان میں کچھ تو کمی ہونا چاہیے۔ ہاں اگر کوئی یہ کہے کہ فرق تو ہے مگر چوں کہ ہمارا اقرار ضعیف ہے اس لئے اس فرق کا ظہور نہیں ہوا جیسے گرم پانی کے ایک مٹکے میں لوٹا بھر ٹھنڈا پانی ملا دیا جائے تو پہلے سے گرمی میں کمی ضرور ہوگی مگر اس کا احساس بھی نہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جو شے اپنے اثر سے خالی ہو وہ معتبر نہیں جس چیز پر غایت مرتب نہ ہو۔ وہ غیر معتدلہ ہے اس لئے یہ اعتقاد جس کا اثر کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا معتدلہ نہیں دنیا میں تو اس سے کچھ نفع نہ ہوگا گو آخرت میں کسی مدت کے بعد کام آجائے۔ (خیر الحیات وخیر الممات، ص:۵)

سوال: کیا قیاس ورائے کی اکثریت کلیتہً دلیل بن جاتی ہے؟

جواب ۱: آج کل یہ عجیب مسئلہ نکلا ہے کہ جس طرف کثرت رائے ہو وہ بات حق ہوتی ہے صاحبو! یہ ایک حد تک صحیح ہے مگر یہ بھی معلوم ہے کہ رائے سے کس کی رائے مراد ہے کیا ان عوام کالانعام کی۔ اگر ان کی رائے مراد ہے تو کیا وجہ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کی رائے پر عمل نہیں کیا ساری قوم ایک طرف رہی اور حضرت ہود علیہ السلام ایک طرف آخر انہوں نے کیوں کیا کہ قید کو چھوڑ کر بت پرستی اختیار نہ کی۔ کیوں تفریق قوم کا الزام سر لیا۔ اسی لئے کہ وہ قوم جاہل تھی اس کی رائے جاہلانہ رائے تھی۔ آج کل علماء پر یہی الزام لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے قوم میں پھوٹ ڈال دی یہ اتفاق نہیں ہونے دیتے۔

(فضائل العلم والخشیہ، ص:۳۰)

جواب ۲: (غزوۂ اُحد میں) ان پچاس آدمیوں میں جو جو پہاڑ کی گھاٹی میں متعین کر دیئے گئے تھے اختلاف ہوا۔ بعض نے کہا کہ ہمارے بھائیوں کو فتح حاصل ہوگئی ہے اب ہم کو گھاٹی پر رہنے کی ضرورت نہیں۔ حضور اکرم ﷺ نے جس غرض کے لئے ہم کو متعین کیا تھا وہ غرض حاصل ہو چکی۔ اس لئے حکم قرار بھی ختم ہوگیا۔ اب یہاں سے ہٹنے میں حضور کے مقصود کی مخالفت نہ ہوگی اور ہم نے اب تک جنگ میں کچھ حصہ نہیں لیا تو کچھ ہم کو بھی کرنا چاہیے۔ ہمارے بھائی کفار کا تعاقب کر رہے ہیں ہم کو مال غنیمت جمع کر لینا چاہیے بعض نے اس رائے کی مخالفت کی اور کہا کہ حضور ﷺ نے صاف فرما دیا تھا کہ بدوں میری اجازت کے یہاں سے نہ ہٹنا۔ اس لئے ہم کو بدون آپ کی اجازت کے ہرگز نہ ہٹنا چاہیے۔ مگر پہلی رائے والوں نے نہ مانا اور چالیس آدمی گھاٹی سے ہٹ کر مال غنیمت جمع

کرنے میں مشغول ہو گئے یہ اُن سے اجتہادی غلطی ہوئی اور گھاٹی پر صرف دس آدمی اور ایک ان کے افسر رہ گئے (اس واقعہ میں کثرت رائے غلطی پر تھی اور قلت رائے صواب پر تھی۔ جو لوگ کثرت رائے کی غلطی پر تھے اور قلت رائے صواب پر تھے جو لوگ کثرت رائے کو حق سمجھتے ہیں وہ اس سے سبق حاصل کریں) (ذم النسیان، ص:۱۲)

جواب ۳: حضور ﷺ کے وصال کے بعد کچھ قبائل مرتد ہو گئے تھے۔ جن میں بعض تو مسیلمہ کذاب وغیرہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہو گئے تھے اور بعض لوگ کسی کے ساتھ تو نہیں ہوئے بلکہ ظاہر میں اپنے کو مسلمان کہتے رہے توحید و رسالت کے مقر رہے کعبہ کو قبلہ مانتے رہے نماز کی فرضیت کے قائل رہے۔ مگر زکوٰۃ کی فرضیت سے منکر ہو گئے اور یہ کہا کہ فرضیت زکوٰۃ صرف حضور ﷺ کے زمانہ سے مخصوص تھی اب فرض نہیں اور علت یہ بتلائی کہ حضور ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں پر فقر زیادہ تھا اس لئے اس وقت زکوٰۃ کی ضرورت تھی۔ اب وہ حالت نہیں رہی۔ اس لئے فرضیت بھی باقی نہیں رہی۔ جیسے آج کل بھی بہت سے لوگ اس قسم کی تاویلیں کرتے ہیں پہلی جماعت کے بارے میں سب صحابہ کی بالاتفاق یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ جہاد کر لیا جائے۔ مگر دوسری جماعت کے حق میں یہ سب کی رائے نرم تھی۔ حتی کہ حضرت عمرؓ کی بھی یہ رائے تھی کہ ان کے ساتھ نرمی کی جائے۔ اور جو کھلے کافر ہیں صرف ان سے لڑائی کی جائے ان لوگوں پر جہاد نہ کیا جائے حضرت صدیق اکبرؓ کی رائے اس دوسری جماعت کے متعلق بھی وہی تھی۔ جو اور مرتدین کے متعلق تھی وہ ان لوگوں کو کافر کہتے تھے اور یہ فرماتے تھے کہ جو شخص نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا میں اس کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمرؓ کہتے تھے کہ یہ لوگ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہتے ہیں ہمارے قبلہ کی طرف نماز پڑھتے ہیں۔ ان پر کیوں کر جہاد ہو سکتا ہے اور ان کو کفار کی طرح کیسے قتل کیا جا سکتا ہے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ سب کچھ صحیح مگر یہ لوگ نماز کو تو فرض مانتے ہیں اور زکوٰۃ کو فرض نہیں مانتے حالاں کہ شریعت نے دونوں کو فرض کیا ہے تو یہ لوگ فرض قطعی کے منکر ہیں اور ان لوگوں نے دین کو بدل دیا ہے۔ اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے: ''من بدل دینہ فاقتلوہ'' اس لئے میں ان کے ساتھ قتال کروں گا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پھر کہا کہ آپ کلمہ گو آدمیوں سے کیسے قتال کریں

گے۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

اجبار فی الجاهلية خوار فی الاسلام والله لو منعونی وفی روایته عناقاً عقالاً كانوا يودونه الى رسول الله ﷺ لاقاتلهم عليه۔

ترجمہ -اے عمر یہ کیا کہ تم جاہلیت میں تو اتنے زبردست تھے اور اسلام میں اتنے بودے (کمزور) ہو گئے۔ بخدا اگر یہ لوگ ایک رسی کو یا بکری کے بچہ کو بھی روکیں گے جو رسول اللہ ﷺ کو دیا کرتے تھے۔ تو میں اس پر بھی ان سے قتال کروں گا۔

اور یہ بھی فرمایا کہ جب یہ آیت نازل ہوئی۔ ان الله معنا ۔تو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس وقت میں بھی تھا تو خدا تعالیٰ میرے ساتھ بھی ہیں اگر میں تنہا بھی جہاد کو نکل کھڑا ہوں گا تو خدا میرے ساتھ ہے۔ انشاء اللہ میں تمام دنیا پر غالب آؤں گا۔ کیا انتہا ہے اس قوت قلب کی۔ چنانچہ پھر سب صحابہ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کی رائے پر متفق ہو گئے اس واقعہ سے بھی ان لوگوں کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔ جو کثرت رائے کو علامت حق سمجھے ہوئے ہیں۔ (ذم الیسان، ص:۳۰)

سوال :ایک زہر آلود سوال کہ ''کام شریعت محمدی ﷺ کو مصالح دنیوی کی بنا پر ٹھہرانا'' افسوسناک بات ہے؟

جواب:اس طرز تقریر میں زہر بھرا ہوا ہے جو اس کو جان لے گا وہ سمجھ جائے گا کہ یہ لوگ ایسے اسرار بیان کر کے اسلام کے ساتھ دوستی نہیں کرتے بلکہ دشمنی کرتے ہیں اور یہ لوگ حامیٔ اسلام نہیں بلکہ اسلام کے نادان دوست ہیں۔ ع

دوستی بخیر دچوں دشمنی ست

اب میں آپ کو بتلاتا ہوں کہ اس تقریر میں زہر کیا ہے۔ اس میں مضمون کا حاصل یہ ہے کہ بس اصل چیز تو اتفاق ہے اور جماعت پنج گانہ اور جمعہ وعیدین وحج اسی اتفاق کے پیدا کرنے کے واسطے ذرائع ووسائل ہیں۔ تو عجب نہیں کہ بعض لوگوں پر اس کا یہ اثر ہو کہ وہ ان احکام کو مقصود بالذات نہ سمجھیں اور اگر کبھی کسی دوسرے طریق سے اتفاق ممکن ہوا تو وہ بہت آسانی سے جماعت اور نماز دونوں کے چھوڑنے پر آمادہ ہو جائیں گے کیوں کہ ان کے خیال میں تو یہ سب احکام حصول اتفاق کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ اور ان کو قلب میں جانے

اور تھیٹر میں مل کر شریک ہونے سے بھی یہ بات حاصل ہو سکتی ہے۔ جہاں راحت سے آرام کرسی اور گدے تکیوں پر جگہ ملتی ہے۔ تو وہ خواہ مخواہ مسجد میں کیوں آنے لگے اور وضو اور نماز کی مشقت کیوں برداشت کرنے لگے۔ چنانچہ اس وقت ان تقریروں کا یہ اثر ضرور نمایاں ہو رہا ہے۔ اخباروں میں ایک شخص کا قول شائع ہوا تھا۔ کہ وضو کی ضرورت ابتدائے اسلام میں تھی۔ آج کل نہیں ہے۔ کیوں کہ اس وقت بدوی لوگ پاک وصاف نہ رہتے تھے۔ جنگل کے کاروبار سے غبار آلود آتے تھے۔ اس لئے ان کو وضو کا حکم کیا گیا۔ اور ہم لوگ آج کل صفائی کا بہت اہتمام رکھتے ہیں ہر وقت موزے اور دستانے چڑھائے رہتے ہیں جن کی وجہ سے ہاتھ پیر گرد سے محفوظ رہتے ہیں ہم کو وضو کی ضرورت نہیں یہ نتیجہ ہے ایسے اسرار بیان کرنے کا اب ہر شخص اس قسم کی مصلحتوں ہی کو مقصود سمجھنے لگا اور اس شخص سے کچھ بھی تعجب نہیں کہ وہ نماز کو چھوڑ دے اور یہ کہے کہ نماز کی ضرورت ابتداء اسلام میں اس لئے تھی کہ اس زمانے کے لوگ جاہلیت کی وجہ سے بڑے متکبر وسرکش ہوتے تھے اور ان کو مہذب بنانے کے لئے یہ افعال تواضع وخشوع کی تعلیم کے لئے فرمائے گئے تھے اور ہم لوگ تعلیم یافتہ ہیں۔ ہمارے اندر تعلیم سے تہذیب پیدا ہو گئی ہے ہم کو نماز کی کیا ضرورت ہے۔ اسی طرح قربانی کے متعلق ایک شخص نے جو کہ مسلمان ہیں۔ انگلستان سے مجھ کو لکھا تھا کہ قربانی شریعت کو مقصود نہیں اور یہ بالکل عقل کے خلاف ہے کہ ایک دن میں اتنے جانوروں کو ذبح کیا جاوے۔ جن کا گوشت آدمیوں سے کھایا بھی نہ جائے۔ چنانچہ اس لئے منیٰ میں قربانی کرتے ہی جانوروں کو کھیتوں میں ڈال دیا جاتا ہے، غضب یہ ہے کہ آج کل خدا پر بھی عقل کی حکومت ہونے لگی۔ صد افسوس ہے میں کہتا ہوں کہ اگر ایک جج کسی مجرم کو سزا دے۔ اور مجرم یہ کہے کہ یہ سزا تو عقل کے خلاف ہے تو کیا وہ اس بات کی سماعت کرے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ صاف یہ کہے گا کہ قانون پر تمہاری عمل کی حکومت نہیں۔ بلکہ قانون عقل پر حاکم ہے اور اس کے اس جواب کو سب عقلاء کے تابع کرنا چاہتے ہیں اور یہ جواب علی سبیل التنزل ہے ورنہ قانون الٰہی تو بالکل عقل کے مطابق ہے بشرطیکہ عقل سلیم ہو یہ کیا ضرور ہے کہ ہر شخص کی عقل میں اس کی حکمتیں آجایا کریں آخر پارلیمنٹ کے عقلاء جو قوانین تجویز کرتے ہیں کیا ہر عامی عقل اس کے مصالح تک پہنچ جاتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ اس کے مصالح کو ہر شخص اپنی عقل سے کیوں معلوم کرنا چاہتا ہے اور یہاں یہ کیوں نہیں کہا جاتا۔ کہ

قانون الٰہی عقل کے مطابق ضرور ہے مگر ہماری عقلیں اس کے مصالح سمجھنے سے قاصر ہیں خاص خاص لوگ ہی اس کو سمجھ سکتے ہیں اور بالفرض اگر کسی قانون کی حکمت خاص لوگوں کی عقل میں بھی نہ آئے تو قانون کے بدلنے کا بھی کسی کو اختیار نہیں۔ کیوں کہ قانون پر عقل حاکم نہیں۔ بلکہ اس کے ماتحت اور اس کی تابع ہے۔ غرض ان حضرت نے مجھے لکھا کہ قربانی خود شریعت کو مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود غرباء کی امداد ہے۔ اور ابتداء اسلام میں لوگوں کے پاس نقد کم تھا۔ مویشی زیادہ تھے اس لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا۔ کہ جانور ذبح کر کے غرباء کو گوشت دے دو۔ اور اس زمانہ میں نقد بھی بہت موجود ہے۔ غلہ بھی موجود ہے۔ بس آج کل بجائے قربانی کے نقد روپے سے غربا کی امداد کرنا چاہیے۔ تو اس شخص نے قربانی کی حکمت امداد غرباء سمجھ کر جب یہ دیکھا کہ یہ حکمت دوسرے طریقہ سے بآسانی حاصل ہو سکتی ہے قربانی چھوڑنے کا ارادہ کر لیا حالاں کہ یہ حکمت مقصود ہی نہیں۔ بلکہ مقصود تو تعمیل حکم ہے اگر یہ حکمت مقصود ہوتی تو اس کی کیا وجہ کہ غرباء کو زندہ جانور دینے سے واجب ادا نہیں ہوتا۔ اور اس زمانہ میں نقد اور غلہ کم تھا اور مویشی زیادہ تھے اس لئے جانوروں کے ذریعے غرباء کی امداد کا طریقہ مقرر ہوا تھا۔ تو اس کے کیا معنی کہ جانور کو ذبح کر کے غرباء کو گوشت ہی دیا جائے تو واجب ادا ہو اور زندہ جانور کسی غریب کو دے دیں تو واجب ادا نہ ہو۔ پھر کیا پہلے مسلمان پر نقد کی وسعت کبھی نہ ہوئی تھی بالکل غلط ہے۔ تاریخ اٹھا کر دیکھو تو معلوم ہوا کہ صحابہؓ نے جس وقت کسریٰ و قیصر کے خزانے فتح کئے تو مسلمانوں کے پاس نقد سونا اور چاندی اس قدر تھا کہ آج کل تو اس کا عشر عشیر بھی نہ ہوگا۔ پھر اس وقت صحابہ کو یہ بات کیوں نہ سوجھی جو اس شخص کو انگلستان میں بیٹھ کر سوجھی اور صحابہ نے بجائے قربانی کے نقد امداد کو کیوں نہ اختیار کیا۔ دوسرے اگر یہ حکمت قربانی سے مقصود بالذات ہوتی تو اس کا مقتضا یہ تھا کہ قربانی کے گوشت میں سے کسی حصہ کا تصدق ضرور واجب ہوتا۔ حالاں کہ شریعت میں یہ بھی حکم نہیں۔ بلکہ اگر کوئی شخص سارا گوشت خود ہی کھا لے اور غریبوں کو حصہ برابر بھی نہ دے۔ تو قربانی میں کچھ قصور نہیں آتا۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ امداد غرباء قربانی سے مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ کچھ اور ہے۔ مگر آپ نے دیکھ لیا۔ کہ اس قسم کے اسرار بیان کرنے کا نتیجہ کہاں تک پہنچا ہے کہ ہر شخص اپنی مخترع حکمتوں پر احکام کا مدار سمجھنے لگا۔

(سبیل النجاح: ص: ۱۵)

سوال: دنیا کی سب سے بڑی معتبر جگہ کعبہ ہے اور قاعدہ ہے کہ کوئی عظیم الشان شئی کسی کے استقبال کے لئے نہیں جاسکتی تو پھر خانہ کعبہ بعض بزرگوں کے استقبال کے لئے کیسے اور کیوں کر گیا؟

جواب: بعض بزرگوں کی نسبت یہ مشہور ہے کہ وہ مکہ معظّمہ پہنچے تو جا کر دیکھا کہ کعبہ نہیں ہے سخت حیرت ہوئی اور باری تعالیٰ سے دعا کی کہ مجھے معلوم ہو جاتا کہ اس وقت کعبہ کہاں ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ ہم منکشف کر دیتے ہیں۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ایک بزرگ آرہے تھے۔ کعبہ ان کے استقبال کو گیا ہوا تھا اور یہ حکایت تین فرقوں کو مضر ہوئی ایک تو ان کو جنہیں دین سے کچھ تعلق اور واسطہ نہیں۔ ایسے لوگوں نے تو اس کی تکذیب کی اور کہنے والوں پر ہنسنا اور وہم پرست کہنا شروع کیا۔ دوسرے ان دینداروں کو جو کہ محض ظاہر پرست ہیں ایسے لوگوں نے ان کو صوفیہ کے ڈھکوسلے کہہ کر اڑا دیا تیسرے ان لوگوں کو جو فلسفی دماغ کے ہیں اور تاریخ ان کا نصب العین ہے۔ انہوں نے اس کو خلاف عقل بتلایا۔ اور یہ اعتراض اس پر کیا کہ اگر ایسا ہوتا تو تاریخ میں اس کا تذکرہ ضرور ہوتا سو ہم نے کسی تاریخ میں نہیں دیکھا۔ حالاں کہ ان تینوں کی حالت یہ ہے کہ ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

تو سمجھو کہ ایک تو کعبہ کی صورت ہے اور ایک کعبہ کی رُوح ہے۔ روح کعبہ ایک خاص تجلی ہے کہ کعبہ ظاہری اس کا مظہر ہے پس جن بزرگ نے یہ دیکھا کہ کعبہ اپنی جگہ نہیں ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ روح کعبہ زائرین کی طرف متوجہ نہیں ہے بلکہ ان بزرگ کی طرف متوجہ ہے۔ غرض بعض بزرگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ جن کی طرف کعبہ نے خود توجہ کی۔ لیکن حج کے لئے ان کو بھی خود کعبہ ہی میں آنا پڑا۔ (اصلاح النفس: ص:۱۴)

سوال: مسلمانوں کا کہنا ہے کہ عالم کا سب سے اچھا اور اہم مذہب مذہب اسلام ہے تو پھر اس مذہب میں زور زبردستی کے ساتھ سلطنت نے جمہوری تعلیم کیوں؟

جواب: نظام عالم تابعیت و متبوعیت کو چاہتا ہے۔ اس لئے متبوع کو تابع کی مساوات گوارہ نہیں۔ اسی وجہ سے سلطنت کی ضرورت ہے۔ تاکہ ایک تابع ہو۔ ایک متبوع ہو سب کے سب آزاد نہ ہو۔ تو ہر شخص آزاد ہوگا اور آزادی مطلق انتظام کے لئے ہرگز کافی نہیں چنانچہ آج کل ایک فرقہ نکلا ہے جو سلطنت کا مخالف ہے۔ مگر میں نہیں سمجھتا کہ بدون سلطنت کے

انتظام نزاعات کا فیصلہ کیوں کر ہوگا اگر کہو کہ کثرت رائے سے فیصلہ ہوگا تو میں کہتا ہوں کہ جن کثیرین کی رائے پر فیصلہ ہوگا وہی سلطنت کے مصداق ہوگئے کیوں کہ ان کے سامنے دوسروں کی آزادی سلب ہوگئی اور یہی حقیقت ہے سلطنت کی کہ بعض کی آزادی مطلق کہاں رہی اس فیصلہ کی پابندی سے بھی تو آزادی سلب ہوگی تو یہ لوگ جس چیز کو مٹاتے ہیں۔ اخیر میں اس کو ثابت کرتے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے بھی آزادی مطلق کو گوارا نہیں کیا۔ بلکہ ایک کو تابع ایک متبوع بنایا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اپنے احکام نبی کے واسطے بھیجے ہیں اور تمام مخلوق پر نبی کا اتباع فرض کیا ہے۔ تاکہ مخلوق کو کسی ایک کا تابع کیا جاوے ورنہ بہت سہل تھا کہ انبیاء کو نہ بھیجتے بلکہ آسمان سے چھپے ہوئے کاغذ ہر ایک کے پاس آکر گرتے اور ہر شخص اس کو پڑھ کر کام کرتا نہ نبی کا اتباع ضروری ہوتا نہ خلیفہ کا نہ علماء و مجتہدین کا، شاید کوئی کہے کہ خدا تعالیٰ کے یہاں پریس کہاں ہے میں کہتا ہوں کہ جب تم پریس ایجاد کر چکے ہو تو خدا تعالیٰ کو پریس بنالینا کیا مشکل ہے۔ بلکہ تم جو کچھ ایجاد کرتے ہو اور عقل خدا کی دی ہوئی ہے تو یہ ایجاد بھی حقیقت میں خدا تعالیٰ کی ایجاد ہے تمہارا محض نام ہی نام ہے اس لئے شبہ محض لغو ہے دوسرے میں دعویٰ کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ کے یہاں اس وقت بھی پریس موجود ہیں کیوں کہ کاتبین اعمال کا لکھا ہوا قیامت تک نہ مٹے گا۔ ایسی سیاہی اور ایسا کاغذ تو کسی پریس کو نصیب نہیں۔ جو قیامت تک باقی رہے۔ پھر کاتبین اعمال آپ کے کاموں کو ایسی سیاہی سے روزانہ لکھتے ہیں انہی احکام کو لکھ کر اگر ہر شخص کے پاس ڈال دیا کریں تو کیا مشکل ہے۔ مگر حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا بلکہ احکام کو نبی پر نازل کیا اور مخلوق کو نبی کا تابع کیا تاکہ آزادی سلب ہوجائے۔ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں اور حریت و مساوات کے مدعی ہیں۔ وہ بھی آزادی کا عام ہونا گوارا نہیں کرتے۔ کیوں کہ جمہوری سلطنت کے بعد بھی کبھی وہ کوئی قانون ہوگا جس کی پابندی عام رعایا پر لازم ہوگی۔ تو اس قانون کے سامنے سب کی آزادی سلب ہوجائے گی ہم تو آزادی کا دعویٰ جب مانیں گے جب کہ کسی شخص کو بھی قانون کا پابند نہ کیا جاوے۔ بلکہ جس کے جو جی میں آوے کرنے دیا جاوے کسی سے کچھ مزاحمت نہ کی جاوے کیوں کہ تم تو آزادی کے حامی ہو تو آزادی تو اسی کا نام ہے کہ کوئی کسی بات کا پابند نہ ہو۔ پھر تم لوگوں کو قانون کا پابند کیوں بناتے ہو۔ اور ان کی آزادی کو قانون کا تابع کیوں بناتے ہو یا کم از کم یہی کرو کہ قانون بنانے میں ساری رعایا کی رائے

لے لیا کرو۔ قانون کے لئے پارلیمنٹ کی مختصر جماعت کو کیوں خاص کر رکھا ہے۔ اور تمام رعایا کو چند آدمیوں کی رائے کا تابع کیوں بنا رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ جمہوری سلطنت کے حامی ہیں وہ بھی شخصیت ہی کے حامی ہیں۔ مگر شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے کبھی حکمی۔ فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے حقیقی نہیں۔ تو یہ لوگ جس پارلیمنٹ کے فیصلوں کا اتباع کرتے ہیں اس میں گو بظاہر بہت سے آدمی ہوتے ہیں مگر مجموعہ مل کر پھر شخص واحد ہے کیوں؟ اس لئے کہ جو قانون پاس ہوتا ہے وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوتا ہے پارلیمنٹ میں بھی ہر شخص آزاد نہیں کہ جو شخص جو رائے دیدے وہی پاس ہو جایا کرے۔ ایسا بھی ہوتا جب بھی کسی قدر آزادی کا دعویٰ صحیح ہوتا مگر وہاں تو پارلیمنٹ کے بھی ہر شخص کی انفرادی رائے معتبر نہیں۔ بلکہ اجتماعی رائے معتبر ہے اور اجتماعی رائے پھر شخصی رائے ہے۔ کیوں کہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہم شخص واحد حقیقی کے حامی ہیں اور تم شخص واحد حکمی کے حامی ہو، جمہوریت کے حامی تو تم بھی نہ رہے۔ جمہوریت اور آزادی کامل تو جب ہوتی جب ہر شخص اپنے فعل میں آزاد ہوتا کوئی کسی کا تابع نہ ہوا۔ نہ ایک بادشاہ کا نہ پارلیمنٹ کے دس ممبروں کا اور یہ کیا آزادی ہے کہ تم نے لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو پارلیمنٹ کے دس ممبروں کی رائے کا تابع بنا دیا ہم تو ایک ہی کا غلام بناتے تھے تم نے دس کا غلام بنا دیا تمہیں فیصلہ کر لو کہ ایک کا غلام ہونا اچھا ہے یا دس بیس کا غلام ہونا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص پر ایک کی حکومت ہو وہ اس سے بہتر ہے جس پر دس بیس کی حکومت ہو۔ یہ حاصل ہے جمہوری سلطنت کا کہ رعایا کی غلامی سے تو اس کو بھی انکار نہیں۔ مگر وہ یہ کہتی ہے کہ تم دس بیس کی غلامی کرو اور ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف ایک کی غلامی کرو۔ شریعت میں یہ خاص بات ہے کہ اس کے دعاوی کہیں نہیں ٹوٹتے۔ کسی وقت ان کو اپنے دعوے سے ہٹنا پڑتا ہے۔ آخر کیوں ہٹتے ہو۔ اگر کوئی شخص پارلیمنٹ کے فیصلہ کو نہ مانے تو اس کو مجبور کیوں کرتے ہو۔ اسے پارلیمنٹ کا غلام کیوں بناتے ہو۔ آزاد کیوں نہیں رہنے دیتے مگر کیوں کر آزاد رہنے دیں۔ نظام عالم بدون اس کے قائم نہیں ہو سکتا کہ مخلوق میں بعض تابع ہوں بعض متبوع ہوں۔ آزادی مطلق سے فساد برپا ہوتے ہیں۔ اس لئے یہاں آکر ان کو اپنے دعویٰ آزادی سے ہٹنا پڑتا ہے اور شریعت کو کبھی اپنے دعوے سے ہٹنا نہیں پڑتا۔ کیوں کہ وہ تو پہلے ہی سے تابعیت و متبوعیت کی حامی ہے تو وہ آزادی کا سبق

سکھاتی ہی نہیں اوّل ہی دن سے نبی کے اتباع کا حکم دیتی ہے۔ جس سے تمام مخلوق کو ایک کا تابع کر دیا۔ بلکہ کسی وقت خدائے تعالیٰ نے ایک زمانے میں دو نبی بھی ایک قوم کی طرف ارسال کئے ہیں۔ تو ان میں بھی ایک تابع تھے دوسرے متبوع تھے چنانچہ حضرت موسیٰ وہارون علیہما السلام ایک زمانہ میں دو نبی تھے۔ جو بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے مگر ان میں حضرت موسیٰ علیہ السلام متبوع تھے۔ حضرت ہارون علیہ السلام تابع تھے۔ دونوں برابر درجہ میں نہ تھے اور یہ تابعیت محض ضابطہ کی تابعیت نہ تھی۔ بلکہ واقعی تابعیت تھی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وہارون علیہ السلام پر پوری حکومت رکھتے تھے۔ وہ ان کی مخالفت نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک واقعہ ایسا پیدا کر دیا جس سے اس حقیقت کا ظہور ہو گیا جب موسیٰ علیہ السلام تورات لینے کے لئے کوہ طور پر تشریف لے گئے تو ہارون علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنا کر چھوڑ گئے تھے کہ میرے پیچھے بنی اسرائیل کا خیال رکھنا اور ان کی اصلاح کرتے رہنا یہاں پیچھے یہ قصہ ہوا کہ سامری نے ایک سونے کا بچھڑا بنایا اور اس میں قدم جبرئیل کی مٹی ڈال دی جس سے اس میں حیات پیدا ہو گئی ''فقالوا ھٰذا الٰھکم و الٰہ موسی فنسی '' جاہل لوگ کہنے لگے کہ ہمارا اور موسیٰ علیہ السلام کا خدا یہ ہے وہ بھول کر نہ معلوم کہاں چلے گئے۔ بس بے وقوف اس کی عبادت کرنے لگے اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس واقعہ کی اطلاع دی۔ وہ غصہ میں بھرے ہوئے تشریف لائے اور قوم کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا۔ اسی وقت انہوں نے ہارون علیہ السلام سے فرمایا کہ جب یہ کمبخت گمراہ ہو گئے تھے تو تم یہاں کیوں رہے۔ میرے پاس باقی ماندہ جماعت کو لے کر کیوں نہ چلے آئے۔ اور غصہ میں ان کا سر اور ڈاڑھی پکڑ کر کھینچنے لگے۔ ''قَالَ یَابْنَؤُمَّ لَاتَاْخُذْبِلِحْیَتِی وَلَابِرَاْسِیْ '' ہارون علیہ السلام نے کہا کہ ارے بھائی میری ڈاڑھی اور سر کو نہ پکڑو میری بات سنو! مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں ان کو چھوڑ کر چل دوں گا تو آپ یہ نہ کہیں کہ تو نے وہاں رہ کر ان کو سمجھایا کیوں نہیں؟۔ ان کی اصلاح کیوں نہ کی۔ اس لئے میں یہیں رہ کر ان کو سمجھاتا رہا۔ لیکن وہ لوگ نہ مانے نیز ہارون علیہ السلام عمر میں موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے، مگر نبوت میں ان کے تابع تھے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام نے بے تکلف اپنی متبوعیت اور اس کی تابعیت کے مقتضیٰ پر عمل کیا اور ایسا برتاؤ فرمایا۔ جو حاکم ومحکوم کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ آج ایک سب انسپکٹر باوجود یہ کہ انسپکٹر کا تابع اور ماتحت ہوتا ہے مگر

انسپکٹر اپنے ماتحت کے ساتھ ایسا کر کے تو دیکھیں معلوم ہوا کہ ہارون علیہ السلام کی تابعیت محض ضابطہ کی نہ تھی۔ بلکہ واقعی تابعیت تھی جس کا اس واقعہ سے ظہور ہو گیا۔ اور لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ دونوں رسولوں میں ایک تابع ہیں ایک متبوع ہیں اور دونوں یکساں مرتبے میں نہیں ہیں اس واقعہ سے بعض لوگوں کو تعجب ہوتا ہوگا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فعل میں کیا حکمت تھی۔ لیجئے ایک حکمت تو میرے قلب پر اسی وقت آ گئی کہ حق تعالیٰ کی متبوعیت اور تابعیت کا ظاہر کرنا تھا اس لئے موسیٰ علیہ السلام کو غصہ سے ایسا بیتاب کر دیا جس سے انہوں نے اپنی حکومت و متبوعیت کے مقتضاء پر بے تکلف عمل کیا اور نہ معلوم کتنی حکمتیں ہوں گی۔ غرض اسلام میں جمہوری سلطنت کوئی چیز نہیں۔ اسلام میں محض شخصی حکومت کی تعلیم ہے اور جن مفاسد کی وجہ سے جمہوری سلطنت قائم کی گئی ہے وہ سلطنت شخصی میں تو محتمل ہی ہیں اور جمہوری میں متیقن ہیں شخصی سلطنت میں یہ خرابیاں ہو جاتی ہیں کہ اس میں ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام چھوڑ دیا جاتا ہے کہ وہ جو چاہے کرے۔ حالاں کہ ممکن ہے کہ کسی وقت اس کی رائے غلط ہو اس لئے ایک شخص کی رائے پر سارا انتظام نہ چھوڑنا چاہیے۔ بلکہ ایک جماعت کی رائے سے کام ہونا چاہیے، میں کہتا ہوں کہ جس طرح شخصی سلطنت کے بادشاہ کی رائے میں کبھی غلطی کا احتمال ہے۔ اسی طرح جماعت کی رائے میں بھی غلطی کا احتمال ہے کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک شخص کی رائے ہمیشہ غلط ہوا کرے۔ اور دس کی رائے ہمیشہ صحیح ہوا کرے بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کا ذہن وہاں پہنچتا ہے جہاں ہزاروں آدمیوں کا ذہن نہیں پہنچتا۔ ایجادات عالم میں رات دن اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کیوں کہ جتنی ایجادات ہیں وہ اکثر ایک ایک شخص کی عقل کا نتیجہ ہیں۔ کسی نے کچھ سمجھا کسی نے کچھ سمجھا ایک نے تار برقی کو ایجاد کیا۔ ایک نے ریل کو ایجاد کیا۔ تو موجد اکثر ایک شخص ہوتا ہے اور اس کا ذہن وہاں پہنچتا ہے۔ جہاں صدہا ہزار مخلوق کا ذہن نہیں پہنچتا علوم میں بھی یہ امر شاہد ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کسی مضمون کو اس طرح صحیح حل کرتا ہے کہ تمام شراح و محشین کی تقریریں اس کے سامنے غلط ہو جاتی ہیں تو جماعت کی رائے کا غلط ہونا بھی متحمل ہے۔ اب بتلایئے اگر کسی وقت بادشاہ کی رائے صحیح ہوئی اور پارلیمنٹ کی رائے غلط ہوئی تو عمل کس پر ہوگا۔ جمہوری سلطنت میں کثرت رائے پر فیصلہ ہوتا ہے تو بادشاہ اپنی رائے پر عمل نہیں کر سکتا۔ بلکہ یہ کثرت رائے سے مغلوب ہو کر غلط رائے کی موافقت پر مجبور

ہوتا ہے اور شخصی سلطنت میں بادشاہ اپنی رائے پر ہر وقت عمل کر سکتا ہے، اور جمہوری میں اگر کثرت رائے غلطی پر ہوئی تو صحیح رائے پر عمل کرنے کی کوئی صورت نہیں۔ سب مجبور ہیں غلط رائے کی موافقت پر اور یہ کتنا بڑا ظلم ہے اس لئے یہ قاعدہ ہی غلط ہے کہ کثرت رائے پر فیصلہ کیا جائے بلکہ قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ صحیح رائے پر عمل کیا جاوے خواہ وہ ایک ہی شخص کی رائے ہو مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادیؒ سید احمد خاں کی رائے پر فیصلہ کرتے ہیں کیوں کہ قانون فطرت یہ ہے کہ دنیا میں عقلاء کم ہیں اور بیوقوف زیادہ تو اس قاعدہ کی بناء پر کثرت رائے کا فیصلہ بیوقوفی کا فیصلہ ہوگا۔

سید احمد خاں نے جواب دیا کہ دنیا میں جو عقلاء کی قلت اور بیوقوفوں کی کثرت ہے یہ اس صورت میں ہے جب کہ بہت سے آدمیوں کو کیف ما اتفق جمع کر لیا جائے تو ان میں واقعی بیوقوف زیادہ ہوں گے لیکن ہم جن لوگوں کی کثرت رائے پر فیصلہ کرتے ہیں وہ کیف ما اتفق جمع نہیں کئے جاتے، بلکہ انتخاب کر کے خاص خاص آدمیوں کی کمیٹی بنائی جاتی ہے، جس میں سب عقلاء کی کثرت ہوتی ہے۔ مولانا نے جواب دیا کہ بہت اچھا لیکن عقلاء میں بھی قانون فطرت یہ ہے کہ کامل العقل تھوڑے ہیں اور ناقص العقل زیادہ چنانچہ تجربہ کر لیا جاوے کہ ہزاروں عاقلوں میں کامل العقل ایک دو ہی ہوتے ہیں۔ تو عقلاء میں بھی کثرت انہیں لوگوں کی ہے جو ناقص العقل ہیں۔ پس کثرت رائے پر فیصلہ اگر حماقت کا فیصلہ نہیں تو کم عقلی کا فیصلہ تو ضرور ہی ہوگا۔ سید احمد خاں کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ بالکل خاموش ہی ہو گئے، غرض صحیح رائے پر عمل کرنا بدون شخصی حکومت کے ممکن نہیں جمہوری میں تو کثرت رائے کا اتباع لازم ہے۔ خواہ وہ غلط ہو یا صحیح ہو بلکہ مولانا محمد حسین صاحب کے قول کے موافق کثرت رائے اکثر غلط ہی ہوگی تو گویا جمہوری میں اکثر غلط رائے پر عمل ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ جب تک صحیح رائے پر عمل نہ ہوگا۔ اس وقت تک انتظام درست نہیں ہو سکتا۔ پس ثابت ہو گیا کہ انتظام بدون شخصی حکومت کے نہیں ہو سکتا۔ دوسرے جو لوگ کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار رکھتے ہیں وہ بادشاہ کو تنہا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیتے، وہ پہلے ہی سے اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہمارا بادشاہ ایسا ضعیف الرائے ہے کہ اس کی تنہا رائے قابل اعتبار نہیں اور وہ نااہل ہے تو واقعی جو لوگ اپنے بادشاہ کو ایسا سمجھتے ہوں ہم ان سے گفتگو نہیں کرتے ان کو جمہوریت مبارک ہو۔ ایسا نااہل بادشاہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کو

شخصی سلطنت کا بادشاہ بنایا جائے اسلام میں جو شخصی سلطنت کی تعلیم ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی حکم ہے کہ اے اہل وعقد اور اے جماعت عقلاء بادشاہ ایسے شخص کو بناؤ جو اتنا صائب الرائے ہو کہ اگر کبھی اس کی رائے سارے عالم کے بھی خلاف ہو تو یہ احتمال ہو سکے کہ شاید اسی کی رائے صحیح ہو۔ اور جس کی رائے میں اتنی زرانت نہ ہو۔ اس کو ہرگز بادشاہ نہ بناؤ اب بتلاؤ کہ جس کی رائے اتنی زریں ہو کہ سارے عالم کے مقابلہ میں بھی اس کی رائے کے صائب ہونے کا احتمال ہو وہ حکومت شخصی کے قابل ہے۔ یا نہیں یقیناً قابل ہے بشرطیکہ اہل حل وعقد انتخاب میں خیانت نہ کریں بس ہم شخصی سلطنت کے اس لئے حامی ہیں کہ تم اپنے بادشاہ کو ضعیف الرائے اور نااہل سمجھتے ہو۔ تو ایسے شخص کو بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کی ضرورت ہو بلکہ پہلے ہی سے بادشاہ بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے جس کے لئے ضم ضمیمہ کا محتاج نہ ہو مستقل الرائے ہو اور اگر تم بھی اپنے بادشاہ کو مستقل الرائے صائب العقل زریں سمجھتے ہو تو پھر کثرت رائے پر فیصلہ کا مدار کہنا اور کامل العقول کو ناقصین کی رائے کا تابع بنانا ظلم ہے جس کی حماقت ہونا بدیہی ہے۔ بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھونسنا چاہتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے اور استدلال میں آیت پیش کرتے ہیں کہ **وشاورھم فی الامر** مگر یہ بالکل غلط ہے ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا کہ اے بریرہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو۔ قصہ یہ ہوا تھا کہ حضرت بریرہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا ان کے آقاء نے کر دیا تھا جب وہ آزاد ہوئیں تو قانون اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالت غلامی میں ہوا تھا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں۔ اگر چاہیں فسخ کر دیں اصطلاح شریعت میں اس کو اختیار عتق کہتے ہیں۔ اس اختیار کی بناء پر حضرت بریرہؓ نے نکاح سابق کو فسخ کر دیا۔ لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی وہ صدمہ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے حضور ﷺ کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہؓ سے آپؐ نے فرمایا کہ اے بریرہؓ کیا اچھا ہوتا کہ تم اپنے شوہر سے رجوع کر لیتی۔ تو وہ دریافت فرماتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کی

طرح ایک فرد ہے۔ اگر حکم ہے تو بلا کسی تکلف کے منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو، آپ نے فرمایا حکم نہیں صرف مشورہ ہے تو حضرت بریرہؓ نے صاف عرض کر دیا کہ اگر مشورہ ہے تو میں اس کو قبول نہیں کرتی لیجئے۔ اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ پر عمل نہ کرے اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں۔ بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور ﷺ کے مشورہ پر عمل نہ کیا اور محض ضبط ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے چنانچہ جب حضرت بریرہؓ نے حضور ﷺ کے یہ مشورہ پر عمل نہ کیا تو حضور ﷺ ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوتے نہ حضرت بریرہؓ کو کچھ گناہ ہوا نہ ان پر کچھ عتاب ہوا سو جب امت اور رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا اپنے مشورہ سے کیوں کر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے موافق عمل کرے۔ اس کے خلاف کبھی نہ کرے۔ پس **شاورھم فی الامر** سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ لیا کریں یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل ضرور کیا کریں اور اگر کثرت رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہے اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک **شاورھم فی الامر** سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی جب اسلام میں معمولی آدمی بھی بادشاہ کے مشورہ پر مجبور نہیں ہوتا تو تم بادشاہ کو رعایا کے مشورہ پر کیوں کر مجبور کرتے ہو۔ آخر اس کی کوئی دلیل بھی ہے یا محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے اور ہمارے پاس حدیث بریرہؓ سے دلیل موجود ہے کہ کسی کے مشورہ پر عمل کرنا ضروری نہیں۔ خواہ نبی ہی کا مشورہ کیوں نہ ہو۔ اس سے یہ بات ثابت ہو گیا کہ حکام رعایا سے مشورہ لیں تو وہ ان کے مشورہ پر عمل کرنے کے لئے مجبور ہرگز نہیں ہیں بلکہ عمل خود اپنی رائے پر کریں خواہ وہ دنیا بھر کے مشورہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو چنانچہ اس آیت میں آگے ارشاد ہے **فاذا عزمت فتوکل علی اللہ** کہ جب آپ ارادہ کسی بات کا کریں تو خدا پر بھروسہ کر کے اس پر عمل کریں یہاں **اذا عزمت** صیغہ واحد ہے معلوم ہوا کہ عزم میں حضور مستقل تھے اسی طرح آپ کا نائب یعنی سلطان بھی عزم میں مستقل ہے اگر عزم کا مدار کثرت پر ہوتا تو اذا عزمت نہ فرماتے بلکہ اس کے بجائے **اذا عزم اکثرکم فتوکلوا علی اللہ** فرماتے پس جس آیت سے یہ لوگ جمہوریت پر استدلال کرتے ہیں اس کا اخیر جزو اُن کے دعوے کی تردید کر رہا ہے مگر ان کی یہ حالت ہے **حفظت شیئاً وغابت عنک اشیاء** کہ ایک جزو کو

دیکھتے ہیں اور دوسرے جزو سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں دوسرے اس آیت میں صرف حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ کر لیا کریں رعایا کو تو حق نہیں دیا گیا کہ از خود استحقاقاً حکام کو یہ کہا گیا ہے کہ وہ رعایا سے مشورہ لیں یا نہ لیں اہل مشورہ ان کو مشورہ سننے پر مجبور کر سکیں۔ چنانچہ شریعت میں اشیروا الحکام وھو حقکم علیھم کہیں نہیں کہا گیا جب رعایا کو از خود مشورہ دینے کا کوئی حق بدرجہ لزوم نہیں تو پھر اسلام میں جمہوریت کہاں ہوئی کیوں کہ جمہوریت میں تو پارلیمنٹ کو از خود رائے دینے کا حق ہوتا ہے چاہے بادشاہ ان سے رائے لے یا نہ لے۔ یہاں تک کہ اگر بادشاہ پارلیمنٹ سے بغیر رائے لئے کوئی حکم نافذ کر دے تو اس پر چاروں طرف سے لے دے ہوتی ہے کہ ہم سے بدون مشورہ لئے یہ حکم کیوں جاری کیا گیا بھلا رعایا کو یہ حکم اسلام میں کہاں دیا گیا ہے ذرا کوئی صاحب ثابت تو کریں پس یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ اسلام میں جمہوریت کی تعلیم ہے۔ (تقلیل الاختلاط مع الانام، ص:۴۸)

سوال: کیا مذہب اسلام امن وسلامتی قائم کرتا ہے؟

جواب: مولوی اسی کو کہتے ہیں کہ آپ کے گھر میں آگ لگی ہے لیکن آپ کو خبر نہیں صاحبو! غضب ہے کہ غیر قومیں تو اسلام کی تعریف کرتی چلی جا رہی ہیں اور ہم اسلام کو چھوڑتے چلے جا رہے ہیں غرض کہ ہم لوگوں نے دین کا ستیہ ناس کر دیا ہے اس لئے میں بتلاتا ہوں کہ دین واقع میں چند چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے اور وہ پانچ چیزیں ہیں:

۱-عقائد ۲-عبادات ۳-معاملات ۴-آداب ۵-معاشرت اخلاق باطنی یعنی یہ کہ تکبر نہ ہو ریا نہ ہو تواضع ہو اخلاق ہو قناعت ہو شکر ہو صبر ہو وعلیٰ ہٰذا، پس ان پانچ چیزوں کا نام دین ہے اس وقت کسی نے کسی کو کسی نے کسی کو چھوڑ رکھا ہے کسی نے اعمال کو چھوڑا کسی نے معاملات کو کسی نے معاشرت کو اسی طرح اپنی معاشرت کو چھوڑ کر غیروں کی معاشرت کو اختیار کر لیا ہے اور بعض نے اخلاق باطنی کو چھوڑ دیا ہے بلکہ ان اخیر کے دو جز کو تو قریب قریب سب ہی نے چھوڑ دیا ہے اس تفصیل کے بعد حاصل آیت شریف کا یہ ہوا کہ دین کو یعنی ان پانچ چیزوں کو اصلاح فی الارض میں اور ان پانچوں کی اصلاح کو فساد فی الارض میں دخل ہے بس اب اس کو دیکھ لیجئے مشاہدہ کہ اصلاح فی الارض میں جدا جدا ہر ایک کا کیا دخل ہے سنو بعض کا دخل توہین ہے مثلاً اخلاق کہ اس کا اثر امن عام میں بین ہے اور ذرا غور کرنے سے معاملات کا اثر بھی انعام میں ظاہر ہو جاتا ہے کیوں کہ احکام معاملہ کا

حاصل حقیقت یہ ہے کہ کسی کا حق ضائع نہ کیا جائے پس معاملات کو بھی اتفاق میں بڑا اثر ہے۔ بشرطیکہ وہ شریعت کے موافق ہوں کیوں کہ آپ کی رائے ان مصالح کی رعایت نہیں کر سکتی جیسے کہ شریعت نے کی ہے جیسے پھل فروخت کرنا کہ آپ نے قبل از وقت پھل فروخت کئے تو اس صورت کو شریعت نے حرام کیا ہے۔ کیوں کہ پھل آنے سے پہلے فروخت کرنے میں معدوم کی بیع ہے اور بیع معدوم میں کسی نہ کسی کا ضرر ضرور ہوتا ہے اور شریعت کے موافق بیع کرنے میں کسی کا ضرر نہیں ہوتا۔ پس امن قائم ہوگا تو ان دونوں کا اثر تو دنیا کے انتظام میں صاف معلوم ہوتا ہے باقی اور تین چیزوں کا امن عام میں داخل ہونا سو یہ کم ظاہر ہے اس لئے اس کو بھی ثابت کرنا ضرور ہے کہ یہ تین چیزیں بھی امن عام میں داخل ہیں سو اوّل یعنی عقائد کو تو یوں سمجھو کہ توحید اور رسالت اور معادم ام العقائد ہیں اور ان سب کو امن عام میں بڑا دخل ہے آپ نے اخلاق اور معاملات کو تو امن میں دخیل مان لیا ہے۔ اس کے تسلیم کرنے سے یہ دعویٰ بھی ثابت ہو جائے گا ایک مثال بطور نمونہ کے عرض کرتا ہوں کہ مثلاً اخلاق میں جھوٹ نہ بولنا سچ بولنا ہمدردی کرنا خود غرضی نہ کرنا داخل ہے اور یہ اصول تمدن میں سے بہت بڑی چیزیں ہیں جن پر تمام دنیا کا مدار ہے۔ لیکن واقعات میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر یہ اخلاق دو شخصوں میں پائے جائیں جن میں ایک تو توحید و رسالت کا قائل ہے اور دوسرا قائل نہ ہو تو یقیناً دونوں میں بہت بڑا فرق ہوگا، یعنی منکر توحید میں تو یہ اخلاق محدود العمر ہوں گے اس طرح سے کہ جب تک ان اخلاق پر عمل کرنے میں اس کے دنیاوی منافع فوت نہ ہوں یا اُن کے خلاف عمل کرنے سے دوسروں کو خبر ہو کر رُسوائی کا اندیشہ ہو اس وقت تو ان اخلاق پر عمل کیا جاوے گا اور اگر کوئی ایسا موقع آپڑے گا کہ ان اخلاق پر عمل کرنے سے دنیوی ضرر ہوتا ہو، اور ان کے خلاف کرنے میں کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ جس میں اندیشہ بدنامی نہ ہو تو اس منکر توحید و رسالت کو کبھی ان اخلاق کے ترک کی پروانہ ہوگی ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ جب کبھی بے دین سلطنتوں میں آپس میں معاہدہ ہوتا ہے تو اس کی پابندی اسی وقت تک کی جاتی ہے جب تک اپنے منافع حاصل ہوتے ہیں یا خلاف کرنے میں اپنا ضرر ہوتا ہو اور اگر خلاف کرنے میں اپنا ضرر نہ ہوتا ہو تو عہد شکنی میں ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوتا ہے۔ بافرض کرو کہ دو شخص ہم سفر ہوں جن میں ایک کے پاس ایک لاکھ روپے کے مشہور اور

دوسرا ایسا ہو کہ اس پر فاقے گزرتے ہوں اور اتفاق سے وہ متمول انتقال کر جائے اور دوسرے رفیق سفر کو ان نوٹوں کے لے لینے کا موقع ملے اور عاقل بھی یہ اتنا بڑا ہو کہ بلا تکلف ان کو فروخت کر سکے اور اس مرحوم کے ورثہ میں بھی صرف ایک نابالغ بچہ ہو اور ان نوٹوں کی کسی اور کو خبر بھی نہ ہو کہ اس شخص کے پاس یہ ذخیرہ ہے اس صورت میں اخلاق اور نفس میں سخت کشاکش ہوگی اخلاق کا فتویٰ تو یہ ہوگا کہ یہ روپیہ اس وارث کو دینا چاہیے اور نفس کا فتویٰ یہ ہوگا کہ جب اس روپے کے رکھ لینے میں کوئی بدنامی نہیں کسی قسم کا اندیشہ نہیں تو پھر ان کو کیوں نہ رکھ لیا جائے اس کشاکشی میں میں نہیں سمجھتا کہ نری اخلاق قوت انسانی کو اس عظیم مہلکہ سے بچا لے پس جس شخص کی نری اخلاقی تعلیم ہوتی ہے وہ ہرگز اس خیانت سے نہیں بچ سکتا، البتہ جو اخلاقی تعلیم کے ساتھ خدا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور قیامت کا بھی قائل ہے وہ اس سے بچ سکتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ اگر میں یہاں بچ گیا اور مجھے دنیا میں خمیازہ بھگتنا نہ پڑا تو قیامت میں تو ضرور ہی بھگتنا پڑیگا اسی طرح سے ایک اور جزئی یاد آئی کہ میرے پاس اکثر ایسے ٹکٹ آجاتے ہیں جو ڈاک خانے والے ہوتے ہیں نہ کوئی دوسرا دیکھنے والا ہوتا ہے لیکن محض خدا کے خوف سے اکثر میں سب سے اوّل ان ہی کو چاک کر کے پھینک دیتا ہوں اس کے بعد خط پڑھتا ہوں علی ہذا القیاس۔

اگر روزمرہ کے واقعات کو دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ دوسروں کے حقوق کی پوری حفاظت جب ہی ہو سکتی ہے جب دل میں خدا کا خوف ہو یہ مثال نمونہ کے طور پر بیان کی ورنہ غور سے معلوم ہوگا کہ تمام مسائل تمدن میں اس کی ضرورت ہے کہ مبداء و معاد کا معتقد ہو۔ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مآل التہذیب دیکھنے کے قابل ہے۔ اس میں دکھلایا گیا ہے کہ اس مخترع تہذیب کا مآل دنیا ہی میں ہونے والا ہے انہوں نے ایک ایک مفسدہ کو لکھا ہے اور ختم پر ہر جگہ یہ کہہ دیتے ہیں کہ فویل یومئذ للمکذبین غرض امن عام اور تمدن اس وقت باقی رہ سکتا ہے۔ جب اخلاق درست ہوں اور اخلاق کی کامل درستی جب ہی ہو سکتی ہے کہ عقائد درست ہوں اب اعمال کا دخل لیجئے۔ یہ بھی انشاء اللہ اخلاق کی ضرورت تسلیم کر لینے سے ثابت ہو جائے گا سب کو معلوم ہے کہ اخلاق میں بڑی چیز تواضع ہے اس کے نہ ہونے سے تمام عالم میں فساد پھیلتا ہے کیوں کہ فساد کا مبنی ہے نااتفاقی اور

نااتفاقی تکبر سے پیدا ہوتی ہے کیوں کہ اگر تکبر نہ ہو اور آپ مجھ کو بڑا مانیں اور میں آپ کو بڑا مانوں تو نااتفاقی کی کوئی وجہ نہیں تو اتفاق کے لئے تواضع کے پیدا کرنے اور تکبر کے مٹانے کی ضرورت ہے اور اس تواضع کی عادت نماز سے خوب ہوتی ہے نفس کا یہ خاصہ ہے کہ اگر کہیں اس کو ذلت نہ سکھلائی جائے تو اس میں فرعونیت پیدا ہوتی ہے اور نماز میں اوّل سے ہی اللہ اکبر کی تعلیم ہے تو جو شخص پانچ وقت زبان سے اور دل سے اللہ اکبر کہے گا اور جوارح سے رکوع اور سجدہ کرے گا زمین پر پیشانی رکھے گا وہ کیوں کر اپنے کو بڑا سمجھے گا اگر کہو اس سے تو یہ ہوگا کہ اپنے کو خدا سے بڑا نہ سمجھے گا۔ لیکن دوسروں سے تو بڑا نہ سمجھنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جواب یہ ہے کہ یہ ناتجربہ کاری کا اعتراض ہے۔ دیکھو اگر تحصیل دار اپنے جوش حکومت میں تحصیلداری کر رہا ہو اور اچانک لیفٹیننٹ گورنر آجائے تو خود ان کے ذہن میں بھی وجداناً سب اختیارات مسلوب سے ہونے لگتے ہیں اس وقت اگر کوئی حضور بھی کہہ دیتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے گولی ماردی تو جس کے دل میں خدا کی عظمت ہوگی وہ اپنے کو چیونٹی سے بھی مغلوب اور ناتواں سمجھے گا۔ کیوں کہ بڑوں کے سامنے ہوتے ہوئے چھوٹوں پر بھی حکومت نہیں رہتی تو اللہ اکبر کی وہ تعلیم ہے کہ اس سے تکبر کی بالکل جڑ کٹ جاتی ہے اور پھر اس سے نااتفاقی کا جاتا رہنا لازمی ہے علیٰ ہذا قوت ہے اسی طرح زکوٰۃ سے لینے والے کے علاوہ دوسروں کو بھی زکوٰۃ دینے والے کے ساتھ محبت ہوتی ہے دیکھو حاتم طائی سے بوجہ سخاوت کے سب کو محبت ہے اور اتفاق کا مبنیٰ یہی محبت ہے تو دیکھو زکوٰۃ کو اتفاق میں کتنا بڑا دخل ہے علیٰ ہذا حج پر غور کیجئے کہ اس میں ساری دنیا کے آدمی ایک شغل میں ایک زمانہ میں ایک مکان میں جمع ہوتے ہیں اور تمام سامان تکبر سے خالی ہو کر ایک عظیم الشان دربار میں حاضر ہوتے ہیں جس کو اتفاق واتحاد میں بہت دخل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا اور اسی اتفاق فی الخیال کا اثر ہے کہ دوسرے مجمعوں میں جن کو مجمع حجاج سے کچھ بھی نسبت نہیں ہوتی۔ بہت سی واردات ہو جاتی ہیں اور وہاں بہت کم حادثے پیش آتے ہیں البتہ اکثر لوگ شاید بدوؤں کے شاکی ہوں گے۔ سو اصل میں ان کا مقصود سلب وقتل نہیں ہے بلکہ وہ ایک درجہ میں حجاج کی بے پروائی کا انتقام لیتے ہیں ان کی حالت بالکل یہاں کے گاڑی بانوں کی سی ہے کہ اگر گھاس دانہ زیادہ دیدیا تو خوش ہیں ورنہ پھر دیکھئے کیسے پیر پھیلاتے ہیں۔ ویسے ہی اگر بدوؤں کی مدارات کی جائے ان کو

انعام کے طور پر کچھ زیادہ دے دیا جائے تو وہ بہت آرام پہنچاتے ہیں اور جو سننے میں آتا ہے کہ بدو پتھر مار کر مال چھین لیتے ہیں تو اوّل تو ایسا بہت کم ہوتا ہے اور اگر ہوتا بھی ہے تو ایسے بدوؤں کے ہاتھ سے جو اس مجمع کے نہیں بلکہ وادیوں میں دیہات کے لوگ پھیلے رہتے ہیں وہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں اور وہ بھی اس وقت جب کہ خود اپنی حفاظت نہ کرے کہیں قافلے سے آگے پیچھے رہ جائے غرض حج کو اتفاق و امن میں بہت بڑا دخل ہے جس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اعمال حج از سر تا پا تواضع سے پُر ہیں۔ اب رہی معاشرت سو تامل سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جتنے طریقے ناجائز ہیں وہ سب کے سب وہی ہیں جن سے تکبر ٹپکتا ہے مثلاً ناجائز وضع سے شریعت نے منع کیا ہے سو جتنی ناجائز اوضاع ہیں ان سب میں تکبر ہے جو لوگ خلاف شریعت وضع رکھتے ہیں وہ دیکھیں کہ اس وقت ان کے دل کی کیا حالت ہے اور اس حالت کو یاد رکھیں اور پھر ایک ہفتہ شریعت کے موافق وضع لباس اختیار کر کے اس کا اثر دیکھیں۔ تو ان کو زمین و آسمان کا فرق معلوم ہوگا یہ تو سمجھ میں آنے والی تقریر ہے۔ ایک دوسری تقریر اور ہے جو ان تینوں میں مشترک ہے وہ یہ کہ ہر چیز میں ایک خاصیت ہوتی ہے پس اس طرح اعمال میں بھی ایک خاصیت ہے اور عقائد میں بھی اور معاشرت میں بھی اور وہ یہ کہ ان سب سے قلب میں ایک سوز پیدا ہوتا ہے اور اس سوز سے اس کی وہ حالت پیدا ہو جاتی ہے۔

المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده.

اب میں ایک اور بات کہتا ہوں کہ جو تمام اجزاء دین کو عام ہے وہ یہ کہ دین کی یہ غرض نہیں کہ دنیاوی نفع ہو بلکہ مقصود اس سے رضائے حق ہے اور جب خدا تعالیٰ راضی ہوں گے تو وہ خود ہی اسکی تمام مصالح دنیویہ کی رعایت فرمالیں گے۔ (محمد نسیم رحمانی فاضل دیوبند)

من يتق الله يجعل له مخرجاً ويرزقه من حيث لا يحتسب.

پس دین کی دوستی کو اس طرح دنیا کی دوستی میں دخل ہوئی۔ مگر دین کے کام اس نیت سے بھی نہ کرنا کہ خدا راضی ہوگا تو دنیا کے کام بنیں گے۔ بلکہ صرف اس لئے کہ ؎

دلا رامی کہ داریکہ دل درد بند ☆ وگر چشم از ہمہ عالم فرد بند

اور جو مصلحتیں سامنے آئیں ان کو بھی تو یہ پڑھ دو کہ ؎

مصلحت دید من آنست کہ یاراں ہمہ کار ☆ بگزار رند و خسم طرۂ یارے گیرند

رند عالم سوز را با مصلحت بینی چہ کار ☆ کار ملک ست آنکہ تدبیر وتحمل بایدش

ہمیں مصلحتوں سے کیا لینا مگر حاصل ضرور ہوں گی وفادار نوکر وہ ہے کہ آقاء کی رضامندی کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھے اور کوئی کام اس کی مرضی کے خلاف نہ کرے ورنہ اس کو خودغرض اور خودکام کہا جائے گا۔ پھر آقاء اپنے کرم سے خود ہی اس کی مصلحتوں کی رعایت فرمائیگا اور اگر دیکھا جائے تو راحت بھی اسی میں ہے کہ کسی کے حکم کے تابع رہے۔ چاہے مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور اگر ہر کام میں مصلحت سوچتا رہے تو کچھ کام نہ کر سکے گا۔

میں نے تین تقریریں ہر تقریر سے یہ ثابت ہوگیا کہ دین کو طاعت کو امن عام میں بہت دخل ہے اور یہ تین تقریریں اس لئے کیں تا کہ حقانیت اسلام عیاں ہوجائے اور فرقۂ باطلہ خاموش ہوجائے۔

بہار عالم حسش دل وجاں تازہ میدارد

برنگ اصحاب صورت رابہ بوار باب معنی را

غرض جس پہلو سے چاہو پرکھ لو اور پرکھالو۔ الحمدللہ یہ بات ثابت ہوگئی کہ امن کی صورت اگر ہے تو احکام خداوندی کی پابندی سے ہے۔ (ضرورۃ العلماء، ص:۲۳)

سوال: مذہب اسلام تنگی کو پسند نہیں کرتا؟

جواب: اس کے دو درجے ہیں ایک تو یہ کہ قانون کی پابندی کرنا پڑتی ہے اور یہ دشوار ہے اور ایک یہ کہ خود قانون ہی سخت تو اسلام میں کون سی دشواری ہے۔ آیا یہ کہ قانون کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ تو تسلیم ہے کیوں کہ اس میں ضرور دشواری ہوتی ہے خواہ کتنا ہی سہل قانون ہو۔ مثلاً جو لوگ کہ عدالت میں نوکر ہیں اور ان کا وقت دس بجے سے ہے۔ تو کیا کبھی یہ پابندی دشوار نہیں ہوتی۔ ضرور ہوتی ہے اور اس وقت کہتے ہیں کہ نوکری بڑی ذلت کی چیز ہے۔ مگر اتنی ہی بات پر اس کو کبھی نہ چھوڑا۔ تو جب قانون کی پابندی ہوگی۔ اس میں دشواری ضرور ہوگی۔ تو اگر اسلام میں یہ دشواری ہے تو تسلیم ہے۔ بلکہ اس کو تو خود ہی ثابت کرتے ہیں: لاتتبعوا الھوی اور اس سے صاف انھا لکبیرۃ الاعلی الی الخاشعین۔

غرض یہ دشواری تو تسلیم ہے مگر اس میں اسلام کی کیا تخصیص ہے یہ تو سبھی کام میں بلکہ کھانے میں بھی ہے، کوئی اپاہجوں سے پوچھے خاص کر واجد علی شاہ کے احدیوں سے کہ کھانا کتنا مشکل کام ہے مشہور ہے کہ واجد علی شاہ کے دو احدی تھے ان میں باری اس طرح تھی کہ ایک لیٹا ہوا آرام کرے۔ دوسرا بیٹھا ہوا اس کی حفاظت کرے، اسی طرح

ایک لیٹا ہوا تھا۔ ایک بیٹھا ہوا۔ ایک سوار اُدھر سے گزرا۔ لیٹے ہوئے نے پکارا کہ میاں سوار ذرا یہ بیر جو میرے سینہ پر رکھا ہے میرے منہ میں ڈال دو اس کو اس آرام طلبی سے سخت حیرت ہوئی اور اس سے زیادہ حیرت یہ ہوئی کہ اس کا رفیق جو پاس بیٹھا ہے اس سے اتنا کام نہیں ہوتا۔ اس لئے اس بیٹھے ہوئے سے کہا کہ بھائی تو ہی اس کے منہ میں ڈال دے وہ بہت بگڑا اور کہنے لگا کہ جناب میری آپ کی لڑائی ہو جائے گی آپ کو کیا خبر میرے ساتھ اس کا معاملہ کیسا ہے۔ کل میں لیٹا ہوا تھا یہ بیٹھا ہوا تھا مجھ کو جو جمائی آئی اس سے منہ کھل گیا ایک کتا آ کر منہ میں موتنے لگا یہ بیٹھا ہوا دیکھتا رہا اور اس سے اتنا نہ ہوا کہ کتے کو ہٹا دے میں ضرور اس کے منہ میں بیر دوں گا۔ سوار ہی حیرت میں غرق ہو گیا اور لاحول پڑھتا ہوا چل دیا تو حضرت اگر کوئی احدیوں سے پوچھے تو ان کو کھانا بھی مشکل ہے۔ ہمارے عزیز دو بھائی ہیں ایک چھوٹے ایک بڑے بڑے صاحب ہاتھ پاؤں لپیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور چھوٹے سے کہتے ہیں کہ میرے منہ میں لقمے دے کر مجھ کو کھانا کھلا۔ تو ایسی نظریں بھی موجود ہیں اور رہیں گی اس طرح تو کھانے میں بھی دشواری ہے اور اس میں شرعی اور قانونی پابندیاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ دوسرے کی چیز نہ کھاؤ اور ڈکیتی نہ ڈالو۔ مگر اس کو کسی نے نہ کہا کہ بڑا سخت قانون ہے وجہ یہ کہ آپکو ڈکیتی ڈالنا ہی نہیں ہے اس لئے آپ کو ممانعت کا قانون سخت معلوم نہیں ہوتا اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت سخت معلوم ہوتی ہے لیکن جو ڈکیتی پیشہ ہیں اور رشوت لینا مقصود ہے اس لئے اس کی ممانعت کے قانون کو کتنا سخت سمجھتے ہیں اسی طرح ایک جماعت بیہودوں کی ایسی بھی ہے کہ ان کی رائے یہ ہے کہ کوئی سلطنت نہ ہو۔ حالاں کہ ضرورت سلطنت کا قانون امر فطری ہے۔ مگر یہ ان کو گراں ہے تو ایسے لوگ تو انسانیت ہی سے خارج ہیں تو محض پابندی سے تو کوئی بھی بچ سکتا پھر اسلام ہی پر کیا اعتراض ہے دوسرا درجہ یہ ہے کہ پابندی کی ضرورت تو تسلیم اور سختی نہیں۔ مگر خود قانون ہی بڑا سخت ہے تو واقعی یہ دشواری ہے۔ مگر دین میں ایسی دشواری ہی نہیں کہ قانون سخت ہو۔ اب یہ شبہ ہوگا کہ یہ تو مشاہدہ کے خلاف ہے تو حقیقت میں اس میں تلبیس ہوتی ہے قانون کی سختی تو وہ ہے کہ اگر اس کو بھی مان لیں تب بھی دشواری پیش آوے۔ مثلاً یہ قانون ہو جاوے کہ اگر چھٹانک بھر سے زیادہ کوئی کھاوے تو پھانسی ہوگی یہ ایسی سخت بات ہے کہ اگر اس پر عمل کرنے کا ارادہ کریں تب بھی تو تکلیف ہو

اور ایک دشواری اس طرح کی ہے، قانون تو نرم ہے اور علامت اس کی یہ ہے کہ اگر سب اس پر عمل کرنے لگیں تو کسی کو بھی دشواری پیش نہ آوے لیکن اس میں ایک خاص عارض سے سختی پیش آجائے وہ عارض یہ ہے کہ زیادہ آدمی اس پر عمل نہیں کرتے پس جب تھوڑے آدمی عمل کریں گے تو ان کو دوسروں کی وجہ سے ضرور تنگی ہوگی۔ کیوں کہ تعلق معاملات کا ان ہی دوسروں سے ہے تو اس کو قانون کی سختی نہ کہیں گے بلکہ اس سختی کا منشاء ان باغیوں کی بغاوت ہے۔ مثلاً کوئی ایسی جگہ پہنچے کہ وہاں کے لوگ باغی ہوں۔ اور وہ شخص وہاں پہنچ کر کوئی چیز خریدے اور دام دے دے۔ پھر اس سے کہا جائے کہ قانون سلطنت یہ ہے کہ پورے دام لے کر پوری چیز دیدو۔ مگر ہم اس قانون کو نہیں مانتے۔ اس لئے تم کو آدھی چیز ملے گی۔ تو ایمان سے کہے کہ یہ دشواری قانون کی ہے یا ان بدمعاشوں کی قانون کا منشاء تو یہ ہے کہ سیر بھر دو مگر ان بدمعاش لوگوں نے بدمعاشی کی اور سیر بھر کا آدھ سیر دیا۔ تو اس دشواری سے اگر کوئی گورنمنٹ کو برا کہنے لگے تو وہ احمق ہے یا نہیں۔ تو جو دشواری اس وقت پیش آرہی ہے۔ وہ دشواری یہ ہے جس کو اسلام پر تھوپا جاتا ہے۔ کوئی شخص اسلام کا کوئی ایسا قانون بتلائے کہ سب مسلمانوں کے مان لینے اور عمل کرنے کے بعد بھی اس میں دشواری پیش آوے۔ اگر پچاس قباحتیں بھی آجاویں۔ جب بھی شریعت کا کوئی ایک قانون بھی ایسا نہیں بتلا سکتے۔ صرف موجودہ دشواری کی وجہ یہ ہے کہ نافرمانوں سے سابقہ پڑ رہا ہے۔ مثلاً قرض کی ضرورت ہوئی۔ اب جس کے پاس جاتے ہیں وہ کہتا ہے کہ سود لاؤ تو سود کی حرمت کا الزام شریعت کو دینا اور اپنے کئے کو اسلام پر تھوپنا ایسا ہے کہ

مثنوی میں شیر کی ایک لمبی چوڑی حکایت لکھی ہے کہ ایک شیر کو ایک خرگوش نے دھوکا دی اور کہا میں تمہارے لئے ایک موٹا خرگوش لا رہا تھا۔ راستہ میں ایک دوسرا شیر ملا اور مجھ سے چھین لیا شیر کو غصہ آیا کہ بتلاؤ وہ کہاں ہے اس نے ایک کنویں پر لے جا کر کھڑا کر دیا۔ واقعی اس میں شیر کا عکس نظر آیا بس شیر اس کنویں میں جا کود اندر پہنچ کر معلوم ہوا کہ میں نے اپنے ہی اوپر حملہ کیا تھا مولانا اس کو فرماتے ہیں ؎

حملہ بر خود می کنی اے سادہ مرد ❁ ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد

اسی طرح ہم کو بھی اپنی دشواری کی صورت شریعت میں نظر آتی ہے مگر حقیقت میں یہ اپنے اوپر اعتراض ہے اس پر ایک حکایت اور یاد آئی کہ ایک حبشی نے ایک آئینہ دیکھا اس

میں اپنی صورت نظر پڑی۔ آئینہ کو بڑے زور سے پتھر پر کھینچ مارا کہ ایسا ہی بدشکل تھا تب ہی تو کوئی تجھ کو راستہ میں پھینک گیا ایک اور احمق کی حکایت ہے کہ اس کا بچہ روٹی کھا رہا تھا لوٹے میں ایک ٹکڑا پڑا۔ جھانکنے سے اپنی صورت نظر آئی سمجھا کہ اس میں کوئی بچہ ہے باپ سے کہا ابا اس نے یہ میرا ٹکڑا لے لیا۔ آپ چھیننے اٹھے۔ جھانک کر دیکھا تو اپنی شکل پر نظر پڑی بولے کہ لعنت خدا کی بڈھا ہو کر بچہ کا ٹکڑا چھین لیا۔ تف ہے تیری اوقات پر۔ سو وہ کس کو تف کہہ رہے تھے۔ اسی طرح ہم لوگوں نے آئینہ شریعت میں اپنی شکل کو دیکھا اور وہ تنگی اپنی صفت تھی۔ اس کو شریعت کی تنگی سمجھا۔ حضرت یہ ہے حقیقت سختی کی اور میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ ایک طبیب علاج کر رہا ہے اور بہت شفیق بھی ہے۔ مگر نہ ایسا آزاد کہ خاک پتھر سب کی اجازت دیدے ظاہر ہے کہ جب غذائیں کھائی جاویں گی تو کسی چیز کی تو ضرور ہی ممانعت ہوگی اتفاق سے ایک دیہاتی پہنچا کہ صاحب کھاؤں کیا جواب دیا کہ بکری کا گوشت پالک وہ بولا یہ تو ملتا نہیں۔ کہا مونگ کی دال کہا یہ بھی نہیں ملتی۔ کہا فیرنی کہنے لگا یہ بھی نہیں ہے پھر خود پوچھا بیگن کھالوں کہا ہرگز نہ کھانا۔ کریلہ کو پوچھا۔ اس کو بھی منع کیا۔ آلو سے بھی روک دیا تو دیہاتی نے کہا کہ صاحب ہمارے یہاں تو یہی چیزیں ملتی ہیں۔ طبیب نے کہا کہ فتویٰ طب کا تو یہی ہے دیہاتی نے باہر آکر کہا کہ صاحب یہ تو بڑے سخت ہیں کہ یہ بھی نہ کھاؤ۔ وہ بھی نہ کھاؤ تو کیا طبیب پر یہ الزام صحیح ہے یا یہ کہا جاوے گا کہ وسعت تو یہ ہے کہ متعدد چیزوں کی سب کی اجازت دیدی لیکن وہ مقام ایسا کوردہ ہے کہ بجز مضر چیزوں کے وہاں کچھ ملتا ہی نہیں تو یہ طب کی تنگی تو نہیں۔ اس شخص کے گاؤں والوں کی معاشرت کی تنگی ہے۔ اسی طرح حاجت ضروریہ پر نظر کر دیکھئے کہ معاش کی ضروری سبیلوں کو جو کہ قریب الوقوع ہیں۔ اگر پچیس آپ نکالیں گے تو بیس کو شریعت بجوز کہے گی اور پانچ کو لا بجوز لیکن اگر آپ کے ملک والے ہمیشہ ان ہی پانچ کو استعمال کریں اور بیس کو متروک کر دیں تو یہ تنگی معاشرت کی ہوئی یا قانون شریعت کی۔ پس یہ الزام تو بحمد اللہ بوجہ احسن واکمل رفع ہو گیا اور اگر اس کی تصدیق میں شبہ ہو۔ تو علم دین پڑھتے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ شریعت نے ابواب معاش میں کس قدر توسیع کی ہے۔ اب صرف ایک فریاد رہ گئی ہے اس میں جی چاہتا ہے مسلمانوں کی ہمدردی کرنے کو وہ یہ ہے کہ یہ تو سمجھ میں آگیا کہ شریعت میں تو دشواری نہیں مگر حالت موجودہ میں اس عارض کے سبب کہ ہم کو سابقہ ایسوں سے پڑا ہے جو شریعت پر عمل

نہیں کرتے، عارضی دشواری تو ہوگئی پسہم پر تو دشواری کا اثر آخر پہنچ گیا البتہ اعتقاد درست ہوگیا کہ شریعت میں دشواری نہیں مگر عمل کس طرح سے کریں کیا لین دین چھوڑ دیں۔ کیوں کہ نوکریاں اکثر ناجائز معاملات اکثر ناجائز تجارت اکثر ناجائز تو یہ ایک فریاد قابل استماع ہے سواس سے متعلق بھی سن لیجئے اس میں قدرے تفصیل ہے وہ یہ کہ آپ نے جو چند معاملات کو دیکھ کر اس عارضی دشواری کے اعتبار سے عام حکم کر دیا کہ سب ہی دشوار ہے، غیر مسلم ہے۔ سمجھئے کہ ایسے اعمال دو قسم کے ہیں ایک وہ کہ ان کی اصلاح کرنے سے معاش کی گاڑی کچھ اٹکتی ہے اور ایک وہ کہ ان کی اصلاح سے معاش کا کچھ بھی نقصان نہیں۔ مثلاً وضع شریعت کے موافق بنائے نماز روزہ کرے حج کرے تکبر نہ کرے باجا گاجا چھوڑ دے تو بتلایئے اس میں معاش کا کیا نقصان ہے تو اس میں تو آج ہی سے اصلاح کر لیجئے پس زیادہ اعمال تو آپ کے آج ہی درست ہو جاویں گے۔ کیوں کہ پچاس عمل میں چالیس ایسے نکلیں گے کہ محض گناہ بے لذت ہیں۔ کہ خواہ مخواہ آپ نے ان کو اپنے پیچھے لگا رکھا ہے، آگے دس ہی رہ جاویں گے اس میں اگر آپ کی اصلاح نہ بھی ہوئی تو چوں کہ غالب درجہ اعمال صالحہ کا موجود ہو چکا ہے اس لئے حق تعالیٰ سے امید ہے کہ بقیہ اعمال کو جو کہ مغلوب و قلیل ہیں درست فرما دیں گے جیسے ایک شعلۂ جوالہ کے دیکھنے میں پورا دائرہ شعلہ نظر آتا ہے حالاں کہ اس میں بہت چھوٹی قوس نورانی ہے اور بڑی قوس ظلمانی مگر جب نور ظلمت جمع ہوتے ہیں تو نور ہی غالب آتا ہے اور اس درستی میں گویا یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کی خاصیت ہی یہی ہے جیسے مقناطیس کے بالخاصہ جاذب حدید ہے۔ پس اگر ہم یہ کہیں کہ اعمال صالحہ میں بھی خاصیت یہی ہے کہ بقیہ اعمال کو درست کر دیتا ہے تو اس کا دعویٰ ہو سکتا ہے مگر میں اس کا راز بھی بتلاتا ہوں کہ اعمال صالحہ میں ایک اثر ہے کہ اس سے قلب میں قوت ہوتی ہے اور صحابہ کی ترقی کا راز یہی ہے ہم نے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ بیماری میں اٹھا نہیں جاتا۔ مگر نماز کے وقت بلا تکلف کھڑے ہو کر نماز ادا کر لیتے ہیں۔ خوب کہا ہے ؎

ہر چند کہ پیر خستہ وبس ناتواں شدم
ہر گہ نظر بروئے تو کردم جواں شدم

ان کی خدمت میں جب جی چاہے جا کر دیکھ لیجئے غرض طاعت سے قوت ہوتی ہے اور اصلاح نہ کرنے کا صرف یہی سبب تھا کہ ہمت نہیں ہوتی تھی مگر جب قوت ہوگی تو تمام

موانع مضمحل ہو جاویں گے اور اگر اس ڈر سے کبھی اصلاح ہو جائے یہ تدبیر بھی نہ کرے تو دوسری بات ہے جیسے کسی نے یہ سن کر کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہو جاتا ہے، کہا تھا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے غرض اس طرح قوت پیدا ہو جاتی ہے اور ضعف جاتا رہتا ہے یہ ہے وہ راز اور اگر بالفرض اصلاح بھی نہ ہوئی تو ایک اور بات تو ضرور پیدا ہو جاوے گی کہ اس معصیت کی مذمت آپ کے قلب میں جمتی چلی جاوے گی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر اس طرح بھی اصلاح نہ ہوئی تو جرائم تو گھٹ گئے اگر ایک شخص پر چار جرم قائم ہوئے اور وکیل نے کہا کہ تین تو ٹل سکتے ہیں مگر ایک نہیں ٹل سکتا تو کیا کوئی یہ کہے گا کہ جو آپ از سر گذشت چہ یک نیزہ چہ یک دست پر گز نیں بلکہ تخفیف ہی کو غنیمت سمجھیں گے تو اس طرح آپ بھی پچاس جرائم میں سے صرف دس ہی کے مجرم رہ گئے اب وہ حصہ رہ گیا جس میں تغیر کرنے سے معاش کا حرج ہے تو اوّل تو چوں کہ آپ کو شریعت کے احکام نہیں معلوم ہیں اس کی وجہ سے بہت سے افعال ناجائز صادر ہو جاتے ہیں اگر آپ احکام کی تحقیق کیجئے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تھوڑے تغیر سے وہ ناجائز ہو جائے گا مثلاً اگر آپ نے چاندی خریدی تو اس میں مسئلہ یہ ہے کہ چاندی کا مقابلہ اگر چاندی سے ہو تو زیادتی کمی حرام ہے۔ اب اگر کہئے کہ صاحب اچھا مسئلہ سنا کر نرخ کے حساب سے تو سو روپے کی چاندی ایک سو بیس روپے بھر آتی مگر اب سو روپے کی سو ہی روپے بھر ملی اچھا عمل کیا کہ بیس روپے کا خسارہ ہوا اب ساری عمر کے لئے مولویوں کو خیر باد کہہ دیں گے۔

سنیئے! بات یہ ہے کہ اگر مولوی صاحب سے یوں پوچھتے کہ مولوی صاحب جب چاندی میں زیادتی حرام ہے تو اب اگر اس پر اس خاص صورت میں عمل کریں تو بڑا نقصان ہوگا کیا کوئی جائز شکل بھی معاملہ کی ہے تو مولوی صاحب یوں کہتے کہ ان روپیوں میں ایک گنی بھی ملا دو تو ایک سو بیس بھر چاندی جو آوے گی تو پچاس روپے بھر تو پچاس روپے کی آوے اور باقی کی اس گنی میں شریعت محسوب کرے گی تم کو نیت کرنے کی بھی ضرورت نہیں شریعت خود فیصلہ کر چکی ہے تو اب بتلایئے کیا نقصان ہوا اب مشکل تو یہ ہے کہ علماء سے پوچھتے بھی نہیں۔ صاحبو! پوچھتے تو رہو اور میں یہ تو نہیں کہتا کہ سب کو مولوی صاحب جائز ہی کہہ دیں گے۔ کیوں شریعت ان کے گھر کی تو ہے نہیں کہ وہ اپنے اختیار سے جسے چاہے جائز ہی کہہ دیں گے جیسا کہ ایک معطوف سے ایک بڑھیا نے صفا مروہ کی سعی میں تھک کر

کہا تھا کہ مولوی صاحب اب تو معاف کردو۔اسی طرح بعضے لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء مصر کے کرنے لگیں ان بعض علماء نے ایسا کر رکھا ہے کہ جو دنیا میں ہو رہا ہے سب جائز ہے تو یہاں کے لوگ بھی یہی کرانا چاہتے ہیں۔جیسے ایک رئیس نے ایک نوکر سے یہ کام لیا تھا کہ جو ہماری زبان سے نکلے تم اس کی تصدیق کر کے توجیہہ کر دیا کرو چنانچہ ایک بار رئیس کے منہ سے نکلا کہ ہم شکار کو گئے ایک ہرن پر گولی چلائی وہ اس کے سم کو توڑ کر ماتھے کو پھوڑ کر نکل گئی سب اہل مجلس ہنسنے لگے کہ سم اور ماتھے کا کیا جوڑ نوکر بولا سچ ہے حضور وہ اس وقت سم سے پیشانی کھجلا رہا تھا تو حضور علماء سے ایسی نوکری نہیں ہوتی۔نہ ہم اتنے ذہین ہیں اور نہ خدا کرے کہ ہوں تو حاصل یہ کہ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ سب کو جائز کہہ دیں۔مگر پوچھ کر دیکھو تو بہت سے اشکالات کا جواب مل جاوے گا تو بہت بڑا حصہ اس عارضی دشواری کا اس طرح ختم ہو جاوے گا ہاں بعض امور پھر بھی ایسے رہ جائیں گے کہ وہ بالکل ناجائز ہوں گے مگر اس میں بھی دو درجے ہیں ایک تو وہ کہ اس کو چھوڑ کر دوسرے کام میں لگ سکتے ہیں پس اس کو چھوڑ دیا جاوے کیوں کہ اس کا چھوڑنا مضر حوائج ضروریہ نہیں اور ایک وہ درجہ ہے کہ اس کو چھوڑ نہیں سکتے۔کیوں کہ دوسرے کام اس کے حوائج ضروریہ کو کافی نہیں تو بادل کارہ اس کو کرتے رہو۔اور گویا جائز تو نہ ہوں گے مگر اس کے متعلق ایک دستور العمل ایسا بتلاتا ہوں کہ اس سے ایسے جرائم خفیف ہو جاویں گے اور یہ کہ اس میں دو برتاؤ کرنے چاہئیں۔ایک تو یہ کہ ہر روز توبہ کر لیا کرے اب تو یہ غضب ہے کہ لوگ توبہ کی حقیقت نہیں سمجھتے۔توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ کیا اس پر پچھتایئے اور دعا کیجئے کہ اے اللہ مجھے معاف فرمایئے مواخذہ نہ کیجئے تو یہ کیوں نہیں کرتے کیا ایسے کرنے سے نوکری سے موقوف ہو جاؤ گے۔ہرگز نہیں بلکہ تم نوکر ہی رہو گے۔دوسرے یہ دعا کرو کہ اے اللہ کوئی دوسری سبیل نہ نکلی۔تو یہ شخص شرمندہ گنہگاروں کی فہرست میں تو لکھا جاوے گا۔جرمی گنہگاروں کی فہرست میں نہیں لکھا جاوے گا۔اور یہ توسیع آپ میری ہی زبان سے سنیں گے اور توسیع میں راز شرعی یہ ہے کہ اگر چھوڑنے پر مجبور کیا جائے تو شاید اس کو چھوڑ کر اس سے بھی زیادہ کسی گناہ شدید میں مبتلا ہو جائے مثلاً یہی کہ چلو آریہ بنیں تو یہ توسع این بلا دفع بلاہائے بزرگ کا مصداق ہے اور میں کفر سے بچا رہا ہوں کیوں کہ جب آدمی نادار ہوتا ہے تو خدا جانے کیا کیا اس کو سوجھتا ہے ہمارے حضرت حاجی صاحب تھانہ بھون میں رہتے تھے۔ایک پٹھان

حضرت کی خدمت میں دعا کرانے آیا کرتے تھے کہ مجھ پر ایک شخص نے جائیداد کے معاملہ میں بڑا ظلم کر رکھا ہے۔ حضرت جی دعا فرما دیجئے۔ ایک بار آ کر کہنے لگے کہ اب اس نے حد ہی کر دی اور جائیداد غصب ہی کرنے کو ہے۔ حضرت نے فرمایا بھائی صبر کرو۔ اس نے کہا بہت اچھا دفعتہً حافظ محمد ضامن صاحب حجرہ سے نکل آئے اور اس پٹھان سے فرمایا ہرگز صبر مت کرنا جاؤ، نالش کرو اور ہم دعا کریں گے اور حضرت سے فرمایا آپ تو صابر شاکر تھے۔ سب چھوڑ کر بیٹھ رہے اس میں تو اتنی قوت نہیں یہ اگر اسباب معاش کو چھوڑ دے گا تو جب حاجت ستاوے گی یہ جھوٹی گواہی دے گا چوری کرے گا تو ایسوں کو صبر نہیں کرایا کرتے تو یہ ہے اصل راز اس توسع کا تو آپ کسی سے اتنی گنجائش نہ سنیں گے مگر یہ اس لئے ظاہر کر دیا گیا کہ کفر سے بچانا ہے لیکن خدا کے لئے اس کو آپ تمام معاصی میں آڑ نہ بنالیں کہ یہ جز تو بہت اچھا ہاتھ آیا۔ بات یہ ہے کہ اوّل تو یہ بہت تھوڑا حصہ ہے سب معاصی میں اس کا توڑ یہ نہیں ہو سکتا۔ دوسرے اس میں یہ قید لگی ہوئی ہے کہ اس سے نکلنے کی ہر وقت فکر کرتے رہو۔ جیسے کوئی پاخانہ میں بیٹھا ہوا ہو اور تقاضا نکلنے کا رہتا ہے۔ اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ ایک رئیس صاحب ریل میں بیٹھے ہوئے تھے اور کہیں جگہ نہ تھی مگر انہوں نے کئی آدمیوں کی جگہ گھیر رکھی تھی اور کوئی کچھ کہتا تو دھمکاتے اور آخر پاخانہ میں گئے تو چٹخنی لگ گئی اور ان کے کھولنے سے نہ کھلی بڑے پریشان ہوئے۔ لوگوں سے التجا کی سب نے انکار کر دیا۔ آخری بڑی سماجت کے بعد لوگوں نے دوسروں کو تنگ نہ کرنے کی قسم کھلائی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ پائخانہ میں ہے اس میں قسم کھلانا جائز نہیں تو جس طرح وہ پائخانہ سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا اسی طرح حرام نوکری میں جا کر فخر کرتا ہے بلکہ قید سمجھتے ہیں مگر مجبوری میں کیا کریں بس اس کی یہ حالت ہوگی ؎

چوں کہ بریخت بہ بندوبستہ باش
چوں کشاید چابک وبرجستہ باش

تو نکلنے کی تو فکر کرو۔ کوشش تو کرو۔ گو کچھ امید نہ بھی ہو۔ اسی کو فرماتے ہیں ؎

گرچہ رخنہ نیست عالم راپدید ❁ خیر یوسف وار یا یدو وید

یوسف علیہ السلام کا قصہ یہ ہوا کہ جب زلیخا نے دروازہ بند اور مقفل کر لیا اور آپ نکلنے کے لئے دوڑے ہیں عجیب توکل اور ہمت تھی کہ باوجود قفل لگے رہنے کے دوڑے اور

آخر قفل ٹوٹ کر سب دروازے کھل گئے۔ اس کو فرماتے ہیں کہ ؎

گر چہ رخنہ نیست عالم را پدید ❁ خیر یوسف واریا بید و وید

اور اگر نہ بھی کھلے گا تو حق تعالیٰ یہ تو دیکھیں گے کہ یہ تو دوڑا ٹکر بھی لگ گئی اتنے پر بھی فضل ہو جاوے گا اب بتلایئے اس میں کون سی چیز مشکل ہے۔ میں تو نوکری نہیں چھڑاتا مگر نفور رہیں سو یہ کیا مشکل ہے اب تو یہ بھی نہیں۔ بلکہ برناز ہے بیبا کی ہے سو یہ فخر کیسا اور تکبر کیسا اور اہل دین کو ذلیل کیوں کہا جاتا ہے سو اہل اسباب کا علماء کے ساتھ بڑا اختلاف معاش کے باب میں تھا مگر اس سے زیادہ معاش کے متعلق کیا گنجائش ہو سکتی ہے، تو اب کون سا مرتبہ اختلاف کا رہ گیا تیرا قانون تو دشوار ہی نہیں اور قانون سخت نہیں صرف بات یہ تھی کہ لوگوں کی طرف سے دشواری ہو جاتی ہے تو اس میں بہت بڑی فہرست اصلاح کی تو معاش میں مخل ہی نہیں۔ اور جو مخل ہے اس کا بڑا حصہ تدبیر سے جائز ہو سکتا ہے اور جو تدبیر سے بھی جائز نہ ہو سکے وہ اولاً بہت مختصر ثانیاً اس میں اس طرح رہنے کی اجازت کہ اس سے نکلنے کی کوشش اور کئے پر پچتانا اور توبہ کرتے رہنا تو اب وہ کون سا جز ہے جس پر یہ اشکال ہے کہ شریعت کی پابندی بہت سخت ہے تو بحمد اللہ بے غبار یہ ثابت ہو گیا کہ **ماجعل اللہ علیکم فی الدین من حرج الآیۃ** (نفی الحرج: ص:۱۸)

سوال: مذہب اسلام میں ناول بینی ناجائز اور اس کے مضر اثرات؟

جواب: اس میں اس قدر مشغولی ہوتی ہے کہ سوائے اس کے قلب میں کچھ نہیں ہوتا اگر کوئی کہے کہ غفلت تو کچہری میں کام کرنے اور روٹی کھانے پکانے سب میں ہوتی ہے کہ چاہیے کہ سب چھوڑ دیں بات یہ ہے کہ کام دو قسم کے ہیں۔ ایک ضروری اور ایک غیر ضروری ضروری اشغال کا یوں تجربہ ہوا ہے کہ مضر نہیں ہوتے۔ اس لئے کہ اس کو ضروری سمجھ کر آدمی اس میں پھنستا ہے اور جب اس کو ضروری سمجھا تو اصلی کام دوسری شے کو سمجھے گا۔ تو دل اسی اصلی کام کی طرف رہے گا کہ اس کام سے فارغ ہو کر اپنا اصلی کام کریں گے۔ اور جو تھوڑی غفلت اس میں ہو جاتی ہے اس کے لئے استغفار کا حکم فرمایا ہے کہ استغفار سے وہ دھل جاوے گی اور غیر ضروری کی نسبت یہ تو خیال ہے نہیں کہ یہ ضروری ہے اس لئے اس کو ہی مقصود سمجھے گا اور وہ مضر ہے اور مورث غفلت ہے اور یہ غفلت بڑھتے بڑھتے مفضی الی الکبائر بلکہ الی الکفر ہو جاتی ہے، بالخصوص ناول سے ایک بڑا ہی سخت مرض پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے دیکھنے سے

بدمعاشی کے طریقے خوب یاد ہو جاتے ہیں (اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو ایسے ایسے مضرات سے نجات دے) ہمارے ناول کے شیدائی پرانے قصوں پر اعتراض کرتے ہیں اور تاریکی اور خلاف تہذیب سمجھتے ہیں۔ لیکن اس تاریکی اور اس روشنی میں اس قدر فرق ہے کہ اس تاریکی میں وقت تو ضائع ہو جاتا ہے۔ لیکن اخلاق پر برا اثر نہیں پڑتا۔ اس لئے کہ وہ قصے صریحاً کذب اور عادۃً مستحیل ہیں۔ مثلاً گل بکاؤلی کا قصہ۔ بکاؤلی کی تصویر اور جنوں کی عملداری وغیرہ من الخرافات ان قصوں سے کوئی ترکیب بدمعاشی کی نہیں سیکھ سکتا لیکن کہ اس میں وصال بکاؤلی کا طریقہ ایک جن کا مہربان ہو کر پہنچا دینا ہے تو اس کو کوئی کس طرح حاصل کرے گا۔ بخلاف ناولوں کے کہ اس میں لکھا ہے۔ کہ ماما کے ہاتھ رقعہ بھیج دیا۔ جس کو ہر شخص کر سکتا ہے۔ ناول کا طرز چوں کہ ایسا دکھلایا جاتا ہے۔ جیسے کہ واقعات ہوتے ہیں اس لئے اس کا ایک اثر خبیث پڑتا ہے کہ اکثر آدمی اس کے دیکھنے سے عشق اطفال میں مبتلا ہو جاتا ہے اور قلب میں سوزش کی سی کیفیت ہو جاتی ہے اور یہ سخت مضر ہوتا ہے۔ (الصوم: ص: ۹۴)

سوال: کیا پردہ پر اشکال ہے؟

جواب: حق تعالیٰ نے بنون کی زینت حیوۃ الدنیا بتلایا ہے بنات کو بیان نہیں فرمایا اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ بنات کو خود تم نے بھی بے حقیقت سمجھ رکھا ہے کیوں کہ لوگوں کو لڑکوں سے زیادہ خوشی ہوتی ہے اور لڑکیوں کو تو عموماً وبال سمجھتے ہیں تو تمہارے نزدیک وہ کیا خاک زینت دنیا ہوں گی۔ دوسرا نکتہ بنات کے ذکر نہ کرنے میں یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے یہ بتلا دیا کہ بنات زینت دنیا بھی نہیں ہیں بلکہ محض زینت خانہ ہیں۔ اگر وہ ہی زینت دنیا ہوتیں تو حق تعالیٰ ان کو بھی یہاں ذکر فرماتے۔ پس صرف بنون کو زینت دینا فرمایا اور بنات کو ذکر نہ فرمایا اس کی دلیل ہے کہ لڑکیاں دنیا کی زینت نہیں ہیں۔ کیوں کہ عرفاً زینت دنیا وہ سمجھی جاتی ہے جو منظر عام پر زینت بخش ہو اور وہ ایسی زینت نہیں ہیں کہ تم ان کو ساتھ لئے پھرو اور سب دیکھیں کہ ان کے اتنی لڑکیاں ہیں اور ایسی آراستہ پیراستہ ہیں۔ بلکہ وہ محض گھر کی زینت ہیں یہاں سے پردہ کی دلیل کی طرف اشارہ نکل آیا، دوسرے لغت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ عورتوں کو پردہ کرایا جائے۔ کیوں کہ اوروں میں عورت کو پردہ نہ کراؤ۔ ایسا ہے جیسا یوں کہا جائے کہ کھانے کی چیز کو نہ کھاؤ۔ پہننے کی چیز کو نہ پہنو اور اس کا تو ہونا ظاہر ہے کہ عورتوں کا پردہ کراؤ ان کو عورت کہنا خود اس کی دلیل ہے کہ وہ پردہ میں رہنے کی چیزیں ہیں۔ ایک ترقی یافتہ کہتے

تھے کہ عورتیں پردہ کی وجہ سے ترقی علم سے رُکی ہوئی ہیں میں نے کہا جی ہاں اسی واسطے تو ان چھوٹی قوموں کی عورتیں جو پردہ نہیں کرتیں بہت تعلیم یافتہ ہوگئی ہیں یہ جواب سن کر وہ خاموش ہی تو رہ گئے اصل بات یہ ہے کہ تعلیم یافتہ ہونے میں پردہ یا بے پردگی کو کوئی دخل نہیں۔ بلکہ اس میں بڑا دخل توجہ کو ہے۔

اگر کسی قوم کی عورتوں کی تعلیم پر توجہ ہو تو وہ پردہ میں بھی تعلیم دے سکتے ہیں ورنہ بے پردگی میں بھی کچھ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ غور کیا جائے تو پردہ میں تعلیم زیادہ ہوسکتی ہے۔ کیوں کہ تعلیم کے لئے یکسوئی اور اجتماع خیال کی ضرورت ہے اور وہ گوشۂ تنہائی میں زیادہ حاصل ہوتی ہے اس واسطے مرد بھی مطالعہ کے لئے گوشۂ تنہائی تلاش کیا کرتے ہیں۔ جیسا کہ طلباء کو اس کا اچھی طرح اندازہ ہے پس عورتوں کا پردہ میں رہنا تو علوم کے لئے معین ہے نہ کہ مانع نہ معلوم لوگوں کی عقلیں کیا ہوئیں جو پردہ کو تعلیم کے منافی سمجھتے ہیں۔ ہاں علوم تجارت کے لئے سیر وسیاحت کی البتہ ضرورت ہے مگر عورتیں ناقص العقل اور کم حوصلہ ہیں ان کے لئے سیر وسیاحت سے تجربے میں حقیقی یعنی اخلاق ترقی نہ ہوگی بلکہ آزادی اور شرارت بڑھے گی، اس لئے شریعت نے عورتوں کے ہاتھ میں طلاق نہیں دی کیوں کہ یہ ایسی کم حوصلہ ہیں کہ ذرا سی بات پر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں۔ مرد تو برسوں میں کسی بہت بڑی بات پر طلاق کا قصد کرتا ہے۔ وہ بھی ہزاروں میں سے ایک ورنہ زیادہ تو ایسے ہی مرد ہیں جو عورت کی بدتمیزیوں پر صبر کرتے ہیں اور اگر عورتوں کے ہاتھ طلاق ہوتی تو یہ تو ہر مہینہ شوہر کو طلاق دے کر نئی شادی کیا کرتیں۔ پس عورتوں کے لئے یہی سیر وسیاحت کافی ہے کہ اپنے گھر میں چل پھر لیا کریں۔ جن تجربوں کی ان کو ضرورت ہے وہ گھر میں رہ کر ہی ان کو حاصل ہوسکتے ہیں بلکہ میں تو کہتا ہوں کہ نظر حقیقت بین سے دیکھئے تو مردوں کو بھی اس کی ضرورت نہیں۔ اگر سیر وتماشہ چاہتے ہو تو وہ بھی آپ کے اندر موجود ہے۔ دل کی آنکھوں سے دیکھ لو تم کو اپنے اندر ایسا تماشا نظر آئے گا کہ دنیا کے پھول پھلواریوں سے استغناء ہوجائے گا۔

تم است اگر ہوست، کشد کہ بیسر سر دشمن درآ
تو زغنچہ کم ندمیدۂ دردل کشا بچمن درآ

چوں کوئے دوست ہمست بصحرا چہ حاجت است
خلوت گزیدہ را بہ تماشا چہ حاجت است

(مظاہر الآ ال: ص:۱۶)

دوسرا جواب: مردوں کو تو یہ حکم فرمایا قل للمؤمنین یغضوا من ابصارھم ویحفظوا فروجھم ۔یعنی آپ مومنین سے کہہ دیجئے کہ اپنی نگاہوں کو نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔اور عورتوں کے لئے یہ بھی حکم فرمایا اور اس پر اضافہ فرمایا۔ولا یبدین زینتھن ۔یعنی بناؤ سنگار کا موقع ظاہر نہ کریں اور ظاہر ہے کہ بناؤ سنگار کا موقع وہ ہے کہ اکثر کھلا رہتا ہے جب اس کا اظہار بھی اجانب کے سامنے جائز نہیں تو باقی تمام بدن کا تو کیسے جائز ہوگا اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے والقواعد من النساء التی لایرجون نکاحاً فلیس علیھن جناح ان یضعن ثیابھن غیر متبرجات بزینہ ۔یعنی جو عورتیں بوڑھی ہیں وہ اگر اپنے زائد کپڑوں کو اتار کر رکھ دیں جیسے اوپر تلے کپڑے ہوں اور اوپر کا کپڑا اتار دے بشرطیکہ بدن ظاہر نہ ہو۔تو کچھ حرج نہیں۔لیکن اس حالت میں بھی اپنے مواقع زینت کو ظاہر نہ کریں۔مثلاً گردن کان کہ ان میں زیور پہنا جاتا ہے اور ارشاد ہے وان یستعففن خیر لھن یعنی ان زائد کپڑوں کو اتار کر رکھنے سے بچیں۔تو ان کے لئے زیادہ بہتر ہے پس جب بوڑھیوں تک کے لئے یہ حکم ہے تو اے لڑکیو اور اے نوجوان عورتو تم کو کہاں مہلت ہوگی کہ دور دور کے رشتے داروں کے سامنے بے محابا آجاؤ۔حضور سے زیادہ تو کوئی نہ ہوگا۔حضور خود اپنے سے عورتوں کو پردہ کراتے تھے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ آج کل جو بعضے نو تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ پردہ ضروری نہیں ہے اور ایسا پردہ قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔محض غلط ہے بات یہ ہے کہ ان لوگوں نے قرآن وحدیث کو دیکھا ہی نہیں۔بس دیکھا کیا ہے کوئی اخبار دیکھ لیا، اگر کچھ عربی پڑھی ہے تو مصری اخبار دیکھ لیا۔سو سمجھ لو۔کہ یہ پردہ کے پیچھے سے خط دیا۔اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اپنے سامنے عورتوں کو نہ آنے دیتے تھے اور قرآن کی آیت اوپر گزری ہے پھر جب کہ حضور خود سے پردہ کروائیں تو کون سا پیر ہے اور کون سا رشتہ دار ہے جس سے بے حجابی جائز ہوگی۔خواہ کوئی خالو ہو یا پھوپھا دادا لگتا ہو۔یا چچا اگر محرم نہ ہو وہ اجنبی ہے۔بڑا ظلم قرار دیا کہ باوجود کہ یہ پاک تھا۔پھر بھی اس سے پردہ کا حکم دیا۔اگر یہ پاک وصاف ہوتے تو حق تعالیٰ ضرور ان کا نام لکھ دیتے کہ فلاں شخص پاک ہے یاد رکھو اللہ تعالیٰ کو سب خبر ہے کہ کون پاک ہے اور کون نہیں ہے۔انبیاء سے زیادہ تو کوئی نہیں ہوسکتا ہے۔یوسف علیہ السلام باوجود نبی ہونے کے فرماتے ہیں۔وما ابرئ نفسی ان النفس لامارۃ

بالسوء الا ما رحم ربی ۔یعنی میں اپنے نفس کو بری نہیں کرتا ہوں، نفس تو بری بات کا حکم کرنے والا ہی ہے مگر جس پر میرا رب رحمت فرمادے کہ وہ مستثنیٰ ہے۔اب بتلایئے کہ کس کا منہ ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے۔مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا اور اگر ایسا اتفاق ہوتا ہے تو وہ عارضی حالت ہے جو کہے کہ میرا نفس پاک ہے مجھ کو برا وسوسہ نہیں آتا کہ انہوں نے جب دیکھا کہ ان کو وسوسہ نہیں آتا کہ تو یوں سمجھے کہ ہمارا نفس مزکی ہوگیا ہے کہ انہوں نے غیر محرم کے اختلاط میں کوئی باک نہیں کیا۔اور پھر کسی فتنہ میں مبتلا ہوگئے خواہ وہ فتنہ قلب ہی ہو اور یہ کارگزاری شیطان کی ہے کہ اس ترکیب سے کہاں سے کہاں تک لایا اسی واسطے حق تعالیٰ نے اوّل یہ تدبیر بتلائی کہ نگاہ نیچی رکھو اگر بضرورت تم کو کسی غیر محرم کے سامنے آنا پڑے۔تو نگاہ نیچی اور کپڑوں میں لپٹ کر آؤ یہ نگاہ بظاہر ہے بہت خفیف لیکن سینکڑوں بیماریوں کا منشاء ہوجاتا ہے۔اسی طرح نظر بھی ہے۔اگر یہ بگڑ گئی تو آئندہ امن اٹھ گیا اسی واسطے اوّل اسی کو روکا ہے۔دیکھو نبی کی بیبیوں سے تو زیادہ کوئی عورت نہیں ہوسکتی میں تم کو قصہ سناتا ہوں۔ جس سے تم کو اندازہ ہوگا کہ پردہ کس درجہ ضروری ہے حضرت عبداللہ ابن مکتوم رضی اللہ عنہ ایک نابینا صحابی ہیں وہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ازواج مطہرات میں سے غالباً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بیٹھی تھیں حضور نے فرمایا کہ تم پردہ میں ہوجاؤ انہوں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہ اندھے ہیں۔حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ افعمیاوان نتھا السما تبصرانہ یعنی کیا تم بھی اندھی ہو۔اس کو دیکھتی نہیں ہو۔دیکھو حضور کی بیبیاں امہات المومنینؓ دوسری طرف نابینا صحابی بھلا یہاں کون سے وسوسہ کا احتمال ہوسکتا ہے مگر پھر بھی کس درجہ اہتمام کرایا۔(العفۃ ص:۷)

سوال: کیا علماء (امیر مذہب اسلام) ترقی سے مانع ہیں؟

جواب ۱: لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں آج میں اس الزام کو دفع کرنا چاہتا ہوں اور اس وقت میں ترقی کی ضرورت ہی پر بیان کروں گا۔اس پر جنٹل مین چونکے کہ یہ ملا آدمی اور ترقی کا بیان۔میں نے کہا کہ آپ تو ترقی کو صرف عقلی ضروری ہی کہتے ہیں اور میں اسے شرعی فرض کہتا ہوں اس پر اور بھی حیرت ہوئی میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتے ہیں ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات یعنی ہر قوم کے لئے ایک جہت قبلہ مقرر ہے جس

کی طرف وہ منہ کرتی ہے۔ پس ایک دوسرے پر سبقت کرو اس آیت میں حق تعالیٰ نے ہم کو استقباق کا حکم دیا۔ جس کے معنی ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے ہیں اور یہی حاصل ہے ترقی کا تو ترقی کی ضرورت قرآن سے ثابت ہے۔ بلکہ استبقوا صیغہ امر ہے جس کا مقتضیٰ وجوب ہے (امر مختلف معنوں کے لیے مستعمل ہے ان میں سے ایک وجوب بھی ہے جیسا کہ احقر اپنی کتاب بیان الحق میں مفصل بیان کر چکا ہے) تو یوں کہنا چاہیے کہ قرآن میں ترقی کو واجب و فرض کیا گیا ہے تو اب جو لوگ علماء کو ترقی سے مانع کہتے ہیں وہ ان پر کتنا بڑا افترا کرتے ہیں۔ بھلا جس چیز کا قرآن میں امر ہے۔ علماء کی مجال ہے کہ اس سے منع کر سکیں پس ترقی کا ضروری ہونا تو متفق علیہ ہے البتہ اس کے طریقہ میں اختلاف ہے جنٹل مین کہتے ہیں کہ جس طرح ہم کہیں اسی طرح ترقی کرو اور علماء کہتے ہیں کہ جس طرح قرآن کہے اسی طرح ترقت کرو۔ سو قرآن فاستقبوا کے ساتھ الخیرات کی بھی قید ہے جس کا حاصل یہ ہوا کہ نیک کاموں میں ترقی کرو۔ اب اس اختلاف کا فیصلہ بہت جلد ہو سکتا ہے۔ آپ یہ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ خواہاں ہیں وہ ترقی فی الخیر ہے تو میں اس کا ذمہ لیتا ہوں کہ علماء آپ کو اس ترقی سے منع نہ کریں اور اگر ترقی فی البشر ہے تو اس کا مطلوب ہونا بلکہ مذموم نہ ہونا تمام عقلاء کے نزدیک مسلم ہے ورنہ پھر ایک ڈاکو کو بھی یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ مجھے ڈاکہ سے کیوں منع کیا جاتا ہے میں تو ترقی کا طالب ہوں۔ بتلایئے اسے کیا جواب دیں گے ظاہر ہے کہ اس سے یہی کہا جاوے گا کہ تیری یہ ترقی ترقی محمود نہیں بلکہ ترقی مذموم ہے جو کہ برے طریقے سے حاصل کی جاتی ہے۔

معلوم ہوا کہ ترقی مطلقاً مطلوب نہیں بلکہ وہی مطلوب ہے جو محمود ہو مذموم نہ ہو۔ پس اب یا تو آپ ثابت کر دیں کہ جس ترقی کے آپ طالب ہیں وہ محمود ہے مذموم نہیں یا ثابت کر دیں کہ ترقی محمود وہی ہے جس کی ہم تعلیم دے رہے ہیں اور یہ ترقی مذموم ہے جس کی تعلیم آپ دے رہے ہیں۔ اس تقریر سے بہت جلد سمجھ گئے اور اقرار کر لیا کہ واقعی علماء کو ترقی سے اختلاف نہیں۔ بلکہ اس کے طریق تحصیل سے اختلاف ہے کیوں کہ ان طرق نے خلاف شرع ہونے کی وجہ سے اس ترقی کو فی الشر کا مصداق بنا دیا ہے۔ غرض دوسری قوموں کی ترقی دیکھ کر مسلمانوں کے منہ میں پانی بھر آتا ہے اور وہ اس کی ہر حالت کو ترقی میں داخل

سمجھ کر اختیار کرتے جاتے ہیں کبھی ان کی صورت و وضع کو اختیار کرتے ہیں کہ شاید اس کو ترقی میں دخل ہو کبھی عورتوں کے پردہ کو اٹھانا چاہتے ہیں کہ یہی ترقی سے مانع ہے اگر عورتیں آزاد ہوں گی تو علوم صنعت و حرفت سیکھ کر خود بھی ترقی کریں گی اور اولاد کو بھی ترقی یافتہ اٹھائیں گی۔ ایک صاحب نے میرے سامنے یہی دلیل بیان کی تھی میں نے کہا کہ مسلمانوں میں صرف شرفاء کی عورتیں پردہ نشیں ہیں جن کی تعداد ہندوستان میں بہت کم ہے زیادہ تعداد تو چھوٹی قوموں کی ہے اور ان میں پردہ کا ہمیشہ سے رواج نہیں ہے اگر بے پردگی کو ترقی میں کچھ دخل ہے تو ان قوموں نے کیوں نہ کر لی۔ بس اس کا جواب کچھ نہ تھا۔ وہ میرا منہ کو تکنے لگے۔ (العبرۃ بذبح البقرہ: ص:۴۵)

جواب ۲: یہ سب کہتے ہیں کہ عزت اور ترقی حاصل کرنا چاہئے اور اس کے ساتھ ہی علماء پر یہ الزام لگاتے ہیں کہ علماء ترقی کے مانع ہیں اور علماء کیسے مانع ہوتے ہیں جس شے کو قرآن و حدیث ثابت کرتے ہیں۔ اس کو کونسا مولوی مٹانے والا ہے حق تعالیٰ فرماتے ہیں وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ یعنی اللہ ہی کے لئے عزت اور اس کے رسول کے لئے اور مومنین کے لئے بھلا جس شخص کا اس آیت پر ایمان ہوگا وہ کیسے اس کی نفی کرے گا پھر علماء پر الزام کیسا۔ بات یہ ہے کہ ان کی بات پوری طرح سنتے تو ہیں نہیں بے سوچے ہانک دیا کہ علماء ترقی سے روکتے ہیں۔ صاحبو! علماء ترقی سے مانع نہیں ہیں علماء جو طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہیں وہ نفس ترقی کے طلب پر نہیں کرتے ہیں۔ بلکہ اس کا حاصل یہ ہے کہ آپ لوگ اس کو غیر طریق سے حاصل کر رہے ہیں۔ طریق یہ نہیں ہے اگر کوئی پشاور جانا چاہے اور ٹکٹ لے لے کلکتہ کا اور اس کو کوئی اس کی غلطی پر آگاہ کرے تو وہ پشاور جانے کا اور ریل میں سوار ہونے کا مخالف نہیں بلکہ طریق کے اندر مخالفت کرتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ رستہ یہ نہیں ہے پشاور کو دوسری گاڑی جاوے گی اس کا ٹکٹ لو وہ تم کو پشاور پہنچا دے گی اور یہ گاڑی پشاور نہیں جاوے گی میرے ایک ہم وطن اسٹیشن سہارنپور سے میرٹھ جانے والے لکھنؤ جانے والی گاڑی میں غلطی سے سوار ہو گئے اتفاق سے میں بھی لکھنؤ جا رہا تھا عین روانگی کے وقت تو ان سے کوئی بات ہوئی نہیں۔ اس لئے کہ خیال ہوا کہ گاڑی میں موجود ہیں ہی۔ ان سے باطمینان بات کروں گا۔ جو لوگ مجھ کو پہنچانے کے لئے آئے تھے ان سے باتیں کرتا رہا۔ جب ریل

چھوٹ گئی تو میں ان کی طرف متوجہ ہوا میں نے پوچھا کہ آپ کہاں جائیں گے کہنے لگے کہ میرٹھ میں نے کہا کہ ممکن ہے کہ آپ میرٹھ جائیں مگر یہ گاڑی میرٹھ نہ جاوے گی یہ تو رڑکی ہوتی ہوئی سیدھی لکھنؤ پہنچے گی یہ سن کر تو بہت چکرائے اور سردی کا موسم تھا ان جنٹل مین کو یہ بھی مرض ہے کہ کپڑا ساتھ نہیں لیتے اور رضائی اور روئی دار انگرکھا پہننے کو خلاف تہذیب سمجھتے ہیں بیک بینی و دو گوش ہی سفر کرتے ہیں۔ ایسے ہی وہ بھی تھے خیر رڑکی وہ اترے پھر وہاں سے اخیر شب میں میرٹھ پہنچے۔ پس دیکھنے میں اُن کے ریل میں سوار ہونے کا میرٹھ جانے کا مخالف نہیں تھا۔ بلکہ گفتگو یہ تھی کہ آپ نے طریق میں غلطی کی پس علماء کو اگر کہیں طالبان ترقی پر اعتراض کرتے ہوئے سنا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ترقی کے مخالف ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جس طریق سے آپ ترقی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ طریق اس کا نہیں ہے۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی
کیں راہ کہ میروی بترکستان است

طریق اس کا وہ ہے جو مولوی بتاتے ہیں اور یہ مولوی وہ چیز بتاتے ہیں جو خداوند اور رسول نے بتایا ہے وہ طریقہ ہے مولوی بیچارے جو سرکاری حکم کے منادی کرنے والے ہیں۔ منادی کرنے والا ہوں مجھ سے گلچپ نہ کرو اس کی ایسی مثال ہے جیسے چپراسی سمن لایا اور اس سے کوئی مباحثہ کرنے لگے تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوں گے۔ ایک تو تعمیل نہ کرنے کا دوسرے سرکاری آدمی سے مقابلہ کرنے کا پس یاد رکھو کہ یہ علماء سرکاری آدمی ہیں ان سے منازعت کرنا سخت جرم ہے۔ غرض طریق ترقی کا وہ نہیں ہے جو آپ لوگوں نے اختیار کیا ہے ترقی اور عزت حاصل کرنے کی ضرورت تو مسلم ہے لیکن طریق یہ نہیں ہے اب میں اس کو بیان کرتا ہوں مگر اس کی تحقیق کے لئے اوّل یہ سمجھئے کہ عزت حاصل کرنے کی غرض کیا ہے اور وہ کیوں ضروری ہے۔ سو لوگ تو ترقی اور عزت کے طالب ہیں کہ اس کی غرض محض بڑا بننا ہے۔ مگر اس کی اصل وجہ بیان کرتا ہوں کہ اس کی کس لئے ضرورت ہے اصل یہ ہے کہ عقلی طور پر انسان کو دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ منافع کو حاصل کرنا اور مضرات سے بچنا۔ آدمی جو کچھ کرتا ہے اس کی غایت صرف یہی ہوتی ہے کہ یا تو نفع کی تحصیل ہو یا مضرت کا دفع مثلاً کھانا کھاتا ہے تاکہ بھوک کے ضرر سے بچے، اور قوت کی

منفعت حاصل ہو دوا کرتا ہے تا کہ مرض دور ہو اور صحت حاصل ہو۔ غرض جو کچھ کرتا ہے یا تو جلب منفعت کے لئے یا دفع مضرت کے لئے اور دوسرا قاعدہ عقلی یہ سمجھو کہ ضروری چیزوں کے طریقے بھی ضروری ہوتے ہیں پس جلب منفعت اور دفع مضرت جس طریقے سے حاصل ہو وہ بھی ضروری ٹھہرا۔ سو طریقہ اس کا یہ ہے کہ مال و جاہ کا حاصل ہونا۔ مال تو اصل میں منافع کی تحصیل کے واسطے ہے اور جاہ اصل میں دفع مضرت کے واسطے ہے گو کبھی کبھی جاہ خطرہ میں بھی پڑنے کا احتمال ہے لیکن وہ بحیثیت جاہ ہونے کے خطرہ کا سبب نہیں ہوتی اس لئے کہ جاہ فی حد ذاتہ خطرات سے بچانے والی ہے۔ بلکہ سبب وقوع فی الخطرہ کا قلت جاہ ہوتی ہے۔ مثلاً بعض بڑے لوگوں کے کچھ دشمن ہو گئے اور آزار پہنچایا تو یہ ایذا جاہ کے سبب سے نہیں ہوئی جاہ کے محدود ہونے کی وجہ سے ہے۔ اگر غلبہ پورا ہوتا ہے تو اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسی واسطے حق تعالیٰ کا کوئی کچھ نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ غلبہ اور عزت غیر محدود ہے کامل درجہ میں ہے لیکن تاہم جاہ ہی ایسی شے ہے جو بہت سے مصائب اور خطرات سے آدمی کو بچاتی ہے مثلاً اب ہم اطمینان سے بیٹھے ہیں کوئی ہم کو ذلیل نہیں کر سکتا بیکار میں نہیں پکڑ سکتا تو اس کا سبب کیا ہے یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عزت عطا فرمائی ہے بخلاف ان لوگوں کے جن کو عزت حاصل نہیں ہے پولیس نے حکم دے دیا کہ دس چماروں کو بیگار میں پکڑ لاؤ۔ بیچارے چار رونا چار آتے ہیں۔ پس جاہ اور عزت کی غرض مضرت سے بچنا ہے۔ اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ عز[illegible]ور مال دونوں مطلوب اور ممدوح ہیں مہروب عنہ اور مذموم نہیں ہیں اور جو مال و جاہ کی مذمت کرتے ہیں ان کا عنوان تعبیری مختصر ہوتا ہے۔ مقصود مذمت کرنا حب مال اور حب جاہ کا ہے اور حب بھی وہ جو حق تعالیٰ کی محبت سے بڑھی ہوئی ہو کہ ان کی ہوس میں اللہ تعالیٰ کے حکم کو بھی پس پشت پر ڈال دے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

قل ان کان آباؤکم وابناء کم واخوانکم وازواجکم وعشیرتکم واموال نا قترفتموها وتجارة تخشون کسادها ومساکن ترضونها احب الیکم من اللہ ورسوله وجهاد فی سبیله فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہٖ

احب الیکم من اللہ سے صاف سمجھا جاتا ہے کہ مذموم اور منہی عنہ نہ مال ہے نہ جاہ

اور حب مال اور حب جاہ بلکہ مال اور جاہ کی حب مفرط ہے۔ جو اللہ کی یاد سے غافل کردے اور اس کے مقابلہ میں دین کی بھی پرواہ نہ رہے۔ عزت اور آبرو کی ایسی حفاظت کرے کہ دین رہے یا جائے مگر بات نہ جائے۔

جیسے ایک شخص ریل میں سوار تھے۔ انہوں نے نماز نہ پڑھی اور کہتے تھے کہ میں نے نماز اس لئے نہ پڑھی کہ ہندوؤں کا مجمع تھا اگر ان کے سامنے نماز پڑھتا تو وہ یوں کہتے کہ کیا اٹھک بیٹھک کرتا ہے اور اس سے اسلام کی اہانت ہوتی۔ استغفر اللہ یہ اس شخص کا گمان فاسد تھا اگر وہ نماز پڑھتا تو زیادہ عزت ہوتی ایک وزیر اعظم ریاست بھوپال کی حکایت ہے کہ کسی بڑے حاکم کا لیکچر ہو رہا تھا نماز کا وقت آ گیا۔ بڑے بڑے امراء وزراء شریک تھے ان میں نمازی بے نمازی سب قسم کے تھے۔ سب یہ سمجھے کہ یہاں سے اٹھنا بڑی سبکی کی بات ہے اس لئے سب ساکت بیٹھے رہے وزیر صاحب نے کھڑے ہو کر کہا کہ حضور نماز کا وقت آ گیا ہے۔ ہم نماز پڑھیں گے حاکم نے بہت خوشی سے کہا کہ ضرور پڑھ لیجئے۔ وزیر صاحب کھڑے ہوئے اور لوگ بھی نماز کے لئے کھڑے ہو گئے دربار ہی میں بڑی شان و شوکت سے نماز باجماعت ہوئی دیکھئے عزت یہ ہے کہ آج کل یہ حالت ہے کہ گو دین جاتا رہے مگر ہماری آبرو و عزت مزعومہ میں فرق نہ آنے پائے۔ ہماری آمدنی میں فرق نہ آنے پائے چنانچہ مختلف تدبیروں سے خواہ وہ جائز ہوں یا ناجائز کوئی مال بڑھا رہا ہے کوئی جائیداد کی فکر میں ہے عورتیں زیور کے بڑھانے کی فکر میں ہیں اسی طرح جاہ کو مختلف تدبیروں سے حاصل کرتے ہیں اور اس کو ریاست سمجھتے ہیں۔ آج کل ریاست کا حاصل کیا ہے کہ اپنے دباؤ اور زور سے غریبوں پر ظلم کرنا کسی کی گھانس چھین لی کسی کی زمین دبالی وغیرہ غرض جب عزت کے مقابلہ میں دین کی پرواہ نہ کی تو کیا عزت ہے۔ ہاں یہ بھیڑیئے کی عزت ہے اگر ابھی بھیڑیا آ جاوے۔ تو سب کھڑے ہو جاویں خواہ وہ یہ سمجھے کہ میری تعظیم میں کھڑے ہوئے ہیں (حالاں کہ لوگ اپنی حفاظت کے لئے غمے ہوئے ہیں۔ علی محمد) واللہ ان امراء اور ظالموں کی ایسی ہی عزت ہے کہ لوگ اپنے بچاؤ کی وجہ سے ان سے ڈرتے ہیں ورنہ ویسے تو کوستے اور گالیاں ہی دیتے ہیں کہ خدا تعالیٰ اس کو غارت کرے عزت ہے اللہ والوں کی کہ اُن کیلئے جان تک فدا کرنے کے واسطے لوگ حاضر ہیں۔ پس حقیقی عزت یہ ہے وہ دلوں پر قبضہ کرے

اور دلوں پر سکہ جمائے سو ایسی عزت اللہ والوں کی ہے۔

سوال: اس دور کے اندر یہ فتنہ پھیل چکا ہے کہ جو جو باتیں خلاف عقل ہوں اسے قطعی طور پر قبول نہ کیا جائے خواہ آیات قرآنیہ ہوں یا احادیث رسول وغیرہ؟

جواب: ہمارے بھائیوں نے ایک سبق پڑھ لیا ہے کہ جو بات ان کی سمجھ میں نہ آئے کہہ دیا کہ خلاف عقل ہے اس لئے قابل قبول نہیں اور لگے نصوص میں تحریف وتاویل کرنے چنانچہ ان کے نزدیک پل صراط پر چلنا بھی خلاف عقل ہے اور ساری آیات اور معجزات خلاف عقل ہیں۔ تو اس طرح انہوں نے عقائد میں بھی اختصار وانتخاب کرنا شروع کیا اب ایمان کے معنی وہ نہ رہے۔ جو پہلے تھے یعنی تصدیق بما اوفق عقل مما جاء به النبی ﷺ بلکہ معنی یہ ہو گئے کہ تصدیق بما اوفق عقل مما جاء به النبی ﷺ یعنی ان کے نزدیک ایمان کہتے ہیں اس چیز کے ماننے کو جو حضور ﷺ کی بیان کردہ باتوں میں سے ان کی عقل کے مطابق ہو میں کہتا ہوں کہ یہاں دو مقدمے ہیں ایک یہ کہ جو بات شریعت میں عقل کے خلاف ہے تمہاری عقل کے سب عقلاء کی عقل کے دوسری شق تو مسلم نہیں کیوں کہ علماء راسخین جن کی عقل کے سامنے اہل دنیا کی عقل کچھ حقیقت نہیں رکھتی وہ ان کو خلاف عقل نہیں کہتے اور ہر زمانہ میں ان مسائل کو ایسی صورت پر تسلیم کرتے آئے ہیں جس صورت سے شریعت میں تعلیم دی گئی ہے چنانچہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم وتابعین رضی اللہ عنہم وعلماء وصلحاء امت سب ان کا اعتقاد ظاہر کے مطابق رکھتے آئے ہیں اگر یہ کہو کہ تمہاری عقل کے خلاف ہے تو اس صورت میں صغریٰ تو مسلم مگر یہ کبریٰ مسلم نہیں کہ جو تمہاری عقل کے خلاف ہو وہ غلط اور نا قابل قبول ہے۔ کیوں کہ قوانین سلطنت میں بہت سی باتیں تمہاری عقل میں نہیں آتیں مگر تم قانون دانوں کی عقل پر اعتماد کر کے ان کو تسلیم کرتے ہو۔ اس کو بھی جانے دو میں تم سے پوچھتا ہوں کہ ماں کے پیٹ سے تم جس طرح پیدا ہوئے ہو کیا یہ تمہاری عقل میں آتا ہے واللہ ہم کو اس پر حیرت نہیں ہوتی کہ رات دن اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے اگر اس کا مشاہدہ نہ ہوتا اور صرف بیان سے یہ طریقہ معلوم ہوتا تو ہرگز عقل میں نہ آتا۔ اس کا امتحان اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ایک نوزائیدہ بچہ کی اس طرح نگرانی کرو کہ وہ یہ بات سننے یا دیکھنے نہ پائے۔ کہ بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا کرتا ہے۔ اس کے بعد آپ اس کو فلسفہ اور

سائنس اور طب سب کچھ پڑھائیں مگر یہ نہ پڑھائیں جس میں طریق ولادت کا ذکر ہو پھر جب وہ بی اے اور ایم اے اور ایل ایل بی ہو جائے اس وقت اس سے کہو کہ خبر بھی ہے تو کیوں کر پیدا ہوا تھا اور اس سے بیان کرو کہ اوّل تیرا باپ تیری ماں کے پاس گیا تھا۔ جس سے منی کے کچھ قطرے تیری ماں کے پیٹ کے اندر جو رحم ہے اس میں گرے تھے پھر رحم کے اندر اس کی پرورش ہوئی کہ خون بنا اور خون سے علقہ پھر مضغہ بنا پھر گوشت میں ہڈیاں بنیں۔ پھر جسم کامل تیار ہو گیا تو اس میں روح پڑی جس کی پرورش عرصہ تک خون رحم سے ہوتی رہی پھر نو ماہ کے بعد تو شرم گاہ مادر سے نکلا اور اب وہی خون رحم دودھ کی شکل میں ماں کے پستان میں آ گیا جس سے دو برس تک پرورش پاتا رہا الی آخرہ تو میں سچ کہتا ہوں کہ واللہ العظیم وہ نہایت سختی سے آپ کی مخالفت کرے گا اور کہے گا کہ ایک قطرے سے ایسے حسین جسم کا بننا پھر اس کا شرمگاہ سے جو نہایت تنگ راستہ ہے نکل آنا عقل کے بالکل خلاف ہے۔ اب بتلایئے کہ اگر یہ قاعدہ مان لیا جاوے کہ جو بات جس کی عقل میں نہ آئے وہ غلط ہوا کرے تو پھر آپ کا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونا بھی غلط ہے بات یہ ہے کہ آپ خلاف عادت کو خلاف عقل کہتے ہیں جیسے وہ نوزائیدہ بچہ جس کی ایسی نگرانی کی گئی ہو جس کا اوپر ذکر ہوا ماں کے پیٹ سے پیدا ہونے کو خلاف عقل کہے گا کیوں کہ اس نے یہ بات کبھی دیکھی یا سنی نہ تھی اور آپ اس کو خلاف عقل اس لئے نہیں کہتے ہیں کہ آپ کو اس کی عادت ہو گئی۔ ورنہ آپ بھی وہی کہتے اور خلاف عقل وہ ہے جو عقلاً ناممکن ہے۔ یعنی عقل اس کے استحالہ پر دلیل قائم کر سکے اور استحالہ کہتے ہیں اجتماع نقیضین کو تو خلاف عقل وہ ہے جس کے ماننے سے نقیضین کا ایک محل میں ایک آن میں ایک جہت سے مجتمع ہونا لازم آ جائے اب جو لوگ معادیات کو اور پل صراط وزن اعمال وغیرہ کو خلاف عقل سمجھتے ہیں وہ مہربانی کر کے اس کے استحالہ پر دلیل قائم کریں۔ اور بتلائیں کہ ان کے ماننے سے اجتماع نقیضین کیوں کر لازم آتا ہے۔

یقیناً وہ ہرگز کوئی دلیل عقلی ان کے استحالہ پر نہیں قائم کر سکتے بس بہت سے بہت بھی یہی کہے گے کہ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیونکر ہو جائے گا۔ اس کی نظیر دکھلاؤ بس آج کل تمام شبہات کا حاصل یہ ہے کہ اس کی کوئی نظیر نہیں ملتی ہے۔ اس لئے یہ محال ہے اور جو دعویٰ

امکان کرتا ہے۔ وہ اس کی نظیر دکھلائے۔ عجب اندھیرا ہے کہ نظیر پر ثبوت شے کو موقوف بتلایا ہے۔ اور جس چیز کی نظیر نہ ملے اس کو خلاف عقل اور محال کہا جاتا ہے۔ لوگوں کو ثبوت کی حقیت ہی معلوم نہیں۔ نظیر پر ثبوت کو موقوف سمجھتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ جو صنائع اور عجا ئبات اس زمانہ میں ایجاد یا مشاہدہ ہوتے ہیں۔ کیا اس زمانے سے پہلے کسی کے پاس ان کی نظیر تھی۔ اور اگر نہ تھی تو کیا اس وقت یہ خلاف عقل اور محال نہیں۔ اور اگر محال تھیں تو پھر آج ان کا دعویٰ کیونکر ہوا۔ معلوم ہوا کہ کسی شے کا امکان نظیر کے ملنے پر موقوف نہیں تو خوب سمجھتے کہ کسی دعویٰ کا ثبوت نظیر کے ملنے موقوف نہیں۔ بلکہ نظیر تو محض توضیح اور تنویر کے لئے ہوا کرتی ہے۔ مدعی ثبوت کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ہرگز لازم نہیں خصوصاً ایسے مدعی کے ذمے جو کسی امر کا ثبوت یہ کہہ کر کرتا ہے کہ یہ امر خلاف عادت بطور معجزہ کے واقع ہوا یا قیامت میں خلاف عادت یوں ہوگا۔ اس کے ذمہ تو کسی قاعدہ سے بھی نظیر کا پیش کرنا لازم نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ وہ تو اپنے دعوے میں تصریح کر رہا ہے کہ مدعی بے نظیر کی صفت کے ساتھ متصف ہے اگر نظیر کا پیش کرنا مدعی کے ذمہ کسی درجہ میں لازم بھی ہوسکتا ہے۔ تو صرف اس مدعی کے ذمہ ہوسکتا ہے۔ جو اپنے دعوے کے موافق عادت بتلائے۔ اور جو خرق عادت کا مدعی ہو۔ اس سے نظیر کا مطالبہ کرنا عجب ہے اب میں آپ کو ثبوت کی حقیت بتلاتا ہوں۔ جس کے نہ ماننے کی وجہ سے لوگوں کا مذاق ایسا بگڑ گیا کہ آج علماء سے معراج کی نظیر کا سوال ہوتا ہے۔ شق القمر کی نظیر کا مطالبہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ عقلی مسئلہ ہے کہ کسی خبر کا صحیح ہونا۔ یا کسی امر کا واقع ہونا نظیر پر موقوف نہیں۔ چنانچہ جن کو عقلیات سے کچھ بھی مس ہے وہ اس کو جانتے ہیں کہ مدعی اگر نظیر بیان کردے تو یہ اس کا تبرع ہے۔ بلکہ ثبوت خبر کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ ایک مخبر بہ کا ممکن ہونا۔ دوسرے مخبر کا صادق ہونا۔ پس ہمارے ذمہ تمام معجزات اور معادیات کے متعلق دو باتوں کا ثبوت مہیا کرنا ہے۔ ایک یہ کہ وہ فی نفسہٖ ممکن ہوں۔ دوسرے مخبر صادق نے ان وقوع کی خبر دی ہو۔ ان دو باتوں کے ثابت کرنے کے بعد کسی انکار کا حق نہ ہوگا۔ اب ہم معراج وغیرہ اور صراط ووزن اعمال وغیرہ کے ثبوت پر دلیل قائم کر سکتے ہیں۔ کہ یہ معجزات اور معادیات فی نفسہٖ ممکن ہیں۔ یہ تو دلیل کا پہلا مقدمہ ہے۔ اگر کسی کو اس مقدمہ میں کلام ہو تو اس پر لازم ہے کہ ان کے امتناع پر

دلیل قائم کرے۔اور ہم کو امکان پر دلیل قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔کیونکہ امکان کی علت نہیں ہوتی بلکہ امتناع پر دلیل نہ ہونا یہی امکان کی دلیل ہے۔اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ امتناع کہتے ہیں۔اجتماع نقیضین کو کہ محل واحد میں جہت واحد سے ہو تو جس کو ان امور کے امکان میں کلام ہو وہ ثابت کرے کہ ان میں اجتماع نقیضین کس طرح لازم آتا ہے۔دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ جس امر ممکن کے وقوع کی خبر کوئی مخبر صادق دے وہ ثابت ہے۔اور ان معجزات ومعادیات کے وقوع کی خبر مخبر صادق نے دی ہے۔پس یہ امور واقع و ثابت ہیں۔ان مقدمات میں اگر کوئی کلام کرے۔تو اس کا جواب ہمارے ذمے ہے۔باقی نظیر کا پیش کرنا ہمارے ذمہ نہیں ہے۔مثلاً اگر کوئی کہے کہ پل صراط پر چلنا عقل کے خلاف ہے سمجھ میں نہیں آتا تو میں کہوں گا۔کہ بتلاؤ کیوں نہیں سمجھ میں آتا۔اس میں کیا استحالہ ہے کہ ایک باریک چیز چلا جائے۔جب یہ محال نہیں اور مخبر صادق اس کے وقوع کی خبر دے رہا ہے۔تو پھر انکار کی وجہ کیا ہے۔اگر کوئی انکار کرے تو اس کو یہ حق تو ہے کہ امکان کو رد کرے اور امتناع کو ثابت کرے یا دوسرے مقدمہ میں کلام کرے کہ یہ مخبر صادق کی خبر نہیں۔تو ہم دلیل امتناع سننے کے لئے تیار ہیں اور کلام اللہ کو کلام اللہ ثابت کرنا بھی ہمارے ذمہ ہے۔اور جب یہ دونوں باتیں ثابت ہو جائیں۔پھر ہم نظیر پیش کرنے کے ذمہ دار نہیں۔اور اگر نظیر ہم کو معلوم بھی ہو تب بھی نہ بتلائیں گے۔کیونکہ یہ ہمارے ذمہ نہیں ہے کہ ہم اپنی سب معلوماتِ آپ کو بتلا دیں۔ہاں اگر تم یہ ثابت کر دو۔کہ مستدل کے ذمہ نظیر کا پیش کرنا ضروری ہے۔تو جب ثابت کر دو گے اس وقت دیکھا جائے گا بدون اس کے کہ ہم اس کے ہم زوائد کے ساتھ جواب نہ دیں گے یہ عوام کو زیادہ تو جواب دینے والوں ہی نے خراب کیا ہے۔کہ وہ ہر بات میں تبرعاً نظیریں کرنے لگے۔عوام سمجھے کہ یہ بھی مجیب کے ذمہ ہے تو میں اس کا فیصلہ کرتا ہوں کہ مستدل کے ذمے یہ ہرگز نہیں اور جو دعویٰ لزوم کا کرے وہ دلیل قائم کرے۔یہ ہے دلیل مطرد جو تمام معجزات ومعادیات میں برابر چل سکتی ہے۔اور جو دلیلیں آج کل بیان کی جاتی ہیں۔جن میں زیادہ تر نظیر سے جواب دیا جاتا ہے۔وہ مطرد نہیں ہیں۔اب میں عقلاً یہ بات ثابت کرتا ہوں کہ کسی واقعہ کا ثبوت نظیر پر موقوف نہیں۔تقریر اس کی یہ ہے کہ یہ ظاہر ہے کہ نظیر بھی ایک واقعہ ہے۔میں پوچھتا ہوں کہ اس کے لئے نظیر کی

ضرورت ہے یا نہیں۔ وعلیٰ ہذا اگر ہر نظیر کی ضرورت رہی تو تسلسل مستحیل لازم آئے گا۔ اور نظیر سے ایک دعویٰ بھی ثابت نہ ہو سکے گا۔ اور اگر کہیں جا کر ٹھہرو گے۔ کہ اس نظیر کے لئے کسی نظیر کی ضرورت نہیں تو معلوم ہوا کہ واقعہ کا ثبوت بدون نظیر کے ہو گیا۔ تو پھر پہلے ہی کے لئے نظیر کی کیوں ضرورت ہے۔ اور جس طرح تم نے اخیر میں ایک واقع کو بلا نظیر کے مان لیا۔ تو پہلے ہی کو بلا نظیر کیوں نہیں مان لیتے۔ غرض کسی دلیل سے مستدل کے ذمہ نظیر کا بیان کرنا نہیں ہے۔ ہاں اگر بیان کر دے تو یہ اس کی شفقت ہے اور اس کا موقع اس وقت ہے۔ جب کہ سائل دلیل کے مقدمات پر کلام کرنے سے عاجز ہو جاوے۔ اور تسلیم کر لے کہ واقعی دلیل سے یہ دعویٰ ثابت ہو گیا اور مجھے اب انکار کا کوئی حق نہیں اس وقت اگر مجیب تقریب فہم کے لئے کوئی نظیر دیدے تو اس کا احسان ہے اور اگر وہ نظیر پر ثبوت دعوے کو موقوف بتلاتا رہے تو مستدل نظیر ہرگز نہ بتلائے بلکہ اس سے اس توقف علی النظیر کی دلیل مانگے۔ چنانچہ اس وقت میں ثبوت پل صراط پر دلیل قائم کر کے اس کی ایک نظیر تبرعاً بتلاتا ہوں اوّل پل صراط کی حقیقت سمجھئے مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ یہ مضمون ظنی ہے۔ اس طور پر پل صراط کو سمجھنا واجب نہیں۔ اصل تو یہی ہے کہ آدمی مجملاً پختہ عقیدہ رکھے باقی بعض طبائع ضعیف ہوتی ہیں ان کے لئے میں یہ مضمون بیان کرتا ہوں اگر وہ اس طرح بھی پل صراط کو سمجھ لیں تو حرج کچھ نہیں۔ مگر لازم بھی نہیں۔ لازم تو وہی اجمالاً مان لینا ہے اس تنبیہ کے بعد کہتا ہوں کہ اوّل تو حقیقت سمجھو جس کے لئے اوّل تو یہ مقدمہ سنو! کہ اس عالم کے سوا ایک عالم اور بھی ہے مسلمان تو اس کا انکار نہیں کر سکتے اور مخالفین اگر انکار کریں تو ہمارے پاس اس کے جواب کے لئے وہی دلیل مطرد ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ دوسرے عالم کا ہونا ممکن ہے۔ کسی کو امکان پر کلام ہو تو دلیل امتناع قائم کرے اور جس ممکن کی خبر مخبر صادق نے دی ہو وہ ثابت ہے۔ پس دوسرا عالم ثابت ہے اور مخبر کے صادق ہونے کو ہم دلائل سے ثابت کر سکتے ہیں دوسرا مقدمہ یہ سنئے کہ عالم کے اختلاف سے بعض احکام اور حالات بدل جاتے ہیں۔ اس کی بھی دلیل تو وہی ہے جو مذکور ہوئی اور تقریب فہم کے لئے ایک نظیر بھی بتلاتا ہوں۔ جیسے اقالیم کے بدلنے سے بھی دنیا ہی میں حالات بدل جاتے ہیں۔ مثلاً یہاں اس وقت رات ہے اور اقلیم میں اس وقت دن ہے یہاں آج کل گرمی ہے اور کسی اقلیم

میں اس وقت سردی ہے وعلیٰ ہذا یہاں چوبیس گھنٹہ کا دن رات ہے اور بعض اقالیم میں چھ مہینے کا دن اور چھ مہینے کی رات ہے اور یہیں سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن میں جو آیا ہے کہ عالم آخرت کا ایک دن ہزار برس کے برابر ہے اور اس پر بعض لوگ ہنستے ہیں تو یہ ان کی حماقت ہے۔ اس میں استبعاد کیا ہے جب عالم دنیا ہی میں اقلیم کے بدلنے سے یہ بات مشاہد ہے کہ بعض جگہ چھ ماہ کا دن ہوتا ہے تو اختلاف عالم کے بعد عالم آخرت میں اگر ہزار برس کے برابر ایک دن ہو تو کیا تعجب ہے تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ اختلاف کی کوئی حد نہیں ہے نہ یہ منضبط ہوسکتا ہے یہ مقدمہ بدیہی ہے محتاج دلیل نہیں اور جو شخص کسی حد پر انتہا اختلاف کا دعویٰ کرے اور اس سے آگے اختلاف ہونے کو ممتنع کہے۔ وہ اس پر دلیل قائم کرے چوتھا مقدمہ یہ ہے کہ ممکن ہے کہ جو چیز یہاں عرض ہو اس عالم میں جا کر جوہر ہو جائے اس کا ممکن ہونا بھی ظاہر ہے یہ تو مسلم ہے کہ ایک آن اور ایک محل میں شے واحد عرض و جوہر نہیں ہوسکتی مگر یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شئے یہاں عرض ہو اور دوسری جگہ جوہر ہو جائے اس کے امتناع پر کوئی دلیل قائم نہیں اگر کسی کے پاس دلیل ہو پیش کرے اور استناس کے طور پر اس کو یوں سمجھئے کہ اس زمانہ میں بعض آلات کے ذریعہ سے حرارت و برودت وغیرہ کا وزن ہوتا ہے حالاں کہ پہلے حکماء اس کو مقولہ کیف سے سمجھتے تھے جس کے لئے وزن اور مقدار نہیں ہوسکتی مگر اس زمانہ میں ان کے لئے وزن ہونا ثابت ہو گیا اس لئے میں تو کہا کرتا ہوں کہ جتنی یہ نئی نئی ایجادات ہیں سب معادیات کے سمجھنے کے لئے معین و ممد ہیں۔ چنانچہ گراموفون ہاتھ پیر کے بولنے پر بڑی دلیل ہے کیوں کہ گراموفون میں تو روح بھی نہیں اور کلام کرتا ہے تو اعضاء انسانی کے بولنے میں کیا تعجب ہے جن میں حیات کا تلبس ہے اسی طرح ایک حدیث میں ہے۔ جو نسائی میں موجود ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے صلوٰۃ کسوف کے موقع پر فرمایا کہ میں نے مسجد کی دیوار کے قریب جنت و دوزخ کو دیکھا۔ بعض لوگ اس پر ہنستے تھے کہ کہ جنت و دوزخ تو آسمان و زمین سے بڑی بتلائی جاتی ہے۔ حضور ﷺ نے ان کو دیوار پر کیوں کر دیکھ لیا مگر خدا تعالیٰ نے فوٹو اور خوردبین کو ایجاد کرا کے اس استبعاد کو دور کرایا۔ فوٹو میں بڑی سے بڑی شے کو چھوٹا کر کے دکھایا جا سکتا ہے اور خوردبین سے چھوٹی سے چھوٹی چیز پہاڑ بنا کر دکھائی جا سکتی ہے تو خدا تعالیٰ کو یہ قدرت نہیں کہ اس نے جنت و دوزخ کا فوٹو مسجد

کی دیوار پر اتار دیا ہو اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شعاع میں خوردبین کی قوت رکھ دی ہو جس سے فوٹو کی چھوٹی چیزیں آپ کو اصلی حالت پر نظر آ گئی ہوں۔ اور حدیث میں یہی لفظ وارد ہے مثلت لی الجنة والنار یہ نہیں فرمایا کہ جنت و دوزخ زمین میں اتر آئی تھی۔ بلکہ آپ نے فرمایا کہ وہ میرے لئے ممثل ہو گئیں اسی لئے جب کوئی نئی ایجاد ہوتی ہے۔ تو میں خوش ہوتا ہوں کیوں کہ ان سے شرعیات کا استبعاد دور ہوتا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک عجیب بات اس زمانہ میں یہ ہے کہ آج کل حرارت برودت کا بھی وزن ہونے لگا کہ اس مکان میں کس قدر وزن کی حرارت موجود ہے اور کس درجہ کی برودت ہے اور بخار میں تھرمامیٹر سے مریض کی حرارت کا وزن کیا جاتا ہے اب اگر کسی گنوار سے کہا جائے کہ گرمی بھی تلتی ہے تو اس کو کتنا تعجب ہوگا تو جب دنیا ہی میں بعض اعراض کا وزن ہونے لگا جس کی حقیقت ہے مابہ الوزن کے انخفاض وارتفاع سے مقدار کا معلوم ہو جانا جو کہ سرسری نظر میں خواص جوہر سے ہے تو اگر دوسرے عالم میں جا کر وہ جوہر ہی بن جاوے تو کیا تعجب ہے اور لیجئے اگر ایک برتن ٹھنڈا پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا اور اسی میں گرم پانی بھر کر وزن کرو تو اور وزن ہوگا آخر کمی بیشی کیوں ہے پانی کی مقدار تو دونوں حالتوں میں یکساں تھی معلوم ہوا کہ برودت وحرارت کا بھی کچھ وزن ہے اب خواہ اس کو یوں تعبیر کر لیجئے کہ وزن پانی ہی کا ہے مگر بشروط برودت وحرارت کے آخر ان کو وزن میں دخل تو ہوا تو اس عالم میں اگر یہی دخل درجہ موزونیت میں اس طرح ہو جاوے کہ یہ عرض جوہر بن جاوے تو کیا تعجب ہے اور سنئے اطباء کہتے ہیں کہ جس شخص میں صفراء کا غلبہ زیادہ ہو وہ خواب میں آگ بہت دیکھتا ہے دیکھئے جو چیز یہاں عرض تھی یعنی حرارت صفراوی وہ عالم خیال میں آگ بن گئی جو کہ جوہر ہے پس اس عالم میں عرض کا جوہر بن جانا کچھ بعید نہیں اب پل صراط کی حقیقت سمجھئے گو اس کے بیان کی ضرورت نہیں کیوں کہ مسلمان کا مذاق تو یہ ہونا چاہیے۔

حدیث مطرب وی گوورا زدہر کمتر جو
کہ کس نکشود نکشاید بہ حکمت ایں معمار

اور میں کہہ چکا ہوں کہ میرے ذمے اس کا بیان کرنا لازم نہیں میرے ذمے تو وہی تھا جو میں بیان کر چکا ہوں مگر اس میں خط نہ آیا تھا۔ اس لئے تبرعاً بیان کرتا ہوں کہ خیر جس

طرح بھی کام چلے اچھا ہے تو سنئے پل صراط کی حقیقت شریعت میں ہے (کما قال اصحاب الکشف من العرفه) پس دنیا میں پل صراط کی نظیر شریعت موجود ہے۔ اتنا فرق ہے کہ یہاں یہ عرض ہے اور وہاں جا کر جوہر بن جائے گی باقی اور تمام صفات میں یہ اس کی نظیر ہے جیسے وہ بال سے باریک ہے جس پر استقامت کے ساتھ چل لینا ہر ایک کا کام نہیں کیوں کہ شریعت مقدسہ مرکب ہے علم و عمل سے تو اس پر چلنے کے لئے دو قوتوں کی ضرورت ہے۔ ایک قوت علمیہ کی دوسری قوت عملیہ کی۔ قوت علمیہ کا تعلق عقل سے ہے اور قوت عملیہ کا ارادہ سے پھر عمل بعض مفید ہیں اور بعض مضر تو اس میں کہیں تو جلب منفعت کی ضرورت ہے اور کہیں دفع مضرت کی اور جو ارادہ جلب منفعت سے متعلق ہو اس کو قوت شہویہ کہتے ہیں او جو دفع مضرت کے متعلق ہو اس کو قوت غضبیہ کہتے ہیں تو شریعت پر چلنے کے لئے تین قوتوں کی ضرورت ہوئی قوت عقلیہ، قوت شہویہ، قوت غضبیہ یہی اصول اخلاق کہلاتے ہیں پھر ان میں سے ہر ایک کے تین درجے ہیں افراط و تفریط اور توسط اور شریعت نام ہے توسط کا شریعت میں افراط عقل سے بھی کام نہیں چلتا نہ تفریط سے کام چلتا ہے بلکہ توسط کی ضرورت ہے جس کا نام حکمت ہے اور قوت عقلیہ کی افراط کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے اور قوت عقلیہ کی افراط کا نام جزیرہ ہے یہ نہایت مضر ہے جب عقل بہت بڑھ جاتی ہے تو ہر چیز میں احتمالات عقلیہ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ جس سے آدمی وہمی ہو جاتا ہے۔ جیسے اہل فلسفہ میں ایک فرقہ ہے اور یہ مشہور ہے کسی حقیقت کا وجود تسلیم نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ہم ایک چیز کو دور سے دیکھ کر آدمی سمجھتے ہیں۔ اور وہ گدھا نکلتا ہے بہت لوگ ایک شخص کو حسین سمجھتے ہیں اور بہت سے اس کو بدصورت سمجھتے ہیں بعض لوگ ایک چیز کو میٹھا بتلاتے ہیں اور بخار والا اس کو کڑوی بتلاتا ہے اسی طرح مسائل عقلیہ میں کوئی ایک دلیل کو صحیح کہتا ہے۔ کوئی غلط تو جب ہمارے حواس ظاہرہ اور باطنہ میں اتنا اختلاف ہے اور کبھی ان سے غلطی بھی ہو جاتی ہے تو یہ کیا اطمینان ہے کہ جس کو ہم نے آدمی سمجھا ہے وہ آدمی ہی ہے گدھا نہیں اور جس کو ہم زمین کہتے ہیں۔ وہ زمین ہی ہے آسمان نہیں۔ ممکن ہے ہماری نظر نے غلطی کی ہو بس اب

ان کا یہ حال ہو گیا کہ ہر بات میں ان کو شک ہے اور شک میں بھی شک ہے۔ فھو شاک وشاک فی انه شاک۔

تو حضرت عقل جب بڑھتی ہے تو اتنا پریشان کرتی ہے کہ زندگی تباہ کر دیتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بہت سے عقلاء کے تباہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عقل سے وہ کام لیا جو اس کی حد سے آگے تھا اور ہر چیز کا اپنی حد سے آگے نکل جانا مضر ہے میں تو عقل کے متعلق ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ یہ ایسی ہے جیسے گھوڑا پہاڑ پر چڑھنے والے کے لئے اب تین قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ جو گھوڑے پر سوار ہو کر پہاڑ تک پہنچے اور پھر پہاڑ پر بھی اس پر سوار ہو کر چڑھنے لگے۔ یہ غلطی پر ہیں ضرور کسی سیدھی چڑھائی پر سوار اور گھوڑا دونوں گریں گے۔ اور ایک وہ ہیں جو یہ سمجھ کر کہ گھوڑا پہاڑ پر تو کام دیتا ہی نہیں تو اس سے صاف سڑک پر بھی کام لینے کی کیا ضرورت ہے وہ گھر ہی سے پیدل چل پڑے نتیجہ یہ ہوا کہ پہاڑ تک پہنچ کر تھک گئے۔ یہ بھی نہ چڑھ سکے تو ان دونوں کی رائے غلط تھی پہلی جماعت نے گھوڑے کو ایسا بیکار سمجھا کہ اخیر تک اسی سے راستہ طے کرنا چاہا اور دوسرے نے ایسا بے کار سمجھا کہ پہاڑ پر چڑھنے کے لئے بیکار ہے۔ اس کے لئے کسی اور سواری کی ضرورت ہے۔ یہی حال عقل کا ہے کہ عقل سے بالکل کام لینا بھی حماقت ہے اور اخیر تک کام لینا بھی غلط ہے۔ پس عقل سے اتنا کام تو لو کہ توحید و رسالت کو سمجھو اور کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم کر لو۔ اس سے آگے فروغ میں عقل سے کام نہ لینا چاہیے بلکہ اب خدا اور رسول کے احکام کے آگے گردن جھکا دینی چاہیے۔ چاہے ان کی حکمت عقل میں آوے یا نہ آوے۔ دیکھئے قانون سلطنت کے منوانے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے یہ سمجھا دیا جائے کہ جارج پنجم بادشاہ ہیں۔ اس کے بعد تمام احکام کے متعلق یہ کہہ دیا جائے کہ یہ بادشاہ کے احکام ہیں۔ اس لئے ماننا پڑے گا تو یہ صورت آسان ہے اور تمام عقلاء ایسا ہی کرتے ہیں دوسری صورت یہ ہے کہ ایک شخص جارج پنجم کو بادشاہ مان کر پھر بھی ہر قانون میں الجھنے لگے کہ میں اس دفعہ کو نہیں مانتا تو بتلایئے اس شخص کا کیا حال ہوگا ظاہر ہے کہ ہر جگہ ذلیل ہوگا اور عقلا کہیں گے کہ جب بادشاہ کا بادشاہ ہونا مسلم اور اس قانون کا قانون سلطنت ہونا معلوم تو پھر انکار کی کیا وجہ ضرور ماننا پڑے گا چاہے سمجھ میں آئے یا نہ آئے معلوم ہوا کہ صاحب سلطنت

کے پہچاننے کے لئے تو عقل سے کام لینے کی اجازت ہے اس کے بعد عقل سے کام لینے کی اجازت نہیں۔ پھر کیا وجہ کہ آپ دین کے معاملہ میں اخیر تک عقل سے کام لینا چاہتے ہیں۔ یہ سخت غلطی ہے جس سے بجز ذلت کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا جب خدا کا ہونا مسلم رسول کا رسول ہونا مسلم کلام اللہ کا کلام اللہ ہونا معلوم۔ پھر ہر حکم میں الجھنے کا آپ کو کیا حق ہے۔ اور ہر شخص آپ کو بیوقوف بنائے گا اور تمام عقلاء کی نظروں میں آپ ذلیل ہوں گے سچ یہ ہے ؎

عزیزے کہ از درکشش سر بافت
بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

غرض عقل سے اس وقت تک کام لو جب تک وہ کام دے سکے۔ اور جہاں اس کا کام نہیں وہاں اس کو چھوڑ دو اور حکم کا اتباع کرو تو عقل کی بھی ایک حد ہوئی اور کیوں نہ ہو وہ بھی تو ایک قوت ہے جیسے آنکھ کی ایک قوت ہے اور اس کی ایک حد ہے اس سے آگے دوربین لگانے کی ضرورت ہے بلکہ دوربین وہی سے کام لینا ضروری ہے ایسے ہی کام کی ایک قوت ہے جس کے لئے ایک حد ہے کہ اس سے آگے ٹیلیفون سے مدد لینے کی ضرورت ہے پیروں کی ایک قوت ہے جس سے آگے سواری سے مدد لینے کی ضرورت ہے تو جب ہر قوت محدود ہے تو عقل کیسے محدود نہ ہوگی۔ ضرور ہوگی۔ اس کے آگے ولی سے کام لو ورنہ یاد رکھو کہ عمر بھر رستہ نہ ملے گا۔ کیوں کہ سمعیات میں عقل کا کام نہیں۔ وہاں تو اتباع رسول کی ضرورت ہے اور ؎

خلاف پیمبر کسے رہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

صاحبو! دنیا میں بھی تو آپ بہت جگہ عقل کو چھوڑ کر کسی نہ کسی کا اتباع کرتے ہیں دیکھئے جب آپ بیمار ہوتے ہیں تو عقل سے اتنا کام تو لیتے ہیں کہ اطباء موجودین میں سے کون زیادہ حاذق و تجربہ کار ہے اور جب ایک طبیب کا حاذق ہونا معلوم ہو گیا تو پھر آپ اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ نبض دیکھ کر نسخہ تجویز کرتا ہے پھر آپ اس سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس نسخہ میں فلاں دوا کیوں لکھی اور فلاں کیوں نہیں لکھی اور دو کا وزن چار ماشہ کیوں لکھا چھ ماشہ کیوں نہیں لکھا۔ ہم نے کسی کو طبیب سے ان باتوں سے الجھتا ہوا نہیں دیکھا اور اگر

کوئی اس سے الجھنے لگے تو عقلا اس کو بیوقوف بناتے ہیں۔ اور طبیب بھی صاف کہہ دیتا ہے کہ اگر تم میرے پاس مجھ کو طبیب سمجھ کر آئے ہو تو جو نسخہ میں تجویز کر دوں اس میں تم کو چوں چرا کا کوئی حق نہیں اور اگر چوں و چرا کرتے ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تم مجھ کو طبیب نہیں سمجھتے پھر میرے پاس کیوں آئے تھے اور اس کے اس جواب کو تمام عقلا صحیح کہتے ہیں پھر حیرت ہے کہ رسول تسلیم کرنے اور کلام اللہ کو کلام اللہ مان لینے کے بعد عقل کو ان کے تابع نہ کیا جاوے۔ اور بات بات میں الجھا جاوے کہ یہ تو خلاف عقل ہے ہم اسے کیوں کر مان لیں صاحب اگر تم نے رسول کو رسول مان لیا ہے تو ہر بات کو بلا چوں و چرا مان لینا پڑیگا اور یہ کہنے کا حق نہ ہوگا کہ ہماری عقل میں یہ بات نہیں آتی ورنہ اس کے یہ معنی ہیں کہ تم نے اب تک رسول کو رسول ہی نہیں سمجھا۔ اور کلام اللہ کو کلام اللہ ہی نہیں مانا افسوس دنیا کے کاموں میں تو عقل کی ایک حد ہو اور طبیب کو طبیب مان لینے کے بعد اس کی تجویز میں عقل کو دخل نہ دیا جاوے اور امور آخرت میں اس کی کوئی بھی حد نہ ہو۔

صاحبو! جب دنیا کے کام بدون اس کے نہیں چل سکتے کہ عقل کو ایک حد پر چھوڑ دیا جاوے اور بلا چوں و چرا دوسرے کا اتباع کیا جاوے تو آخرت کام بدون اس کے کیوں کر چلے گا کیوں کہ دنیا کی چیزیں تو دیکھی ہوئی بھی ہیں۔ ان میں کسی قدر عقل چل بھی سکتی ہے پھر بھی ان کو چھوڑ کر کاملین و ماہرین کی تقلید کی جاتی ہے اور آخرت سے تو ہم سب اندھے ہیں وہاں بدون تقلید وحی کے کیسے کام چلے گا اور اگر اس میں عقل سے کام لیا گیا تو وہی مثال ہوگی جیسے ایک اندھے نے کہا تھا کہ یہ تو بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ شان ورود اس کا یہ ہے کہ ایک لڑکا اپنے اندھے حافظ کے لئے گھر سے کھیر کی دعوت کرنے آیا پوچھا کہ کھیر کیسی ہوتی ہے کہا سفید ہوتی ہے حافظ جی نے سیاہ سفید میں کیوں کر فرق کیا تھا ان کے نزدیک تو نہ کوئی چیز سفید تھی نہ سیاہ، کیوں کہ آنکھیں ہی نہ تھیں تو آپ پوچھتے ہیں کہ سفید کیسا ہوتا ہے اس نے کہا جیسے بگلا۔ حافظ جی نے پوچھا کہ بگلا کیسا ہوتا ہے لڑکے نے ہاتھ کو اس طرح موڑ کر (۸) کہا کہ ایسا ہوتا ہے۔ حافظ جی نے جو اپنا ہاتھ پھیر کر اس شکل سے تصور کیا تو کہنے لگے بھائی تو یہ بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ میرے گلے سے کیوں کر اترے گی تو دیکھئے جو چیز آنکھ سے نہ دیکھی ہو اس میں عقل سے کام لینے کا یہ نتیجہ ہوا کہ معمولی سی کھیر کا کیا سے

کیا بن گیا۔ جس میں چبانے اور نگلنے کی بھی مشقت نہ تھی اب وہ گلے میں پھنسنے لگی تو واقعی اندھے کو کوئی کیونکر سمجھائے کہ سفید رنگ کیسا ہوتا ہے اگر حافظ جی ساری عمر بھی اسی سبق رہیں تب بھی نہیں سمجھ سکتے بس اس کا طریقہ تو یہ ہے کہ کسی خیر خواہ سوانکھے کی تقلید کرلی جائے اسی طرح اگر تم کسی ولایتی کو جس نے کبھی آم نہ کھایا ہو آم کا مزہ سمجھانا چاہو تو کیا وہ سمجھ جائے گا ہرگز نہیں۔ تم کہو گے کہ آم میٹھا ہوتا ہے وہ کہے گا کہ ہم تو روز گڑ کھاتے ہیں بس آم ایسا ہی ہوتا ہوگا۔

صاحبو! اس کو سمجھانے کا طریقہ یہ ہے کہ آم لاکر اسے کھلا دو اور اگر یہ نہیں تو پھر اس کو تقلیداً مان لینا چاہیے اور اپنی عقل سے اس کی نظیریں نہ نکالنا چاہئیں۔ اسی طرح اُمور آخرت کو اگر پوری طرح سمجھنے کا شوق ہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ موت کے منتظر رہو۔ مرنے کے بعد پل صراط اور وزن اعمال وغیرہ کی سب حقیقت سامنے آجائے گی اور اگر دنیا ہی میں سمجھنا چاہتے ہو تو اس کے سوا چارہ نہیں کہ قرآن ورسول نے جو کہہ دیا ہے اس کی تقلید کرو۔ اور ان کی نظیریں دریافت کرنے کے درپے نہ ہو۔ مثالوں سے تم آخرت کی حقیقت ایسی ہی سمجھو گے جیسے حافظ نے کھیر کو ٹیڑھا بتلایا تھا بس خوب سمجھ لو کہ عقل کی ایک حد ہے کیوں کہ افراط عقل کا نتیجہ اوہام وشکوک میں ابتلا ہے جس سے قلب ودماغ دونوں ضعیف ہوجاتے ہیں۔ فارابی کی حکایت ہے کہ ایک شخص حلوہ بیچتا پھرتا تھا۔ اس سے پوچھا کیف تبیع الحلوہ تو حلوہ کس طرح بیچتا ہے۔ اس نے جواب دیا کذا بانق کہ ایک دانگ میں اتنا دیتا ہوں تو آپ کہتے ہیں اسئلک من الکیفیۃ وتجیبنی من الکمیۃ میں تو کیف سے سوال کرتا ہوں اور تو کیفیت سے جواب دیتا ہے آپ حلوائی سے الجھ گئے تو اس کو عقل کا ہیضہ کہتے ہیں کہ ہر وقت اسی کے چکر میں رہیں چنانچہ افراط عقل کا یہ نتیجہ تھا کہ فلاسفہ نے انبیاء علیہم السلام کا مقابلہ کیا اور جب عاجز ہوگئے تو ان کی نبوت کا تو اقرار کیا مگر کہنے لگے کہ یہ جاہلوں کے واسطے بنی ہیں۔ ہم کو نبی کی ضرورت نہیں۔ نحن قوم قد ھذبنا نفوسنا بالحکمۃ ہم نے تو اپنے کو حکمت سے مہذب بنالیا ہے۔ حق تعالیٰ ایسے ہی لوگوں کے حق میں فرماتے ہیں۔ فرحوا بما عندھم من العلم یہ لوگ اپنے علم پر نازاں ہوگئے اور یہ نہ سمجھے کہ علوم نبوت عقل سے باہر ہیں چنانچہ الٰہیات میں فلاسفہ نے

تحقیقات بیان کی ہیں ان میں اتنی ٹھوکریں کھائی ہیں کہ آج مسلمانوں کا ایک ادنیٰ طالب علم بھی ان پر ہنستا ہے یہ تو افراط فی العقل ہے اور ایک ہے تفریط کا درجہ یعنی عقل کی کمی اس کو حماقت کہتے ہیں شریعت میں یہ دونوں درجے بیکار اور مذموم ہیں بلکہ مطلوب توسط ہے جس کو حکمت کہتے ہیں دوسری قوت شہویہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کا نام فجور ہے شریعت میں یہ بھی مطلوب نہیں کیوں کہ اس کا انجام فسق ہے اور ایک تفریط ہے کہ آدمی نامرد بن جائے کہ ضروری انتفاعات سے بھی محروم ہو یہ بھی مطلوب نہیں کیوں کہ اس سے ہمت اور حوصلہ پست ہو جاتا ہے اور اولوالعزمی اور اخلاق عالیہ مفقود ہو جاتے ہیں جو بڑا نقص ہے اور ایک ہے توسط جس کا نام عفت ہے یہ مطلوب ہے تیسری چیز قوت غضبیہ ہے اس میں بھی تین درجے ہیں ایک افراط جس کو تہور کہتے ہیں کہ موقع بے موقع کچھ نہ دیکھتے اندھادھند جوش دکھلانے لگے جیسا آج کل ہو رہا ہے کہ جس طرف چلتے ہیں جوش میں اندھے بنکر چلتے ہیں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ اس جوش سے نفع ہوگا یا نقصان یہ بھی شریعت میں مطلوب نہیں اور ایک ہے تفریط جس کو جبن اور بزدلی کہتے ہیں کہ موقع اور ضرورت کے وقت بھی ہمت سے کام نہ لیا جاوے جیسے بعضے لوگ ایسے ڈرپوک ہوتے ہیں کہ حکام کے سامنے ادب اور تہذیب سے بھی اپنی حاجات ظاہر نہیں کر سکتے یہ بھی مطلوب نہیں۔ اور ایک درجہ توسط کا ہے جس کا نام شجاعت ہے یہ مطلوب ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ضرورت اور موقع پر جوش ظاہر کیا جائے جہاں نفع کا ظن غالب ہو اور بے موقع جوش سے کام نہ لیا جائے جہاں نفع کی کچھ امید نہیں محض نقصان ہی نقصان ہے غرض اخلاق پسندیدہ کے اصول تین ہیں حکمت۔ عفت۔ شجاعت اور ان کے مجموعہ کا نام عدل ہے۔ اور یہی شریعت کا حاصل ہے اور قرآن میں جو فرمایا ہے **وکذلک جعلناکم امة وسطا** اس سے بھی عدل مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایسی شریعت دے کر جو کہ سراپا عدل ہے امت وسط یعنی امت عادلہ بنایا ایک مقدمہ اور لیجئے کہ وسط دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک وسط حقیقی۔ ایک وسط عرفی۔ وسط حقیقی وہ خط ہے جو بیچوں بیچ ہو وہ قابل تقسیم نہیں ہوتا اور ایک وسط عرفی ہے جیسے کہا کرتے ہیں کہ یہ ستون مکان کا وسط ہے تو وہ وسط حقیقی نہیں کیونکہ [illegible] منقسم ہے۔ اس کے اندر بھی ایک جز دائیں اور ایک بائیں اور ایک بیچ میں نکل سکتا ہے۔ پھر وہ وسط حقیقی کہاں ہوا حقیقی

وسط تو وہ ہے جس میں دایاں بایاں کچھ نہ نکل سکے سوا ایسا وسط ہمیشہ غیر منقسم ہوگا پس سمجھ لو کہ شریعت اس وسط کا نام ہے جس میں افراط تفریط کا ذرا بھی نام نہ ہو۔ بلکہ عین توسط ہو یہی وسط حقیقی روح شریعت ہے۔ اور یہی کمال ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وسط حقیقی ہمیشہ غیر منقسم ہوتا ہے تو شریعت کی روح بھی غیر منقسم ہے چنانچہ جن اصول اخلاق کو میں نے بیان کیا ہے ان میں افراط تفریط کو چھوڑ کر جو ایک وسط نکلے گا جس کو نہ افراط کی طرف میلان ہوگا نہ تفریط کی طرف وہ ہمیشہ غیر منقسم ہوگا اور ایسے وسط پر رہنا ضرور دشوار ہے۔ پس شریعت ان دونوں جانبوں پر نظر کر کے اپنی دشواری کی وجہ سے تلوار سے تیز اور بوجہ غیر منقسم ہونے کے بال سے باریک ہوگی کیوں کہ بال بھی منقسم ہے اور وسط حقیقی غیر منقسم ہے پس قیامت میں بھی روح شریعت یعنی وسط حقیقی جوہر بن کر پل صراط کی شکل میں ظاہر ہوگا جس پر مسلمانوں کو چلایا جاوے گا۔ پس جو شخص دنیا میں شریعت پر تیزی و سہولت کے ساتھ چلا ہوگا وہ وہاں بھی تیزی کے ساتھ چلے گا وہ پل صراط پر بھی نہ چل سکے گا یا سستی کے ساتھ چلے گا لیجئے میں نے آپ کو پل صراط کی نظیر بھی دکھلا دی۔ اب کوئی اشکال نہیں رہا۔ اسی طرح ہمارے پاس تمام شرعیات کے لئے عقلی نظائر موجود ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ پل صراط ہی کی خصوصیت ہے لیکن ہم ان تحقیقات کو مقصود نہیں سمجھتے۔ ہمارا اصلی مذہب تو یہ ہے کہ ؎

ماقصہ سکندر و دار را نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر وفا مپرس

باقی میں نے نمونہ کے طور پر یہ تحقیق اس لئے بیان کر دی تا کہ معلوم ہو جائے کہ ہمارے پاس ہر مسئلہ میں ایسی ہی تحقیقات موجود ہیں اور سمجھ میں آجائے کہ علم شریعت کے سامنے علوم فلسفہ کی کچھ بھی حقیقت نہیں۔ جیسے نمونہ کے طور پر اس وقت میں نے کچھ بیان کر دیا ہے۔ تا کہ آپ علمائے اسلام کو تحقیقات سے خالی نہ سمجھیں۔ بحمد اللہ ہمارے پاس ان تحقیقات کا ذخیرہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لیکن ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں اُفتد راز
ورنہ در مجلس رنداں بے خبرے نیست کہ نیست

(تفصیل الدین، ص: ۳۵ تا ۵۲)

سوال: دنیا کے اندر امراض جو پھیلتے ہیں وہ دراصل ہوا اور فضا و موسم کی خرابی سے اور اسی بناء پر ظالموں عالم میں منتشر ہوتا ہے اور العیاذ باللہ باری تعالیٰ کا اس میں کوئی دخل نہیں گویا کہ یہ عمل باری تعالیٰ کی طاقت سے باہر ہے۔ (نعوذ باللہ)

جواب: آج کل تو اس مذاق ہی کے لوگ کم ہیں جو ان مصائب کو اعمال کی خرابی کی طرف منسوب کریں بلکہ بہت لوگ ان کو اسباب مادیہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کہ ہوا بگڑ گئی اس سے طاعون ہو گیا میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ طاعون میں ہوا بگڑنے کو دخل نہیں ممکن ہے کہ اس کو بھی دخل ہو مگر میں یہ کہتا ہوں کہ آپ شریعت کے بتلائے ہوئے سبب کا کیوں انکار کرتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ایک چیز کے متعدد اسباب ہوں ایک سبب قریب ہو ایک سبب بعید۔ ایک سبب ظاہری ہو ایک سبب حقیقی ہو آپ یہ کہتے ہیں کہ ہوا بگڑنے سے طاعون ہوا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ظاہری سبب ہے حقیقی سبب اس کا یہ ہے کہ آپ نے گناہوں کی کثرت کی اس کا انکار آپ کس دلیل سے کرتے ہیں میں اس مقصود کے واضح کرنے کے لئے ایک مثال بیان کرتا ہوں اس سے آپ کی سمجھ میں آجائے گا کہ ظاہری سبب اور حقیقی سبب میں کیا فرق ہے مثلاً ایک شخص کو پھانسی ہو گئی اور وہ مر گیا اب دو شخصوں میں گفتگو ہوئی کہ اس کی پھانسی کا سبب کیا ہے۔ ایک شخص کہتا ہے کہ صرف اس کا سبب یہ ہے کہ وہ کسی طرح سے تختہ کے اوپر پہنچ گیا اور ریشمی پھندا اس کے گلے میں پڑ گیا۔ پھر کسی طرح سے تختہ اس کے نیچے سے الگ ہو گیا تو اس کا گلا گھٹ گیا اور مر گیا۔ ایک دوسرے شخص نے کہا کہ اس کی پھانسی کا سبب یہ ہے کہ اس نے ایک جرم کیا تھا اس وجہ سے اس پر حاکم نے ناراض ہو کر پھانسی دلوادی تو کیا اس پر وہ پہلا شخص یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ تم سائنس کے منکر ہو کہ اس کی موت کا سبب تو (یعنی گلا گھٹ جانا تھا) اور تم جرم کو اس کا سبب بتلاتے ہو کیا اس جرم نے آکر اس کا گلا گھونٹ دیا ظاہر ہے کہ وہ یہ اعتراض کبھی نہیں کر سکتا اور اگر کوئی احمق یہ اعتراض کرے۔ یہ بھی تو تمام مخلوق اس کو پاگل بنائے گی اور یہ کہے گی کہ تیرا یہ کہنا صحیح ہے کہ موت کا سبب انخناق ہے مگر اس کا اصلی سبب تو حاکم کا حکم ہے اور اس حکم کا سبب اس کا جرم ہے غرض اس اختلاف میں ہر عاقل یہی کہے گا کہ وہ شخص سچا حق پر ہے جو یہ کہتا ہے کہ اس سبب طبعی کا سبب خود کا فعل ہے ورنہ پھانسی تو پہلے سے بھی موجود تھی پہلے سے وہ کیوں نہ

مرگیا۔ اوراب بھی موجود ہے پھراس سے روزانہ اموات کیوں نہیں ہوتیں۔

تو صاحبو! غضب کی بات ہے کہ اس شخص کو تو محقق سمجھا جاوے اور علماء کو جو کہ طاعون کا سبب آپ کے گناہوں اور افعال کی خرابی کو بتلاتے ہیں غیر محقق کہا جاوے یہ کہاں کا انصاف ہے کہ جس کو کوتاہ نظر کہا جاتا ہے اسی کی نظر کو دوسری جگہ عالی نظر کہا جاتا ہے غضب ہے کہ دین ہی کے موقع پر سب لوگ بے ہوش ہوجاتے ہیں اس پر مجھے اپنے ایک دوست کی بیان کی ہوئی ایک حکایت یاد آتی ہے کہ انہوں نے لاہور کے پاگل خانہ میں ایک مجنون کو دیکھا کہ وہ سب باتیں ٹھکانے کی کرتا تھا جس سے کسی کو بھی نہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ پاگل ہے۔ مگر جہاں اس کا نام اس کے سامنے لیا گیا اور اس پر جنون سوار ہوا یہی حالت آج کل ہمارے بھائیوں کی ہے کہ جب تک ان کے سامنے دین کا نام نہ لو تو عاقل بھی سمجھدار بھی سب کچھ ہیں مگر جہاں دین کا نام کسی نے لیا اور وہ کوتاہ نظر ہوا۔

صاحبو! آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ جو شخص پھانسی کا سبب ڈکیتی کو بتلاتا ہے اس کو تو تم عاقل کہتے ہو اور اسی کا نظیر وہ عالم شریعت ہے جو طاعون کا سبب آپ کی بدعملی کو بتاتا ہے۔ یہ شخص عالی نظر کیوں نہیں چوں کہ یہ دین کا معاملہ ہے۔ اس لئے اس میں علماء کو تو کوتاہ نظر سمجھا جاتا ہے اور اس شخص کو عالی نظر سمجھا جاتا ہے۔ جو جراثیم کو طاعون کا سبب بتلاتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اچھا ہم نے مانا کہ طاعون کا سبب آب وہوا کا خراب ہونا ہی سہی۔ لیکن یہ تو بتلاؤ کہ خراب آب وہوا کا کیا سبب ہے۔ اگر اس کا بھی کوئی سبب ہے تو پھر اس کا کیا سبب ہے کیوں کہ ہر حادث کی انتہا ایک قدیم پر ضروری ہے تو اس کی انتہا بھی قدیم پر ہوگی اور اگر قدیم پر انتہا نہ مانو تو تسلسل لازم آئے گا کیوں کہ ہر حادث علت اور سبب کا محتاج ہوتا ہے اور تسلسل محال ہے تو منتہا ہونا ضروری ہے اور منتہا ہونے کے قابل سوائے مشیت الٰہی کے اور کوئی چیز نہیں۔ تو جس طرح حاکم نے پھانسی کا حکم دیا تھا جس سے مجرم ہلاک ہوا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے کارکنان قضا۔ قدر کو حکم دیا کہ آب وہوا کو خراب کرو۔ انہوں نے آب وہوا خراب کردی۔ جس سے چوہے مرنے لگے۔ اور طاعون پھیل گیا اب جیسا کہ وہاں ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے۔ جو یہ بتلادے کہ چوں کہ اس شخص نے جرم کیا تھا اس وجہ سے حاکم نے پھانسی کا حکم دیا اسی طرح یہاں بھی ایک سچے مخبر کی ضرورت ہے جو یہ بتلائے کہ گناہوں کی وجہ سے

یہ بلائیں نازل ہوتی ہیں۔تو سنو وہ سچا مخبر قرآن ہے جس میں حق تعالیٰ کا ارشاد موجود ہے:
وما اصابکم من مصیبة فیما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر۔کہ تم کو جو کچھ مصیبت پہنچتی ہے تمہارے ہاتھوں کی کرتوت سے پہنچتی ہے اور حق تعالیٰ بہت سے گناہوں سے درگزر بھی کر جاتے ہیں۔پس یہ کیوں نہ کہا جاوے کہ سبب اس طاعون کا ہماری بدعملی اور سیاہ کاری ہے۔(الاسراف:ص:۶)

سوال: کیا کوئی نبی بھی مزاح کرتے تھے یا کوئی حکمت تھی؟

جواب: حضور اکرم ﷺ کے مزاح میں مصالح کیوں نہ ہوتیں عارفین نے بھی عجیب عجیب مصالح مزاح میں اختیار کی ہیں۔حضور ﷺ کے مزاح میں علاوہ اور مصالح کے ایک ادنیٰ مصلحت کم از کم یہ تو ضرور ہے کہ حضور ﷺ کا مقصود تبلیغ و اصلاح ہے۔جس میں ایک کام تو آپ کا پہنچا دینا اور ایک کام قابل کا ہے کہ وہ فیض لے جس کے لئے حضور ﷺ کی خداداد ہیبت کسی قدر مانع ہو سکتی تھی کیوں کہ حضور ﷺ کو حق تعالیٰ نے وہ ہیبت عطا فرمائی تھی جس کی وجہ سے بڑے بڑے سلاطین دور دراز کی مسافت پر آپ کے رعب سے کانپتے تھے اور جو آپ کے سامنے آتا تھا اس کو از خود گفتگو کی ہمت نہ ہوتی تھی اور فیض لینے کے لئے مستفید کے دل کھلنے کی ضرورت ہے۔جب تک اس کا دل نہ کھل جائے اس وقت تک وہ فیض نہیں لے سکتا۔پس یہ حال ہو جاتا ہے ؎

سامنے سے جب وہ شوخ و دلربا آجائے ہے
تھامتا ہوں دل کو پر ہاتھوں سے نکلا جائے ہے

عاشق پر جب محبوب کی ہیبت کا غلبہ ہوتا ہے تو جو کچھ وہ سوچ کر آتا ہے کہ یوں کہوں گا یہ پوچھوں گا صورت دیکھتے ہی سب ذہن سے نکل جاتا ہے اور وقت پر کچھ بھی نہیں کہا جاتا۔ہمارے ایک عزیز ناخواندہ کہتے ہیں ؎

یوں کہتے ہیں کہتے جو وہ آجاتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اس لئے حضور ﷺ صحابہؓ سے گاہے گاہے مزاح فرمایا کرتے تھے۔تاکہ ان کا دل کھل جائے اور بے تکلف ہو کر استفادہ کر سکیں اور حضور ﷺ کی ہیبت تو بھلا کیسی کچھ

ہوگی۔ جب حضور ﷺ غلامانِ غلام کی یہ حالت تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ ایک جماعت کے ساتھ چلے جارہے تھے کہ دفعتہً پیچھے مڑکر دیکھا۔ تو سب مارے ہیبت کے گھٹنوں کے بل گر پڑے۔ حالاں کہ یہ وہ حضرات تھے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرید نہ تھے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پیر بھائی تھے۔ جن میں گونہ مساوات ہوا کرتی ہے۔ مگر بھی آپکا اس قدر رعب تھا مگر شاید اس میں کوئی شبہ نکالے کہ وہ حضرات تو معتقد تھے تو غیر معتقدین پر آپ کے رعب کی یہ شان تھی کہ ایک مرتبہ سفیر روم بڑی شان وشوکت سے ساتھ مدینہ میں آپ کی خدمت میں آیا اور شہر میں داخل ہوکر لوگوں سے دریافت کیا کہ خلیفہ کا قصر کہاں ہے۔

گفت کو قصر خلیفہ اے حشم
تامن اسپ ورخت را آنجا کشم
قوم گفتندش کہ اواقصر نیست
مر عمرؓ را قصر جان روشنی ست

(اس موقعہ پر حضرت مولانا پر گریہ طاری ہوگیا مگر بہت نے ضبط سے کام لیا) لوگوں نے کہا کہ عمرؓ کے لئے نہ قصر ہے۔ نہ ایوان ہے۔ بس اس کا دل ہی قصر وایوان ہے۔ قاصد کو بڑی حیرت ہوئی کہ وہ خلیفہ جس کے نام سے سلاطین کانپتے ہیں اس کے نہ محل نہ قصر یہ کیا معاملہ ہے پھر اس سے پوچھا کہ آخر وہ کہاں بیٹھا کرتے ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ مسجد میں اکثر بیٹھا کرتے ہیں اور کبھی بازاروں میں گلی کوچوں میں اور کبھی جنگل میدانوں میں گھومتے پھرتے ہیں۔ تلاش کرلو کہیں مل جائیں گے۔ اب وہ آپ کی تلاش میں نکلا معلوم ہوا کہ ابھی جنگل کی طرف تشریف لے گئے ہیں سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ یہ عجیب بادشاہ ہے۔ جو تنہا بازاروں جنگلوں میں پھرتا ہے نہ ساتھ میں پہرہ دار ہیں نہ پولیس۔ آخر وہ جنگل کی طرف چلا جس وقت اس باغ کی حد میں قدم رکھا۔ جہاں حضرت عمرؓ پڑے سو رہے تھے قدم رکھتے ہی اس کے دل پر ہیبت ورعب نے غلبہ کیا کیوں کہ جنگ میں قدم رکھتے ہی بڑے بڑے بہادروں کے دل کانپ جاتے ہیں اب اس سفیر کو بڑی حیرت ہوئی کہ اس شخص کے پاس نہ کوئی پہرہ ہے نہ چوکی ہے نہ جاہ وحشم ہے۔ نہ ساز وسامان ہے پھر یہ کیا

بات ہے کہ صورت دیکھنے سے پہلے ہی میرا دل ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے یہاں تک کہ جب قریب پہنچا تو دیکھا کہ ایک خدا کا شیر جنگل میں تنہا پڑا سو رہا ہے نہ اُسے کسی دشمن کا خوف ہے نہ جاسوس کا ڈر، سر کے نیچے ایک اینٹ تکیہ کے بجائے رکھی ہوئی ہے نہ کوئی فرش ہے نہ بستر بس گلے میں ایک تلوار پڑی ہوئی ہے اور بے فکر سو رہے ہیں اس حالت کا مقتضا یہ ہے کہ سفیر کے دل میں خلیفہ کی بے وقعتی ہوتی مگر یہاں برعکس معاملہ یہ ہوا کہ صورت دیکھتے ہی سفیر روم لرزنے لگا جوں ہی نظر پڑی ہے پیر اٹھانے کی ہمت نہ رہی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ اس وقت وہ سفیر اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ میں نے تو بڑے بڑے سلاطین کے دربار دیکھے ہیں جن کے دربار میں رعب وداب کے ہزار سامان ہوتے تھے مگر مجھ پر کسی کا رعب طاری نہ ہوا۔ آج کیا بات ہے کہ اس بے سروسامان شخص کے رعب سے میرا پتہ پانی ہوا جاتا ہے۔ آخر اس شخص کے اندر کیا چیز ہے کہ میری رگ رگ میں اس کے دیکھنے سے لرزہ پیدا ہو گیا بیشک ؎

ہیبت حق است وایں از خلق نیست ❁ ہیبت آن مرد صاحب دلق نیست

یہ خدائی رعب وجلال تھا جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے چہرہ سے ظاہر ہو رہا تھا بالآخر سفیر روم کی ہمت نہ ہوئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ خود ہی بیدار ہوئے تو دیکھا کہ اجنبی آدمی کھڑا کانپ رہا ہے۔ آپ نے اس کو پاس بلایا اور تسلی دی جس طرح حضور ﷺ نے دو سفیروں کو مرعوب دیکھ کر فرمایا تھا کہ تم مجھ سے اتنا کیوں ڈرتے ہو۔ میں تو اس غریب عورت کا بچہ ہوں جو سوکھا گوشت کھایا کرتی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی باتیں سننے کے بعد ہیبت مبدل بہ محبت ہو گئی اور سفیر کو آگے بڑھنے اور بات چیت کرنے کی ہمت ہوئی جس کے بعد وہ سمجھ گیا کہ واقعی مذہب اسلام حق پر ہے۔ پھر وہ اسلام سے مشرف ہو گیا یہ تو حضرات صحابہ کرامؓ کی حالت تھی۔ ہم نے اپنے بزرگوں کو دیکھا ہے کہ خدا تعالیٰ نے ان کو ایسا رعب عطا فرمایا تھا کہ بڑے بڑے لوگوں کو ان سے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی تھی حضرت مولانا گنگوہیؒ کے رعب وہیبت کی یہ شان تھی کہ بڑے بڑے نواب مولانا سے بے تکلف باتیں نہ کر سکتے تھے حضرت کا ان پر ایسا رعب پڑتا تھا کہ باتیں کرتے ہوئے رکتے اور جھجکتے اور ڈرتے تھے۔ اور خیر بعض بزرگوں سے تو لوگ اس لئے ڈرتے تھے کہ غصیارے ہوتے

ہیں بات بات میں ان کو غصہ آجاتا ہے اس لئے انکے پاس جاتے ہوئے لوگ کانپتے ہیں جیسے مولانا شاہ فضل الرحمٰن تھے یہ آج کل بھی ایک بدنام ہے۔

(ہائے۔ ہزار نام فدائے تو بدنامئے تو۔ جامع)

مگر مولانا گنگوہیؒ میں تو غصہ کا نام بھی نہ تھا میں نے تو کبھی بھی مولانا کو غصہ فرماتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر اس پر بھی مولانا کا اتنا رعب محض ہیبت حق کا اثر تھا اور یہ ہیبت بعض اوقات طالبین کے لئے مانع فیض ہوجاتی ہے۔ اس لئے حضرات انبیاء علیہم السلام والیاء کرام اپنے اصحاب سے گاہے مزاح کر لیتے ہیں تاکہ ان کا دل کھل جائے اور ہیبت ومحبت کے مل جانے سے اعتدال پیدا ہوجائے۔ (الاسعاد والابعاد: ص:۳۰)

سوال: اسلام کس کا راستہ ہے حضور ﷺ کا یا اللہ کا؟

جواب: بعض جگہ حضور ﷺ کی طرف اس صراط کو اس لئے مضاف کر دیا گیا تاکہ سامعین کو اس پر عمل کرنے کی ہمت ہو اور وہ سمجھ لیں کہ ہم اس راستہ کو طے کر سکتے ہیں۔ اگر پہلے ہی یہ فرما دیا جاتا یہ خدا کا راستہ ہے۔ اس پر چلو۔ تو لوگ یہ سن کر گھبرا جاتے کیوں کہ خدا تعالیٰ کی ذات تک ذہن کی رسائی اولاً دشوار ہے۔ ان کی تو یہ شان ہے۔ ؎

اے برتر از خیال وقیاس وگمان ووہم
وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم وخواندہ ایم

خدا تعالیٰ کی ذات تک وہم بھی نہیں پہنچ سکتا جو کچھ اس کے متعلق ہمارے ذہن میں آتا ہے خدا تعالیٰ اس سے بھی وراء الوراء ثم وراء الوراء ہیں اسی کو مولانا فرماتے ہیں ؎

در تصور ذات اور اگنج کو
تا در آید در تصور مثل او

یہ لفظ سارے نسخوں میں گنج ہے۔ مثنوی کو جس گنج (اور جس گوشہ) سے نکالو گے سب میں یہی نکلے گا۔ کسی کے پاس اس کی کنجی نہ تھی۔ صرف حضرت حاجی صاحبؒ ہی کے پاس اس کی کنجی تھی۔ حضرت ہی نے اس کا قفل کھولا۔ حضرت نے مکہ میں ایک دفعہ ایک شیخ کو گنج پڑھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اور اس کے معنی بتلاتے ہیں وہ بہت تاویل کر رہے تھے۔ مگر کوئی بات بنتی نہ تھی۔ حضرت نے اصلاح دی کہ یہ لفظ گنج ہے بمعنی گنجائش کے بس

اس کو سنکر وہ شیخ بھڑک ہی تو گئے۔اب شعر کے معنے بے تکلف ظاہر ہو گئے مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات کی کسی تصور میں گنجائش نہیں۔یعنی تصور بالکنہ کی گنجائش نہیں۔حق تعالیٰ کا بالکنہ ذہن میں آنا محال ہے۔جس کی تفصیل کتب معقول میں مذکور ہے۔جو حق تعالیٰ کی ذات تک کسی کی رسائی نہیں۔تو اگر ابتدا ہی اسلام کو صراط اللہ کہہ دیا جاتا۔یعنی حق تعالیٰ کی ذات کی طرف اس کی نسبت کی جاتی۔تو لوگ گھبرا جاتے اور سوچ میں پڑھ جاتے کہ حق تعالیٰ تو ذہن سے بہت دور ہیں۔پس اسی طرح ان کا رستہ بھی نہیں معلوم کتنا دور دراز ہوگا۔اس لئے پہلے اس کو رسول اللہ ﷺ کی طرف مضاف کیا گیا۔کہ لوگوں سے کہہ دیجئے کہ یہ تو میرا راستہ ہے۔اس پر چلو اور حضور ﷺ تک سب کی رسائی ممکن ہے۔آپ عیانا سب کے سامنے ہیں۔پھر بشریت میں سب کے شریک ہیں۔اس لئے سنکر ہمت بندھی۔کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کا راستہ ہے اور آپ ذہن سے بہت دور نہیں ہیں۔تو آپ کا راستہ دور نہ ہوگا۔بلکہ نزدیک ہوگا۔یہ فائدہ ہوا آپ کی طرف نسبت کرنے سے کہ راستہ سہل و نزدیک ہونا معلوم ہو گیا۔پھر جب حضور ﷺ تک رسائی ہو گئی۔اور اس راستہ پر چلنا شروع کیا۔اور حقیت منکشف ہوئی کہ یہ تو حقیت میں خدا کا راستہ ہے اور حضور ﷺ صرف داعی ہیں۔آپ خود بھی اسی راستہ پر چل رہے ہیں۔یہ دیکھ کر ڈھارس بندھ گئی۔کہ حق تعالیٰ اس کے طے کرنے میں بندوں کی امداد فرماتے ہیں۔چنانچہ حضور ﷺ نے اس راستہ کو طے کرلیا ہے۔معلوم ہوا کہ اس کا طے کرنا انسان کی قدرت سے خارج نہیں۔تو ہم بھی اس کو طے کر سکتے ہیں۔خصوصاً جب کہ حضور ﷺ (جو واقف طریق ہیں) ہمارے معین و رفیق ہیں۔واقعی اگر حق تعالیٰ کی امداد نہ ہو تو پھر اس راہ کا طے کرنا بہت دشوار ہے۔کیونکہ خدائی راستہ ہے۔جس کو وہی طے کر سکتا ہے۔جس کو حق تعالیٰ طے کرانا چاہے۔اس لئے سالک کو جب اس پر نظر ہوتی ہے کہ راستہ خدا تعالیٰ کا راستہ ہے۔اس وقت وہ برا پریشان ہوتا ہے۔بعد اس کے طویل و لامتناہی کے خیال سے گھبراتا ہے۔اور یوں کہتا ہے۔

بحر یست عشق کہ ہمچش کنارہ نیست
آنجا جزا نے کہ جاں بسارند چارہ نیست

اور جب اس پر نظر کرتا ہے کہ یہ راستہ رسول اللہ ﷺ کا راستہ ہے۔جس پر آپ

چل رہے ہیں تو اس کی ہمت بندھتی ہے اور یوں کہتا ہے

تو دستگیر شوائے خضر پتے خستہ کہ من ❁ پیادہ مے روم و ہمر ہاں سوار لرخذ

اور حضور ﷺ کی اعانت ورفاقت سے اس راستہ میں چلنے کا ارادہ کر لیتا ہے یہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جن کی رسائی حضور ﷺ تک ہو چکی ہے اور جو حضور ﷺ تک بھی وصول نہ رکھتے ہوں ان کو اس کی ضرورت ہے کہ ان مشائخ کا دامن پکڑیں جو حضور ﷺ تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ جیسے بادشاہ تک پہنچنے کے لئے وزیر کا واسطہ ضروری ہے مگر جو وزیر تک بھی نہ پہنچا ہو اس کو چاہیے کہ ان لوگوں کی خوشامد کرے جو وزیر تک رسائی رکھتے ہیں۔ (الاسعاد والابعاد)

سوال: کیا ظاہری اصلاح ہی تک دین منحصر ہے؟

جواب: حضرت مجدد صاحب قدس سرہ کا واقعہ ہے کہ آپ کے زمانہ میں ایک بزرگ صاحب سلسلہ تھے جن سے بہت فیض جاری تھا۔ مگر حضرت مجدد صاحب کو ان کی بابت مکشوف ہوا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا پس حضرت مجدد صاحب یہ دیکھ کر تڑپ ہی تو گئے آپ کے دل نے گوارا نہ کیا کہ میرے رسول کی امت کا ایک شخص شقی ہو کر مرے اور وہ شخص بھی کیسا جس سے ہزاروں کو دین کا فیض ہو رہا ہے۔ آپ نے اس کے لئے دعا کرنا چاہی۔ مگر ڈرے کہ اس میں حضرت حق کی مزاحمت نہ ہو کہ تقدیر مکشوف ہونے کے بعد اس کے خلاف بھی دعا کرتا ہے۔ مگر پھر حضرت سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کا مقولہ یاد آیا کہ میں وہ شخص ہوں کہ حق تعالیٰ سے کہہ کر شقی کو سعید کرا سکتا ہوں اس پر مجدد صاحب کی بھی ہمت ہوئی معلوم ہو گیا کہ ایسی دعا کرنا خلاف ادب نہیں چنانچہ پھر تو آپ نے اس کے لئے بہت دعائیں کیں اور پوری کوشش کی کہ کسی طرح اس شخص کی شقاوت کو مبدل بہ سعادت کر دیا جائے حتی کہ آپ کو مکشوف ہو گیا کہ حق تعالیٰ نے اس کو سعید کر دیا تب آپ کو چین آیا تو دیکھئے مجدد صاحب نے اس شخص کے حق میں در پردہ کتنا بڑا احسان فرمایا مگر اس شخص کو خبر بھی نہ تھی اسے کچھ معلوم بھی نہ تھا کہ میرے واسطے کسی شخص کے دل پر کیا گذر رہی ہے۔ راتوں کی نیند اس کی اُڑ گئی ہے خیر یہ واقعہ تو ہو گیا۔ مگر اس پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ تقدیر کس طرح بدل گئی جس کے متعلق ارشاد ہے: ما یبدل القول لدی حضرت مجدد صاحب نے

اس شبہ کا جواب بھی خود ہی دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ بعض امور کے متعلق لوح محفوظ میں اطلاق ہوتا ہے۔ اور واقعہ میں وہ کسی قید کے ساتھ مقید ہوتے ہیں مگر وہ قید لوح محفوظ میں مذکور نہیں ہوتی بلکہ وہ علم الٰہی میں ہوتی ہے۔ تو اس شخص کے متعلق لوح محفوظ میں تو صرف اتنا ہی تھا کہ اس کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا مگر علم الٰہی میں اس کے ساتھ قید تھی۔ یعنی بشرطیکہ کوئی مقبول بندہ اس کے لئے دعا نہ کرے سو یہ واقعہ تقدیر کے خلاف نہیں ہوا کیوں کہ اصل میں علم الٰہی اسی کا نام ہے اسی لئے یہ حضرات ام الکتاب کی تفسیر علم الٰہی سے کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس میں تغیر وتبدل کبھی نہیں ہوسکتا پس دراصل ام الکتاب وہی ہے گو لوح محفوظ بھی کتاب المحوو الاثبات کے اعتبار سے ام الکتاب ہے کیوں کہ لوح محفوظ میں اتنا تغیر وتبدل نہیں ہوتا جتنا کتاب المحوو الاثبات میں ہوتا رہتا ہے۔ مگر فی الجملہ تغیر اس میں ہوسکتا ہے اور ہو جاتا ہے اور جو تقدیر علم الٰہی کے درجے میں ہے اس میں اس کا اصلاً احتمال نہیں پس حقیقت کے اعتبار سے ام الکتاب وہی ہے اور اس کی تفسیر کے اعتبار سے کلام نفسی کے درجہ میں قرآن کے قدیم ہونے کی دلیل نص سے نکل سکتی ہے۔ کیوں کہ حق تعالیٰ فرماتے ہیں۔ **وانہ فی ام الکتاب لدینا لعلی حکیم** ۔یعنی قرآن ہم سے غایت قرب کے درجہ میں علی حکیم ہے یہ غایت قرب لدی کا مدلول ہے اور غایت ذات حق سے مرتبہ صفات کو ہے تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن مجید درجہ صفت میں علی ہے حکیم ہے اور قرآن جو درجہ صفت ہے وہی کلام نفسی ہے اور اسی لئے اس کو علی حکیم کہا گیا اور علی حکیم کا اطلاق قرآن مجید میں کسی حادث پر نہیں آیا تو لدنیا اور علی دونوں کی دلالت اس کے صفت ہونے اور قدیم ہونے پر ہوئی اور اس کے قبل جو ارشاد ہوا ہے۔ **انا جعلناہ قرآناً عربیاً** اس میں اس کے فعل کا مفعول ہونا اور عربیۃ کے ساتھ موصوف ہونا قرینہ ہے کہ اس سے کلام لفظی کا درجہ مراد ہے۔ تو دونوں آیتوں میں دونوں درجوں کا بیان نہایت وضاحت سے ہوگیا۔ (الاسعاد والابعاد: ص:۵۱)

اعتراض۔ شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے

پنڈت دیانند کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں کے بہ قول شیطانِ انسان کو بہکاتا اور

برے کاموں پر ورغلاتا۔ اور اُکساتا ہے اگر یہ صحیح ہے تو سوال یہ ہے کہ خود شیطان کو کس نے بہکایا اور گمراہ کیا اور اس میں کہاں سے اور کیسے برائیاں آ گئیں؟

تلاشِ بسیار کے باوجود پتہ نہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شیطان کو کس نے بہکا کر گمراہ اور برائیوں پر آمادہ کیا، اس لیے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ شیطان کا نہ کوئی وجود ہے اور نہ وہ کسی کو بہکاتا ہے۔ انسان خود برے کام کرتا ہے اور پھر اسے شیطان کی طرف منسوب کر دیتا ہے۔ اور جب شیطان کا وجود افسانہ غلط سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا، تو اس سے متعلق مسلمانوں کے عقیدے اور اسلامی تعلیمات کا غلط اور غیر واقعی ہونا لازمی طور پر ثابت ہو جاتا ہے!!۔ (انتصار الاسلام، ص: ۱۴، ۱۵)

جوابِ اوّل — وجودِ شے کیلئے مصدرِ شے کا علم ضروری نہیں

اس اعتراض کا پہلا اور الزامی و عام فہم جواب تو یہ ہے کہ شیطان کے وجود اور اس میں پائے جانے والے وصفِ اضلال کا محض اس بنیاد پر انکار کر دینا صحیح نہیں کہ بظاہر خود شیطان کا سرچشمہ ضلالت اور اس کا بہکانے والا معلوم نہیں ہوتا دنیا میں بے شمار ایسی چیزیں ہیں، جن کے منبع و ماخذ کا علم نہ ہوتے ہوئے بھی ہم ان کے وجود اور اہمیت و افادیت کو تسلیم کرتے اور ان کے اچھے برے اثرات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کے محدودِ علم و ادراک کے پیشِ نظر یہ ممکن ہی نہیں کہ کائنات میں موجود محسوس و غیر محسوس تمام اشیاء کی تہ تک اسے رسائی حاصل ہو جائے اور بہ یک وقت اسے ان کی اصل بنیاد اور حقیقت کا صحیح علم و ادراک ہو جائے، چنانچہ آگ اور اس کے اثر حرارت کی حقیقت افادیت اور وجودِ ہستی پر ہم سب یقین رکھتے، انہیں محسوس کرتے اور بے شمار ضروریات زندگی کی تکمیل میں ان سے استفادہ کرتے ہیں، حالاں کہ بہ ظاہر کوئی نہیں جانتا کہ آگ میں یہ حرارت اور گرمی کہاں سے آئی اور اس کا سرچشمہ کیا ہے؟ آفتاب اور اس کی روشنی اور تابانی کے وجود اور حقیقت کو کون نہیں مانتا اور محسوس کرتا، جب کہ کسی کو اب تک اس کا صحیح علم و ادراک نہیں ہو سکا ہے کہ اس میں روشنی کہاں سے اور کس طرح آئی؟ تو اگر شیطان کے وجود کا محض اس بنیاد پر انکار کر دینا صحیح ہو کہ کسی کو اس میں پائی جانے والی گمراہی کے سرچشمہ کا علم نہیں، تو لازم ہے کہ آگ اور اس سے حاصل ہونے والی

گرمی اور توانائی کے وجود کا بھی انکار کر دیا جائے، کیوں کہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ آگ میں گرمی کہاں سے آتی ہے۔ اسی طرح آفتابِ نصف النہار اور اس کی روشنی کے وجود و تحقق سے بھی اس لیے انکار کر دینا چاہیے کہ کوئی یہ نہیں جانتا کہ آفتاب کی روشنی کا سرچشمہ کیا ہے؟ بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر خود خدا، ایشور اور بھگوان کے وجود کا بھی انکار کر دینا چاہیے، کیوں کہ کسی کو بھی خدا کے سرچشمۂ وجود کا نہ علم ہے نہ عقیدہ و یقین۔ حالاں کہ ان تمام اشیاء کے وجود کو تمام انسان نہ صرف تسلیم کرتے ہیں، بلکہ ان کے اثرات سے استفادہ اور ان میں سے بعض کا مشاہدہ بھی کرتے ہیں۔

تو جب آگ کے سرچشمۂ حرارت کا علم نہ ہونے کے باوجود اس کے وجود اثرات اور اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جاتا اور جب سورج میں پائی جانے والی روشنی کے مصدر و منبع کا علم نہ ہوتے ہوئے بھی اس کے وجود اور اس کے اثرات پر مشاہدہ و بداہت کی حد تک ایمان و یقین رکھا جاتا ہے اور جب خدا کا خالق و موجد نہ ہوتے ہوئے بھی نہ صرف اس کے وجود و ہستی پر ایمان و اعتقاد رکھا جاتا ہے، بلکہ اس کی عبادت، پرستش اور اطاعت بھی کی جاتی ہے؛ تو اسی طرح شیطان میں پائے جانے والے وصفِ ضلال کے مصدر و منبع کا علم نہ ہونے کے باوجود، اس کے وجود ہستی، اس کے اثرات اور اس کی تباہ کاریوں اور ہلاکت خیزیوں کے اعتراف سے کیا چیز مانع ہے۔

جوابِ دوم — اوصاف اور ان کے صدور کی بحث

مذکورہ اعتراض کے علمی و تحقیقی جواب کو سمجھنے کے لیے پہلے ایک مقدمہ ذہن نشیں کر لیں۔ اور وہ یہ کہ ہر وصف کے لیے حقیقتاً ایک ہی مصدر و منبع ہوتا ہے، جس میں وہ ذاتی حیثیت سے پایا جاتا ہے۔

اور اس مصدر اصلی و ذاتی کے علاوہ دوسرے جتنے بھی اس وصف سے متصف ہوتے ہیں، ان کا اتصاف عارضی ہوتا ہے اور وہ اس اتصاف میں مکمل طور پر مصدرِ اصلی کے خوشہ چین اور تابع ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر روشنی اور دھوپ پر غور کیجیے۔ یہ ایک وصف ہے، جو دن کے وقت کائنات اور اس کی بے شمار اشیاء کو اپنا موصوف بنا کر انہیں روشن و تابناک بنا دیتا ہے۔ لیکن بے شمار اشیاء میں پائے جانے کے باوجود اس وصف کا حقیقی موصوف اور

سرچشمہ صرف آفتاب ہے۔ آفتاب میں روشنی کی صفت ذاتی حیثیت سے موجود ہے، جسے وہ دن کے وقت عارضی طور پر دوسری چیزوں کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور پھر بہ وقت غروب اسے واپس لے کر حسبِ سابق انہیں تاریکی کے حوالے کر دیتا ہے۔

گویا صفت کے حوالے سے موصوف بالذات اور موصوف بالعرض کو وہی مقام حاصل ہے، جو شے مستعار کے حوالے سے مُعیر اور مُستعیر کو حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح مُعیر یعنی عاریتاً کسی کو کوئی چیز دینے والا شخص، اس مستعار چیز کا اصل مالک ہوتا ہے کہ جب چاہتا ہے اسے مُستعیر کو دے کر اس کی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اس سے واپس لے لیتا ہے، اسی طرح مصدرِ وصف بھی اپنے وصفِ ذاتی کا اصل مالک ہوتا ہے، جس سے عاریتاً عارضی طور پر وہ دوسروں کو فیض پہنچاتا ہے اور جب مرضی ہوتی ہے، اپنی چیز واپس لے کر فیض رسانی بند کر دیتا ہے۔

یہیں یہ بھید تہ لگتا ہے کہ کوئی صفت کس طرح اپنے اصلی موصوف سے نکل کر عام ہوتی اور پھیلتی ہے۔ چنانچہ جیسا کہ آفتاب اور دن کی روشنی کے بارے میں اوپر بتایا گیا، دھوپ اور دن کا اُجالا ایک وصف ہے جو کائنات میں اس طرح پھیلا ہوا ہے کہ اس کے ذرے ذرے کو اپنا عارضی موصوف بنا کر روشن و تابناک بنا رکھا ہے۔ لیکن اس کا مصدرِ حقیقی اور موصوفِ اصلی صرف سورج ہے، جس میں یہ ذاتی اور خانہ زاد حیثیت سے پایا جاتا ہے اور پھر اس سے نکل کر عارضی طور پر دوسری اشیاء کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اسی طرح حرارت اور گرمی کی صورت حال ہے، کہ ذاتی اور خانہ زاد حیثیت سے صرف آگ میں پائی جاتی ہے اور پھر اس سے نکل کر عارضی طور پر گرم پانی وغیرہ دوسری اشیاء تک منتقلی ہوتی ہے اور یہی کیفیت بعینہٖ وصفِ وجود کی ہے، جس کا اصلی اور ذاتی مصدر و موصوف خدائے حیّ و قیوم کی ذات ہے، جس سے نکل کر عارضی طور پر دیگر موجودات تک پہنچا اور وہ اس کی بدولت ایک مختصر و محدود وقفے کے لیے عدم سے وجود میں آ گئے۔

تو جس طرح وصف نور کا سرچشمہ اور موصوف اصلی و ذاتی آفتاب ہے وصف حرارت کا آگ اور وصف وجود کا خدائے حیّ و قیوم؛ اسی طرح وصف ضلال کے بارے میں بھی ہم کہتے ہیں کہ اس کا سرچشمہ اور مصدر اصلی و ذاتی شیطان ہے۔ اور وہ گمراہی کے اپنے اس فطری ذاتی

اور خانہ زاد وصف کو دوسروں کی طرف عارضی طور سے منتقل کر کے انہیں گمراہی میں اسی طرح مبتلا کر دیتا ہے، جس طرح مثلاً آفتاب، روشنی کے اصلی اور خانہ زاد وصف کو دن کے وقت دوسری چیزوں کی طرف منتقل کر کے انہیں عارضی طور پر روشن اور تابناک بنا دیتا ہے۔ اور جس طرح وصفِ وجود، وصف نور اور وصفِ حرارت علی الترتیب خدائے حیّ وقیوم، آفتاب اور آتش میں ذاتی اور خانہ زاد حیثیت سے پائے جاتے ہیں، کہیں اور سے نہیں آتے، اسی طرح وصفِ ضلال بھی شیطان میں ذاتی اور خانہ زاد حیثیت سے پایا جاتا ہے، کہیں اور سے اس میں گمراہی کا یہ وصف نہیں آیا۔ بلکہ وہ خود اس کا اصل سرچشمہ ہے اور اسی سے یہ گمراہیاں نکل کر دوسروں تک پہنچتی ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے پنڈت دیانند کا یہ سوال واعتراض مہمل ہو جاتا ہے کہ شیطان کو کس نے بہکایا اور اس میں کہاں سے گمراہی آئی؛ اور جب یہ سوال ہی مہمل ٹھہرا، تو پھر اسے بنیاد بنا کر شیطان کے وجود سے انکار کرنا اور اسلامی عقیدہ کو غلط قرار دینا یا اس کا مضحکہ اڑانا کس طرح روا ہوگا؟

ایک سخت الجھن اور اس کا حل

ہاں ایک شبہ ہنوز باقی ہے جس کا ازالہ ضروری ہے مذکورہ بحث سے معلوم ہوا کہ وصف ضلال شیطان کا ذاتی وصف ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ وصف خدا پیدا کردہ ہے یا نہیں۔ اگر اس کے شیطان کے لیے ذاتی اور خانہ زاد وصف ہونے کا لحاظ کیا جائے، تو اس کا تقاضا تو یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وصف خدا کا پیدا کردہ نہ ہو۔ کیوں کہ خانہ زاد ہونے کا مطلب ہی یہ ہوتا ہے کہ موصوف ہی اس وصف کا حقیقی سرچشمہ ہوتا ہے، اس میں وہ کہیں اور سے نہیں آتا۔ پھر وصف ذاتی اور موصوف حقیقی کے باہم لازم وملزوم اور علت ومعلول ہونے کی وجہ سے لازم آتا ہے کہ جس طرح وصفِ ذاتی خانہ زاد ہے خدا کا پیدا کردہ نہیں۔ اسی طرح اس کا موصوف ذاتی وحقیقی بھی خانہ زاد ہو اور خدا کا پیدا کردہ نہ ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ روشنی کے آفتاب کا وصفِ ذاتی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وصف آفتاب سے کبھی جدا نہیں ہو سکتا۔ اور حرارت کے آگ کی صفتِ ذاتی ہونے کے معنی بھی یہی ہیں کہ یہ اس سے کبھی الگ نہیں ہو سکتی، اور جہاں بھی آگ ہوگی، وہاں حرارت اور گرمی کا اثر بھی لازماً موجود ہوگا۔ اسی طرح وصف ضلال کے

شیطان کے لیے ذاتی ہونے کے معنی بھی یہی ہوں گے کہ گمراہی کی یہ صفت شیطان سے کبھی بھی الگ نہیں ہوسکتی۔ اور جب وصف ذاتی اور اس کے موصوف میں اس قدر تلازم ہوا۔ تو کیوں کر ممکن ہے کہ ان میں سے ایک تو الگ سے اور علاحدہ طور پر خدا کا پیدا کردہ ہو اور وہ دوسرا نہ ہو۔ بلکہ ضروری ہے کہ یا تو دونوں مخلوق ہوں گے یا دونوں نہیں ہوں گے۔ لہٰذا جب وصف ضلال کو شیطان کے حق میں ذاتی خانہ زاد ہونے کی وجہ سے خدا کی مخلوق نہیں مانا گیا، تو لازم ہے کہ مذکورہ تفصیل کی روشنی میں اس کی ذات بھی خدا کی مخلوق نہ ہو، بلکہ وہ بھی اپنی صفت کی طرح ایسے ہی خانہ زاد ہو، جیسا کہ خدا کی ذات اور صفات خانہ زاد ہوتی ہیں۔ اور چوں کہ خدا کی تعریف یہ ہے کہ اس کی ذات وصفات خانہ زاد ہوں لہٰذا شیطان کی ذات اور اس کی صفت ضلال کے خانہ زاد ہونے کے نتیجے میں شیطان کا بھی خدا ہونا لازم آتا ہے، جس کا خلاف عقل وواقعہ ہونا ظاہر ہے۔ شیطان کی خدائی کا یہ نتیجہ چوں کہ ضلالت وگمراہی کو اس کی ذاتی اور خانہ زاد صفت ماننے کی وجہ سے لازم آیا۔ اس لیے اگر اس اشکال سے بچنے کے لیے کہا جائے کہ گمراہی کی یہ صفت شیطان کی ذاتی اور خانہ زاد صفت نہیں، بلکہ خدا کی طرف سے اس میں آئی ہے تو اس صورت میں اوّلاً تو ضلال کا شیطان کے حق میں ذاتی ہونے کا دعویٰ غلط ہو جائے گا اور اس کے اثبات کی مذکورہ بحث ضائع ہو جائے گی، ثانیاً اس سے خدا کی ذات میں برائیوں کا ہونا لازم آئے گا۔ کیوں کہ جب یہ وصف شیطان کا ذاتی اور خانہ زاد وصف نہ ہوا۔ بلکہ اس میں خدا کی طرف سے آیا، تو اس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ اس وصف کا سرچشمہ اور مصدر ومنبع شیطان نہیں، خدا ہے، جس کی ذات سے نکل کر شیطان تک یہ وصف اسی طرح پہنچا، جس طرح آفتاب کی ذات سے نکل کر کائنات اور اس میں موجود اشیاء تک اس کی روشنی اور تابانی کے وصف کا مصدر ومنبع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ وصف اوّلاً اس کی ذات کے اندر موجود رہتا ہے، پھر اس سے نکل کر دن کے وقت کائنات کو روشن کرتا ہے؛ اسی طرح خدا کے ضلال وگمراہی کے وصف کا سرچشمہ ہونے کا مطلب بھی یہی ہونا چاہیے کہ اوّلاً ان برائیوں کا خدا کی ذات میں نعوذ باللہ اجتماع ہو، اور پھر اس سے نکل کر شیطان تک پہنچیں۔ حالاں کہ خدا کے بارے میں برائیوں اور ضلال وگمراہی کی صفت کے مصدر ومنبع ہونے کا تصور بداہتاً غلط اور ناقابل قبول ہے۔

خلاصہ یہ ہے وہ وصفِ ضلال کو شیطان کا ذاتی وصف مانیں، تو مذکورہ تفصیل کی رو سے اس کا خدا ہونا لازم آتا ہے اور نہ مانیں تو خدا کا برائی اور گمراہی کا مصدر و منبع ہونا لازم آتا ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں باتیں خلافِ واقعہ اور نا قابل قبول ہیں، پھر اس الجھن کا حل کیا ہے؟

صدور اور خلق کا فرق

تو الجھن کا حل یوں سمجھئے کہ صدور اور خلق دو لفظ ہیں اور دونوں میں مفہوم و معنی کے لحاظ سے خاصا تفاوت و اختلاف ہے۔ چنانچہ صدور کے معنی ہیں کسی چیز کا اپنے مصدر سے صادر اور برآمد ہونا۔ اس لحاظ سے ظاہر ہے کہ صدور کے اس عمل کا تحقق اس وقت تک ممکن نہیں، جب تک صادر اور برآمد ہونے والی شی اپنے مصدر و منبع کی ذات میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ آفتاب سے روشنی اور آگ سے حرارت کا صدور اسی لیے ممکن ہے کہ یہ اوصاف اپنے ان سرچشموں کی ذات میں پہلے سے موجود تھے، اور پھر ان سے برآمد ہو کر دوسروں کو روشنی یا گرمی کی صفت عطا کی۔ اس کے برعکس خلق کے عمل کے لیے ضروری ہے کہ مخلوق پہلے سے ذاتِ خالق کے اندر موجود نہ ہو، بلکہ عدم کی تاریکیوں میں پڑی ہوئی ہو، کیوں کہ خلق کے معنی پیدا کرنے اور عدم سے وجود میں لانے کے ہیں، اس میں کسی پہلے سے موجود شی کو صادر کرنے کا مفہوم ہرگز نہیں کہ صدور کی طرح خلق کے عمل کے لیے بھی شی مخلوق کا پہلے سے ذاتِ خالق میں ہونا ضروری ہو۔

گویا صدور اور خلق (صادر ہونے اور پیدا کرنے) میں فرق یہ ہوا کہ صدور میں شی صادر کا اپنے مصدر و منبع کی ذات میں پہلے سے موجود ہونا ضروری ہوتا ہے، لیکن خلق میں شی مخلوق، ذاتِ خالق میں پہلے سے موجود نہیں ہوتی، بلکہ سرے سے معدوم ہوتی ہے جسے اس فعلِ خلق کے ذریعے وجود میں لایا جاتا ہے۔

خدا برائیوں کا خالق ہے مصدر نہیں

صدور اور خلق کے مفہوم میں پائے جانے والے اس فرق و اختلاف کو ذہن میں رکھتے ہوئے اگر غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ تمام ذاتی اوصاف کا صدور تو صرف اپنے مصدر و منبع سے ہوتا ہے مگر خلق کے اعتبار سے وہ خدا ہی کے مخلوق ہوتے ہیں۔ یعنی ذاتی اوصاف کا

اپنے موصوف حقیقی کے حق میں خانہ زاد ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کا حقیقی مصدر ومنبع ان کے یہی موصوف ہوتے ہیں، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہ موصوف حقیقی، مصدر ومنبع ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی اوصاف کے خالق بھی ہوتے ہیں۔ بلکہ حقیقتاً جس طرح موصوفِ حقیقی کا خالق خدا ہوتا ہے اسی طرح اس کے وصف ذاتی روشنی اور تابانی کا سرچشمہ حقیقی ہے، خالق نہیں۔ بلکہ آفتاب کے ساتھ ساتھ اس کی روشنی کا خالق بھی خدا ہی ہے۔ اس لحاظ سے وصف ضلال کے بارے میں بھی یہی کہا جائے گا کہ صدور کے لحاظ سے اس کا تعلق شیطان سے ہے اور اس کا حقیقی مصدر ومنبع شیطان ہے، خدا نہیں کہ اس میں برائیوں کا اجتماع لازم آئے اور خلق کے لحاظ سے اس کا تعلق خدا سے ہے اور وہی اس کا اصل خالق ہے، شیطان اور اس کا وصفِ ضلال دونوں خدا کے تابع اور اس کی مخلوق ہیں۔ حاصل یہ کہ برائیوں اور گمراہیوں کا سرچشمہ تو شیطان ہے، لیکن وہ مخلوق خدا کے ہیں، اور اس پر کوئی شبہ یا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

برائیوں کا مصدر ہونا برا ہے، خالق ہونا نہیں

زیادہ سے زیادہ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صرف برائیوں کی تخلیق کو اگر خدا سے منسوب کیا جائے، تو یہ بھی ایک قابلِ اعتراض بات ہے۔ کیوں کہ جس طرح برائیوں کا صدور، یا ان کا ارتکاب غلط ہے، جنہیں خدا کی طرف منسوب نہیں کیا جا سکتا؛ اسی طرح برائیوں کی تخلیق اور انہیں عدم سے وجود میں لانا بھی ایک ایسا غیر مستحسن عمل ہے، جو شانِ خدائی کو قطعاً زیب نہیں دیتا۔ اور جس طرح برائی کے مرتکب کو برا سمجھا جاتا ہے، اسی طرح برائی پیدا کرنے والے کو بھی اچھا نہیں سمجھا جا سکتا۔ لہٰذا شیطان اور اس میں پائی جانے والی برائیوں اور گمراہیوں کی تخلیق ہنوز قابلِ اعتراض ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ محض برائیوں کے پیدا کرنے اور انہیں عدم سے وجود میں لانے میں کوئی خرابی نہیں اور نہ اس سے خدا کی برائی اور اس کے برے ہونے کا نتیجہ نکالنا صحیح ہے۔ اگر یہ برائیاں خدا سے اسی طرح صادر ہوتیں، جس طرح آفتاب سے روشنی صادر ہوتی ہے، تو البتہ اس کا برائیوں اور عیوب ونقائص کے حامل ہونے کی وجہ سے برا ہونا لازم آتا۔ کیوں کہ جیسا کہ گذرا برائیوں کا مصدر ومنبع ہونا برا ہے، خالق ہونا برا نہیں، اور اگر اس پر اصرار کیا جائے کہ

خدا نے شیطان جیسی بری مخلوق اور ضلالت و گمراہی جیسی اس کی ذاتی اور بری صفت کو پیدا کر کے ایک غلط اور برا کام کیا، تو سوال یہ ہے کہ اگر محض برائیوں کی تخلیق ہی برے ہونے کے لیے کافی ہے، تو شیطان اور اس کے وصفِ ضلالت ہی کی کیا خصوصیت اس کے علاوہ بھی بے شمار ایسی چیزوں کو خدا نے پیدا کیا ہے، جو بظاہر بری ہیں مثلاً بری صورت، بری سیرت، بری آواز، پاخانہ پیشاب وغیرہ؛ پھر ان کی تخلیق کو قابلِ اعتراض اور خدا کی شان کے خلاف کیوں نہیں سمجھا جاتا؟ اگر ان چیزوں کو پیدا کرنے اور عدم سے وجود میں لانے میں کوئی خرابی نہیں، جیسا کہ واقعہ ہے تو پھر شیطان اور گمراہ کرنے کی اس کی صفت و صلاحیت کی تخلیق کا عمل بھی برا اور قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۱۶-۱۷)

اعتراض - نسخ احکام و ادیان کا نظریہ غلط ہے

پنڈت دیانند کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ نسخ احکام و ادیان کا اسلامی عقیدہ صحیح نہیں۔ یہ نظریہ عقلاً قابلِ قبول نہیں کہ خدا اپنے ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم اور ایک دین کو کالعدم اور ناقابلِ عمل قرار دے کر اس کی جگہ دوسرا دین جاری و نافذ کرتا رہتا ہے۔ کیوں کہ تبدیلی کی ضرورت وہاں پیش آتی ہے جہاں پہلی چیز میں کوئی خرابی در آئے یا ایسا کوئی نقص نظر آجائے کہ اسے بدلنا اور ہٹا کر دوسری چیز کو اس کی جگہ جاری و نافذ کرنا ناگزیر ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال محدود فکر و نظر کے حامل اور خطا و نسیان سے مرکب انسانوں کو تو پیش آسکتی ہے کہ پہلے وہ کوئی خاص حکم اور قانون نافذ کریں اور جب بعد میں اس کی کسی خرابی اور نقص کا علم ہو جائے یا رفتارِ زمانہ اس کی اہمیت و افادیت کو ختم کر دے، تو اسے بدل کر اس کی جگہ کوئی دوسرا قابلِ عمل اور نسبتاً مفید حکم و قانون نافذ کر دیں۔ لیکن اس طرح کی تبدیل طلب صورتِ حال سے دوچار ہونے کا تصور اس خدا کے فیصلوں اور احکامات کے سلسلے میں نہیں کیا جاسکتا، جو بے پناہ قدرت اور غیر محدود علم و خبر کا مالک ہے اور جس کے علم میں ازل سے ابد تک کی تمام چیزیں داخل ہیں۔ کیوں کہ ایسا خدا اس پر اچھی طرح قادر ہے کہ وہ شروع ہی میں کوئی ایسا جامع اور پائیدار دین یا حکم جاری و نافذ کر دے جو ہر قسم کی خرابیوں سے دور، امتدادِ زمانہ سے جنم لینے والے انقلابات و ضروریات سے ہم آہنگ اور کسی بھی طرح کی خلل پذیری سے پاک ہو۔ جب ایسا ممکن

ہے، تو نسخ احکام وادیان کی کیا ضرورت؟ لہٰذا عقل کا تقاضا ہے کہ خدا کا حکم اور دین ہمیشہ یکساں حالت میں رہے اور کبھی بھی ترمیم و تنسیخ سے دوچار نہ ہو۔ اس کے برعکس نسخ احکام وادیان کا عقیدہ غلط اور نامعقول ہی نہیں، خدا سے قادر مطلق اور علیم وخبیر کی ایک طرح کی توہین بھی ہے۔ (انتصار الاسلام، ص:۱۸)

جوابِ اوّل

مذکورہ اعتراض کا پہلا اور الزامی جواب یہ ہے کہ حکم خداوندی اور ارادہ خداوندی دو چیزیں ہوتی ہیں اور دونوں یکساں طور پر فہم پر موقوف ہیں۔

یعنی جس طرح بے سوچے سمجھے کوئی حکم و فیصلہ دینا اور پھر فوراً انہیں بدل کر کوئی دوسرا حکم و فیصلہ نافذ کرنا کم فہمی کی علامت ہوتا ہے؛ اسی طرح بے سوچے سمجھے کوئی ارادہ کر لینا اور پھر فوراً اسے بدل کر اس کے خلاف کوئی اور قصد کر لینا بھی جلد بازی، غیر مستقل مزاجی اور ایک طرح کی بے شعوری پر محمول ہوتا ہے کیوں کہ حکم ہو یا ارادہ دونوں فہم پر موقوف ہیں۔

تو اگر پنڈت دیانند کے اعتراض کے مطابق خدا کا اپنے حکم و دین میں نسخ کا عمل جاری رکھنا اور ایک کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا حکم و دین نافذ و نازل کرنا، محض اس بناء پر خلافِ عقل و قیاس ٹھہرتا ہے کہ اس سے نعوذ باللہ خدا پر انسانوں کی طرح کم فہمی کا الزام عائد ہوتا ہے؛ تو ارادۂ خداوندی کی تبدیلی کو بھی اسی خرابی کی وجہ سے خلافِ عقل کہنا اور ماننا چاہیے کیوں کہ جیسا کہ بتایا گیا اس کا بھی فہم و شعور سے ویسا ہی تعلق ہے جیسا حکم ہے اور قصد وارادے کی بار بار تبدیلی سے بھی انسان پر غلط فہمی، نادانی اور بے شعوری کا وہی الزام عائد ہوتا ہے جو حکم و فیصلہ کے بار بار بدلنے کی صورت میں اس پر عائد ہوتا ہے۔ حالاں کہ ارادۂ خداوندی کی تبدیلی کا ہر شخص ہمہ وقت مشاہدہ کرتا رہتا ہے اور اس پر کسی کو کبھی بھی نہ کوئی شبہ ہوتا ہے نہ اعتراض۔ حیات و موت، صحت و مرض، فقر و غنا، عسر و یسر اور عزت و ذلت سے انسانوں کا یکے بعد دیگرے دوچار ہوتے رہنا ارادۂ خداوندی کی اسی تبدیلی کا مظہر ہے۔ خدا اپنے بندے کو پہلے پیدا کر کے وجود بخشتا ہے پھر مار کر فنا کر دیتا ہے، کبھی پہلے دولت، عزت اور شہرت سے نوازتا ہے، پھر اچانک افلاس و تنگ دستی ذلت و پستی اور گمنامی سے دوچار کر دیتا ہے اور اس طرح خدا کی مرضی اور مشیت کے مطابق اس کے بندے مختلف

اوقات میں مختلف اور متضاد حالتوں اور کیفیتوں سے دوچار ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ ارادۂ خداوندی کی ان تبدیلیوں کو اور ان کے نتیجے میں انسانی حالات و کیفیات میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو کوئی بھی خلافِ عقل و قیاس نہیں کہتا۔ کیوں کہ خدا قادرِ مطلق، مختارِ کل اور ہر چیز کا خالق و مالک ہونے کی وجہ سے حسبِ مرضی تصرف کرنے کا مکمل حق رکھتا ہے۔ وہ جو جیسا اور جب چاہے قصد و ارادہ اور تصرف کر سکتا ہے، یہ نہ خلافِ عقل ہوگا اور نہ حیرت انگیز۔

تو دیکھئے جس طرح یہاں ایک ارادے کے بعد اس کے برعکس دوسرا ارادہ کر لینا کسی کے نزدیک بھی اس پر محمول نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ خدا نے پہلے۔ بے سوچے سمجھے ایک ارادہ کر لیا تھا۔ جو اس کو بدلنے کی ضرورت پیش آئی اور جس طرح حیات کے بعد موت صحت کے بعد مرض، دولت کے بعد عزت اور فقر و فاقہ سے دوچار کرنے کے حوالے سے خدا کی مرضی اور مشیت کی تبدیلی کو کوئی بھی یہ معنی نہیں پہناتا کہ معاذ اللہ بے شعوری کی حالت میں اور بے سوچے سمجھے کیے گئے اپنے پہلے ارادے کی غلطی اور خرابی پر متنبہ ہونے کے بعد خدا کو اس تبدیلی کی ضرورت پیش آئی؛ اسی طرح ایک حکم کی جگہ دوسرا حکم اور ایک دین کی جگہ دوسرا دین نازل کرنے کو بھی خلافِ عقل و قیاس کہنا غلط ہوگا اور ارادۂ خداوندی کی تبدیلی کی طرح حکم خداوندی کی اس تبدیلی اور ترمیم و تنسیخ کی توجیہہ بھی یہی کی جائے گی کہ خدا مختارِ کل اور قادرِ مطلق ہے، اس لیے جو اور جیسا چاہے اور جس حکم و دین کو جتنی مدت کے لیے بھی نافذ کرنا مناسب سمجھے اور بعد میں اس میں جو بھی ترمیم و تنسیخ کرے، یہ نہ خلافِ عقل ہوگا نہ حیرت انگیز۔ (انتصار الاسلام، ص: ۱۸)

جواب۔ ترمیم و تنسیخ کے دو محرکات

عموماً کسی بھی حکم و فیصلے کی تبدیلی و محرکات کے تحت عمل میں آتی ہے: غلطی یا تبدل مصلحت یعنی کسی بھی حکم و فیصلے کی تبدیلی اور اس کی جگہ دوسرے حکم و فیصلے کے نفاذ کی ضرورت یا تو اس لیے پیش آتی ہے کہ پہلا حکم و فیصلہ غلط ہوتا ہے، یا اس لیے کہ پہلا حکم و فیصلہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہوتا ہے اور جس زمانے میں اس کا نفاذ و اجرا عمل میں آتا ہے، اس سے ہم آہنگ اور اس کے تقاضوں کے مطابق بھی ہوتا ہے؛ مگر بعد میں وقت اور مصلحت

وقت میں تبدیلی آجانے کی وجہ سے اس حکم میں بھی تبدیلی ناگزیر ہو جاتی ہے، تاکہ وہ نئے زمانے میں اور اس کی بدلتی قدروں اور مصلحتوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔

ان دو محرکات پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اگر کسی حکم کی تبدیلی کے پس پشت پہلا محرک کارفرما ہو اور کوئی شخص اپنے ایک حکم کو بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم اس لیے نافذ کر رہا ہو کہ پہلا حکم غلط اور بے جا تھا تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں تو اس تبدیلی کو اس شخص کی نادانی اور فہم و شعور کی کمی پر محمول کیا جا سکتا ہے؛ لیکن اگر کوئی شخص دوسرے محرک کی بناء پر اور تبدل مصلحت کے پیش نظر اپنے کسی سابقہ فیصلے، تجویز اور رائے میں ترمیم و تنسیخ کرے، تو ایسے شخص کو کسی بھی اعتبار سے نادانی یا کم فہم نہیں کہا جائے گا۔ کیوں کہ تبدیلی، مصلحتِ وقت کے پیش نظر عمل میں آئی ہے، اور مصلحتِ وقت کی رعایت، تہذیب و تمدن اور عقل و منطق اور مشاہدے کی رو سے انسانی ارتقاء کے لیے ناگزیر ہونے کی وجہ سے، نادانی نہیں، عین دانائی اور عقل مندی ہوتی ہے۔

ایک طبیب اور معالج اپنے زیر علاج مریض کے سابقہ نسخے کو کبھی اس وجہ سے بدلتا ہے کہ غلط تشخیص کی وجہ سے وہ ضرر رساں اور بے جا ہوتا ہے، اور کبھی اس وجہ سے مریض کے حالات و کیفیات میں تبدیلی آجانے اور کبھی سابقہ نسخے کا وقت گذر جانے کی وجہ سے اس کی جگہ دوسرا موزوں اور مناسبِ حال نسخہ تجویز کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس جگہ بھی پہلی صورت حال سے دوچار طبیب اور معالج کو تو اناڑی اور ناتجربہ کار کہا جا سکتا ہے، لیکن دوسری صورت پر عمل پیرا معالج کو کوئی شخص بھی نادان نہیں کہہ سکتا۔ معلوم ہوا کہ تبدیلیِ حکم و فیصلہ اگر غلطی کی وجہ سے ہو تب تو۔ عیب اور نقص کی بات ہے، لیکن اگر یہ تبدیلی مصلحتاً کی جائے، تو اس میں بھی کوئی عیب اور نقص نہیں۔

مصلحت کی رعایت نادانی نہیں

اس تمہید کے پیش نظر سمجھئے کہ نسخ احکام و ادیان کا تعلق بھی اسی دوسری صورت سے ہے اور اس میں بھی ترمیم و تنسیخ غلطی کی وجہ سے نہیں، مصلحت کے تقاضے کے مطابق ہی عمل میں آئی ہے۔ خدا اپنے کسی ایک حکم اور دین کو منسوخ کر کے اور بدل کر اس کی جگہ دوسرا حکم و دین اس لیے نہیں جاری و نافذ کرتا ہے کہ اس کا پہلا حکم و دین ناقص اور غلط ہوتا ہے، اور

جب بعد میں اسے اپنے حکم ودین کی غلطی اور نقص کا علم ہوتا ہے تو وہ اس کی تبدیلی ضرور سمجھتا ہے، بلکہ اس ترمیم و تنسیخ کا محرک بھی تبدیلی وقت و مصلحت ہی ہوتی ہے یا اس کا باعث پہلے دین کی میعاد کا ختم ہو جانا اور گزر جانا ہوتا ہے۔

اس طرح گویا پہلا حکم ودین بھی اپنی جگہ صحیح اور ایک خاص زمانے کی مصلحت کے پیش نظر موزوں مفید اور مناسب ہوتا ہے اور اس کی جگہ نافذ کیا جانے والا دوسرا حکم ودین بھی اپنے زمانے کے خاص ماحول ومزاج کے لحاظ سے مفید اور موزوں ہوتا ہے اور جس طرح ایک معالج اپنے مریض کے حالات وکوائف کے تقاضوں اور مصلحتوں کے مطابق اس کے جسمانی مرض کے نسخے بدلتا رہتا ہے اور اس کا یہ عمل اس کے دانا اور تجربہ کار ہونے کی دلیل ہوتا ہے اسی طرح خدا بھی زمانہ حالات اور بنی نوع انسانیت کے روحانی امراض کے اتار چڑھاؤ اور مصلحت کے مطابق اس کے نسخۂ علاج میں تبدیلی لاتا رہتا ہے جو احکام و مذاہب کے نسخ وترمیم کی شکل میں ظاہر ہوتی رہتی ہے۔ اور مذکورہ مثال کے اعتبار سے یہ تبدیلی بھی خلافِ عقل وقیاس نہیں کہ شانِ خدائی کے خلاف ہو اور نسخ احکام وادیان کا اسلامی عقیدہ غلط قرار پائے۔ اس کے برعکس یہ نسخ وترمیم عقل منطق اور تہذیبی وانسانی ارتقاء کے تقاضوں کے عین مطابق ہے۔

اعتراض۔ خلقِ ارواح کا نظریہ صحیح نہیں بلکہ نظریۂ تناسخ صحیح ہے

پنڈت دیانند کی طرف سے اسلام پر کیے گئے چوتھے اعتراض کا تعلق خلق ارواح سے ہے۔ اس کے بقول مسلمانوں کا یہ عقیدہ صحیح نہیں کہ ارواح پہلے سے خدا کے یہاں موجود رہتی ہیں اور ان میں سے جب کسی کو دنیا میں آنے کا حکم ہوتا ہے، آجاتی ہے اور جب واپسی کا حکم ہوتا ہے لوٹ جاتی ہے کیوں کہ اس طرح کا عقیدہ خدا کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کے مفہوم اور تقاضوں کے خلاف ہے آخر جب خدا قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہونے کے مفہوم اور تقاضوں کے خلاف ہے آخر جب خدا قادرِ مطلق ہونے کی وجہ سے ہر لمحہ اور ہر وقت ارواح کی تخلیق پر قادر ہے تو کیا ضرورت ہے کہ قبل از وقت روحوں کو پیدا کر کے اپنے یہاں جمع رکھے؟ لہٰذا ارواح کے خدا کے یہاں پہلے سے پیدا شدہ حالات میں موجود ہونے کا عقیدہ

غلط ہے، اور اس کے برعکس صحیح یہ ہے کہ جیسا کہ ہم سمجھتے ہیں کہ ارواح کی تعداد ساڑھے چار ارب سے زیادہ نہیں اور جزا وسزا کے طور پر یہی ارواح تناسخ اور ''آواگون'' کے عمل سے دوچار ہوتی رہتی ہیں۔ (انصار الاسلام، ص: ۱۸-۱۹)

پنڈت دیانند کے مذکورہ اعتراض کے تجزیے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کے ذریعے انہوں نے درج ذیل تین دعوے کئے اور تین عناصر پر زور دیا۔

۱- اوّل یہ کہ جب خدا قادرِ مطلق اور مختارِ کل ہونے کی وجہ سے ہر لمحہ اور ہر آن ارواح کی تخلیق پر قادر ہے، تو پھر کیا ضرورت ہے کہ ارواح کو خدا کے یہاں پہلے سے پیدا شدہ اور موجود مانیے اور یہ عقیدہ رکھئے کہ انہی موجود ارواح میں سے خدا جس کو اور جب چاہتا ہے، جسمانی لباس پہنا کر دنیا میں بھیج دیتا ہے جب چاہتا ہے اسے بشکل موت جسمانی پیکر سے الگ کر کے اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ اس طرح کا عقیدہ رکھنا، جیسا کہ مسلمانوں کا ہے گویا خدا کی توہین اور اس کی قدرت واختیار کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

۲- دوسرے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق اگر مان لیا جائے کہ خدا ہر وقت ارواح کی تخلیق نہیں کرتا، بلکہ پہلے سے اپنے پاس موجود ارواح میں سے ہی وہ جسے چاہتا، دنیا میں بھیجتا ہے اور پھر حسبِ مرضی واپس بلا لیتا ہے اور تناسخ اور آواگون کے تقاضے کے برخلاف یہ کہا جائے کہ جو روح ایک بار دنیا میں آ کر واپس چلی جاتی ہے وہ دوبارہ پھر کبھی نہیں آتی؛ تو اس کے نتیجے اور تقاضے کے طور پر لازم ہے کہ بے حد و بے شمار روحوں کا وجود تسلیم کیا جائے اور کہا جائے کہ ابتدائے عالم سے اب تک اربوں کھربوں کی تعداد میں روحیں آئیں اور گئیں اور اب سے بزم عالم کے درہم برہم ہونے اور نظام کائنات کے ختم ہونے تک بھی اسی مقدار میں یا اس سے بھی زائد تعداد میں ارواح کی آمد و رفت ہوتی رہے گی حالاں کہ یہ غلط ہے۔ کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ کثرت ارواح کی کوئی انتہا نہیں۔ جب کہ حقیقتاً دنیا میں صرف ساڑھے چار ارب روحیں رہتی ہیں اور بطور تناسخ پیدائش اور موت کی شکل میں انہی کی آمد و رفت ہوتی رہتی ہے۔

۳- تیسرے مذکورہ دونوں دعوؤں کی بنیاد پر عقیدۂ تناسخ کے صحیح و ثابت ہونے اور حیات بعد الممات، حشر و نشر، قیامت اور حساب و کتاب سے متعلق اسلامی عقیدوں کے غلط نامعقول

اور غیر واقعی ہونے کا دعویٰ پنڈت دیانند کا یہ تیسرا دعویٰ فی الحقیقت دوسرے دعوؤں کا ضمیمہ اور اس کا منطقی نتیجہ ہے۔

پنڈت دیانند نے مذکورہ اعتراض میں مندرجہ بالا انہی تین دعوؤں کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، ذیل میں ہم بالترتیب ان دعوؤں کا ردالزامی اور علمی و تحقیقی دونوں لحاظ سے کر رہے ہیں۔ (انتصار الاسلام، ص:۱۹)

پہلے دعوے کا الزامی جواب۔ضرورت سے زائد اور قبل از وقت موجود رہنا خلاف عقل نہیں

اعتراض کے پہلے الزامی دعوے کا جواب تو یہ ہے کہ اگر پنڈت دیانند کے بقول، خدا کے قادر مطلق اور مختار کل ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہو کہ وہ وقت اور ضرورت سے پہلے کوئی چیز پیدا نہ کرے بلکہ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو، اپنی قدرت کاملہ کی بدولت فوری طور پر اسے پیدا کر کے ضرورت کی تکمیل کر دے اور اسی وجہ سے ارواح کا خدا کے پاس پہلے سے پیدا شدہ اور موجود ہونا عقلاً غلط اور خدا کی بے پناہ اور غیر محدود قدرت واختیار کے تقاضے کے خلاف قرار پائے! تو لازم ہے کہ اسی طرح اور اسی تقاضے کے پیش نظر نظام کائنات سے متعلق ان بے شمار خدائی افعال واعمال کو بھی عقل اور شان خدائی کے خلاف کہا اور سمجھا جائے، جنہیں قدرت آغاز عالم سے ہی ایک خاص نظام کے تحت انجام دیتی چلی آ رہی ہے۔ چنانچہ بجائے اس کے کہ موجودہ نظام قدرت کے مطابق پھلوں، میووں اور اناج وغلہ وغیرہ کی پیدائش کے لئے کچھ خاص موسم متعین ہوں اور اس ایک موسم کی پیداوار کو لوگ پورے سال حسب ضرورت صرف کرتے رہیں، پنڈت دیانند کے مذکورہ نقطۂ نظر سے، خدا کے قادر مطلق ہونے کا تقاضا تو یہ ہونا چاہئے تھا کہ وہ قبل از ضرورت چیزوں کے پیدا کرنے کے بجائے ضرورت ہی کے وقت ان کو پیدا کر دیا کرتا۔ اور جب بھی کسی کو کسی پھل کی حاجت محسوس ہوتی، بلا قید وشرط موسم، فوراً مطلوبہ پھل پیدا کر کے اس کی حاجت روائی کر دی جاتی، جب بھی کسی کو بھوک ستاتی، فوراً اس کی مرغوب اور دل پسند غذا پیدا کر کے اس کی شکم سیری کا سامان کر دیا جاتا اور جب بھی کسی

کو پیاس کا احساس ہوتا بلا تاخیر اور اسی جگہ خدا اپنی قدرت کاملہ سے آب زلال کا کوئی چشمہ جاری کر کے اس کی تشنگی دور کر دیتا۔

حالاں کہ آغاز کائنات سے ہی کائنات کا نظم، جس خاص قدرتی نظام کے تحت چل رہا ہے، اس کے مطابق غلہ اور فصل وغیرہ کے لیے کچھ موسم مخصوص ہوتے ہیں، جن کی پیداوار سے انسان اور دیگر ضرورت مند حیوانات ومخلوقات پورے سال حسب ضرورت فائدہ اٹھاتے رہتے ہیں۔ تو سوال یہ ہے کہ کیا یہ نظم غلط اور غیر معقول طریقے پر چل رہا ہے؟ اور کیا اس کی وجہ سے صدیوں ہزاروں برس سے، جب کہ دنیا قائم ہوئی، آج تک خدا کی قدرت کاملہ کی مسلسل توہین ہوتی چلی آرہی ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ پنڈت دیانند کے وضع کردہ مذکورہ ضابطے کے پیش نظر اگر غور کیا جائے، تو جیسا کہ عرض کیا گیا، پوری کائنات کے نظام کا نامعقول اور بے جا ہونا لازم آتا ہے۔ کیوں کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز نہیں پائی جاتی جو ضروری نہ ہو اور ضرورت سے پہلے نیز ضرورت سے زائد مقدار میں موجود نہ ہو۔ زمین، پانی، ہوا وغیرہ تمام چیزیں ضروری بھی ہیں اور انسان اور دنیا کی ضرورت سے زائد مقدار میں بہت پہلے سے موجود بھی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ ان ضروری چیزوں کا ضرورت سے زائد مقدار میں پہلے سے موجود ہونا نہ خلاف عقل ہے اور خدا سے قدیر اور شان کبریائی اور خدائی کے منافی۔ بلکہ اس اعتبار سے یہ عین حکمت ہے کہ ضرورت کے وقت مقدار زائد ہی کام آتی ہے۔ تو جب یہاں دنیا میں خدائی اور قدرتی نظام کے مطابق بے شمار چیزوں کا قبل از وقت موجود ہونا اور ضرورت کے وقت انکا کام میں آنا خلاف عقل نہیں، تو پھر خدا کے یہاں ارواح کے موجود ہونے اور حسب ضرورت ان کے دنیا میں آنے اور یہاں سے جانے کا اسلامی عقیدہ ونظریہ کیوں کر غلط اور خلاف عقل ہو گا؟

دوسرے اور تیسرے دعوے کا الزامی جواب۔ مہمل بات

اور جہاں تک اعتراض کے اس دوسرے حصے کا تعلق ہے، جس میں پنڈت دیانند نے کائنات کے آغاز سے اس کے اختتام تک دنیا میں آنے جانے والی تمام روحوں کو کل تعداد کے صرف ساڑھے چار ارب ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس کی بنیاد پر اپنے عقیدۂ تناسخ کی عمارت کھڑی کی ہے، تو اس کا مہمل اور خلاف عقل ہونا بدیہی طور پر واضح ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ

دنیا میں شروع سے اخیر تک کی تمام ارواح کی کل تعداد صرف ساڑھے چار ارب ہو، جب کہ بعض چھوٹے اور معمولی گاؤں کے صرف مچھروں اور مکھیوں وغیرہ کی تعداد بسا اوقات ساڑھے چار ارب سے متجاوز ہو جاتی ہے؟

غرض، یہ دوسرا دعویٰ مشاہدہ اور عقل کی روشنی میں بداہتاً غلط اور خلاف واقعہ ہے۔ اور جب یہ دعوائے دوم خلاف عقل قرار پایا! تو اس بنیاد پر قائم کی گئی تناسخ اور آواگون کی عمارت بھی خود بہ خود ڈھ جاتی ہے اور الگ سے اس کے ابطال تردید کی چنداں ضرورت باقی نہیں رہتی، تاہم نظریہء تناسخ پر قدرے تحقیقی گفتگو تو ہم جواب دوم کے تحت کریں گے، یہاں اشارۃً صرف اس قدر عرض ہے کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے تناسخ کا نظریہ تسلیم کر لیا جائے اور مان لیا جائے، کہ دنیا میں انسانوں بلکہ تمام جاندار مخلوقات کی آمد و رفت جزا و سزا کے طور پر ہوتی ہے، تو سوال یہ ہے کہ یہ کیسی جزا سزا ہے، جس کے پانے والوں کو یہی معلوم نہیں رہتا کہ انہیں کن اچھے برے اعمال کی جزا و سزا کے مرحلے سے گزارا جا رہا ہے؟ آخر اس انعام و اکرام یا عذاب و عتاب کی کیا حیثیت ہے جہاں نہ انعام یافتہ کو معلوم کہ اسے کن اچھے اور پسندیدہ اعمال پر انعام و اکرام سے نوازا جا رہا ہے اور نہ سزایاب و مبتلائے عذاب کو پتہ کہ اسکے کن گناہوں کی پاداش میں اسے عذاب اور سزا کے مرحلے سے گزرنا پڑ رہا ہے؟ دنیا کا کوئی بھی غریب تنگ حال اور مصیبت زدہ انسان یقین کے ساتھ نہیں بتا سکتا کہ اس نے فلاں جنم میں فلاں جرم کئے تھے، جس کی سزا کے طور پر قدرت اسے اس جنم میں غربت، افلاس اور مصیبت سے دوچار کر رہی ہے اور نہ ہی کوئی امیر کبیر آسودہ حال اور صحت، دولت اور سکون خاطر کی نعمت سے بہرہ یاب شخص اپنے ''پہلے جنم'' کے ان نیک اعمال کی نشان دہی کر سکتا ہے، جن کی بدولت اسے ''اس جنم'' میں اس مذکورہ نعمتوں سے نوازا گیا۔ انعام و اکرام جزا و سزا کی اس وقت تک کوئی حیثیت افادیت نظر نہیں آتی، جب تک کہ ان اعمال کا علم نہ ہو، جن پر جزا و سزا مرتب ہو رہی ہو۔ اس لیے اگر سلسلہء آفرینش بطور آواگون اور آواگون بطور جزا و سزا ہوتا، تو لازماً یقینی طور پر ہر شخص کو یاد رہتا کہ وہ پہلے فلاں ''جون'' میں تھا اور جنم کے فلاں فلاں اچھے یا برے اعمال کے نتیجے میں اسے اس جنم میں اس اس طرح جزا یا سزا دی گئی۔ حالاں کہ جیسا عرض کیا گیا، واقعہ اس کے خلاف ہے

اور کسی کو بھی اپنے کسی پچھلے جنم اور اس جنم کے کسی اچھے یا برے عمل کے بارے میں کچھ بھی یاد نہیں۔ اس لیے تناسخ کا عقیدہ و نظریہ بھی خلاف واقعہ، غلط اور نا قابل قبول ہوگا

پہلے دعوے کا علمی جواب۔ روح، جسم اور اعضاء و جوارح کی حیثیت

پنڈت دیانند کے اعتراض میں مذکور پہلے دعوے کے الزامی جواب کے بعد اب اس کا علمی و تحقیقی جواب درج ہے۔ اس پہلے دعوے کے تحت پنڈت دیانند نے ارواح کے پہلے سے خدا کے یہاں موجود ہونے کے مسلمانوں کے عقیدے کو خلاف عقل و واقعہ قرار دیا تھا۔ اس کا جو علمی جواب قدرے تفصیل سے آگے آرہا ہے اسکا خلاصہ یہ ہے کہ ایک خاص تمثیل کی روشنی میں انسانی روح، اسکے جسم اور اس کے اعضاء و جوارح کی مثال ایسی ہی ٹھہرتی ہے جیسے راکب، مرکب اور آلات رکوب وغیرہ کی۔ یعنی جس طرح راکب فاعل ہوتا ہے، مرکب مفعول اور باقی فعل رکوب کے آلات وغیرہ ہوتے ہیں، اس طرح روح فاعل ہوتی ہے، جسم مفعول ہوتا ہے اور اعضا و جوارح بہ منزلہ آلات فعل ہوتے ہیں۔ اور فاعل اور مفعول وغیرہ کا قاعدہ ہے کہ وجود و تحقق کے لحاظ سے فاعل مقدم ہوتا ہے، پھر مفعول کا وجود ہوتا ہے اور اخیر میں آلات فعل وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ راکب، مرکب اور آلات رکوب میں سے سب سے پہلے فاعل یعنی راکب کا پایا جانا ضروری ہوتا ہے، پھر مفعول یعنی مرکب اور پھر اخیر میں آلات رکوب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قاعدے کے پیش نظر روح بھی چونکہ راکب و فاعل ہے، اس لیے وجود کے اعتبار سے اسکا مقدم ہونا ضروری ہوگا۔ اور جسم کے مرکب و مفعول اور اعضاء و جوارح کے آلات فعل ہونے کی وجہ سے وجود میں اپنے فاعل روح سے مؤخر ہونا ضروری ہوگا۔ اس طرح ثابت ہوتا ہے کہ کسی بھی ذی روح خصوصاً انسان کے روحانی وجود کا اس کے جسمانی وجود سے مقدم ہونا نہ صرف معقول بلکہ ضروری بھی ہے۔ اور اسی لیے ارواح کے پہلے سے خدا کے یہاں موجود ہونے اور حسب مرضی خداوندی جسمانی لباس اختیار کر کے دنیا میں آنے کا اسلامی عقیدہ نہ صرف عین موافق عقل و قیاس ہے، بلکہ اس کے برعکس کوئی اور صورت بظاہر نا قابل قبول بھی ہے۔ اسے مزید وضاحت کے ساتھ یوں سمجھئے کہ انسان اور ہر جان دار مخلوق کی روح، اس کے جسم اور اعضاء و جوارح کی وہی شکل ہوتی ہے جو سوار، سواری

اور سوار کے دیگر آلات و وسائل کی ہوتی ہے۔ جس طرح راکب یعنی سوار اور مرکب یعنی سواری اور آلات و وسائل رکوب وغیرہ میں اصل فاعل اور کارفرما کی حیثیت راکب کو حاصل رہتی ہے اس کے بعد مرکب اور اخیر میں دیگر آلات و متعلقات رکوب وغیرہ کا نمبر آتا ہے اسی طرح انسان بلکہ ہر جاندار مخلوق میں اصل فاعل اور کارفرما کی حیثیت روح کو حاصل ہوتی ہے جو بمنزلۂ مرکب ہوتی ہے پھر جسم کو جو بمنزلۂ مرکب ہوتا ہے اور پھر اخیر میں اعضا و جوارح کا نمبر آتا ہے جو بمنزلۂ آلات و وسائل ہوتے ہیں۔ اور جب روح اور جسم کی حیثیت راکب اور مرکب کی طرح ہوئی، تو جس طرح راکب اور مرکب میں وجود کے لحاظ سے راکب کو سبقت حاصل ہوتی ہے کہ پہلے وہ موجود ہوتا ہے، پھر اس کے بعد مرکب اور آلات رکوب کے وجود کی ضرورت ہوتی ہے! اسی طرح یہاں بھی پہلے روح کا وجود ہوگا، پھر جسم کا اور پھر اعضا و جوارح وغیرہ آلات موجود ہوں گے۔

چناں چہ ظاہر ہے کہ اگر کوئی بذریعہ سواری شکار کرنا چاہے، تو سب سے پہلے راکب اور سوار کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے، اس کے بعد اس کے لیے حسب ضرورت و خواہش مرکب و سواری کا بندوبست کیا جاتا ہے، پھر شکار کے لیے ساز و سامان مہیا کیے جاتے ہیں، تب کہیں جا کر فعل شکار وجود پذیر ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی انسان یا کسی اور جان دار مخلوق کی پیدائش کی صورت حال بھی یہی ہوتی ہے کہ پہلے روح پیدا کی جاتی ہے، پھر اس کے مرکب جسم کو وجود میں لایا جاتا ہے اور اخیر میں اس کے اعضاء و جوارح کا وجود عمل میں آتا ہے اور پھر کہیں جا کر اس کی مکمل تخلیق عمل میں آتی ہے۔ غرض اس طرح مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق ہر جان دار کا روحانی اعتبار سے اپنے جسمانی وجود سے پہلے موجود ہونا معقول ہی نہیں ناگزیر ہونے کے لحاظ سے ثابت ہو جاتا ہے۔

رہی یہ بات کہ روح اور جسم کے راکب و مرکب کی طرح ہونے کی کیا دلیل ہے یا دوسرے لفظوں میں، وہ کیا وجوہ ہیں جن کے پیش نظر روح کو راکب اور جسم کو مرکب سمجھا جا سکتا ہے؟ تو اسے سمجھئے کہ دو طرح کی مناسبتیں ہیں، جن کی وجہ سے روح اور جسم کے درمیان راکب اور مرکب کا تعلق سمجھ میں آتا ہے؛ ایک ہے فوقیت و تحتیت کی مناسبت اور دوسری مطاع و مطیع ہونے کی مناسبت جس طرح راکب و مرکب میں راکب میں فوقیت (اوپر ہونے) اور مرکب میں تحتیت (نیچے ہونے) کی نسبت پائی جاتی ہے اور جس طرح

راکب مطاع اور مرکب مطیع ہوتا ہے اسی طرح روح وجسم میں بھی روح کو راکب اور جسم کو مرکب اور روح کو مطاع اور جسم کو مطیع کی حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ اس لحاظ سے روح کا تعلق عالم علوی اور جسم کا خاک دان سفلی سے ہے، روح میں علویت وفوقیت اور جسم میں سفلیت وتحتیت کی صفت پائی گئی اور اس اعتبار سے کہ روح جسم کے لیے فاعل اور اصل کارفرما کی حیثیت رکھتی ہے اور جسم، روح کے لیے مفعول اور کارکن کی حیثیت رکھتا ہے، روح میں مطاع وبلند رتبہ ہونے کی صفت پائی گئی اور جسم میں اس کے مطیع اور اس سے کم رتبہ ہونے کی اور جب فوقیت وتحتیت اور مطاع اور مطیع ہونے کی خصوصیتوں میں راکب ومرکب کے ساتھ روح وجسم بھی شریک ہوئے تو اس کے حکم میں بھی دونوں یکساں طور پر شریک ہوں گے کہ جس طرح راکب کا وجود مرکب پر مقدم ہوتا ہے، اسی طرح روح کا وجود بھی جسم پر مقدم ہوگا۔ اسی سے اگر غور کیا جائے تو ایک جاندار کی روح کے جسم کی طرح اپنے اعضاء وجوارح سے پہلے موجود ومتحقق ہونے کی وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے اور واضح ہو جاتا ہے کہ روح درحقیقت فاعل اور اعضاء وجوارح آلہ ووسیلۂ فعل کی حیثیت کے حامل ہیں۔ کیوں کہ فاعل اور آلاتِ فعل میں بھی مبدیت وتوسط اور مطاع ومطیع ہونے کی نسبت وحیثیت پائی جاتی ہے۔ یعنی فاعل، فعل کا مبداء اور مصدر ہوتا ہے اور آلہ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے فعل کے وجود میں آنے کا واسطہ ہوتا ہے اسی طرح فاعل مطاع کی حیثیت رکھتا ہے اور آلہ اس کے مطیع کی، جیسا کہ واقعہ ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۲۰، ۲۱)

دوسرے دعوے کا علمی جواب - دلیل کم نظری

دوسرے دعوے کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ پنڈت دیانند کے نزدیک آغازِ فطرت سے قیامت تک دنیا میں پیدا ہونے والی تمام روحوں کی تعداد ساڑھے چار ارب سے زیادہ غالباً اس لیے نہیں ہے کہ اس سے زیادہ کا تصور ان کے خیال میں انسان کے لیے اس کے محدود ذہن اور تنگ دائرہ رسائی وادراک کے پیشِ نظر مبالغہ آمیز اور حیرت انگیز ہے، حالاں کہ خدائے ذوالجلال کی حقیقی عظمت وشوکت جاہ وجلال اور سطوت وجبروت کے پیشِ نظر اس کی صرف ذی روح مخلوقات کا کھربوں کی تعداد میں ہونا حقائق شناسوں کے نزدیک کسی بھی طرح حیرت ناک اور تعجب خیز نہیں۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کنویں کا مینڈک اپنے کنویں سے بڑے کسی اور کنویں اور تالاب کا تصور نہیں کر سکتا، کیوں کہ اس کے نزدیک دنیا اسی تنگ و تاریک کنویں سے عبارت ہوتی ہے جس میں اس کے روز و شب بسر ہوتے ہیں۔ اور اس سے کسی وسیع تر کنوئیں کا وجود و تصور اس کے نزدیک محال ہوتا ہے یا مثلاً کوئی ایسا انسان جس نے پوری زندگی کسی ایسی جگہ گذار دی ہو جہاں اسے کبھی نہ کسی ندی اور تالاب کے دیکھنے کا موقع ملا ہو اور نہ ہی اس سلسلے میں اس کو کسی طرح کی معلومات حاصل ہو سکی ہوں۔ اب اگر ایسے انسان کے سامنے بڑی بڑی ندیوں کی منظر کشی کی جائے، ان کے مد و جزر اور طغیانیوں کا ذکر ہو، تو یقیناً اپنی محدود معلومات و مشاہدات کی روشنی میں وہ ان ندیوں کے وجود کو شک کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے ان پر یقین کرنے کے لیے بہ آسانی تیار نہ ہوگا۔ اور اگر اس کے سامنے ناپیدا کنار دریاؤں، سمندروں، اور خلیجوں کا ذکر ہو، ان پر محوِ سفر قوی ہیکل بحری جہازوں اور ان کی تہوں میں زیر آب زندگی گذارنے والی عظیم الجثہ مچھلیوں اور دیگر آبی و دریائی مخلوقات کا بیان ہو، تو شاید وہ ان سب کے وجود کو از قبیل محالات سمجھنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔ لیکن انہی چیزوں کا تذکرہ اگر موجودہ دور کے کسی واقفِ کار شخص کے سامنے کیا جائے یا ایسے شخص کے سامنے جو خود بحری جہازوں کے ذریعہ سمندروں اور دریاؤں کے سینے پر ہفتوں مہینوں سرگرم سفر رہ چکا ہو، تو وہ کسی بھی طرح کی حیرت و استعجاب کے اظہار کے بغیر فوراً آمادۂ قبول و یقین نظر آئے گا۔

بالکل اسی طرح ممکن ہے کہ کچھ محدود اور سطحی ذہن و نظر رکھنے والوں کے نزدیک خدا کی ذی روح مخلوقات کا ساڑھے چار ارب سے زیادہ ہونا، اسی طرح خلافِ عقل و واقعہ اور مبالغہ آمیز معلوم ہو، جس طرح کنویں کے مینڈک کے نزدیک اس کے اپنے تنگ و تاریک کنوئیں سے وسیع تر کسی کنویں اور تالاب کا وجود و تصور خلافِ واقعہ اور حیرت انگیز ہوتا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جو حقائق شناس ہیں، اور جنہوں نے کائنات اور اس کے نظام کا بغور مطالعہ و مشاہدہ کر کے ثابت کیا ہے کہ بعض غیر محسوس اور نظر نہ آنے والے مادّے بھی ہزاروں لاکھوں ذی روح اجزاء پر مشتمل ہوتے ہیں، ان کے نزدیک خدا کی ذی روح مخلوقات کا کھربوں کی تعداد میں بیک وقت موجود رہنا، باعثِ حیرت نہیں، واقعہ اور عین حقیقت ہے۔ بلکہ صحیح بات تو یہ ہے کہ جیسا کہ الزامی جواب کے تحت بتایا گیا، ابتدائے

آفرینش سے قیامت تک پیدا ہونے والی تمام ارواح کا صرف ساڑھے چار ارب ہونا، خدا کی عظمت اور بے پناہ قدرت وقوت کے پیش نظر خلاف عقل اور مہمل ہی نہیں، مشاہدہ اور بداہت کی رو سے خلاف واقعہ بھی ہے۔

تیسرے دعوے کا علمی جواب۔ تناسخ کی بحث

پنڈت دیانند کے مذکورہ اعتراض کا تیسرا حصہ تناسخ سے متعلق تھا۔ جس میں انہوں نے جزا وسزا کے اسلامی عقیدے کو رد کرتے ہوئے تناسخ کے صحیح اور معقول ہونے کا دعویٰ کیا تھا۔ اس دعوے کا الزامی جواب نہایت مختصر انداز میں اوپر آچکا ہے اب اس کا تحقیقی جواب دیتے ہوئے ذیل میں اس پر قدرے تفصیلی روشنی ڈالی جارہی ہے۔

اس سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی نکتہ، جسے تناسخ کے رد میں کی گئی ہماری آنے والی پوری بحث وگفتگو کا حاصل بھی کہا جاسکتا ہے، یہ ہے کہ ہمارے نزدیک تناسخ اور آواگون کے نظریے کے ثبوت وصحت کی نہ کوئی نقلی دلیل موجود ہے نہ عقلی، اور ظاہر ہے کہ ایسا کوئی بھی عقیدہ ونظریہ، جس کے ثبوت پر عقل ونقل میں سے کوئی بھی شاہد نہ ہو، کسی طرح قابل قبول نہیں ہوسکتا۔ کیوں کہ مسلمہ طور پر کسی بھی نظریے اور عقیدے کا ثبوت، خواہ اس کی بنیاد دینی ہو یا غیر دینی، عقل ونقل کی دو دلیلوں کے علاوہ کسی تیسری دلیل سے ممکن نہیں۔ ذیل میں ہم یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ تناسخ کا نظریہ عقلاً ونقلاً کسی طرح ثابت نہیں اور عقلی ونقلی دلائل سے نہ ثابت ہونے والے ہر دعوے کی طرح تناسخ کا دعویٰ وعقیدہ بھی ہمارے نزدیک مہمل اور ناقابل قبول ہے۔ (انتصار الاسلام)

تناسخ اور دلیل نقلی

چنانچہ جہاں تک تناسخ کے نقلاً ثابت ہونے کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں پہلی بات تو یہ ہے کہ تناسخ کے نقلاً ثابت ہونے کا مطلب اس نظریے کا ان چار ویدوں میں سے کسی ایک میں موجود ومذکور ہونا ہے، جو اس کے ماننے والے ہندوؤں کے نزدیک نقل اور کلام الٰہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ انکا کوئی بھی مذہبی اور الہامی کتابوں میں اس کا ذکر نہ

ہو۔ اس نقطہ نظر سے اگر تناسخ کے نقلاً ثابت ہونے نہ ہونے پر غور کیا جائے، تو کئی منطقی سوالات اُبھر کر سامنے آتے ہیں۔

پہلا سوال تو یہی کہ تناسخ کا ذکر ان چاروں ویدوں میں کہیں ملتا بھی ہے یا نہیں؟ اور دوسرا، جو پہلے سوال سے بھی زیادہ اہم اور اس نظریے کی صداقت کے لیے بنیادی حیثیت کا حامل ہے، اور اسی سوال اور نکتے کو ہم اصل مرکزِ بحث بھی بنائیں گے، یہ ہے کہ اگر ان ویدوں میں کہیں اس نظریہ کا ثبوت وتذکرہ مل بھی جائے تو سوال یہ ہے کہ کیا اس کی وجہ سے واقعتاً اس کا نقل اور وحی الٰہی سے ثابت ہونا لازم آتا ہے کہ نقلاً ایک ثابت شدہ خدائی فرمان کی حیثیت سے اسے ماننا اور اس پر عقیدہ وایمان رکھنا ضروری ہو؟

کیا ویدوں کی تعلیمات الہامی ہیں؟

اس سلسلے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر ویدوں میں بالفرض کہیں تناسخ اور آواگون کے عقیدے کا ذکر مل بھی جائے، تب بھی اس کا الہامی حکم اور خدائی فرمان ہونا ثابت نہیں ہوتا اور اس کی کئی وجوہ ہیں: پہلی وجہ تو یہ ہے کہ یہاں سرے سے کوئی بھی ایسی پختہ دلیل موجود نہیں جس سے ان چاروں ویدوں کا یا ان میں سے کسی ایک کا بھی خدائی اور الہامی کتاب یا وحی الٰہی ہونا سمجھ میں آئے۔ ان چاروں ویدوں کو شروع سے اخیر تک دیکھنا چاہئے کہیں بھی کوئی ایسا لفظ نہیں ملے گا، جس سے ان کے کلام خدائی اور وحی الٰہی ہونے کی نشان دہی ہو اور نہ کہیں یہ ذکر ملے گا کہ برہما جی جو ان کے معلم اوّل ہیں، خدا کے رسول اور پیغمبر اور رسول ہیں اور نہ یہ کہ وید وحی الٰہی ہیں۔ پھر کیسے اور کس دلیل سے ویدوں کا کلام الٰہی ہونا ثابت کیا جائے کہ جس کے نتیجے میں اس میں مذکورہ ہر بات، کلام خداوندی اور منشائے الٰہی ہونے کی وجہ سے واجب التسلیم والایمان ہو!!

اور اگر یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ ویدوں میں غیر خدا کی پرستش کا حکم بھی وارد ہے، تو پھر ان کا کلام الٰہی نہ ہونا یقینی یا کم از کم ان کا وحی خداوندی ہونا مشکوک تو ہو ہی جاتا ہے۔ کیوں کہ غیر خدا کی عبادت کی تعلیم، ترغیب اور حکم پر مشتمل ہونے کے باوجود انہیں اگر کلام خداوندی سمجھا جائے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اپنے بندوں کو ایک نااہل اور غیر مستحق کی عبادت کا حکم دے رہا ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ معلوم ومشہور ہے، عبادت کا مدار ملکیتِ نفع وضرر

پر ہوتا ہے۔ جس ذات میں یہ شرط پائی جائے وہ تمام مخلوقات کے نفع وضرر پر قادر اور ان کی مالک ہو۔ وہی حقیقتاً سزاوار عبادت بھی ہوتی ہے اور یہ شرط چوں کہ صرف ذاتِ خداوندی میں پائی جاتی ہے، اس لیے معبود مسجود بننے کی مستحق بھی صرف خدا کی ذات ہی ہوگی۔ پھر صرف خدا کی ذات میں اس شرط کے پائے جانے کی وجہ یہ ہے کہ صرف اس کا وجود ذاتی اور خانہ زاد ہونے کی وجہ سے تمام مخلوقات کے وجود کا سرچشمہ ہے اور اس لیے تمام مخلوقات وموجودات کے وجود عدم اور نفع وضرر پر بھی صرف اسی کو مکمل ومختار صرف خدا ٹھہرا، تو اس کے نتیجے میں کی جانے والی عبادت واطاعت کا مستحق بھی صرف وہی ہوگا۔ لہٰذا اب اگر خدا کے علاوہ کسی اور کو بھی مستحق عبادت سمجھا جائے، تو چوں کہ عبادت کا مستحق صرف وہ ہوتا ہے جس کا وجود ذاتی اور خانہ زاد ہو؛ اس لیے لازمی طور پر اس غیر کے وجود کو بھی خانہ زاد اور ذاتی کہنا پڑے گا۔ حالاں کہ یہ ایک خلافِ واقعہ بات ہے، کیوں کہ جیسا کہ آئندہ آپ کو معلوم ہوگا کہ خدا کے علاوہ کسی کا وجود بھی ذاتی اور خانہ زاد نہیں ہے، بلکہ آئندہ تمام موجودات کا وجود عارضی ہوتا ہے، جس کا سرچشمہ اصلی خدا کا ذاتی وجود ہے۔ غرض، خدا کے علاوہ نہ کسی کا وجود ذاتی ہے اور نہ ہی اس کے علاوہ کوئی مستحق عبادت ہے۔ اب اگر شرک اور غیر خدا کی پرستش کی تعلیم اور حکم پر مشتمل ہونے کے باوجود ویدوں کو خدائی کلام کہا جائے، تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ خدا ایک نااہل کو اہل سمجھ کر اس کی عبادت کا حکم اپنے بندوں کو دے رہا ہے۔ حالاں کہ خدا کے عام الغیب ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں کہ وہ ایک نااہل اور غیر مستحق کو اہل اور مستحق سمجھ کر اس کی عبادت کرنے کا حکم صادر نہیں ہوسکتا، تو جس کتاب میں اس کا حکم وتذکرہ موجود ہو، وہ کیوں کر خدا کی کتاب ہوسکتی ہے؟ نتیجہ یہ نکلا کہ غیر خدا کی پرستش کے حکم پر مشتمل ہونے کی وجہ سے ویدیا تو سرے سے کلام خداوندی ہی نہیں اور اگر ہیں تو لازمی طور پر تحریف وترمیم کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور ان دونوں صورتوں میں ان سے ثابت شدہ کسی نظریے اور عقیدے کو حتمی طور پر ماننا اور ان پر ایمان لانا، عقلاً صحیح نہیں ہوگا۔

حاصل یہ کہ ویدوں کے شرک جیسے مخالفِ واقعہ حکم وتعلیم پر مشتمل ہونے کا منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ یا تو وہ سرے سے کلام الٰہی ہی نہیں ہیں یا اصلاً وہ کلام الٰہی رہے ہوں گے مگر بعد میں شرک وغیرہ حقیقی تعلیمات واحکام ان میں داخل کر کے انہیں تحریف کے عمل سے

دوچار کر دیا گیا جس کی وجہ سے ان کی اصل خدائی تعلیمات وہدایات مشکوک و مشتبہ ہو گئیں۔ اور ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت کے مطابق اگر وہ کلام الٰہی نہ ہوں تب تو ظاہر ہے، دوسری صورت میں بھی ان سے ثابت شدہ کسی حکم عقیدے اور تعلیم کے خدائی اور الہامی ہونے کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اگر ان میں تناسخ اور آواگون کا ذکر ہو، تب بھی اس نظریے کو صحیح نص خداوندی سے ثابت نہ ہونے اور یقینی طور پر اس کے الہامی نہ ہونے کی وجہ سے نقلاً ثابت شدہ نہیں سمجھا جا سکتا اور اس پر ایمان واعتقاد ضروری نہیں ہوتا۔ اس طرح ہمارا یہ دعویٰ ثابت ہو جاتا ہے کہ تناسخ کے ثبوت کی کوئی صحیح نقلی دلیل موجود نہیں (انتصار الاسلام، ص: ۲۲)۔

تناسخ عقل کی روشنی میں

جہاں تک ہمارے اس دعوے کا تعلق ہے کہ تناسخ کی کوئی عقلی دلیل بھی موجود نہیں ہے، تو اس پر بحث کرتے ہوئے ذیل میں ہم پہلے یہ بتائیں گے کہ اسے ثابت کرتے ہوئے بڑی سے بڑی کیا عقلی دلیل پیش کی جاتی یا کی جا سکتی ہے، اور پھر بالترتیب عام فہم اور علمی وتحقیقی دونوں طرح سے اس دلیل کا رد کرنے اور اس کا جواب دینے کی کوشش کریں گے۔ لیکن دلیل اور جوابِ دلیل کی بحث سے قبل یہ بتا دینا بہتر ہوگا کہ جہاں تک تناسخ کے سلسلے میں پنڈت دیانند کے دعوے کا تعلق ہے تو اس کے رد کے لیے ہمیں الگ سے کسی بحث وگفتگو کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ جیسا کہ اعتراض کی تقریر سے واضح ہے، مدعی نے اصلاً ارواح کے ساڑھے چار ارب کی تعداد میں منحصر ہونے کا دعویٰ کیا تھا اور پھر اس بنیاد پر تناسخ وآواگون کے نظریے کی عمارت قائم کرتے ہوئے کہا تھا کہ یہی ساڑھے چار ارب ارواح آغاز کائنات سے ابد تک مختلف جان داروں کا چولا بدل بدل کر آتے جاتے رہے ہیں اور رہیں گے، اور اسی آمد ورفت سے کائنات کا نظام اور اس کے نقشے پر موت وحیات کا کھیل جاری رہے گا۔ اوپر ہم نے وضاحت سے بتا دیا ہے کہ ارواح کے صرف ساڑھے چار ارب میں محدود ومنحصر رہنے کا نظریہ کس قدر غلط اور ناقابل قبول ہے اور جب اس مقدار کا عقلی طور پر غلط اور مہمل ہونا واضح ہو گیا۔ تو اس پر قائم کردہ نظریۂ تناسخ کی عمارت کس طرح باقی رہ سکتی ہے۔

تناسخ کی ممکنہ عقلی دلیل

تناسخ کو عقلاً ثابت کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی باشعور زندگی کا اکثر یا پورا حصہ زہد وتقویٰ اور عبادت وریاضت کی حالت میں گذارتے ہیں اور پھر بھی ہمہ وقت پریشان حال اور معاشی نقطہ نظر سے تنگ دست رہتے ہیں۔ دوسری طرف ایسے لوگوں کو بھی کمی نہیں جو اپنی زندگی کا پورا یا اکثر وبیشتر حصہ فسق وفجور اور خدا کی نافرمانی اور سرکشی میں گذارتے ہیں، اور اس کے باوجود ان کی خوش حال اور عیش وعشرت کی زندگی پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سوال یہ ہے کہ صالح اور زہد وعابد حضرات، بہ ایں ہمہ صلاح وزہد وتقویٰ، تنگ دست اور پریشان کیوں رہتے ہیں اور ان کے مقابلے میں یہ فساق وفجار بہ ایں فسق وفجور عیش وعشرت کے مزے کیوں لوٹتے ہیں؟ اگر کہا جائے کہ ایک کی پریشانی اور دوسرے کی خوش حالی فی الحقیقت ان کے اپنے اپنے عمل اور کردار کا پھل اور اس کی سزا یا جزا ہے، تو سوال یہ ہوگا کہ انہیں ان کے کس عمل اور کردار کی سزا وجزا پریشانی اور خوشحالی کی شکل میں دی جارہی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ان کی پریشانی یا خوش حالی کو ان کی موجودہ زندگی کے اعمال کی سزا یا جزا قرار دیں، کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو معاملہ برعکس ہوتا اور زاہد وصالح کو اس کے زہد وصلاح کے پیش نظر خوش حالی میسر ہوتی اور فاسق وفاجر کو اس کے فسق وفجور کی سزا تنگ دستی کی شکل میں دی جاتی اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ اس تنگ دستی وخوش حالی کو کسی آئندہ زندگی میں انجام پانے والے اچھے یا برے عمل کا نتیجہ اور پھل قرار دیا جائے، کیوں کہ جرم کے ارتکاب سے قبل کسی پر اس کی سزا لاگو کرنا یا اچھا عمل انجام دینے سے پہلے اس پر انعام واکرام سے نوازنا بھی ایک غیر معقول رویہ ہے اور جب مذکورہ صورتوں میں انسانوں کے آرام وتکلیف اور خوش حالی وتنگ دستی کو نہ ان کی موجودہ زندگی کے اچھے برے اعمال کا نتیجہ قرار دیا جاسکتا ہے اور نہ ان کی کسی آئندہ زندگی کے اچھے برے اعمال کا پھل قرار دیا جاسکتا ہے، تو اب صرف یہی صورت باقی رہتی ہے کہ اس خوش حالی اور تنگ دستی کو ان کی کسی گذشتہ زندگی کے اچھے برے اعمال کا پھل اور ان کی جزا وسزا سمجھا جائے۔ اور کہا جائے کہ اگر کسی کو زاہد وصالح کا انعام تو اسے اس کی اگلی زندگی

میں خوشحالی و فارغ البالی کی شکل میں ملے گا، جب کہ اس کی موجودہ تنگ دستی اور پریشانی اس کے پچھلے جنم کے برے اعمال کی سزا ہے۔ اسی طرح اگر دیکھو کہ کوئی شخص فاسق و فاجر اور بدکار ہونے کے باوجود تونگری اور خوشحالی کی نعمت سے بہرہ ور ہے، تو یہاں بھی یہی سمجھو کہ اس شخص کو اس کے اچھے اور صالح اعمال کی جزا اور انعام ہے اور اسی کا نام تناسخ ہے۔ اس طرح عقلاً تناسخ آواگون کا نظریہ و عقیدہ ثابت ہو جاتا ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۲۳)

تناسخ کے خلاف عقل ہونے کی پہلی وجہ

ہمارے خیال سے تناسخ کو عقلاً ثابت کرتے ہوئے عمدہ سے عمدہ جو دلیل دی جا سکتی ہے۔ وہ قریب قریب یہی ہوگی جو اوپر مذکور ہوئی۔ لیکن اس دلیل کا اگر قدرے گہرائی سے جائزہ لیا جائے تو اس کا لچر اور کمزور ہونا اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ مدعی نے یہ فرض کر لیا کہ راحت و تکلیف صرف جزا و سزا کے دائرے میں ہی منحصر ہے، اس سے ہٹ کر جزا و سزا کے علاوہ کسی اور حیثیت سے راحت و تکلیف کا وجود میں آنا ممکن نہیں۔ اور چوں کہ یہ فرض کر لیا گیا کہ راحت و آرام اور عیش و مسرت صرف اچھے اعمال کی جزا اور تکلیف و اذیت اور پریشانی و تنگ دستی صرف برے اعمال کی سزا کے طور پر ہی وجود پذیر ہو سکتی ہیں۔ اس لیے جب انسانوں کو راحت و تکلیف سے دوچار ہوتے ہوئے دیکھا گیا تو اس مفروضے کی بنا پر ان اچھے برے اعمال کی تلاش شروع ہو گئی، جن سے انہیں مربوط کیا جا سکے۔ اور چوں کہ جیسا کہ گزرا انسان کی موجودہ یا آئندہ کسی زندگی کے اچھے برے اعمال سے جزا و سزا کی حیثیت سے اس راحت و تکلیف کو متعلق کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے مجبوراً یہ بھی فرض کیا گیا کہ ضرور ان کی کوئی پچھلی زندگی ہوگی جس میں انہوں نے اچھے برے کام کیے ہوں گے اور ابھی اچھے یا برے کام سرزد ہوں گے ان کی جزا یا سزا انہیں اگلی زندگی میں ملے گی اور اس طرح تناسخ کا نظریہ وجود میں آیا۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ راحت و تکلیف اور خوش حالی اور پریشانی کے جزا و سزا کے دائرے میں منحصر اور اس کے ساتھ متعلق و مشروط ہونے کا مفروضہ ہی سراسر غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ بے شمار مثالیں ایسی موجود ہیں، جن میں کسی کو راحت و تکلیف اور مسرت اور اذیت کے خوشگوار یا اذیت ناک مرحلوں سے جزا و سزا کی وجہ سے نہیں، دیگر وجوہ سے گزارا جاتا ہے۔ مثلاً اگر یک بامروّت

اور رحم دل انسان کسی حاجت مند مسافر کی مدد کرتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس امداد و اعانت کے پس پشت انسانی ہمدردی اور دست گیری کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے، یہاں یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ امداد کے ذریعہ ایک نا آشنا مسافر کو راحت پہنچا کر دراصل اس کے کسی حسن خدمت کی جزا اور اس کا صلہ وانعام دے رہا ہے۔ اسی طرح اگر جراح اور طبیب اپنے مریضوں کو قدرے تکلیف میں مبتلا کر کے علاج کرتے ہوئے ان کا آپریشن کرتے اور انہیں کڑوی دوائیں پلاتے ہیں، تو یہاں بھی یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ مریض کو تکلیف پہنچا کر طبیب دراصل اسے اس کے کسی جرم و گناہ کی سزا دینے کی کوشش کرتا ہے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس جگہ اذیت کا سبب علاج و معالجہ ہے، سزا نہیں۔ یا مثلاً والدین یا مربی اور نگراں حضرات بچوں کو تعلیم و تربیت کی غرض سے اگر مارتے پیٹتے اور زجر و توبیخ سے کام لیتے ہیں تو ظاہر ہے کہ اس زجر و توبیخ اور مار پیٹ کی وجہ سے بچوں کو پہنچنے والی ظاہری تکلیفوں اور اذیتوں کو ان کے کسی جرم و گناہ کی پاداش اور سزا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ اس کی اصل وجہ تعلیم و تربیت قرار پائے گی۔ غرض ان مذکورہ تین مثالوں میں سے کسی میں بھی راحت و تکلیف جزا و سزا کی حیثیت نہیں پائی جا رہی ہے اور نہ ہی کسی میں راحت رسانی یا ایذا رسانی کے پس پشت جزا و سزا کا تصور یا جذبہ کارفرما ہے۔ بلکہ جیسا کہ عرض کیا گیا کہیں ہمدردی اور اخوت کا جذبہ اصل محرک ہے، کہیں علاج و معالجے کی حیثیت عامل اور کہیں تعلیم و تربیت کا نقطہ نظر کارفرما ہے۔

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ راحت و تکلیف کے جزا و سزا کی حیثیت میں منحصر ہونے کا مفروضہ ہی غلط اور خلافِ واقعہ ہے۔ اور جب یہ مفروضہ غلط ٹھہرا تو اس بنیاد پر قائم کی گئی نظریہ تناسخ کی عمارت کس طرح برقرار رہ سکتی ہے؟

اگر کہا جائے کہ مذکورہ مثالوں کی روشنی میں نظریہ تناسخ کا ابطال صحیح نہیں کیوں کہ ان سے صرف یہ سمجھ میں آتا ہے کہ انسان کے حوالے سے راحت و تکلیف کو جزا و سزا کے دائرے میں منحصر کرنا صحیح نہیں کیوں کہ وہ ایک دوسرے کو بسا اوقات جزا و سزا کے علاوہ جذبۂ ہمدردی، علاج و معالجہ اور تعلیم و تربیت کی وجہ سے بھی راحت و تکلیف میں مبتلا کرتے ہیں۔ ان میں یہ ثابت نہیں ہوتا کہ خدا کے ہاں بھی راحت و تکلیف جزا و سزا کے دائرے میں منحصر نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارا یہ دعویٰ ہنوز قائم ہے کہ رنج و راحت پہنچانے کا خدائی عمل صرف جزا و سزا کے دائرے میں منحصر ہوتا ہے، جزا و سزا کے علاوہ کسی اور وجہ سے خدا کسی کو بھی کبھی

رنج وراحت کے مرحلے سے نہیں گزارتا۔ اور اس بنیاد پر قائم کیا گیا تناسخ کا نظریہ بھی اپنی جگہ ثابت وقائم ہے۔ اگر یہ اعتراض کیا جائے تو اس کا یہ جواب دیا جائے گا کہ اگر مذکورہ تاویل صحیح مان لی جائے، تو نتیجتاً بعض اوصاف میں بندے خدا سے بڑھ جائیں گے اور خدا کے بہت سے اوصاف مجمل اور بے معنی ہو کر رہ جائیں گے ظاہر ہے کہ اگر انسانوں کے بارے میں تو یہ وسعت اور ہمہ گیری روا رکھی جائے کہ ان کے لیے راحت وتکلیف پہنچانے کا عمل جزا وسزا کے دائرے میں منحصر نہیں ہے اور وہ جزا سزا کے علاوہ، تعلیم وتربیت، چارہ سازی ومسیحائی، اصلاح وتزکیہ سخاوت ومروت اور ہمدردی ودردمندی کے پیش نظر بھی ایک دوسرے کو راحت وتکلیف میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ اور خدا کے بارے میں یہ شرط اور قید لگا دی جائے کہ وہ صرف جزا وسزا کے طور پر ہی اپنے بندوں کو رنج وراحت میں مبتلا کر سکتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ بندوں میں تو سخی، رحم دل اور مصلح ومربی ہونے کے اوصاف موجود ہیں اور وہ ان سے کام لیتے ہوئے حسب ضرورت لوگوں کو راحت یا تکلیف بھی پہنچاتے ہیں لیکن خدا میں سخی، رحیم وکریم، قاضی الحاجات ربّ العالمین اور مصلح ومربی ہونے کے اوصاف یا تو سرے سے ہیں ہی نہیں یا ہیں مگر اتنے معطل اور مہمل ہیں کہ ان کے تحت وہ کوئی بھی کام انجام نہیں دے سکتا۔ اور حقیقتاً اس کی حیثیت ایک سخت گیر داروغہ یا کرسی عدالت پر بیٹھے ہوئے اس منصفِ محض سے زائد نہیں ہے، جس کا کام صرف مجرموں اور خطا کاروں کو سزا دے کر انجام بد تک پہنچانا اور نیک اور مستحق انعام لوگوں کو انعام واکرام سے نوازنا ہوتا ہے گویا جزا وسزا کے تنگ دائرے سے باہر نکل کر انسانوں کی طرح کسی اور جذبہ سے کسی کو راحت یا نقصان پہنچانا خدا کے بس اور اختیار سے باہر ہے۔ ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ تصور شانِ خدائی کو کس قدر زیب دیتا ہے!! (انتصار الاسلام، ص: ۲۳)

دوسری وجہ

دوسری وجہ یا دوسری دلیل جس سے آواگون اور تناسخ کے نظریے کا غلط اور باطل ہونا سمجھ میں آتا ہے یہ ہے کہ اس نظریے کے ماننے والوں کے عقیدے کے مطابق سزا اور جزا کا مقصد برے اعمال سے بچنا، مکتی یعنی نجات پانا اور اچھے اعمال کی طرف رغبت دلانا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سزا اور جزا کا مقصد صرف یہ ہے کہ سزا یافتہ انسان آئندہ ان برے

کاموں سے بچنے کی کوشش کرے جن کے سبب سزا کے طور پر اسے تکلیف اور عذاب کے مرحلے سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے اور انعام یافتہ شخص ان اچھے کاموں کی طرف مزید راغب ہو جن کی وجہ سے اسے راحت و آرام اور انعام و اکرام کا مستحق سمجھا گیا اور ظاہر ہے کہ سزا و جزا کا یہ مقصد اس وقت تک صحیح معنوں میں حاصل نہیں ہو سکتا جب تک سزا و جزا کے مستحق شخص کو اپنے گذشتہ اعمال یاد نہ ہوں اور یہ پتہ نہ ہو کہ اس کے سابقہ اعمال و افعال میں سے کون سا عمل وجہ عذاب و عتاب یا کون سا فعل سزاوار انعام و اکرام قرار پایا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اگر غور کیا جائے تو دنیا میں کوئی شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جسے اپنی کسی پچھلی زندگی اور اس میں اس کے ہاتھوں انجام پانے والے اچھے یا برے عمل کے بارے میں کچھ بھی یاد نہ ہو۔ لہٰذا ایسی صورت میں خود نظریہ تناسخ کے ماننے والوں کے نزدیک اس نظریے کا اور اس کے مطابق سزا و جزا کے عمل کا جو مقصد ہے یعنی سزا کی صورت میں عبرت پذیری اور اس کے نتیجے میں برے اعمال سے نفرت و پرہیز اور جزا کی صورت میں اچھے کاموں کی طرف رغبت و دلچسپی کا جذبہ پیدا ہونا وہ حاصل نہیں ہوتا اور نتیجتاً یہ عقیدہ و نظریہ بے مقصد اور مہمل ہو کر رہ جاتا ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۲۴-۲۵)

یہاں یہ بھی سمجھتے چلیں کہ جزا و سزا کے وقت گذشتہ اعمال کا یاد رہنا تناسخ و آواگون کے ماننے والوں کے نزدیک جتنا ضروری ہے اسلامی نقطہ نظر سے اتنا ضروری نہیں کیوں کہ دونوں نقطہ ہائے نظر میں خود جزا و سزا کی اصل حیثیت میں ہی بنیادی اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ جیسا کہ گذرا، نظریہ تناسخ کے ماننے والوں کے نزدیک اصل مقصد جزا و سزا نہیں ہوتا، بلکہ اس کے نتیجے کے طور پر حاصل ہونے والی وہ کیفیت مطلوب ہوتی ہے جو اعمال بد سے اجتناب اور اعمال خیر کی طرف رغبت و لگاؤ کے حوالے سے پیدا ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اعمال بد سے نفرت و اجتناب اور اعمال خیر کی طرف رغبت و لگاؤ کا مذکورہ جذبہ اس وقت تک پیدا نہیں ہو سکتا جب تک جزا و سزا کے وقت وہ اچھے اور برے اعمال یاد نہ ہوں، جن کی وجہ سے جزا و سزا کا یہ عمل لازم ہوا۔ اس کے مقابلے میں اسلامی نظریے کے مطابق گذشتہ اعمال کا یاد رہنا اتنا ضروری اس لیے نہیں کہ یہاں جزا و سزا کے سلسلے میں اس قسم کا کوئی تصور ہی نہیں کہ اسے رغبت یا عبرت دلا کر آئندہ کی کسی زندگی کو سنوارنا مطلوب

ہوتا ہو۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے جزا وسزا بہ ذات خود مقصود بالذات ہوتی ہے، کسی دوسری چیز کا وسیلہ اور ذریعہ نہیں ہوتی کہ اس کے حصول کے لیے گذشتہ اعمال کا یاد رہنا ضروری قرار دیا جائے۔ بلکہ تناسخ کے نظریے کے برعکس اسلام کی تعلیمات کے مطابق دنیا ہی میں لوگوں کو اچھائی اور برائی کے انجام سے آگاہ کر دیا گیا اور اسی کی روشنی میں ہمیشہ ہمیش کی زندگی کے لیے دوزخ و جنت کی تعیین کر دی گئی، وہاں پہنچ جانے کے بعد کسی اور ایسی آئندہ دنیوی زندگی کا قصہ ہی ختم ہو جائے گا۔ جہاں اصلاح احوال یا نجات پانے کے لیے مزید کوششوں کی ضرورت ہو۔

اسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ تناسخ کا نظریہ رکھنے والوں کے نزدیک جزا وسزا کو آئندہ زندگی میں اعمال بد سے بچانے، اور اعمال خیر کی طرف راغب کرنے میں اسی طرح وسیلہ اور ذریعہ کی حیثیت حاصل ہے جس طرح کھانے پکانے کے ساتھ چولہا لکڑی برتن وغیرہ اصل کھانا اور روٹی کے حصول کے لیے وسیلہ اور ذریعہ حیثیت رکھتے ہیں، اس کے برعکس مسلمانوں کے نزدیک جزا وسزا ہی آخری منزل ہوتی ہے، کسی دوسری چیز کے حصول کا وسیلہ اور ذریعہ نہیں ہوتی، اسی طرح جس طرح ایک بائع کے لیے اس کے مبیع کی قیمت اور ایک مزدور کے لیے اس کی اُجرت و مزدوری ہی آخری منزل اور اصل مطلوب و مقصود ہوتی ہے۔ اور جس طرح بائع کے لیے مبیع کی قیمت اور مزدور کے لیے اجرت و مزدوری مل جانے کے بعد یہ یاد رکھنا چنداں ضروری نہیں ہوتا کہ یہ قیمت اور یہ اجرت و مزدوری کیوں کر حاصل ہوئی اور نہ اس یاد رکھنے کا کوئی فائدہ ہوتا ہے، اسی طرح اسلامی نقطہ نظر سے جزا وسزا کی آخری منزل پر پہنچ جانے اور جنت و دوزخ میں داخل ہو جانے کے بعد ایک انسان کے لیے یہ یاد رکھنا کچھ زیادہ ضروری اور مفید نہیں کہ کن اعمال کی بدولت اور کن مراحل سے گزرنے کے بعد اسے یہاں تک رسائی ملی! (انتصار الاسلام، ص: ۲۵)

عہد الست پر ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں بظاہر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ تناسخ کا نظریہ اگر محض اس وجہ سے نا قابل قبول ہے کہ دنیا میں کسی کو اپنے گذشتہ اعمال و افعال یاد نہیں تو عہد الست کا نظریہ بھی اس وجہ سے قابل قبول نہیں ہونا چاہیے کہ دنیا میں کسی کو بھی اور کچھ بھی اس کے بارے میں یاد نہیں عہد الست کا

واقعہ کب اور کہاں اور کس طرح پیش آیا، کوئی شخص بھی اس سلسلے میں اپنی یادداشت کی مدد سے کچھ نہیں بتا سکتا، لہٰذا نظریہ نتائج کو گذشتہ طور میں جس بنیاد پر رد کیا گیا اسی بنیاد پر عہد الست کا عقیدہ بھی رد کر دیا جانا چاہیے۔ حالاں کہ اس کے برعکس اس واقعہ کا تذکرہ قرآن شریف میں موجود ہے اور مسلمان اس کے صحیح ہونے کا ایمان وعقیدہ بھی رکھتے ہیں۔

تو اس شبہ کا جواب یہ دیا جائے گا کہ نظریہ تناسخ پر واقعہ عہد الست کو قیاس کرنا صحیح نہیں۔ دونوں کی حیثیتوں میں بنیادی فرق ہے اور اس لیے ان کے احکام بھی مختلف ہیں۔

چنانچہ جیسا کہ بتایا گیا نظریہ تناسخ کا اصل مقصود و مطلوب اس کے ماننے والوں کے نزدیک اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک گذشتہ اعمال وافعال ذہن میں محفوظ نہ ہوں۔ کیوں کہ تناسخ کی حیثیت ایک ایسی جزا وسزا کی ہے، جس کی بدولت انسان کو آئندہ زندگی میں برائی سے بچنا اور اچھائی کا یاد رہنا ضروری ہے۔ اس کے مقابلے میں عہد الست کا معاملہ اور اس کی حیثیت ونوعیت یکسر مختلف ہے۔ جس کے پیش نظر اس سے متعلق جزئیات وتفصیلات کا ذہن میں محفوظ رہنا ضروری نہیں۔ کیوں کہ عہد الست کے واقعے کا تعلق بنیادی طور پر تعلیم وتلقین سے ہے اور سب جانتے ہیں کہ تعلیم میں مقصود صرف علم ہوتا ہے اس کے حصول کی کیفیت اور اس کے زمان ومکان کی کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی۔ علم اگر محفوظ ہو تو اس کی چنداں اہمیت نہیں رہتی کہ وہ کب کس طرح اور کہاں حاصل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے ماہرین علم وفن کو بسا اوقات طالب علمی کے حالات وکوائف اور زمان ومکان سے متعلق تفصیلات وجزئیات صحیح طور پر یاد نہیں رہتیں، لیکن پھر بھی ان کے علم وفضل میں کوئی فرق نہیں آتا، کہ مقصودِ اصلی علم ہے اور وہ اپنی جگہ محفوظ وموجود ہے۔

غرض عہد الست کے واقعے کا حاصل صرف یہ ہے کہ اس کے ذریعہ خدا نے انسانوں کو اپنے رب، معبود اور الٰہ ہونے کی تعلیم وتلقین کی تھی اس لیے دیکھنے کی چیز بھی صرف یہ ہے کہ تعلیم وتلقین کا یہ مقصد کس حد تک پورا ہوا اور اس کا اثر کس حد تک محفوظ وموجود ہے۔ یہ قطعاً غیر ضروری ہے کہ لوگوں میں تعلیم وتلقین کے پائے جانے والے اثر کے علاوہ انہیں اس سے متعلق کیفیات اور زمان ومکان کے بارے میں کچھ یاد ہو۔ چنانچہ اس لحاظ سے انسانی فطرت کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ہر انسان کے یہاں خانہ دل میں اپنے رب، خالق

اور خدا کا تصور کسی نہ کسی حد تک ضرور موجود ہے، یہ دراصل عہد الست کے موقع سے کی گئی اسی خدائی تعلیم و تلقین کا اثر ہے۔ اور عہد الست کی صداقت کے لیے صرف یہی کافی ہے۔

حاصل یہ کہ عہد الست کے اثرات کے پائے جانے کے باوجود اگر لوگوں کو اس واقعے کے تعلق سے کیفیت اور زمان و مکان کی تفصیلات و جزئیات کے بارے میں کچھ یاد نہ ہو، تو اس سے تناسخ کی طرح، عہد الست کے عقیدے کی صحت، صداقت اور معقولیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیوں کہ دونوں کی نوعیتیں بنیادی طور پر مختلف ہیں۔

عہد الست کا عقلی ثبوت

بلکہ حقیقت یہ ہے کہ عہد الست کا واقعہ اور نظریہ مسلمانوں کے نزدیک جس طرح نقلاً یعنی قرآن سے ثابت ہے، اسی طرح عقل بھی اس کے ثبوت پر گواہ ہے کیوں کہ عقلاً ہر مخلوق خصوصاً انسان پر اپنے خالق و مالک کے حقوق کی ادائیگی واجب ہے۔ اور حقوق کی ادائیگی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان کی اطلاع نہ دی جائے اور ان کی ادائیگی کی صحیح تعلیم و تلقین نہ کی جائے۔ اسی طرح یہاں بھی عقل کا تقاضا ہے کہ خالق و مالک نے اپنے بندوں اور مخلوقات کو اپنے حقوق کی ادائیگی کے لیے بھی ضرور تعلیم و تلقین کی ہو اور بتایا ہو کہ وہی ان کا واحد رب، معبود اور خدا ہے، تاکہ وہ اس کے علاوہ کسی دوسرے کی پرستش نہ کرتے ہوئے اس کی ربوبیت اور معبودیت کے حقوق ادا کرتے رہیں۔ اسی تعلیم و تلقین کو اسلامی اور قرآنی اصطلاح میں عہد الست سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس طرح واضح ہوا کہ عہد الست کا تناسخ پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ کیوں کہ اولاً تو دونوں کی نوعیتیں اور دونوں کے احکام مختلف ہیں ثانیاً، اس لیے بھی کہ عہد الست کے ثبوت و صداقت کی شہادت نقل اور عقل دونوں سے ملتی ہے۔ جیسا کہ تناسخ کے نظریے پر نقل یا عقل کسی کی شہادت نہیں ملتی۔ لہٰذا ایک طرف اگر عہد الست کا وقوع پذیر ہونا موافق عقل ہے تو دوسری طرف تناسخ کا نظریہ مخالفِ عقل ہے اور اس کی تائید مذکورہ وجوہ کے علاوہ درج ذیل دو وجوہ سے بھی ہوتی ہے۔ یہ دو وجوہ ان دو وجوہ کے علاوہ ہیں جن کے تحت گذشتہ سطروں میں تناسخ کا مخالفِ عقل ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۲۵-۲۶)

تیسری وجہ - کائنات میں انسان کی حیثیت

تناسخ کے مخالفِ عقل ہونے کی تیسری وجہ قدرے تفصیل سے یوں سمجھئے کہ کائنات اور نظامِ کائنات کی تخلیق کے مقصد پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ اس تخلیق کے اصل مقصد کی حیثیت اہمیت صرف ''عبادتِ خداوندی'' کو حاصل ہے، اور اس مقصد کے فاعل کی حیثیت تمام مخلوقات میں صرف انسان کو حاصل ہے اس کے علاوہ عالم اور نظام عالم سے وابستہ دیگر تمام اشیاء اور مخلوقات و موجودات کی اِس سے زیادہ کچھ حیثیت نہیں کہ وہ عبادتِ خداوندی کے اصل مقصد کی تکمیل کے سلسلے میں اصل فاعل و عامل کی حیثیت کے حامل انسان کے لیے مُعاون ثابت ہوں۔ اِسے مزید وضاحت سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جس طرح کپڑے کے کارخانے کا اصل مقصد ''کپڑے'' کا حصول ہوتا ہے ,,کاری گر، کو اس مقصد کے حصول کے سلسلے میں اصل فاعل کی حیثیت حاصل رہتی ہے اور اس کے علاوہ کارخانہ، اُس کی بڑی بڑی قوی ہیکل مشینیں اور تمام دیگر ساز و سامان اس مقصودِ طعام کا حصول ہوتا ہے، باورچی اور کھانا پکانے والے کو اس مقصدِ اصلی کے حصول کے سلسلے میں اصل فاعل کی حیثیت حاصل رہتی ہے اور اس کے علاوہ باورچی خانہ، اور دیگر تمام متعلقہ ساز و سامان کی حیثیت محض وسیلہ اور ذریعہ کی ہوتی ہے اس طرح کارخانۂ دنیا اور کائنات کی تخلیق کا اصل مقصد عبادتِ خداوندی ہے، اس مقصد کے تعلق سے اصل فاعل کی حیثیت انسان کو حاصل ہے، اور اس کے علاوہ کائنات اور تمام اشیائے کائنات اِس مقصد کے حصول کے لیے ذریعہ اور وسیلہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جس جسے فاعل کی حیثیت سے نواز کر اِنسان کو اس پر مامور کیا گیا ہے کہ وہ قدرت کی طرف سے مسخر کردہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء کو کام میں لاتے ہوئے اور ان سے حسبِ ضرورت فائدہ حاصل کرتے ہوئے ,,عبادتِ خداوندی،، کے اِس اصل مقصد کی تکمیل کا فریضہ انجام دے۔

یہاں اگر یہ سوال کیا جائے کہ یہ کیوں ضروری ہے کہ انسان کو عبادتِ خداوندی کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے میں اصل فاعل و عامل کی حیثیت کا حامل سمجھا جائے، یہ کیوں ممکن نہیں کہ فاعل ہونے کے بجائے یہ بھی دیگر اشیائے کائنات کی طرح مِن جُملۂ اَسباب و آلات ہو؟ تو جواب یہ دیا جائے گا کہ اگر آپ کائنات کی تمام چیزوں پر غور کریں تو معلوم

ہوگا کہ وہ سب تو کسی نہ کسی حیثیت سے انسانوں کے لیے منفعت بخش ہیں، مگر خود انسان ان میں سے کسی کے لیے زیادہ مفید اور کارآمد نہیں ہے۔ چناں چہ سب جانتے ہیں کہ زمین، پانی ہوا، آگ، سورج اور دیگر جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ کا وجود انسان کے لیے اس حد تک ضروری اور نفع بخش ضرور ہے کہ ان کے بغیر اس کے لیے معمول کی زندگی گزارنا محال یا دشوار ہے۔ لیکن خود انسان کا وجود کسی بھی مخلوق کے لیے اتنا ضروری اور مفید نہیں کہ اس کے بغیر اُس کی زندگی اور بقاء دشوار یا محال ہو جائے۔ لیکن جس طرح یہ واضح ہے کہ انسان کسی نہ کسی حیثیت سے اور کسی نہ کسی کے لیے کارآمد ضرور ہے۔ کیوں کہ انسان کا بالکل نکما ہونا اور کسی کے لیے بھی کارآمد نہ ہونا اُس کے اُس بلند رُتبے اور مقام کے خلاف ہے، جو اسے اشرف المخلوقات اور خلیفۃ اللہ فی الارض کی حیثیت سے حاصل ہے۔ غرض یہ طے شدہ ہے کہ انسان کا وجود کسی نہ کسی کے لیے کارآمد ضرور ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ مخلوقات میں سے تو کسی کے حق میں وہ کارآمد اور مفید نہیں، پھر کسی لحاظ سے اور کسی کے لیے اُس کا وجود افادیت کا حامل ہے

جواب یہ ہے کہ انسان کے وجود کی اہمیت و افادیت کسی مخلوق کے لحاظ سے نہیں، خالق کے لحاظ سے ہے۔ یہ ملحوظ رکھتے ہوئے کہ انسان کے اپنے خالق و مالک کے لیے کارآمد او رمفید ہونے کا مطلب وہ ہرگز نہیں جو چاند، سورج وغیرہ مخلوقات کے انسان کے لیے مفید اور کارآمد ہونے کا مطلب ہے کیوں کہ ان مخلوقات کے انسان کیلئے کارآمد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنی ضروریات اور اور لوازمات زندگی کی تکمیل کے لیے اُن سے مدد حاصل کرتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ حاجت مندی کا یہ تصور ہی خدا کے حوالے سے ممکن نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسان کو خدا کے لیے کارآمد ہونے کو سمجھا جاتا ہے۔ خدا سب چیزوں کا خالق و مالک ہے اس لیے اُس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں، جسے پورا کرنے کے لئے اُسے انسان یا کسی اور مخلوق کو حاجت درپیش ہو۔ اگر ایسا ہو تو خالق اور مخلوق یا خدا کی خدائی اور بندوں کی بندگی میں کیا فرق رہ جائے گا؟ ہاں، خدا کے لیے انسانوں کے کارآمد ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ وہ اُس کے لیے اور اُس کے سامنے اپنے عجز و نیاز کا اظہار کر کے اُس کی قدرت و بے نیازی اور عظمت و کبریائی کا اقرار کریں۔ اور عجز و نیاز کے اِسی اظہار و اقرار کا نام ,,عبادت،، ہے۔ اِس طرح ثابت ہوا کہ اِنسان اس ,,عبادتِ خداوندی،، پر مامور اور اُس کو انجام دینے

کے لیے فاعل کی حیثیت رکھتا ہے، کائنات اور دیگر اشیاے کائنات کی طرح اس مقصدِ تخلیق کے حصول کے لیے اُسے آلہ ووسیلہ کی حیثیت حاصل نہیں ہے۔

اِسے اِس طرح بھی سمجھا جاسکتا ہے کہ ہر طالب کو اُسی چیز کی طلب ہوتی ہے جس سے وہ محروم اور تہی دست ہوتا ہے۔ خدا کے پاس چوں کہ عجز و نیاز اور ذلّت وخواری کے علاوہ سب چیزیں موجود ہیں، اس لیے اس کا اگر مطلوب ہوگا تو یہی ہوگا کہ اُس کے لیے عجز و نیاز کا اظہار کیا جائے۔ عجز و نیاز کے اِسی اظہار کو ہم عبادت سے تعبیر کرتے ہیں اور انسان کو اس کا اصل فاعل اور کائنات اور تمام مخلوقات کو آلات ووسائل کی حیثیت سے اُس کا معاون سمجھتے ہیں۔

حاصل یہ کہ انسان کی تخلیق اِس لیے عمل میں آئی کہ وہ عبادتِ خداوندی کے فریضے کی ادائیگی میں اصل فاعل کا کردار ادا کرے اور کائنات اور دیگر مخلوقات کو اِس لیے بنایا گیا کہ وہ اس مقصدِ تخلیق کی ادائیگی میں انسان کے لیے معاون ومددگار ثابت ہوں۔ گویا کائنات اور دیگر مخلوقات کی تخلیق بلاواسطہ نہ سہی، بالواسطہ طور پر عبادت ہی کی غرض سے عمل میں آئی ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھا جاسکتا ہے کہ اگر کہا جائے کہ گھوڑا سواری کے لیے ہوتا ہے اور گھاس دانہ گھوڑے کے لیے، تو منطقی نتیجے کے طور پر یہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ گھاس دانہ بھی بلاواسطہ نہیں یہ تو بالواسطہ طور پر سواری ہی کے لیے ہیں۔ اور جب تخلیق عالم کا مقصد صرف عبادت ہوا اور انسان کو اُس کے فاعل اور کائنات اور دیگر مخلوقات کو آلہ وسیلہ کی حیثیت حاصل ہوئی تو جس طرح کھانا اصل ہوتا ہے مگر اُس کے تیار ہونے تک اُس کے لیے استعمال میں لائے گئے تمام آلات واسباب کو بھی حساب میں شامل کر کے کہا جاتا ہے اتنے میں پڑا اور اس طرح تمام اسباب و آلات کو بھی کھانے کی مَد میں شمار کرلیا جاتا ہے، اِسی طرح کارخانۂ دنیا کی ہر شے، ہر کیفیت، ہر لمحہ، ہر کُلفت اور راحت کو بھی آلات ووسائل کی حیثیت سے عبادت کی مَد میں شاملِ سمجھا جائے گا۔ اب اگر دُنیا میں پیش آنے والی تمام یا بعض کُلفتوں اور راحتوں کو پنڈت دیانند کے بقول تناسخ اور آواگون کے نقطۂ نظر سے جزا وسزا کی حیثیت دی جائے، تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک ہی چیز بیک وقت عبادت بھی ہو اور جزا وسزا بھی۔ حالاں کہ بداہتاً محال ہے کہ جزا وسزا اور عبادت میں تداخُل ہوجائے

او یہ آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح مل جائیں کہ ایک ہی چیز کا بہ یک وقت جزا وسزا اور عبادت ہونا ممکن ہو سکے۔ یہ استحالہ چونکہ نظریۂ تناسخ خود محال ہوتا ہے، نظریۂ تناسخ کا ہی مُحال، غیر حقیقی اور غلط ہونا سمجھ میں آتا ہے۔

اس مفصل بحث کا حاصل یہ نکلا کہ عقلاً یہ ثابت ہے کہ انسان کا مقصدِ تخلیق، عبادتِ خداوندی ہے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے انسان کو فاعل کی حیثیت سے مامور کیا گیا ہے اور تمام مخلوقات اور دنیا کی ہر چیز کو اس کے آلہ وسیلہ کی حیثیت سے پیدا کیا گیا ہے۔ اس لیے آلہ وسیلہ ہونے کی وجہ سے دنیا کی ہر چیز بھی بالواسطہ عبادت کی مَد میں داخل ہوگی۔ اب اگر تناسخ کا نظریہ رکھنے والوں کے عقیدے کے مُطابق یہ تسلیم کرلیا جائے کہ دنیا میں انسانوں کو پیش آنے والی تمام تکلیفوں اور راحتوں کو جزا اور سزا کی حیثیت حاصل ہے، تو دُنیا کی تمام اشیا کے مِن جُملۂ عبادت ہونے کی وجہ سے لازم آئے گا کہ یہ تکلیفیں اور راحتیں بیک وقت عبادت بھی ہوں اور جزا اور سزا بھی۔ حالاں کہ جیسا کہ بتایا گیا کہ یہ تداخُل ممکن نہیں، ایک چیز بیک وقت صرف عبادت ہوگی یا صرف جزا یا سزا۔

(انتصار الاسلام، ص: ۲۶۔۲۷۔۲۸)

چوتھی وجہ۔ انسان کا جسمانی اور روحانی ارتقا اور اسکے مراحل

تناسخ کے نامعقول ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انسان پیدائش سے موت تک جن مراحل سے گزرتا ہے، اُن کے جائزے سے پتا چلتا ہے کہ وہ دراصل ان کے واسطے سے اپنے جسمانی اور روحانی ارتقا کے مراحل طے کرتا ہے۔ یعنی ہر انسان میں پیدا ہوتے ہی جسمانی اور روحانی دونوں لحاظ سے ارتقا کا عمل شروع ہو جاتا ہے اور اس وقت تک جاری رہتا ہے، جب تک اس کی موت نہ واقع ہو جائے۔ چناں چہ جسمانی لحاظ سے ایک عام انسان لڑکپن اور جوانی سے گزرتے ہوئے ہر لحہ ایک خاص طرح کے جسمانی ارتقا کے مراحل سے دوچار ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ بڑھاپے میں ایک خاص مرحلے پر اس کے اِس جسمانی ارتقا کا عمل رُک جاتا ہے اور اسے موت آجاتی ہے۔ اسی طرح روحانی اعتبار سے بھی پوری زندگی انسان ایک ارتقائی سفر طے کرتا ہے، جس کے دوران روحانی، ذہنی، اخلاقی

اور فکری اعتبار سے مختلف حالات و کیفیات سے دوچار ہوتے ہوئے ایک مرحلے پر یہ سلسلہ رُک جاتا ہے اور اُسے موت آجاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ جسم اور روح، دونوں کی مسافت کو ارتقا کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے عموماً ایک خاص جسمانی اور روحانی مسافت طے کرنی پڑتی ہے جس کے دوران اُنھیں مختلف مرحلوں، اور کیفیات و حرکات سے گزرنا پڑتا ہے۔

اِدھر ارتقا کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ کوئی چیز اگر ایک مسافت طے کرتے ہوئے اور صعودی یا ارتقائی حرکت و کیفیت سے دوچار ہوتے ہوئے کسی خاص منزل پر پہنچ کر رُک جائے اور وہاں سے پھر اپنی ابتدائی منزل، حالت اور کیفیت کی طرف واپس آنا چاہے، تو اس تنزّل اور ہُبوط (نیچے آنے) کے لیے بھی اُسے وہی مسافت طے کرنی پڑے گی جو اُس نے صُعود ارتقا (اوپر جانے) کے لیے طے کی تھی اور اِس واپسی کے سفر میں بھی اُسے انہی مراحل سے گزرنا اور دوچار ہونا پڑے گا جن سے اُسے اوپر جاتے ہوئے سابقہ پڑا تھا۔ فرق صرف اتنا ہوگا کہ پہلے جو مبدا تھا اب منتہا ہو جائے گا اور پہلے جس مقام اور کیفیت کو آخری منزل کی حیثیت حاصل تھی، اُسے اب پہلی منزل اولین مرحلے کا درجہ حاصل ہو جائے گا۔

اِسے یوں سمجھے کہ اگر آپ کوئی پتھر یا ڈھیلا فضا میں بلندی کی طرف پھینکیں گے تو وہ ڈھیلا یا پتھر صُعودی حرکت و عمل کے ذریعے ایک معینہ مسافت طے کرتا ہوا فضا میں ایک مخصوص مقام پر جا کر ٹھہر جائے گا اور پھر فوراً وہاں سے زمین کی طرف واپسی کا اُس کا عمل شروع ہوگا، جس کے دوران ہُبوطی حرکت و عمل کے ذریعے اُسی مسافت کو طے کرتے ہوئے وہ زمین پر آگرے گا، جو اس نے اوپر جاتے وقت طے کیا تھا، اس کے علاوہ یہ ممکن نہیں کہ پتھر نے اوپر جاتے وقت اپنی حرکتِ صُعودی کے دورانِ جو مسافت طے کے تھی اور جن مراحل سے گزرا تھا، نیچے آتے وقت اپنی حرکتِ ہبوطی کے دوران اُس مسافت کو طے کیے بغیر اور اُن مراحل سے دوچار ہوئے بغیر وہ اپنی پہلی جگہ واپس پہنچ جائے۔

مذکورہ سطور اور ارتقاء کے مذکورہ بالا قاعدے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اگر تناسخ اور آواگون کے نظریے کا جائزہ لیا جائے، تو اِس کا خلافِ عقل ہونا قدرے وضاحت کے ساتھ سمجھا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ہم نے اوپر بتایا کہ انسانی جسم اور روح دونوں ارتقائی عمل سے دوچار ہوتے ہیں اور جس طرح عام حالات میں جسم بچپن، جوانی اور بڑھاپے سے گزرتے

ہوئے موت تک اپنے ارتقائی سفر کی تکمیل کرتا ہے اسی طرح روح بھی انسان کی پیدائش سے اُس کی موت تک مختلف باطنی اور روحانی کیفیتوں سے گزرتی اور اخلاقی، علمی، کمالات واوصاف کے مختلف مراحل طے کرتی ہوئی اپنے ارتقائی سفر کی تکمیل کرتی ہے۔ اب اگر تناسخ کے نظریے کے مطابق مان لیا جائے کہ ایک انسان کے مرنے کے بعد دوبارہ کسی جان دار کا قلب بدل کر فوراً دنیا میں پیدا ہو جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ برسوں کے روحانی ارتقائی سفر کے دوران مختلف کمالات واوصاف اور عادات واخلاق میں پختہ ہو جانے کے بعد، وہ جس آخری منزل اور مرحلے پر پہنچا تھا، دوبارہ جنم کی شکل میں وہ وہاں سے پھر اپنی ابتدائی منزل اور کیفیت پر فوراً واپس پہنچ گیا اور اُسے اِس واپسی کے سفر میں ہبوطی عمل کے دوران اُن مراحل سے گزارنا نہیں پڑا، جن سے ارتقائی سفر میں صعودی عمل کے دوران اُسے گزرنا پڑا تھا۔ بلکہ اِس کے برعکس، روحانی ارتقا کے دوران برسوں کے حاصل کردہ اُس کے اوصاف وکمالات اور عادات وخصائل یک لخت زائل ہو گئے اور اس ازالے میں اُسے روحانی لحاظ سے وہ مسافت طے نہیں کرنی پڑی، جو اُسے اُن کی تحصیل، ان میں پختگی حاصل کرنے اور ان کے اوجِ ارتقا پر پہنچنے کے لیے اسے قطع کرنی پڑیں تھیں، حالاں کہ اوپر پتھر کی مثال سے ارتقا کے اس قاعدے کی مکمل وصاحت ہو چکی ہے کہ صعود وترقی کے لیے جو مسافت طے کی جاتی ہے، ہبوط وتنزل کے لیے اُس کو طے کرنا ضروری ہے۔

حاصل یہ کہ جس طرح فضا میں بلندی کی طرف پھینکا ہوا پتھر بطورِ ارتقا، صعودی حرکت ومسافت طے کرتا ہے، اسی طرح روح بھی اپنے ارتقا کی آخری منزل تک پہنچنے کے لیے مختلف کیفیتوں اور مرحلوں سے گزرتی ہے۔ اور جس طرح وہاں حرکتِ صعودی کے ذریعے اور اوپر جانے کے بعد نیچے آنے کے لیے حرکت ہبوطی سے دوچار ہونا ضروری ہے کہ اس کے بغیر یکبارگی نیچے پہنچ جانا ممکن نہیں، اسی طرح یہاں بھی ارتقائی سفر مکمل کر لینے کے بعد روح کے لیے اپنی ابتدائی کیفیت وحالت پر واپس آنے کے لیے ترقی کی طرح ہی تنزل کا سفر کرنا ضروری ہے اور علوم، اخلاق وعادات اور باطنی کیفیات سے خالی الذہن ہونے کے لیے بھی اس کے لیے اس خاص مسافت کا طے کرنے ضروری ہوگا۔ کیونکہ پتھر اور روح میں ارتقا اور انحطاط کے لحاظ سے پوری یکسانیت اور مشابہت موجود ہے۔ فرق

صرف اس قدر ہے اوّل الذِّکر میں ارتقایا انحطاط مکانی ہے اور ثانی الذِّکر میں کیفی۔ پتھر میں ایک جگہ سے دوسری جگہ کا ارتقاو انحطاط مکانی ہوتا ہے اور روح میں ایک کیفیت سے دوسری کیفیت کی طرف ارتقاو انحطاط روحانی کیفی ہوتا ہے۔

عوارض واوصاف کی دو قسمیں

یہاں اگر یہ شبہہ پیدا ہو کہ اوپر اخلاق وعادات اور علوم کمالات کے بارے میں کہا گیا کہ اُن کا یکبارگی زوال ممکن نہیں اور پھر اسی کو بنیاد بنا کر تناسخ کے نظریے کو غلط اور نامعقول کہا گیا۔ حالاں کہ یہ صحیح نہیں۔ کیوں کہ اخلاق وعادات اور علوم وکمالات عوارض ہیں اور عوارض کا زوال وانفصال یکبارگی ممکن ہوتا ہے چنانچہ کسی تاریک کمرے میں اگر کوئی چراغ روشن کیا جائے، تو اس کے درودیوار روشن ہو جائیں گے۔ مگر چوں کہ یہ روشنی عارضی ہے، چراغ کے گُل کرتے ہی یکلخت غائب اور دفعتاً زائل ہو جائے گی اور سارا کمرہ پھر تاریکی میں ڈوب جائے گا اور اس کی وجہ یہی ہے کہ عوراض کا دفعتاً زوال ممکن ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ عوارض دو طرح کے ہوتے ہیں۔ بعض عوراض واوصاف تو وہ ہوتے ہیں جن کی اپنے موصوف سے دفعتاً جدائیگی ممکن ہوتی ہے جبکہ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا یک لخت زوال وانفصال ممکن نہیں ہوتا۔ چناں چہ پہلی قسم کے عوارض کی مثال کے طور پر چراغ کی روشنی اور دیوار کی مذکورہ مثال پر ہی غور کیا جا سکتا ہے کہ چراغ کے روشن کرنے کی وجہ سے کمرے کے درودیوار پر روشنی کی جو صفت عارض وطاری ہوتی ہے، وہ ان عوارض میں سے ہے جو اپنے موصوف سے یک لخت جُدا ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ چراغ گُل کرتے ہی روشنی کے زائل ہو جانے اور درودیوار کے تاریکی میں ڈوب جانے سے ظاہر ہے۔ دوسری قسم کے عوارض کو جسم اور سطح کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے کہ اگرچہ جسم کے لیے اس کی سطح ایک عارضی اور خارجی وصف عارض کی حیثیت رکھتی ہے، مگر اِس کا جسم سے یکبارگی جدا ہونا ممکن نہیں کہ یہ وہ اُن عوارض میں سے ہے جو یک لخت اپنے موصوف سے الگ نہیں ہو سکتے۔ روح کے لیے اخلاق وعادات اور علوم وکمالات کی حیثیت بھی اگرچہ عوارض کی ہی ہے، مگر یہ بھی دوسری قسم کے عوراض ہیں، جن کی اپنے موصوف سے دفعتاً جدائیگی

ممکن نہیں۔ جیسے ہر جسم کے لیے کسی نہ کسی سطح اور مکان کا ہونا ضروری ہے جو اس کا عارضی وصف ہوتا ہے، ایسے ہی ہر روح کے لیے بھی کسی نہ کسی نوع کی عادت، کیفیت اور علم ہونا ضروری ہے جو اُس کے لیے عارضی وصف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چوں کہ ہر روح کے لیے کسی نہ کسی طرح کی صفت، عادت اور اخلاقی کیفیت کا پایا جانا ضروری ہے، شروع ہی سے انسانوں میں سے کوئی طبعاً حلیم و بردبار ہوتا ہے، اور کوئی غضب ناک، کوئی فطرتاً سخی ہوتا ہے اور کوئی بخیل اور کوئی طبعاً ذکی ہوتا ہے اور کوئی غبی وغیرہ۔

یہی صورتِ حال علوم و کمالات کی ہے کہ یہ بھی عوارض و اوصاف ہونے کے باوجود روح کے ساتھ لازم و ملزوم کا تعلق رکھتے ہیں۔ اور ہر روح کے لیے قوتِ علمیہ کا ہونا اسی طرح لازم ہے جس طرح آفتاب کے لیے روشنی لازم ہوتی ہے۔

بے ہوشی اور علم

اگر کہا جائے کہ روح کے لیے قوتِ علمیہ کو اس طرح لازم کرنا صحیح نہیں جس طرح آفتاب کے لیے روشنی لازم ہے۔ کیوں کہ آفتاب سے تو روشنی کبھی جدا نہیں ہوتی جب کہ روح سے علم یا قوتِ علمیہ بحالتِ بے ہوشی جُدا ہو جاتی ہے اور ایک بے ہوش شخص کو کسی چیز کا علم و ہوش نہیں رہتا۔ تو جواباً کہا جائے گا کہ یہ کہنا ہی غلط ہے کہ بے ہوشی میں علم زائل ہو جاتا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ بے ہوشی کی حالت میں علم زائل نہیں ہوتا، چُھپ جاتا ہے۔ اور علم و ادراک کی صلاحیت حسبِ سابق موجود رہتی ہے، ہاں کمالِ استغراق کی وجہ سے اس علم و ادارک کی قوت کا احساس نہیں ہو پاتا۔ اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ بے ہوشی میں عدمِ علم نہیں، عدم علم علم ہوتا ہے۔ بلکہ اگر یہ نکتہ پیشِ نظر رہے کہ بے ہوشی استغراق کا نام ہے اور استغراق، کمالِ علم و غایتِ احساس و ادراک کا نتیجہ ہوتا ہے، تو یہ حقیقت اور واضح ہو جاتی ہے کہ بے ہوشی کے عالم میں علم و احساس زائل نہیں ہوتا بلکہ اوجِ کمال پر پہنچ جاتا ہے۔

بہر حال، مذکورہ تقریر سے واضح ہوا کہ تناسخ کا نظریہ چند وجوہ سے قابلِ قبول نہیں۔ اوّلاً اس وجہ سے کہ تناسخ کے ثبوت پر نقلاً کوئی دلیل نہیں ہے ثانیاً، عقل اور واقعہ بھی اس نظریہ کی تائید نہیں کرتا۔ ثالثاً، تناسخ کے نتیجے میں عبادت اور جزا و سزا میں تداخل لازم آتا ہے جو

محال ہے اور رابعاً یہ نظریہ ارتقا کے قاعدے کے بھی خلاف ہے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۲۳۰، ایضاً ۳۰، ۳۱)۔

اعتراض۔ دفنِ میّت کا اسلامی طریقہ مناسب نہیں ہے

پنڈت دیانند کا اسلام پر نواں اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں کے دفنِ میت کا طریقہ بہتر اور موزوں نہیں، اس سے کہیں بہتر اور موزوں مُردے کو نذرِ آتش کرنے کا طریقہ ہے۔ کیوں کہ دفن کی صورت میں زمین، مُردے اور لاش کی آلایشوں کی وجہ سے ناپاک ہوجاتی ہے جب کہ جلانے کی صورت میں زمین کی ناپاکی اور آلودگی کوئی اندیشہ نہیں رہتا۔

اِس اعتراض کے الزامی جواب کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ اگر مسلمانوں کے دفنِ میت کے طریقے کو محض اس وجہ سے مذموم گردانا جاسکتا ہے کہ اس سے زمین آلودہ اور ناپاک ہوجاتی ہے، تو مُردوں کے نذرِ آتش کرنے کا طریقہ بدرجۂ اولیٰ مذموم ہونا چاہیے، کیوں کہ دفن کی صورت میں تو صرف زمین کا اندرونی حصہ آلودہ ہوتا ہے جس سے انسان کو براہِ راست واسطہ نہیں پڑتا اور نہ ہی اُسے بظاہر کوئی نقصان پہنچتا ہے، جب کہ میت کو نذرِ آتش کرنے کی صورت میں دھواں اور بدبودار ہوا میں سرایت کرجاتے ہیں جس سے انسان کو براہ راست سابقہ پڑتا ہے اور نتیجتاً فضا کے آلودہ اور مسموم ہوجانے کی صورت میں انسانوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ بھی پیدا ہوجاتا ہے۔ اس لیے نذرِ آتش کرنے سے بہتر دفن ہی کا طریقہ معلوم ہوتا ہے۔ مگر چوں کہ اس جواب کی کوئی تحقیقی بنیاد نہیں ہے، اِس لیے ایسا جواب، جس سے علمی اور تحقیقی طور پر دفنِ میت کا بہتر، مُفید اور موزوں طریقہ ہونا ثابت ہو، درجِ ذیل ہے۔

جواب روح اور جسم کی حیثیت

دفنِ میت کا اسلامی طریقہ علمی اور عقلی لحاظ سے تمام طریقوں کی بہ نسبت زیادہ بہتر موزوں اور مناسب کیوں ہے؟ اسے سمجھنے کے لیے یہ مقدمہ ذہن نشین کرلیں کہ انسان بنیادی طور پر روح اور جسم دو چیزوں سے مرکب ہوتا ہے اور ان دونوں میں حقیقتاً آسمان و زمین کا تفاوت و اختلاف ہے۔ کیوں کہ ایک طرف روح اگر جوہر لطیف ہے تو دوسری

طرف جسم تو دۂ خاکِ کثیف ہے اور روح اگر عالمِ علوی کا نور ہوتی ہے تو جسم اس کے مقابلے میں خاک ہوتا ہے۔ روح و جسم کے درمیان پائے جانے والے اس اختلاف و تضاد کے پیشِ نظر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ اگر خدا کا حکم نہ ہوتا تو یہ دو متضاد چیزیں کبھی باہم جمع نہ ہوتیں اور روح جیسی پاکیزہ اور لطیف ترین شے، جسمِ خاکی جیسی کثیف اور منی، خون اور بول و براز سے مرکب ملوّث ناپاک شے میں کبھی نہ آتی، حکمِ خداوندی ہی کا اثر ہے کہ اس تضاد و اختلاف کے باوجود روح کو جسم کثیف کو اپنا بسیرا بنانا پڑتا ہے۔ اس کے بعد جب تک وہ اس میں رہتی ہے، اپنی پاک سرشت سے جسم کو بھی اُسی طرح پاک بنائے رہتی ہے جس طرح سورج، زمین جیسی ظلمت و تاریکی میں ڈوبی ہوئی شے کو اپنی تابانی اور ضوفشانیوں سے روشن کیے رکھتا ہے۔ اور جب طویل صحبت اور رفاقت کی بدولت روح کو جسم سے اُنس و لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے، تو دوبارہ خدا کا حکم ہوتا ہے کہ وہ جسم سے الگ ہو جائے اور حکمِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے روح کو جسم فانی سے جدائیگی اختیار کرنی پڑتی ہے جس کے نتیجے میں موت واقع ہو جاتی ہے اور جسمِ خاکی پھر اُسی ناپاک حالت پر پہنچ جاتا ہے جس پر وہ روح کے آنے یعنی انسان کی پیدائش سے قبل تھا۔ گویا انسان اور جسم انسانی کے قبضے میں اپنی زندگی ہوتی ہے نہ موت، بلکہ بہ دلِ ذوق۔

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی گئے

نیز جسم انسانی روح کی صحبت کی بدولت اپنی ناپاکی کی حالت سے پاکی کی طرف آنے میں مختار ہوتا ہے اور نہ روح کی جدائیگی کے بعد دوبارہ ناپاکی کی پہلی حالت پر لوٹ آنے میں مختار ہوتا ہے۔ خُدا کے حکم سے جب روح جیسی پاکیزہ شے اس جسم کو اپنا بسیرا بناتی ہے، تو اُس کی صحبت کی بدولت اِسے بھی زندگی اور پاکیزگی مل جاتی ہے اور خدا ہی کے حکم سے جب روح اُس سے جدا ہو جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں موت طاری ہو جاتی ہے اور جسم اپنی سابقہ ناپاک حالت پر لوٹ جاتا ہے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ اس طرح جسم کے پاک سے ناپاک ہونے اور پھر ناپاک سے پاک ہونے میں جب نہ جسم کا کوئی دخل ہوتا ہے نہ روح کا، بلکہ جو کچھ ہوتا ہے۔ خدا کے حکم سے ہوتا ہے، تو پھر اب کیوں خواہ مخواہ جسم کو اُس کی

اس غیر اختیاری ناپاکی کی سزا دیتے ہوئے یا زمین کو اس اضطراری ناپاکی سے بچانے کی فکر کرتے ہوئے، نذرِ آتش کیا جائے اور کیوں اس بے قصور جسم انسانی کے بے قصور وارثین کو اس کے جلانے کی تکلیف دِہ فکر واذیت اور المناک مرحلے سے دوچار کیا جائے؟ حقیقتاً اس لحاظ سے بہتر یہی معلوم ہوتا ہے جسم میت کو نذرِ آتش کرنے یا کسی اور طریقہ سے ضائع کرنے کے بجائے انتہائی اعزاز اکرام کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا جائے۔

دفن ہی قابلِ اعتراض کیوں؟

علاوہ ازیں، اگر مُردے کو زمین میں دفن کرنا محض اس وجہ سے مذموم وممنوع قرار پاتا ہے کہ کہیں اس کی ناپاکی کی وجہ سے زمین بھی ناپاک اور آلودہ نہ ہو جائے، تو پھر سوال یہ ہے کہ دفن ہی کی کیا تخصیص ہے، کھانا پینا اور بول وبراز کرنا تک ممنوع ومذموم ہونا چاہیئے، کیوں کہ دفنِ میت کی صورت میں زمین کی جس آلودگی اور ناپاکی کا خدشہ ہے، اس سے کہیں زیادہ آلودگی اور ناپاکی یقینی طور پر بول وبراز سے ہوتی ہے۔ بول وبراز کی ناپاکی اور بدبو کا جسمِ میت کی ناپاکی اور بدبو سے فزوں تر ہونا واضح اور عیاں ہے کیوں کہ جسمِ میت کو دفن کرنے کی صورت میں اُس کی آلایش سے زیادہ سے زیادہ زمین کا اندرونی حصہ آلودہ وناپاک ہوگا جس سے انسانوں کا کوئی ظاہری نقصان متصوّر نہیں ہے، جب کہ پاخانہ پیشاب سے نہ صرف زمین کا ظاہری حصہ آلودہ اور ناپاک ہوتا ہے بلکہ اس کی بو سے اوّل اوّل انسان کو شدید دماغی کرب واذیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس لحاظ سے سمجھ میں آتا ہے کہ اگر جسمِ میت کی آلایش سے زمین کے اندرونی حصّے کو بچانا ضروری ہے تو اس سے کہیں زیادہ ضروری زمین کے ظاہری حصّے کو پاخانہ پیشاب کی نجاست وگندگی سے بچانا اور لوگوں کو ان کی ناقابلِ برداشت بدبو سے بچانے کی کوشش کرنا ہے، اور اس لیے اگر دفنِ میت کا طریقہ مذموم وممنوع ہے تو اِس سے زیادہ مذموم وممنوع پاخانہ پیشاب کرنا اور نتیجتاً کھانا پینا ہونا چاہیئے۔

بلکہ اگر اور گہرائی میں جا کر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موت کی وجہ سے پیدا ہونے والی انسانی جسم کی ناپاکی سے اُس کے اضطرار ومجبوری کے پیشِ نظر یہ سمجھ کر درگزر بھی کیا جا سکتا ہے کہ جسم خاکی کی اس پاکی اور ناپاکی میں اُس کا اپنا کوئی دخل نہیں ہے، لیکن اس کے

کا اثر زمین تک نہیں پہنچ سکتا، تو پھر اس کو بنیاد بنا کر دفن کے اسلامی طریقے پر کس طرح اعتراض کیا جا سکتا ہے؟ پھر مشاہدے سے بھی ثابت ہے کہ زمین میں میت کو دفن کرنے کے بعد اُس کی آلایش زمین کی طرف متعدی نہیں ہوتی بلکہ زمین کی پاکی اُس پر غالب آکر چند ہی روز میں اسے اس طرح اپنا ہم رنگ بنا لیتی ہے کہ پھر وہاں نہ کوئی بدبو ہوتی ہے اور نہ کسی آلودگی، نجاست کا نام ونشاں رہتا ہے۔

دفن کے فوائد

پھر یوں بھی اگر دفنِ میت کے اسلامی طریقے کا مُردے کو نذرِ آتش کرنے یا ضائع کرنے کے دیگر ممکنہ طریقے سے موازنہ کیا جائے تو عقل وقیاس کی روشنی میں اسلامی طریقے کی ہی برتری، موزونیت اور فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ بتایا گیا موت وحیات کے سلسلے میں خود انسان کو کوئی دخل واختیار حاصل نہیں ہے، بلکہ وہ اس سلسلے میں پوری طرح اپنے خالق ومالک کی مرضی کا تابع ہوتا ہے کہ وہ جب چاہتا ہے اُسے زندگی دیتا ہے اور جب چاہتا ہے موت سے ہم کنار کر دیتا ہے۔ اور جب موت وحیات کے تعلق سے انسان بالکل مجبور وبے بس ہے۔ اور موت کے نتیجے میں حاصل ہونے والی جسمِ میت کی ناپاکی میں بھی اُس کا کوئی قصور نہیں اور وہ ہر طرح سے بے قصور وبَری الذِمّہ ہے، تو عقل وقیاس کا تقاضا ہے کہ جسمِ میت کو دفن کرنے نہ کرنے یا اُس کی آلایش سے زمین کو پاک رکھنے نہ رکھنے کے سلسلے میں بھی ہر طرح کی فکر وذمہ داری سے اُسے الگ اور بری الذمہ رکھا جائے اور بہ ظاہر اُسے اس سے کوئی غرض نہیں ہونی چاہئے کہ جسم میت کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اُسے دفن کیا جا رہا ہے، جلایا جا رہا ہے یا غرقِ آب کیا جا رہا ہے۔

غرض، چوں کہ موت وحیات کا اور موت کی وجہ سے جسم انسانی کو پاکی سے ناپاکی کی حالت کی طرف منتقل کرنے کا معاملہ براہِ راست باری تعالےٰ سے متعلق ہے اس لیے بنیادی طور پر اُس کی یہ ذمّے داری بھی نہیں ہے کہ جسم میّت کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں کسی طرح کی فکر میں مبتلا ہو اور دفن کرتے ہوئے اس فکر سے پریشان ہو کہ کہیں اس کی آلایش سے زمین کا اندرونی حصّہ ناپاک اور آلودہ نہ ہو جائے، اور نذرِ آتش کرتے ہوئے

اُسے یہ فکر ستائے چتا سے اُٹھنے والا دھواں، بدبو اور جراثیم ہوا اور فضا کو مسموم نہ بنا دیں اور اس کے نتیجے میں عام انسانوں کو نقصان نہ اُٹھانا پڑے!

البتہ اِس سے قطع نظر، انسان پر اخلاقاً یہ ذمّے داری ضرور عائد ہوتی ہے کہ جب تک جسمِ میت اُس کے قبضہ و تصرف میں ہے، وہ اُس کے ساتھ ہمدردی اور احترام و اکرام کا معاملہ کرے اور کوئی ایسا سلوک نہ کرے جس سے اُس کی توہین ظاہر ہو یا اس کے بارے میں کوئی غلط تصور یا خراب تصویر اُبھرے، اس خاص پہلو اور نقطۂ نظر سے اگر آپ غور کریں معلوم ہوگا کہ میت کو دفن کرنے کا طریقہ اُسے نذرِ آتش یا غرقِ آب وغیرہ کر دینے سے اِس لیے بہتر ہے کہ اُس کے اکرام و احترام کا تقاضا دوسرے طریقوں کے مقابلے میں اسی طریقے سے بہتر طور پر پورا ہوتا ہے۔ کیوں کہ اگر جسمِ میت کو دفن کرنے کے بجائے کھلی فضا میں رکھ کر کہیں چھوڑ دیا جائے یا اُسے غرقِ آب کر دیا جائے، تو اِن دونوں صورتوں میں لاش کے سڑنے گلنے اور مسخ ہو جانے کے بعد اوّلاً تو انسانوں کو کئی وجوہ سے پریشانی ہوگی۔ کیوں کہ بدبو کی وجہ سے لوگوں کے دماغ اور قوتِ شامّہ پر اثر پڑے گا اور میت کی شکل و صورت اور جسمانی اعضا کے مسخ ہو جانے کی صورت میں اُن کی قوتِ باصرہ کو تکلیف دہ صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے گا اور ثانیاً خود مُردے کے سلسلے میں بھی ایک ایسی غلط، نفرت آمیز اور گھناؤنی تصویر اُبھرے گی کہ لوگوں کو اُس سے گھن آئے گی جس کے نتیجے میں وہ طبعاً اس سے متنفر بھی ہو سکتے ہیں۔

اور اگر مُردے کو نذرِ آتش کرنے کا طریقہ اختیار کیا جائے تو یہ بھی ایک حد تک مذکورہ خرابیوں کے علاوہ دیگر نقصان دہ پہلوؤں سے خالی نہیں ہے اس طریقے کا پہلا خراب پہلو تو یہی ہے کہ جلاتے وقت مُردہ کے جلتے ہوئے بدن سے نکلنے والی بدبو نہایت تکلیف دہ اور ناقابلِ برداشت ہوتی ہے۔ دوسرے، اِس صورت میں فضا کے آلودہ ہونے اور جراثیم سے ملوث ہونے کی وجہ سے بیماریوں کے پھیلنے کا بھیانک اِمکان ہے۔ تیسرے، خود مُردے کے جسم میں جو عناصر اربعہ ہوتے ہیں، وہ جلانے، دریا بُرد کرنے یا کھلی فضا میں چھوڑ دینے کی صورت میں بالکل ضائع اور برباد ہو جاتے ہیں۔

لیکن اِن کے بجائے اگر دفنِ میت کا اسلامی طریقہ اختیار کیا جائے تو مذکورہ خرابیوں میں سے کوئی بھی خرابی لازم نہیں آتی اور میت کے احترام و اکرام کے جملہ تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ جیسا کہ سب جانتے ہیں، دفن کی صورت میں نہ مُردہ کے جسم سے کوئی بدبو باہر آتی ہے کہ انسانوں یا دیگر جانداروں کو تکلیف دِہ اور پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑے، نہ اُس کی مُسخ شدہ صورت پر کسی کی نگاہ پڑتی ہے کہ اُس سے گھن آنے اور مُردے کی نفرت انگیز تصویر اُبھرنے کا اندیشہ ہو، نہ اُس کے جراثیم نکل کر فضا میں سرایت کرتے ہیں کہ اس کی وجہ سے فضا کی آلودگی اور نتیجتاً کسی طرح کی بیماری پھیلنے کا کوئی خطرہ ہو اور نہ ہی اِس صورت میں جسمِ میت میں موجود عناصر اربعہ کا کوئی حصّہ ضائع ہوتا ہے۔ کیوں کہ مُردہ کو جب دفن کر دیا جاتا ہے، تو ایک خاص مدّت کے بعد عناصر اربعہ سے مرکب اُس کے جسم کا شیرازۂ ترکیب کُھل جاتا ہے اور یہ عناصر (آب و باد و خاک و آتش) اپنی اپنی اصل میں جا ملتے ہیں۔ مٹی مٹی سے مل جاتی ہے، پانی پانی سے، ہوا ہوا سے اور آگ آگ سے۔ اور اس طرح عناصر اربعہ کا کوئی حصّہ ضائع نہیں ہو پاتا۔ غرض، اِن تمام وجوہ سے عقلاً بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مُردے کو نذرِ آتش کرنے، غرقِ آب کرنے یا کھلی فضا میں چھوڑ کر ٹھکانے لگانے کے بجائے اُسے دفن کرنے کا اسلامی طریقہ اختیار کیا جائے جو ہر لحاظ سے موزوں اور مناسب ہے۔ اور جس میں میت کے اکرام و اعزاز کے تمام تقاضے بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں کہ اُسے نہلا دُھلا کر، عطر و خوشبو لگا کر اور سفید و باوقار رنگ کے کفن میں ملبوس کر کے نہایت سنجیدگی اور اعزاز و اکرام کے ساتھ سپردِ خاک کیا جاتا ہے۔

زمین کی قوتِ نمو کا تقاضا

مذکورہ وجوہ کے علاوہ، غور کیجیے تو دفنِ میت کے اسلامی طریقے کے افضل و بہتر ہونے کی وجہ ایک اور بات سمجھ میں آتی ہے، اور وہ ہے زمین کی قوتِ نمو کا تقاضا۔ جیسا کہ مسلّم ہے زمین کی قوتِ نمو کی بنی نوعِ انساں ہی نہیں، دیگر حیوانات و مخلوقات بلکہ کائنات تک کی بقا کے لیے ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔ کیوں کہ اِسی قوت کی بدولت گھاس، درخت فصل، سبزیاں اور بے شمار ایسی چیزیں پیدا ہوتی ہیں جو انسان اور تمام حیوانات کی بقا کے لیے نہایت ضروری ہیں۔ اسی قوت کے نتیجے میں زمین کے بطن میں سونا، چاندی، تیل اور معدنیات کا وہ عظیم ذخیرہ جنم لیتا ہے، جن کے دَم سے کارخانۂ عالم کی سرگرمی اور رنگارنگی

قائم ہے۔ غرض، زمین کی یہ قوتِ نمو ہر لحاظ سے انسان کی بقا، مخلوقات کی بقا اور کائنات کی بقا کے لیے ضروری ہے، اور اسی قوت کا تقاضا ہے کہ جسمِ میت کو زیرِ زمین دفن کر کے اس قوت و توانائی میں مزید اضافے کا سامان فراہم کیا جائے نہ کہ اُسے جلا کر، غرقِ آب کر کے یا کسی اور طریقے سے ضائع کر کے زمین کی اس قوتِ نمو کو جسمِ میت سے حاصل ہونے والی اس ممکنہ توانائی اور فائدے سے محروم رکھا جائے۔ کیونکہ ظاہر ہے کہ اگر مُردے کو دفن کرنے کے بجائے، اُسے غرقِ آب کر دیا جائے یا کھلی فضا میں رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو اس صورت میں زمین جسمِ میت سے توانائی حاصل کر کے اپنی قوتِ نمو میں وہ اضافہ نہ کر سکے گی جو دفن کی شکل میں ممکن تھا۔ اور اگر مُردے کو نذرِ آتش کرنے کا طریقہ استعمال کیا جائے تب تو نہ صرف یہ کہ زمین مذکورہ ممکنہ توانائی کے حصول سے محروم رہے گی بلکہ آگ اور تپش کے قوت سوز ہونے کی وجہ سے زمین کی قوتِ نمو کو نقصان بھی پہنچے گا۔ ہاں اگر ان سب طریقوں کو چھوڑ کر دفنِ میت کا اسلامی طریقہ اختیار کیا جائے، تو اس سے زمین کی قوتِ نمو میں اضافہ تو ممکن ہے، کسی طرح کا نقصان متصوّر نہیں۔ اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ زمین کی اس قوتِ نمو کے تقاضے کے پیشِ نظر دفنِ میت کا اسلامی طریقہ ہی معقول، موزوں اور مناسب ترین طریقہ ہے۔

اسے مزید وضاحت کے ساتھ یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ جسمِ انسانی جس قوت اور نطفۂ منی کے واسطے سے عدم سے وجود میں آتا ہے، وہ قوت اور وہ نطفہ بجائے خود قوائے نامیہ کا نچوڑ اور خلاصہ ہے۔ پھر وجود میں آجانے اور پیدا ہو جانے کے بعد بچپن سے بڑھاپے بلکہ موت تک انسانی جسم کو تر و تازہ اور زندگی سے بھرپور رکھنے کے لیے اناج، سبزیاں، اور پھل فروٹ وغیرہ جن چیزوں کے ذریعہ قوت و توانائی پہنچائی جاتی رہتی ہے، وہ چیزیں خود اعلیٰ درجے کی قوائے نامیہ ہوتی ہیں۔ اس طرح بے شمار اور اعلیٰ درجے کی مقویات یا قوائے نامیہ کے اجتماع کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی جسم کا ذرّہ ذرّہ زبردست توانائی کا حامل اور نہایت قوت بخش ہو جاتا ہے۔ اس بے پناہ قوت کا ہلکا سا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ انسان یا کسی بھی جاندار کا جسم اپنی غذا کے تمام قوت بخش اجزا کو حاصل کر لینے کے بعد اُس کے جس حصّے کو بے کار، مہمل اور فُضلہ سمجھ کر پاخانہ پیشاب کی شکل میں خارج کر دیتا ہے، وہ فُضلہ بجائے خود اتنا قوت بخش ہوتا ہے کہ اگر اسے زمین

میں ملا دیا جائے تو اس کی بدولت اُس کی قوتِ نمو میں کافی اضافہ ہو جاتا ہے اور اُس کی پیداوار کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ فُضلات کے قوت بخش ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ اُسے کھاد میں تبدیل کر کے اُس سے زمین کی پیداوا بڑھانے کا کام لیا جا رہا ہے۔ تو جب اِس قدر قوت و توانائی اُس فُضلے میں پائی جاتی ہے جسے جسم بے کار اور فاضل سمجھ کر خارج کر دیتا ہے تو اِس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خود وہ جسم کس قدر قوت بخش ہوگا، جو اس کے اصل قوت بخش اجزا کو حاصل کر کے اُسے بے کار سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتا ہے! جب فُضلہ اِس قدر قوت بخش ہے، تو اصل کی قوت خیزی کا کیا عالم ہوگا!

غرض اس لحاظ سے انسانی جسم کا بے پناہ قوت و توانائی کا حامل ہونا مسلّم ہے۔ اب اگر انسان کے مرنے کے بعد قوت و توانائی سے بھرپور اُس کے جسم کو زمین میں دفن کر دیا جائے، تو ایک خاص مدّت کے بعد جب یہ جسم مٹی میں مل کر قوت بخش ثابت ہوگا، اور اس کی قوتِ نمو میں زبردست اِضافہ کرے گا، جس کے نتیجے میں زمین انسانوں اور جان داروں کے لیے نسبتاً زیادہ مفید اور بار آور ہو سکے گی۔ لیکن اگر میت کو دفن کرنے کے بجائے نذرِ آتش کر دیا جائے، تو اس طرح نہ صرف یہ کہ زمین اپنی قوتِ نمو میں اُس اضافے سے محروم رہ جائے گی جو دفن کی صورت میں اُسے حاصل ہوتا، بلکہ اُس کی اپنی قوتِ نمو کو آگ اور اُس کی تپش سے نقصان بھی پہنچے گا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ چوں کہ جلائے جانے میں، ویران اور بے آب و گیاہ رہتے ہیں اور میت کو سپردِ خاک کر دینے کی وجہ سے چوں کہ زمین کی قوتِ نمو میں اضافہ ہوتا ہے، مُسلمانوں کے قبرستان اور اُس کے قوتِ نمو کے تقاضے کے پیشِ نظر بھی دفنِ میت کا اسلامی طریقہ ہی بہتر اور موزوں نظر آتا۔

طبعی تقاضا

بلکہ اگر مزید غور کیا جائے، تو معلوم ہوگا کہ طبعی تقاضا بھی دفنِ میّت کے اسلامی طریقے کو دیگر طریقوں کے مقابلے میں بہتر اور موزوں قرار پاتا ہے۔ کیوں کہ روح کو جسمِ انسانی کے حوالے سے وہی حیثیت حاصل ہے جو باپ کو اپنے بچے کے حوالے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس طرح باپ اپنے بچّے کا نگراں اور مُربّی ہوتا ہے، اُسی طرح روح بھی جسم کی نگرانی اور تربیت کا کام انجام دیتی ہے۔ اور خاک کو جسم کے تعلق سے وہی درجہ حاصل ہے جو ماں کو

اپنے بچے کے تعلق سے حاصل رہتا ہے۔ جس طرح بچہ اپنی ماں کے بطن سے پیدا ہو کر عالم وجود میں قدم رکھتا ہے اسی طرح جسم بھی خاک سے بن کر عالمِ وجود میں آتا ہے۔ اور جب خاک کی حیثیت انسانی جسم کے لیے مادرِ مہربان کی سی ہوئی تو ظاہر ہے کہ آگ، ہوا، پانی، خاک کی طرح عناصرِ اربعہ میں ہونے کی وجہ سے اُس کے سوتن اور رقیب کی ہی حیثیت رکھیں گی۔ اس تمثیل کی روشنی میں اصل یہ عرض کرنا ہے کہ جب باپ کسی سفر میں یا اپنے بچے سے کہیں دور جانے کا ارادہ کرتا ہے تو طبعاً وفطرتاً اپنے بچے کو اُس کی اصل مادرِ مہربان کے حوالے کرتا ہے تاکہ اُس کی آغوش میں اُسے صحیح راحت وسکون ملے، اِس کے برعکس اگر وہ بچے کو اُس کی اصل ماں کے بجائے اُس کی کسی رقیب یا سوتن کے سپرد کرے، تو عام حالات میں اِسے غیر مناسب اور پدرانہ شفقت اور طبعی تقاضے کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح بوقتِ موت، روح جسے ہم نے جسم کے حق میں باپ کے مشابہ قرار دیا ہے، جب جسم خاکی کو چھوڑ کر عالمِ بالا کے سفر پر روانہ ہو رہی ہوتی ہے، تو یہاں بھی بہتر اور مناسب یہی ہوگا کہ وہ اپنے بچے یعنی جسم کو اُس کے لیے مادرِ مہربانی کا درجہ رکھنے والے عُنصر خاک کے حوالے کردے اور اُسے نہایت اعزاز واکرام کے ساتھ اس خاک کی آغوش کے سپرد کر دیا جائے۔ اس کے برعکس یہ طبعی تقاضے کے خلاف ہوگا کہ جسم میت کو اس کی مادرِ مہربان: خاک کی آغوش میں پہنچانے اور دفن کرنے کے بجائے، اُس کے رقیب عناصر: آتش وآب وباد میں سے کسی کے حوالے کر دیا جائے۔ (انتصار الاسلام، ص: ۴۸)

تناسبِ عناصر کا تقاضا

علاوہ ازیں، انسانی جسم جن چار عناصر سے مُرکّب ہے، اُن کے تناسب کا تقاضا بھی یہی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد اُس کے جسم کو کسی اور طرح ضائع کرنے کے بجائے سپردِ خاک کر دیا جائے۔ کیوں کہ اگرچہ جسمِ انسانی مٹی، آگ، پانی اور ہوا چاروں عناصر سے مرکّب ہے، مگر یہ بھی مسلم ہے کہ ان چار عناصر میں مٹی کا عنصر غالب ہے اور اس کے مقابلہ میں بقیہ تین عناصر کم مقدار میں پاتے ہیں اور عناصر کے اِسی تناسُب اور عُنصر خاک کی اس زیادتی اور غلبے کا تقاضہ ہے کہ مرنے کے بعد انسانی جسم کو اِسی خاک کے حوالے کر دیا جائے، تاکہ وہ اپنا اور زیادہ تر حصّہ اپنے پاس رکھ کر دوسرے عناصر کو اُن کا حصّہ واپس کردے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہوتا اور جسم میّت کو دفن کرنے کے بجائے نذرِ آتش یا غرقِ آب

کر دیا جاتا ہے، تو اس صورت میں جسم کے صرف وہ حصے محفوظ رہ کر اپنی اصل سے مل سکیں گے جن کا تعلق آگ یا پانی سے ہوگا، اور اس کا بیشتر حصہ، خصوصاً وہ اجزا جو عنصرِ خاک سے متعلق ہوں گے، جل کر یا ڈوب کر ضائع و برباد ہو جائیں گے اور اپنی اصل تک نہیں پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا بہتر یہی معلوم ہوتا ہے کہ جسم کو سپردِ خاک ہی کیا جائے تاکہ اُس کا کوئی حصہ ضائع نہ ہو اور تمام اجزا محفوظ رہتے ہوئے اپنے اپنے عناصر سے جا ملیں۔

اِسے یوں بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ اگر کسی شخص کا کوئی کبوتر کسی دوسرے کے کبوتروں کے جھنڈ میں شامل ہو جائے یا کسی کی کوئی بکری کسی دوسرے شخص کی بکریوں کے ریوڑ میں مل جائے، تو ظاہر ہے کہ اس جگہ حُسنِ تناسب کا تقاضا یہی ہوگا کہ اصل بکریوں اور کبوتروں کا مالک اُن میں داخل شدہ دوسرے کی بکری اور کبوتر کو اُن سے الگ کر کے اُسے کے مالک کو لوٹا دے، اس کے برعکس یہ مناسب نہیں ہوگا کہ پہلا شخص محض اپنے ایک کبوتر یا بکری کے حصول کے لئے دوسرے شخص کے تمام کبوتروں اور بکریوں پر قبضہ کر لے یا انھیں تتر بتر کر دے۔ اسی طرح جسمِ انسانی کے عُنصرِ خاکی پر زیادہ مشتمل ہونے کی وجہ سے یہاں بھی تناسب عناصر کا تقاضا یہی معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد اس جسم کو خاک کے حوالے کر دیا جائے تاکہ وہ اپنا حصہ لے کر بقیہ عناصر کو اُن کے حصے واپس کر دے، یہ مناسب نہیں ہوگا کہ اُسے آگ، پانی اور ہَوا میں سے کسی کے سپرد کر کے اُسے ٹھکانے لگا دیا جائے اور اس کا اکثر حصہ ضائع ہونے دیا جائے۔

محبت و اکرام کا تقاضا

اس کے علاوہ میت کے ساتھ محبت و اکرام اور ربط و تعلق کا تقاضا بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ میت کو دفن کرنے کا اسلامی طریقہ ہی اختیار کیا جائے کسی اور طریقہ سے اسے ضائع نہ کیا جائے کیوں کہ کسی بھی میت کا اپنے اقربا اور تمام بنی نوع انسان پر، جو ایک ماں باپ آدم و حوّا کی اولاد ہونے کی وجہ سے باہم قرابت دار ہیں، یہ حق اور اخلاقی، ذمہ داری ہے کہ وہ اُس کے ساتھ محبت، احترام اور تعلق کا سلوک کریں۔ گویا ہر میت اپنے رشتہ داروں کے لیے خصوصاً اور تمام انسانوں کیلئے عموماً محبوب و محترم ہونے کی وجہ سے قابلِ اکرام ہے۔ اس اکرام و احترام کا بنیادی اور اوّلین تقاضا تو یہ ہے کہ اپنے محبوب، محترم

اور متعلق شخص کو خود سے جدا نہ ہونے دیا جائے۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ تقاضا صرف جیتے جی مجوزا میت کو جدا کرتے وقت کے بعد میت کی جدائیگی لازمی ہو جاتی ہے۔ لیکن مجوزا میت کو جدا کرتے وقت بھی اس کی محبت و اکرام کا کم از کم یہ تقاضا صرف دفنِ میت کے اسلامی طریقے کے اختیار کرنے کی صورت میں ہی پورا ہو سکتا ہے، کسی اور طریقے سے اسے پورا نہیں کیا جا سکتا (انتصار الاسلام، ص: ۴۸، ۴۹۔)

اعتراض- قیامت، برزخ، حساب کتاب اسلامی عقائد وغیرہ خلافِ عقل ہیں؟

پنڈت دیانند کا اسلام پر دسواں اعتراض یہ تھا کہ مسلمانوں کے خیال میں انسان مرنے کے بعد اور قیامت اور حساب کتاب کے مراحل سے قبل برزخ کی زندگی گزارتا ہے، جس میں اُس کی حیثیت اس شخص کی سی ہوتی ہے جو حوالات میں بیٹھا اپنے بارے میں آخری اور حتمی فیصلے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ قیامت قائم ہوگی اور حساب کتاب کے بعد اُس کے انجام کے بارے میں خدا کا آخری فیصلہ صادر ہو جائے گا اس پر اعتراض یہ ہے کہ اس طرح عقیدہ خلافِ عقل و حقیقت ہے۔ حوالات میں انتظار کی حالت میں کسی شخص کو رکھنا اور جزا و سزا کے معاملہ کو قیامت پر اُٹھائے رکھنا ایک غیر مُنصفانہ اور ظالمانہ فعل ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اچھے یا بُرے کام کی جزا یا سزا میں کسی طرح کی تاخیر اور لیت ولعل سے کام نہ لیا جائے۔ اور مسلمانوں کے مذکورہ خیالات و نظریے کے مطابق چوں کہ جزا و سزا میں تاخیر لازم آتی ہے، اس لیے اس نظریے اور عقیدے کا خلاف عدل و قیاس ہونا لازم آتا ہے اور نتیجتاً برزخ اور جزا و سزا کے تعلقات قیامت اور حشر و نشر کے اسلامی عقائد و تعلیمات کی صداقت و معقولیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے۔ بلکہ جزا و سزا کے مذکورہ میں کس طرح کی تاخیر لازم نہیں آتی بلکہ یہ مرنے کے فوراً بعد دوسرے جنم کی راحتوں اور تکلیفوں کے شکل میں مِل جاتی ہے۔

جواب اوّل

اس اعتراض کا علمی تحقیقی جواب تو آگے آرہا ہے، یہاں الزامی جواب کے طور پر

صرف یہ عرض ہے کہ پنڈت دیانند کے بقول اگر برزخ، قیامت اور حشر ونشر کے اسلامی عقیدے محض اس وجہ سے غلط اور نامعقول قرار ہوتے ہیں کیوں کہ اس کی رو سے بھی جزاوسزا میں تاخیر ہوتی ہے۔ عام طور سے ایک انسان اپنی طبعی زندگی پوری کر کے ستر اسّی سال کی عمر میں وفات پاتا ہے۔ اس لحاظ سے اگر تناسخ کا نظریہ تسلیم بھی کرلیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ایک شخص نے بشر ہو جانے کے بعد اپنے اوائلِ عمر یا جوانی میں جو اچھا یا بُرا کام کیا ہے، اس کی جزاوسزا اُسے اس وقت ملے گی جب ساٹھ ستر سال یا اس سے بھی زائد طبعی مدّت حیات گزار کر مرنے کے بعد وہ دوسرے جنم میں داخل ہوگا۔ حالاں کہ بقول پنڈت دیانند اس ہاتھ دے، اُس ہاتھ لے، کا تقاضا یہ ہونا چاہئے کہ اِدھر ایک شخص نے اچھا کام کیا اور اُدھر فوراً اسے خدا کی طرف سے اس کی جزا مل گئی یا کسی نے بُرا کام کیا اور فوراً سزا کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔

لہٰذا برزخ کے اسلامی عقیدے کو ماننے کی وجہ سے جزاوسزا میں جو "تاخیر" لازم آتی ہے، اگر وہ ظلم اور اس کی وجہ سے برزخ کا یہ عقیدہ نامعقول اور غلط ہے، تو تناسخ بھی نامعقول اور غلط ہے، تو تناسخ کو ماننے کی صورت میں جو تاخیر ہوتی ہے، اُسے بھی ظلم اور اُس کی وجہ سے نظریۂ تناسخ کو بھی نامعقول اور غلط کہنا چاہیے۔ اور اگر تناسخ کی صورت کی یہ تاخیر ظلم نہیں، تقاضائے عدل وانصاف ہے تو برزخ کی صورت میں نظر آنے والی تاخیر بھی ظلم نہیں مقتضائے عدل وانصاف ہوگی۔

جواب دوم

اس الزامی جواب کے علاوہ مذکورہ بالا اعتراض کا قدرے علمی وتحقیقی جواب بھی درج ذیل ہے:

اس جواب کے حوالے سے یہ بات ذہن میں رکھیں کہ پنڈت دیانند نے جزاسزا میں تاخیر کو خلافِ عدل مان کر اسے بنیاد بناتے ہوئے برزخ قیامت اور حساب کتاب سے متعلق الام عقائد کو غلط اور خلافِ عقل وواقعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور اسی بنیاد پر ان کے مقابلے میں تناسخ

اور آواگن کے نظریے کو زیادہ درست اور قرین عقل وقیاس قرار دیا ہے۔
جزاوسزا میں تاخیر کس حد تک خلاف عقل وواقعہ ہے؟ اسلامی تعلیمات وعقائد کی روشنی میں پہلے اس کی وضاحت درج ہے۔اس کے بعد چند دلائل سے قیامت کو ثابت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ضمناً آواگون کے نظریے کا ناقابل قبول ہونا بھی بتلایا جائے گا۔

جزاوسزا میں تاخیر خلافِ عدل نہیں

جہاں تک پنڈت دیانند کے اِس اعتراض کا تعلق ہے کہ قیامت اور روزِ حشر میں حساب کتاب کے اسلامی عقیدے کے مطابق چوں کہ جزاوسزا میں تاخیر لازم آتی ہے اور تاخیر کا خلافِ عدل ہونے کی وجہ سے، غلط اور ناقابلِ قبول ہونا لازم آتا ہے تو اِس سلسلے میں عرض ہے کہ پہلی بات تو یہ کہ یہ بنیاد ہی غلط ہے کہ جزاوسزا میں تاخیر خلافِ عدل ہے دراصل جیسا کہ اعتراض کی تقریر سے واضح ہوتا ہے یہاں بنیادی غلط فہمی یہ ہوئی کہ جزاوسزا کے خدائی عمل کو مزدور کی مزدوری کی طرح سمجھ لیا گیا ہے اور چونکہ کسی مزدور کو اُس کی مزدوری اور حقِ محنت دینے میں تاخیر یا ٹال مٹول سے کام لینا عام طور پر ایک غیر منصفانہ اور ظالمانہ فعل سمجھا جاتا ہے، اسی پر قیاس کرتے ہوئے جزاوسزا میں تاخیر کو بھی خلاف عدل سمجھ لیا گیا اور نتیجتاً اس تاخیر کے شبہے پر جزاوسزا، قیامت اور حساب کتاب کے اسلامی عقائد کو بھی ظالمانہ اور غیر منصفانہ قرار دے دیا گیا۔ حالاں کہ جیسا کہ ہم آگے بتا رہے ہیں یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ اور اسلامی تعلیم کی رو سے جزاوسزا کا خدائی عمل مزدور کی مزدوری سے مفہوم، حقیقت اور حیثیت ہر لحاظ سے یکسر مختلف ہے اور ان میں یکسانیت کی کوئی بنیاد ہی نہیں کہ جزاوسزا کو مزدور کی مزدوری پر قیاس کرنا اور مزدوری ہی کی طرح اسے بھی خدا کے اوپر اس کے اچھے یا بُرے بندوں کا واجب الادا حق سمجھنا کسی لحاظ سے بھی صحیح ہو۔ اِن دونوں میں کیا اختلاف ہے؟ اس کی وضاحت تو آگے آرہی ہے، لیکن اس سے قبل یہ سمجھ لیجئے کہ اگر بالفرض جزاوسزا میں ہونے والی ظاہری تاخیر کا خلافِ عدل ہونا لازم نہیں ہوتا۔ کیوں کہ خود مزدور کی مزدوری کی ادائیگی میں تاخیر کو کلیتاً اور ہر حال میں خلافِ عدل سمجھا نہیں جاتا۔ کچھ مثالیں ایسی بھی ہیں جن میں مزدور کی مزدوری میں تاخیر کو خلافِ عدل

نہیں، جائز و مستحسن سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی تقریب کے لیے کسی باورچی سے کھانا بنوایا جاتا ہے یا درزی سے کپڑے سلوائے جاتے ہیں، تو عام طور سے ایسی صورتوں میں باورچی اور درزی کو اس کی مزدوری اُس وقت تک نہیں دی جاتی جب تک کہ اُس کا کام تیار ہو جانے کے بعد مالک کو پسند نہیں آجاتا۔ بلکہ پسند نہ آنے کی صورت میں تو اُنھیں اُن کی مزدوری دینے کے بجائے۔ اُن سے جرمانہ وصول کرنے کے عمل کو خلافِ عدل سمجھا جاتا ہے۔

کیوں کہ ان صورتوں میں مزدور کی مزدوری بھی اُس وقت تک واجب نہیں ہوتی جب تک اُس کا کام پسندیدہ شکل میں مکمل و تیار نہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی صورت میں کوئی کام اگر کئی مزدور مل کر اجتماعی طور پر پورا کر رہے ہوں جیسا کہ ٹھیکے وغیرہ میں ہوتا ہے تو اس جگہ اور زیادہ تاخیر لازم آتی ہے اور جب تک سب مزدور مل کر کام کو پایۂ تکمیل نہیں سمجھا جاتا۔ معلوم ہوا کہ مزدوری کی بہت سی ایسی بھی شکلیں ہیں، جن میں تاخیر خلافِ عدل نہیں، محمود و مطلوب ہوتی ہے۔ تو انہی شکلوں پر جزا و سزا کو قیاس کرتے ہوئے اُن میں لازم آنے والی تاخیر کو بھی محمود و مباح سمجھا جائے تو کیا حرج ہے؟

جزا و سزا کی حقیقت

بہر حال، یہ جواب تو اس مفروضے کی بنا پر ہے کہ جزا و سزا کو مزدوری پر قیاس کرنا صحیح ہو اور اسے بھی مزدوری کی طرح ایک واجب الادا حق سمجھا جائے۔ لیکن، جیسا کہ عرض کیا گیا:

> اصل حقیقت یہ ہے کہ جزا و سزا اور مزدوری میں اشتراک و یکسانیت کی کوئی بنیاد نہیں کہ ایک کا دوسرے پر قیاس کرنا صحیح ہو۔ جزا و سزا یا خدا کا نیک لوگوں کو انعام و اکرام سے نوازنا اور بُرے افراد کو مبتلائے عذاب کرنا اُس پر بندوں کا واجب الادا کرنا کسی طرح کا بھی کوئی حق نہیں ہے کہ اس میں تاخیر یا تعجیل کے مذموم یا محمود ہونے کا کوئی سوال پیدا ہو۔

اس کے برعکس اصل صورتِ حال یہ ہے کہ جیسا کہ اس سے قبل ایک موقع پر عرض کیا گیا تمام بندے خدا کے مملوک و مخلوق ہیں، جنھیں اس نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور اس لیے ان کا فرض ہے کہ وہ خدا کی اور اپنے خالق و مالک کی اطاعت و عبادت

کر کے، اس کے احکام کی تعمیل کر کے اپنا مقصدِ تخلیق پورا کریں۔ لہٰذا ایسا کر کے وہ خدا پر کوئی احسان نہیں کرتے، اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس عبادت واطاعت پر خدا اگر بندوں کو انعام واکرام سے نوازے، تو یہ محض اُس کا احسان اور لطف وکرم ہوگا، اِس کی حیثیت اُس پر واجب بندوں کے کسی لازمی حق، فرض یا قرض کی نہیں ہوگی کہ اس میں ہونے والی تاخیر کو کسی طرح کے ظالمانہ اور غیر منصفانہ عمل سے تعبیر کرنا صحیح ہو۔ اس طرح واضح ہوا کہ خدا کی طرف سے اُس کے نیک اور اطاعت شعار بندوں کو جزا یا انعام واکرام ملنے میں اگر کوئی تاخیر ہو بھی تو اِسے کسی بھی لحاظ سے خلافِ عدل کہنا صحیح نہیں ہوگا، کیوں کہ اِس جزا اور انعام واکرام کی حیثیت صرف احسان کی ہے، اور بطورِ احسان جو بھی مل جائے غنیمت ہے، اس میں تاخیر قطعاً مذموم نہیں سمجھی جاتی اس سے تو جزا کی تاخیر کا خلافِ عدل نہ ہونا ثابت ہوا، جہاں تک سزا میں تاخیر کے خلافِ عدل ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا مہمل وغلط ہونا بھی واضح ہے۔ کیوں کہ بندے خدا کی نافرمانی کر کے اُس کی جو حق تلفی کرتے ہیں، اس کی وجہ سے خدا کا یہ حق ہوتا ہے کہ وہ انھیں سزا دے اور مبتلائے عذاب وعتاب کر کے اُن کی نافرمانی کا مزہ چکھائے لیکن اگر وہ اس میں تاخیر یا عفو ودرگذر سے کام لے تو یہ خلافِ عدل نہیں، عین مقتضائے عدل وکرم ہے! غرض، اس طرح واضح ہوا کہ اسلامی عقیدے کی رو سے جزا وسزا میں اگر کوئی تاخیر لازم آتی ہو تو یہ کسی لحاظ سے بھی خلافِ عدل وانصاف نہیں کہ اِسے نامعقول اور غلط کہا جائے۔

ایک شبہ کا ازالہ

ہاں، یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ جزا وسزا صرف حقوق اللہ میں ہی منحصر نہیں کہ اس میں تاخیر کو خلافِ عدل نہ کہا جائے، بلکہ بندوں کے ایسے کچھ حقوق بھی بعض بندوں پر واجب ہوتے ہیں، جن کی ادائیگی دنیا میں پورا نہ ہونے کی صورت میں قیامت پر موقوف ہوتی ہے کہ اس روز خدا کے دربار عدل وانصاف میں تمام مظلوم بندوں کو ظالموں سے اُن کے حقوق دِلوائے جائیں گے۔ تو سوال یہ ہے کہ اس لحاظ سے مظلوم انسانوں کو اُن کے حقوق ملنے میں قیامت اور حشر ونشر کے اسلامی عقیدوں کی رو سے جو تاخیر لازم آتی ہے، کیا وہ بھی قابلِ گرفت نہیں ہے؟

تو جواباً عرض کیا جائے گا کہ اسلام نے حکمرانوں اور تمام ذمہ دار افراد کو اپنے رعایا اور ماتحتوں کے جملہ حقوق کی ادائیگی کی جو تاکید کی ہے اور انسانوں میں سے ہر ایک پر دوسروں کے تئیں واجب ہونے والے حقوق و فرائض کی ادائیگی کی جو سخت ہدایت کی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی ادائیگی میں دنیا میں جس قدر تعجیل ممکن ہے، اُس میں اسلام نے کسی قسم کی ڈھیل نہیں دی ہے۔ البتہ کچھ ایسے حقوق ضائع نہیں ہوتے بلکہ یہاں نہیں ہوتے بلکہ یہاں نہیں تو قیامت میں اُس کی ادائیگی ضرور ہوگی اور خدا روزِ قیامت ہر حق دار کو اس کا حق ضرور دِلائے گا۔ اور قیامت تک ان حقوق کو مؤخر رکھنے کی وجہ اور مصلحت و حکمت یہ ہے کہ خدا اپنے بندوں کے حق میں صرف حاکم، مالک اور خالق ہی نہیں ہے، بلکہ وہ ان کے لیے ان کے والدین سے بھی زیادہ مہربان و شفیق ذات کی حیثیت بھی رکھتا ہے، چنانچہ ایک طرف اگر اس نے حاکم و مالک ہونے کی حیثیت سے بندوں کو یہ حکم دے رکھا ہے کہ وہ اس کے حقوق کے ساتھ ساتھ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا بھی پورا خیال رکھیں اور اُن کی ادائیگی میں کسی کوتاہی اور کمی کا اظہار نہ کریں، تو دوسری طرف ان کے کارساز، مہربان و مُشفق کی حیثیت سے یہ راہ بھی نکال رکھی ہے کہ اگر کچھ حقوق حق دار بندوں کو دنیا میں نہ مل سکیں، تو اُنھیں قیامت تک کے لیے محفوظ رکھ دیا جائے تاکہ کل روز قیامت میں جب نفسی نفسی کا عالم ہوگا اور لوگوں کے پاس خدا کی رحمت اور ظاہری طور پر اپنے ان باقی ماندہ حقوق کے سوا کوئی سامانِ نجات نہ ہوگا، وہ اس سخت گھڑی میں اپنے ان حقوق سے ہدایت خداوندی کے مطابق اپنا کام نکال سکیں اور نجات پاسکیں، دُنیا عالمِ اسباب ہے، یہاں بہ وقتِ ضرورت مختلف حیلوں، بہانوں یا اسباب وسائل کے ذریعے حاجت پوری کی جاسکتی ہے مگر قیامت میں کہ سارا عالمِ اسباب درہم برہم ہوجائے گا اور حیلے بہانے کی تمام راہیں بھی مسدود ہوجائیں گی، یہی حقوق کام آسکیں گے جنھیں خدا نے روزِ جزا سزا کے لیے محفوظ رکھ رکھا ہے۔

معلوم ہوا کہ حقوق اللہ میں تاخیر تو مذموم یا خلافِ عدل و انصاف ہیں ہی نہیں حقوق العباد میں ظاہر بینوں کو جو تاخیر نظر آتی ہے، وہ بھی مذکورہ مصلحت و حکمت کے لحاظ سے مذموم نہیں، بلکہ سراسر مطلوب و محمود ہے۔ اس پوری تفصیل سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ قیامت

اور جزا وسزا کے اسلامی عقائد کی رو سے نیکوں کو اُن کی نیکی جزا اور بُروں کو اُن کی بُرائی کی سزا ملنے میں جو بظاہر تاخیر نظر آتی ہے، اُسے کسی لحاظ سے بھی ظلم نہیں کہا جا سکتا، جیسا کہ پنڈت دیانند کو غلط فہمی ہوئی۔

قیامت کی دلیل اوّل

یہ ایک عام اور مسلّمہ قاعدہ ہے کہ کوئی چیز اگر مختلف الاغراض اشیاء سے مرکّب ہو، تو ایک نہ ایک روز وہ لازماً توڑ پھوڑ کا شکار ہوتی ہے جس کے نتیجے میں اُس کے مختلف الاغراض اجزا اُس سے الگ ہو کر اپنے اپنے اصل ٹھکانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر کھیتی کو لے لیجئے۔ یہ اس لحاظ سے مختلف الاغراض اجزا سے مرکب ہوتی ہے کہ عام طور سے اس کی جو پیداوار ہوتی ہے، اس کا ایک جز تو غلّہ اور اناج ہوتا ہے جس کی غرض انسانی ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے اور دوسرا حصّہ بھُس وغیرہ ہوتا ہے جس کا مقصد جانوروں کی غذائی ضروریات کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ ان مختلف الاغراض اجزا پر مشتمل ہونے ہی کا نتیجہ ہے کہ ایک نہ ایک روز کھیتی کو کاٹ چھانٹ سے ضرور دوچار ہونا پڑتا ہے جس کے بعد اُس کے مختلف اجزا کو علاحدہ علاحدہ کر کے انھیں اُن کے مختلف اغراض کے لیے استعمال میں لایا جاتا ہے اور وہ اپنے اصل ٹھکانوں تک پہنچ جاتے ہیں۔ چناں چہ غلّہ اور اناج کو الگ کر کے اُس سے انسانی ضروریات پوری کی جاتی ہیں اور بھُس وغیرہ سے جانوروں کی شکم سیری کا مقصد حاصل کرنے کے لئے انھیں الگ رکھ لیا جاتا ہے اور پھر حسب ضرورت انھیں ان کے مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

غرض یہ طے شدہ ہے کہ مختلف الاغراض اجزا سے مرکّب شے لازمی طور پر کبھی نہ کبھی توڑ پھوڑ کا شکار ہوتی ہے اور پھر اُس کے اجزا الگ الگ ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں سے جا ملتے ہیں۔ اِس قاعدے کی رو سے اگر کائنات کی ترکیب پر غور کیا جائے تو اس کا مختلف الاغراض والحقائق اشیا سے مرکّب ہونا واضح ہو جاتا ہے۔ اس لیے مذکورہ قاعدے کے مطابق نظامِ کائنات کا کسی نہ کسی روز درہم برہم ہونا لازمی ہو جاتا ہے، جس کے بعد اُس کے اجزا کُلّ شئي یرجع الی اصلہ کے مطابق اپنے اپنے ٹھکانوں اور اصل سے جا ملیں گے۔ نظامِ کائنات کی اسی برہمی اور انتشار وخلل پذیری کو ہم قیامت کہتے

ہیں اور ہر شئی اور ہر جُز کا اپنے اپنے ٹھکانوں سے جا ملنے کا نام ہمارے نزدیک حساب کتاب یا جزا سزا ہے۔ جس کی رو سے نیکی اور نیک لوگ اپنی اصل اور اپنے ٹھکانے جنت میں اور برائی اور بُرے لوگ اپنے ٹھکانے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔

جہاں تک کائنات کے مختلف الاغراض اجزا پر مشتمل ہونے کا تعلق ہے، تو اس کا اظہار اس کے ہر ہر جز اور ہر ہر رُکن اور ہر ہر طبقے سے نمایاں طور پر ہوتا ہے۔ مثلاً کائنات کے اجزا عناصر اور طبقات میں سے زمین کی کچھ اور ہی خوبیاں ہیں اور پانی کچھ اور ہی خصوصیات ہیں۔ مومن کسی اور کام کا ہے اور کافر کسی اور مصرف کا۔ عُلما کسی اور مَصرف کے ہیں اور جہلا کسی اور مصرف کے۔ ذکی اور غبی میں فرق سخی اور بخیل میں تفاوت، مَرد اور نامرد میں امتیاز، عورت اور مرد میں اختلاف، غرض دنیا کی ہر شے۔

ہر گُلے را رنگ و بو دیگر است، کا مصداق ہے اس لئے مذکورہ قاعدے کی رو سے اُس کے نظام کا درہم برہم ہونا اور پھر اس کے مختلف اجزا، عناصر اور طبقات کا شیرازۂ ترکیب سے الگ ہو کر اپنی اپنی اصل میں جا ملنا ضروری ہوا۔ اور اسی کا نام اسلامی نقطۂ نظر سے قیامت اور حساب کتاب کے بعد جنت اور جہنم میں جانے کے مراحل طے کرنا ہے جیسا کہ مذکورہ ہوا۔ (انتصار الاسلام ص: ۵۰، ۵۱)

دلیلِ دوم

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ عالم اور کائنات چند اجزا اور اعضا کے ایک مجموعے کی حیثیت رکھتا ہے، اُسی طرح جس طرح جسم انسانی مختلف اعضا و جوارح کا ایک مجموعہ ہے۔ چناں چہ جس طرح انسانی جسم کے اعضا و جوارح، آنکھ، ناک، ہاتھ، پاؤں وغیرہ الگ الگ مقاصد اور مختلف اغراض میں کام آتے ہیں، اسی طرح مجموعۂ کائنات کے اجزا مثلاً زمین، آسمان، پہاڑ اور دریا وغیرہ بھی مختلف اغراض اور الگ الگ مقاصد کے لیے کار آمد ثابت ہوتے ہیں۔ اور جس طرح انسانی جسم کے عناصرِ اربعہ، آگ، پانی ہوا اور مٹی میں سے ہر عنصر الگ الگ خصوصیات و اوصاف کا حامل ہے، اسی طرح عالمِ ناپائدار کے اجزا میں سے ہر ایک الگ الگ خاصیت و حقیقت رکھتا ہے، چنانچہ اُس کے اجزا عناصر میں

دے مثلاً علویات کی مختلف خاصیتیں ہیں، سفلیات کی الگ حقیقتیں ہیں اور نفسانی خواہشات کے دوسرے تقاضے اور جُدا گانہ تاثیرات ہیں وغیرہ وغیرہ۔ غرض، اس طرح واضح ہوتا ہے کہ مجموعۂ کائنات کو انسانی جسم کے ساتھ بہت حد تک مشابہت و یکسانیت حاصل ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ صوفیا نے اپنی خاص اصطلاح میں کائنات کو ''شخص اکبر'' اور جسمِ انسانی کو اس کے مقابلے میں ''شخصِ اصغر'' یا کائنات کو ''عالمِ اکبر'' اور جسمِ انسانی کو ''عالمِ اصغر'' سے تعبیر کیا ہے۔ تو اِسی مشابہت و مماثلت کو ذہن میں رکھتے ہوئے سمجھیے کہ جس طرح ''شخصِ اصغر'' انسانی کے جسمِ خاکی میں اگر کسی خلط کے باعث اُس کے مزاجِ اصلی اور اعتدال میں کوئی تغیر و فساد رونما ہو جائے تو اسے مرض (یا علامتِ مرگ وغیرہ) سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی طرح ''شخص اکبر'' کائنات کے مزاج و ترکیب میں اگر اُس کے کسی عُنصر یا رُکن کے غلبے کے باعث (مثلاً خواہش نفسانی کے، گمراہی اور بے راہ روی کے غلبے کے باعث) اگر اُس کے اصل اور معتدل مزاج میں کسی طرح کا تغیّر و فساد رونما ہو جائے اور کوئی نئی اور انوکھی کیفیت ظاہر ہو جائے۔ تو اسے اسلامی نقطۂ نظر سے کائنات کے مرض یا بالفاظ دیگر علامت قیامت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ تغیّر و فساد اور مرض میں اگر اتنی شدّت پیدا ہو جائے کہ اس نتیجے میں انسانی روح جسم سے الگ ہو جائے، تو اِسے موت سے تعبیر کرتے ہیں، اسی طرح کائنات کی ترکیب میں بھی اگر مذکورہ فساد و تغیر کی وجہ سے ایسا خلل پیدا ہو جائے کہ اُس کے نتیجہ میں اُس کی روح کو اس سے الگ ہونا پڑے، تو اِسے اسلامی تعلیم کی رو سے ''قیامت'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پھر جیسے موت کے بعد انسانی جسم جن عناصر سے مرکّب ہوتا ہے، وہ الگ الگ ہو کر اپنی اپنی اصل سے جا ملتے ہیں (چنانچہ آگ سے آگ، پانی پانی سے مٹّی مٹّی سے اور ہَوا ہوا سے مل جاتی ہے)، اسی طرح ''عالم اکبر'' اور ''شخصِ اکبر'' کائنات کے نظام کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کے شیرازۂ ترکیب میں شامل ہر جُز، ہر عنصر اور ہر طبقہ بھی اپنی اصل سے جا ملے گا، چنانچہ نیکی اور نیکیوں کا عنصر و طبقہ جنّت میں اور ہر برائی اور بُروں کا عُنصر و طبقہ جہنم میں پہنچ جائے گا۔ اسی عمل کو اسلام میں جزا و سزا، حساب کتاب اور پھر جنت و جہنم میں جانے کے مرحلے سے تعبیر کیا گیا ہے۔

دلیلِ سوم

اثبات قیامت کی تیسری دلیل قدرے مفصل انداز میں آگے آرہی ہے، یہاں صرف اس کا خلاصہ درج ہے کہ جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، کارخانۂ عالم کی ایجاد تخلیق ایک خاص مقصد کے پیش نظر میں عمل میں آئی ہے اور وہ ہے خدا کی عبادتِ کاملہ۔ عبادت کاملہ کا جب یہ خاص مقصد پورا ہو جائے گا، تو جس طرح کھانا وغیرہ پک جانے اور اُس کے تمام لوازمات وغیرہ کے تیار ہو جانے کے بعد باورچی خانے کو ٹھنڈا کر دیا جاتا ہے، اُسی طرح کارخانۂ عالم کا ہنگامہ بھی ختم اور اس کا نظام بھی درہم برہم کر دیا جائے گا۔ کارخانۂ عالم کے ہنگامے کے اسی اختتام اور اس کے نظام کی اس برہمی کو اسلام میں قیامت کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے اس قیامت کے بعد حساب کتاب اور جزا سزا کی نوبت آئیگی، جسے اسلام میں یوم الحساب، حشر اور یوم الفصل وغیرہ کے ناموں سے موسوم کیا گیا ہے۔ روزِ جزا کو یوم الحساب کہنے کی وجہ تو ظاہر ہے کہ دونوں کے معنی ایک ہیں، اسے حشر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں حشر کے معنی جمع کرنے کے ہیں اور اس روز ابتدائے آفرینش سے قیامت تک کی تمام مکلّف و باشعور مخلوقات کو خدا کی عدالت میں جمع کیا جائیگا۔ اور اسے یوم الفصل کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں نیک اور بد میں کچھ زیادہ امتیاز باقی نہیں رہتا اور وہ سب باہم مخلوط و مجتمع رہتے ہیں۔ مگر روزِ قیامت میں اُن میں سے ہر ایک کو الگ الگ کر کے بُروں کو اُن کے ٹھکانے اور نیک لوگوں کو اُن کے اصل مقام پر بھیج دیا جائے گا اور اس طرح وہ دن اُنکے درمیان فصل و امتیاز کا دِن یومُ الفصل ہوگا۔

غرض کارخانۂ عالم کی تخلیق کا مقصد عبادتِ کاملہ جب پورا ہو جائے گا، تو اِسے ختم کر دیا جائے گا اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ اور اس طرح قیامت کا اسلامی عقیدہ عقلاً ثابت ہو جاتا ہے۔ مگر یہ ذہن میں رہے جیسا کہ آگے آرہا ہے خدا کی عبادتِ کاملہ کا مقصد اُس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا، جب تک خاتم النبیین کے دین و مذہب کو عمومی سیادت اور تسلط حاصل نہ ہو جائے اور اس طرح گویا یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ قیامت کے آنے اور نظامِ کائنات کے فنا اور درہم برہم ہونے سے قبل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ورودِ مسعود اور اُن کے لائے ہوئے پیغام اور مذہب و تمدن کا دنیا پر چھا جانا کیوں ضروری ہے؟

عبادت کاملہ اور اُس کی ادائیگی کی شکل

اس اجمال کی تفصیل کو سمجھنے کے لئے بہ طورِ تمہید یہ سمجھنا چاہئے کہ خدا کی عبادت صحیح طور پر اور اس کی مرضی کے مطابق اسی وقت ممکن ہے جب کہ اُس کے نام اَسماء وصفات کے مقابلے میں عجز و نیاز اور تضرّع وزاری کا مکمل اظہار کیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ عبادت عجز و نیاز کے اظہار کا نام ہے اور کسی کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار اُسی سے ممکن ہے، جو اُس کا محتاج اور اُس سے کسی معاملے میں اندیشہ مند ہو، جیسا کہ اِس سے قبل بھی بتایا جا چکا ہے۔

اِس لحاظ سے غور کریں، تو معلوم ہوگا کہ بندہ خدا کا محتاج بھی ہے اور اُس سے اندیشہ مند بھی۔ محتاج بہ ایں طور کہ بندوں کے پاس اپنا کچھ بھی نہیں ہے، جو کچھ بھی ہے اُسی خدائے خالق و مالک کا عطا کردہ ہے۔ اور اندیشہ مند بہ ایں وجہ کہ خدا کوئی چیز دے کر اپنی قہاری و خود مختاری کی بنا پر اُسے بندوں سے واپس بھی لے سکتا ہے، جس کے پیش نظر بندے ہر وقت اندیشہ مند رہتے ہیں کہ خدا اُن سے اپنی عطا کردہ شے چھین نہ لے۔ اس طرح بندوں کا خدا کے تئیں محتاج اور اُس سے اندیشہ مند ہونا واضح ہو جاتا ہے اور یہ بھی کہ خدا اُنکا اصل معطی اور محتاج الیہ ہے۔ پھر بندوں کا یہ احتیاج صرف چند صفات میں نہیں، بلکہ خدا میں موجود ہر ہر صفت کے مقابلے میں ہے۔ کیوں کہ خدا میں جتنی صفات ہیں، بندے اُن میں سے اکثر صفات سے عاری ہیں۔ اُن میں سے چند صفات اگر اُنھیں ملی بھی ہیں، تو وہ بھی اس طرح کہ وہ انکے بارے میں پوری طرح خدا کے حاجت مند دوست نگر ہیں۔ اور جب بندے تمام صفات میں خدا کے محتاج ہوئے، تو ان تمام کے مقابلے میں اُن کیلئے اپنے عجز و نیاز کا اظہار بھی ضروری ہوا اور اِسی کا نام عبادت ہے۔

اِسی طرح یہ حقیقت ثابت ہوتی ہے کہ خدا کی عبادتِ کاملہ اُس وقت تک ممکن نہیں جب تک اس کی ہر ہر صفت کے تقاضے کو پورا کرتے ہوئے اس کی تمام صفات کے مقابلے میں عجز و نیاز اور تضرّع وزاری کا اظہار نہ کیا جائے۔ دوسری طرف یہ حقیقت بھی مسلم ہے کہ خدا کی ہر صفت کے مقابلے میں اظہارِ عجز و نیاز انسانوں کے لیے ممکن نہیں۔ کیوں کہ خدا کی صفات غیر محدود اور غیر متناہی ہیں جن کے مقابلے میں مکمل اظہارِ عجز و نیاز کے لیے بھی غیر محدود زمانہ چاہئے اور یہ

بندوں اور انسانوں کی نہایت محدود و مختصر زندگی کے پیشِ نظر اُن کے لیے ممکن نہیں ہے۔

ہاں، اِن تمام صفات کے مقابلے میں بالا جمال عجز و نیاز کا اظہار البتہ ممکن ہے مگر اُس شخص سے جسے خاتم المراتب ہونے کا درجہ حاصل ہو۔ اور خاتمِ المراتب ہونے کا درجہ اُسی شخص کو حاصل ہو سکتا ہے جس میں وہ صفت موجود ہو جسے خاتم الصفات کہا جاتا ہے۔ یعنی صفتِ علم۔ اس طرح گویا نتیجہ یہ نکلا کہ جس ذات میں صفتِ علم بدرجۂ کمال پائی جائے گی، اسی ذات کو خاتم المراتب کی حیثیت کے حامل ہونے کا شرف حاصل ہوگا اور پھر وہی عبادت کاملہ یعنی خدا کی نام صفات کے مقابلے میں بالا جمال اظہارِ عجز و نیاز پر قادر ہوگی۔

علم، خاتم الصفات کیوں ہے؟

قبل اس کے کہ ہم یہ نشان دہی کریں کہ خاتم المراتب ہونے کا شرف و امتیاز کس فرد کو حاصل ہے، یہ بتا دینا مناسب ہے کہ علم کو خاتم الصفات ہونے کا درجہ کیوں کر حاصل ہے؟ تو اس سلسلہ میں یہ ذہن نشین رکھنا چاہئے کہ صفات میں باہم ترتُّب توقُّف اور نتیجتاً فرق مراتب ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر قدرت، ارادہ اور علم، تینوں صفات ہیں، مگر ان میں ترتب، توقف اور فرق مراتب کی صورت یہ ہے کہ قدرت کا تعلق ارادے کے تعلق پر موقوف ہے اور ارادے کا تعلق علم کے تعلق پر موقوف ہے، مگر علم کا تعلق ان میں سے کسی کے تعلق پر موقوف نہیں۔ پھر قدرت اور ارادہ دونوں علم کے تعلق پر اس طرح موقوف ہیں کہ علم کے بغیر قدرت اور ارادہ کا تصوّر بھی ممکن نہیں ہے۔

اِسے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ مشیتِ الٰہی جب کوئی کام کرنا چاہتی ہے، تو قدرتِ خداوندی سے وہ کام انجام پذیر ہو جاتا ہے۔ مگر اس قدرت سے بھی پہلے اس کام کا ارادہ ہوتا ہے اور ارادے، سے بھی قبل اس کا علم کہ کیا کرنا ہے۔ چناں چہ اس ترتیب کے اعتبار سے دیکھئے کہ پہلے علم پایا گیا، پھر کام کا ارادہ اور پھر اُس کی قدرت وجود پذیر ہوئی، گویا قدرت اور ارادہ دنوں بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر علم پر موقوف ہوئے، مگر علم ان میں سے کسی پر موقوف نہیں ہوا کیوں کہ وہ سب سے پہلے وجود پذیر پھر جس طرح علم، پھر ارادہ اور پھر قُدرت کے وجود پذیر ہونے نہ ہونے کی یہ ترتیب اور یہ توقّف تصوّر و خیال

میں پائے جاتے ہیں، اُسی طرح بالفعل وجود و تحقیق میں بھی یہی ترتیب قائم رہتی ہے۔ یعنی وجود و تحقیق کے اعتبار سے بھی پہلے علم ہوتا ہے۔ پھر ارادہ اور پھر قدرت یا بالفاظِ دیگر، تحقیق کے لحاظ سے بھی قدرت وارادہ وغیرہ دیگر صفات کے مقابلے میں وہی ہوئی جو شعاعِ آفتاب کو دھوپ وغیرہ کے مقابلے میں حاصل ہے۔ یعنی جس طرح دھوپ اور روشنی وغیرہ کا وجود و تحقیق اُس شعاعِ آفتاب کے وجود و تحقیق پر موقوف ہوتا ہے جو جرمِ آفتاب میں پائی جاتی ہے اور اُس سے پھوٹتی ہے، اسی طرح قدرت وارادہ وغیرہ صفات بھی صفتِ علم پر موقوف ہوتی ہے۔ اور جس طرح دھوپ کے مقابلے میں اُس کے موقوف علیہ شعاع آفتاب کو فوقیت و برتری حاصل ہے، اسی طرح قدرت وارادہ وغیرہ صفات کے مقابلے میں بھی ان کے موقوفِ علیہ صفتِ علم کو فوقیت و برتری حاصل ہوگی اور اس طرح صفتِ علم کا تمام صفات کا خاتم اور اُن سے افضل و برتر ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔

پھر اب تک کی گفتگو خداوندی صفات کے بارے میں تھی، جن میں صفتِ علم کا خاتم الصفات ہونا ثابت کیا گیا۔ لیکن بندوں کی صفات بھی چوں کہ صفاتِ خداوندی کا عکس ہوتی ہے، اس لیے ان کی بھی وہی ترتیب ہوگی جو صفاتِ خداوندی کی بیان ہوئی اور ان میں بھی صفتِ علم کو اُسی طرح خاتم الصفات کا درجہ حاصل رہے گا جس طرح صفاتِ خداوندی میں تھا۔ چنانچہ بندوں میں اگر کسی کو اس خاتم المراتب کی حیثیت حاصل ہوگی جیسا کہ عرض کیا گیا، خاتم المراتب ہونے کی وجہ سے وہی عبدیتِ کاملہ کا حامل بھی ہوگا۔ یعنی صرف اُسی کے بس میں یہ قدرت ہوگی کہ وہ خدا کی ہر ہر صفت کے مقابلے میں بالاجمال تضرع وزاری کا اظہار کر کے اُس کی عبادتِ کاملہ کا حق ادا کر سکے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی شخص میں اگر خدا کی اس صفتِ علم ظہور ہو، جو کامل اور خاتم الصفات: تو اس لحاظ سے کہ کامل و اکمل صفتِ خداوندی کا ظہور اُسی میں ہو سکتا ہے جس کے ظرف میں اتنی وسعت ہو کہ وہ اس صفت کو سمو سکے، جس شخص میں خدا کی اِس کامل و اکمل صفت کا ظہور ہوا ہو، اس کے ظرف میں بھی خدا نے اتنی وسعت ضرور دی ہوتی کہ اس میں دیگر کمالات وصفاتِ خداوندی کو سمو لینے کی گنجائش موجود ہو گو بالفعل ایسا نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں قالب موجود ہو اور اس میں کمالات وصفاتِ خداوندی کے سمانے کی گنجائش بھی ہو، مگر بالفعل وہ قالب اور ظرف اِن صفات

وکمالات سے خالی ہو۔ تو اگر ایسا کوئی شخص ہو، جو خدا کی خاتم الصفات صفتِ علم میں کامل ہو اور خاتم المراتب ہو تو بلاشبہ تمام کمالات وصفاتِ خداوندی کو اپنے ظرف میں سما لینے کی قدرت وسعت رکھنے کی وجہ سے اُس میں یہ قدرت بھی ہوگی کہ وہ ان سب کے مقابلے بالاجمال عجز و نیاز کا اظہار کر سکے۔

خاتم المراتب کون؟

اظہارِ عجز و نیاز کے اِس عمل کا نام عبدیتِ کاملہ ہے۔ اور ایسے باکمال بندے کو عبدِ کامل، سید الکونین اور خاتم النبیین کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا خوش بخت و باکمال عبدِ کامل ہے کون؟ تو ہمارا جواب ہے کہ عبدِ کامل کی یہ ذات صرف محمدِ عربی صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مُبارک ہے، جیسا کہ ہم آگے مختصراً ثابت کریں گے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ عبادت کاملہ کا یہ عظیم الشان کارنامہ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی اور سے انجام نہیں پا سکتا۔ کیونکہ خاتم الصفات: علم کے بدرجۂ اتم حامل ہونے کی وجہ سے، کمالات وصفاتِ خداوندی کا ظرف ہونے کے باوجود اُن سے محروم ومحتاج ہونے کے سبب اُن سب کے مقابلے میں حقیقی عجز و نیاز کا اظہار بھی صرف آپ ہی کر سکتے ہیں، اور اسی کا نام عبادت کاملہ ہے۔ گویا رات دن محض ظاہری اور جسمانی طور پر مصروف رہنے کا نام عبادتِ کاملہ نہیں، بلکہ یہ اس مجموعۂ عجز و نیاز کا نام ہے جو خدا کی ہر صفت اور ہر کامل کے مقابلے مجملاً ظاہر کیا جائے۔

پھر جب خاتم النبیین او عبدِ کامل صلے اللہ علیہ وسلم کے ورودِ مسعود کے نتیجے میں عبادتِ کاملہ وجود میں آچکی، تو چونکہ کائنات کی تخلیق جس مقصد سے عمل میں آئی تھی، عبادتِ کاملہ کا وہ مقصد اچھی طرح پورا ہو گیا، اس لئے اب کائنات کے بقا کی بھی چنداں ضرورت نہیں رہی۔ ہاں جیسا کہ عرض کیا گیا اب صرف ایک چیز کا انتظار رہے گا کہ دینِ خاتم النبیین پورے عالم پر ایک بار چھا جائے۔ اس کام کے پورا ہوتے ہی، شیرازۂ کائنات بکھیر دیا جائے گا اور اسلامی تعلیمات وعقائد کی رو سے قیامت قائم ہو جائے گی۔

دینِ خاتم النبیین کا مصرف

رہی یہ بات کہ قیامت سے پہلے دینِ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم یعنی اسلام کا ایک

بار پورے عالم میں پھیل جانا ضروری کیوں ہے؟

تو جواب یہ ہے کہ ہر شے کا ایک مَصرف ہوتا ہے، جس کے بغیر کسی بھی چیز کا وجود مہمل اور فضول ہوتا ہے۔ روٹی کا مصرف کھانا ہے، اگر پکا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کس کام کی؟ پانی کا مصرف پینا ہے، اگر لائیں اور اس سے تشنگی دور نہ کریں تو اُس کا کیا فائدہ؟ اسی طرح دینِ خاتم النبیین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مَصرف بھی پورے عالم کی ہدایت ورہنمائی ہے، اگر یہ کام اُس سے حاصل نہ ہوا تو وہ بے مَصرف اور نتیجتاً بے مقصد وفضول قرار پائے گا۔

وجہ یہ ہے کہ خاتم الصّفات علم اور اس کے نتیجے میں نبوت کے حامل ہونے کی وجہ سے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی دو حیثیتیں ہیں ایک عبدِ کامل کی اور ایک سیّد الانبیا اور افضل البشر ہونے کی وجہ سے حاکمِ اعلیٰ کی۔ چنانچہ خدا کے مقابلے میں تو آپ عبدِ کامل کی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کے مقابلے میں آپ حاکم وسربراہِ اعلیٰ کا درجہ رکھتے ہیں، عبدِ کامل ہونے کی وجہ تو گذر چکی، اور جہاں تک بندوں کے مقابلے میں آپ کے سربراہِ اعلیٰ ہونے کی حیثیت کا تعلق ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ خاتم الصفات علم میں کامل ہونے کی وجہ سے آپ خاتم المراتب اور نتیجتاً سیّد الانبیاء والرسل ہوئے اور ظاہر ہے کہ اس طرح آپ لامحالہ تمام انسانوں سے افضل قرار پائیں گے اور چوں کہ عموماً جو سب سے افضل ہوتا ہے، اُسی کو سربراہِ اعلیٰ کا درجہ حاصل رہتا ہے، آپ کو بھی سربراہِ اعلیٰ کی حیثیت رہے گی، اور اس لیے جس طرح سربراہِ اعلیٰ کے رائے آخری اور فیصلہ کُن ہوتی ہے، جس کی تعمیل ہر فرد پر ضروری ہوتی ہے، اسی طرح حضور کا لایا ہوا دین وپیغام بھی آخری اور فیصلہ کُن ہوگا، جسے قبول کرنا ایک نہ ایک روز طوعاً یا کرہاً سب کے لیے ضروری ہوگا۔ اس طرح گویا آپ کا زمانی طور پر خاتم النبیین ہونا بھی ثابت ہوگیا۔

حضور ﷺ کی دو خصوصیتیں

غرض حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی دو لازمی خصوصیتیں ہیں: ایک عبدِ کامل ہونے کی اور دوسری حاکمِ اعلیٰ ہونے کی، اور لازمی ہونے کی وجہ سے ان دونوں کا آپ کی ذات

میں پایا جانا بھی ضروری ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے۔ کہ عبدِ کامل ہونے کی حیثیت سے تو آپ سے عبدیت کاملہ کا ظہور ہو اور حاکم اعلیٰ ہونے کے لحاظ سے آپ کی حاکمیت اعلیٰ بھی آپ کے دین و مذہب کی عام سیادت و قیادت کی صورت میں ظاہر ہو، او جب عبدیت کاملہ اور حاکمیتِ اعلیٰ، دونوں کا ظہور ہو جائے گا تو تخلیق کائنات کا مقصد عبادتِ کاملہ بھی بہ ہمہ وجوہ مکمل ہو جانے کی وجہ یہ ہے کہ مذکورہ دونوں تقاضوں کے پورا ہو جانے کی صورت میں عبادت، کیفی اور کمی دونوں لحاظ سے کامل شکل میں ادا ہو جائے گی۔ چناں چہ محض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شکل میں ایک عبد کاملِ کے پیدا ہونے کی وجہ سے تو عبدیتِ کاملہ کے کمالِ عبادتِ کیفی کا مقصد پورا ہو جائے گا اور آپ صلے اللہ علیہ وسلم کے دین و پیغام کے پوری دنیا میں چھا جانے کی صورت میں عبادتِ کمی کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔ کیوں کہ اس طرح دنیا کا اکثر و بیش تر حصہ خدا کے حضور سر بسجود ہو جائے گا جس کی وجہ سے عبادت گذاروں کی تعداد بہت ہو جائیگی اور جب کیفی و کمی، دونوں لحاظ سے عبادت کا مقصد پورا ہو جائے گا، تو اب عبادت کی کوئی شکل باقی نہیں رہے گی اور اس لئے کائنات کی تخلیق کے مقصد کے پورا ہو جانے کے بعد اُس کے وجود بقا کا کوئی فائدہ بھی نہیں رہے گا۔ حاصل یہ کہ تخلیقِ کائنات کا مقصد عبادت ہے۔ اور عبادت کا یہ مقصد پوری طرح اور خدا کی مرضی کے مطابق اُسی وقت پورا کیا جانا ممکن ہے جب کہ خدا کی ہر ہر صفت کے مقابلے میں بالتفصیل نہ سہی، بالاجمال تضرع وزاری اور عجز و نیاز کا اظہار کیا جائے پھر اظہار عجز و نیاز کے یہ عمل، جسے عبادت کہتے ہیں، کسی کے لیے بھی اُسی شخص سے انجام پا سکتا ہے۔ جو اُس کا محتاج اور اُس سے اندیشہ مند ہو۔ اس لحاظ سے خدا کی ہر صفت چوں کہ اپنی جگہ کامل ہے اور بندے تمام صفات میں خدا کے متاج، دست نگر اور اس سے اندیشہ مند ہیں: اس لیے ان میں علتِ عبادت: احتیاج و اندیشہ مندی کے پائے جانے کی وجہ سے ضروری ہوا کہ وہ خدا کی ہر صفت کے مقابلے میں اظہار عجز و نیاز کر کے عبادتِ خداوندی کا یہ فریضہ انجام دیں۔ اُدھر یہ بھی حقیقت ہے کہ خدا کی تمام صفات کے مقابلے میں بالتفصیل عجز و نیاز کا اظہار بندوں سے ممکن نہیں، کیوں کہ صفات و کمالاتِ خداوندی غیر محدود ہیں اور اس لیے اُن کے لیے بالتفصیل اظہارِ عجز و نیاز کے لیے بھی غیر محدود وقت چاہئے، جو بندوں

کے لیے ان کی نہایت محدود مختصر زندگی کے پیش نظر ممکن نہیں ہے، ہاں جملہ صفاتِ خداوندی کے مقابلے میں بالاجمال عجز و نیاز کا اظہار کر کے عبادت کرنا ممکن ہے، مگر صرف اُسی شخص کے لیے علم جیسی خاتم الصّفات صفت کے حامل ہونے کی وجہ خاتم المراتب ہونے کا شرف رکھتا ہو۔ کیوں کہ جس میں یہ صفت ہوگی، اُس کے ظرف میں دیگر کمالات واوصافِ خداوندی کے سمانے کی وسعت بھی ہوگی، گو بالفعل ایسا نہ ہو۔ اور ظاہر ہے کہ اِس صورت میں خدا کی ہر ہر صفت کے بارے میں احتیاج واندیشہ مندی کی علّت کے موجود ہونے کی وجہ سے اُس ہر ایک صفت وکمالِ خدواندی کے مقابلے میں عجز و نیاز کا اظہار یعنی عبادت کے فریضے کی ادائیگی ضروری ہوگی اور تمام صفات کے مقابلے میں مجملاً عجز و نیاز کے اسی اظہار کا نام عبادتِ کاملہ ہے۔ پھر اس خاتم الصّفات صفتِ علم کے حامل حقیقتاً محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی اور فرد نہیں، اس لیے صرف وہی عبدِ کامل، خاتم المُراتب اور خاتم النبیین ہونے کا شرف امتیاز رکھتے ہیں۔ اسی طرح عبدیتِ کاملہ اور وصفِ علم ونبوّت میں درجۂ کمال پر فائز ہونے کی وجہ سے چوں کہ آپ کو سربراہ اعلیٰ اور سید الاولین والآخرین کی حیثیت بھی حاصل ہوگی، اس لیے یہ بھی لازم ہوگا کہ آپ کا دین و پیغام کم از کم ایک بار پورے عالم پر چھا جائے، اور جب ایسا ہو جائے گا، تو چوں کہ اظہار عجز و نیاز کی صورت میں عبادتِ کیفی کے علاوہ حاکمیت اعلیٰ کی شکل میں عبادتِ کمّی کی بھی ادائیگی ہو جائیگی، اور پھر عبادتِ کاملہ کا کوئی عنصر باقی نہیں رہے گا، اس لیے تخلیق کائنات کے مقصد کے پورا ہو جانے کی صورت میں اس کے مزید وجود و بقا کی ضرورت باقی نہیں رہے گی اور اُسے ختم کر دیا جائے گا، اس کو اور اس کے بعد کے مرحلے کو اسلامی نقطۂ نظر سے قیامت، یوم الحساب حشر اور یوم الفصل والحساب کے ناموں سے جانا جاتا ہے، جن کی وجوہ تسمیہ معلوم ہو چکی ہیں ہے۔

دلیل چہارم

قیامت اور جزا و سزا وغیرہ اسلامی عقائد کو ثابت کرتے ہوئے اب تک تین دلیلیں بیان کی جا چکی ہیں، اور اب اس سلسلے کی یہ چوتھی دلیل درج کی جا رہی ہے۔

دنیا میں جتنی بھی اشیا ہیں اور جو نشو ونما سے دوچار ہوتی رہتی ہیں، ان میں بہت سی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں، جن میں قوتِ نامیہ اور قوتِ مصورہ خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، قوتِ نامیہ کے ذریعے نشو ونما کا عمل انجام پاتا ہے اور قوتِ مصورہ کے ذریعے اشیا کی مختلف شکلیں اور صورتیں وجود پذیر ہوتی ہیں، اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قوتِ مصورہ اصلاً قوتِ نامیہ کی تابع اور خادم ہوتی ہے، یعنی جہاں بھی قوتِ مصوّرہ نظر آئے گی، وہاں محسوس یا غیر محسوس طور پر قوتِ نامیہ بھی ضرور موجود ہوگی اور نشو ونما سے متعلق اپنا کام انجام دے گی، پھر دنیا میں جتنے اوصاف و معانی ہیں، ان میں سے ہر ایک کی کوئی نہ کوئی شکل و صورت ہے یعنی ہر ایک میں قوتِ مصوّرہ کارفرما ہے، اور جہاں بھی قوتِ مصورہ ہو، وہاں قوتِ نامیہ کا ہونا بھی چوں کہ ضروری ہے، اس لئے دنیا کی ہر شے، ہر وصف اور ہر معنی میں قوتِ نامیہ بھی ہے، جس کے ذریعے نشو ونما کا عمل انجام پائے، اور چوں کہ دنیا میں بے شمار اشیا اور اوصاف و معانی ابھی نشو ونما کے بعد مرتبۂ ظہور تک نہیں پہنچے ہیں، اس لئے یقیناً یہ کبھی نہ کبھی اس مرتبے تک پہنچیں گے اور اس وقت ایک بڑی تبدیلی سے دوچار ہوں گے، اسی کو قیامت سے تعبیر کرتے ہیں۔

دلیل پنجم

سیاسی نقطۂ نظر سے بھی اگر کائنات کا جائزہ لیجئے، تو قیامت کا وقوع یقینی نظر آتا ہے۔ کیوں کہ حکام دنیا اور فرماں روایانِ عالم کا یہ عام رویہ رہا ہے کہ اگر کسی قصبے، شہر، یا علاقے کے لوگ باغی ہو جائیں، کھلے عام سرکشی پر اتر آئیں اور قانون، اخلاق اور تہذیب ہر چیز کی خلاف ورزی کو اپنا شعار بنالیں اور کسی طرح بھی راہ پر آنے کے لیے آمادہ نہ ہوں تو مجبوراً اس بھیانک جرم کی سزا دیتے ہوئے اور لوگوں کو اُن کے شر سے محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے یا تو انھیں قتل یا دائمی طور پر قید کر دیا جاتا ہے، یا پھر جلاوطن کر کے اُن کے ٹھکانوں اور علاقوں کو جلا پھونک کر خاک کر دیا جاتا ہے، کیوں کہ کسی بھی جگہ عام اور رائج قانون و حکومت کی خلاف ورزی اور اس سے بغاوت سے بڑا کوئی جُرم نہیں سمجھا جاتا اور اِس لئے اس کی سزا بھی بھیانک ترین تجویز کی جاتی ہے۔

اس لحاظ سے دنیا اور اس میں بسنے والے انسانوں کے بارے میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ صورتِ حال سے یہاں پوری مماثلت و مشابہت پائی جارہی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ پوری کائنات اور اس میں موجود تمام مخلوقات و موجودات کا اصل خالق، مالک اور حاکم، ذاتِ خداوندی ہے۔ بنی آدم ایک مکلف و باشعور مخلوق ہونے کی وجہ سے خدا کے مملوک و محکوم اور اس کے رعایا ہیں اور آسمان و زمین اُس کے رہنے سہنے اور زندگی گزارنے کی جگہ۔ کیوں کہ یہ اسی مقصد کے لئے بنائے گئے ہیں جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے۔ اس اعتبار سے حالات کا جائزہ لینے سے واضح ہوتا ہے کہ کائنات میں موجود انسانوں یعنی رعیت خداوندی کی ایک بڑی تعداد اپنے خالق و حاکم خدائے عزوجل کی نافرمانی، سرکشی اور بغاوت پر آمادہ اور اس میں مبتلا ہے۔ اس لیے یہ یقین ہے کہ ایک نہ ایک روز ایسا وقت ضرور آئے گا جب احکام خداوندی کی نافرمانی اور بغاوت و سرکشی بالکل عام ہوجائے گی اور پوری دنیا پر چھا جائے گی۔ کیوں کہ بغاوت کی بنیاد خواہش پر ہوتی ہے اور خواہش کے مطابق عمل کرنا ہر انسان کا فطری اور طبعی خاصہ ہوتا ہے اور اس کے مقابلے میں اطاعت و عبادتِ خداوندی کی بنیاد مخالفتِ خواہش پر ہوتی ہے، جو انسان کے لیے ایک عارضی کیفیت ہوتی ہے۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ عارضی چیزوں کا انجام دینا چوں کہ مخالف خواہش ہونے کی وجہ سے دشوار ہوتا ہے، اس لیے ہمیشہ اس مخالفِ امر یعنی اطاعت پر آمادہ کرنے کے لیے آسمانی پیغمبر اور کتابیں بھیجی جاتی رہی ہیں اور عتاب و ثواب کے وعدے اور وعیدوں سے کام لیا جاتا رہا ہے، لیکن تمرد و سرکشی چوں کہ انسانی فطرت کا خاصہ ہے اسی لئے اس کے فطری اور منطقی ہونے کی وجہ سے کوئی ترغیبی کام نہیں کیا گیا۔ غرض خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کی آمد تک تو مختلف انبیاء اور آسمانی کتابیں بھیج کر انسانوں کو خدا کی بغاوت سے باز رکھنے کی کوشش کی جاتی رہی ہے، مگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بعد کائنات کی تخلیق کا مقصد عبدیت کاملہ چوں کہ پورا ہوگیا، جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے، اس لیے کائنات کے بقا کی مزید کوئی ضرورت نہیں رہی اور نہ ہی بنی آدم کی مزید نگرانی کی، چناں چہ نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام انسان احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی اور اس سے بغاوت جیسے فطری تقاضوں

پر عمل پیرا ہونے لگیں گے اور ایک دن ایسا ضرور آئے گا جب سارا عالم باغی ہو جائے گا، ساری خدائی سرکش ہو جائے گی اور پورا عالم کفر و شرک کے سیاہ بادلوں میں گھر جائے گا۔ اسی وقت خدا بھی اپنی قہاری کا مظاہرہ کرے گا اور جس طرح دنیا میں باغیوں اور سرکشوں کو ملیا طیٹ یا دائمی طور پر قید کر کے اُن کے ٹھکانوں کو برباد کرنے کی روش عام ہے، خدا بھی کائنات کے نظام کو درہم برہم کر دے گا اور تمام انسانوں کو گرفتار کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق جزا سزا دے گا۔ اِسلام میں کائنات کے تھوڑ پھوڑ اور اس کے نظام کے اسی درہم برہم ہونے اور جزا سزا کے مراحل کو قیامت اور حشر و نشر سے تعبیر کیا گیا ہے۔

ربّنا تقبل منّا انّک انت السمیع العلیم

تمت

FAISAL INTERNATIONAL
2649,Kucha Chelan, Daryaganj, New Delhi.110002
Phone : +91-9625523987,9568894770,8439971785
e-mail : faisalexim@gmail.com, web : idarafaisal.com